ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت
شریعت اسلامی کی روشنی میں

[اسلامک فقہ اکیڈمی(انڈیا) کے اٹھائیسویں فقہی سمینار منعقدہ مؤرخہ ۸۔۱۰؍ربیع الاول۱۴۴۰ھ
مطابق ۱۷۔۱۹؍نومبر ۲۰۱۸ء کو جامعہ اسلامیہ دار العلوم محمدیہ میل کھیڑلا، بھرتپور،
راجستھان میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ]

ایفا پبلی کیشنز - نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت - شریعت اسلامی کی روشنی میں
صفحات : ٤٣٤
قیمت : ٣٣٥؍ روپے
سن طباعت : اکتوبر ٢٠٢٣ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز
١٦١- ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ٩٧٠٨
جامعہ نگر،نئی دہلی-١١٠٠٢٥
ای میل: ifapublications@gmail.com
فون: ٠١١ - ٢٦٩٨١٣٢٧

مجـــلـــــس ادارتـــــــــــ

۱- مولانا محمد نعمت الله اعظمی
۲- مولانا محمدبرہان الدین سنبھلی
۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
۴- مولانا خالد سیف الله رحمانی
۵- مولانا عتیق احمد بستوی
۶- مفتی محمد عبید الله اسعدی


بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	٧
باب اول: تمہیدی امور		
سوالنامہ		١١
تجاویز		١٧
تلخیص مقالات	مفتی امتیاز احمد قاسمی	٢٠
عرض مسئلہ (محور اول)	ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی	٧٩
عرض مسئلہ (محور دوم)	ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی	٨٨
عرض مسئلہ (محور سوم)	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	٩٤
عرض مسئلہ(محور چہارم)	مولانا محمد ظفر عالم ندوی	١٠٧
باب دوم: مقالات		
جواہرات کی خرید وفروخت .بعض جدید شکلیں	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	١١٥
جواہرات کی بیع سے مربوط اہم مسائل	مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی	١٢٠
ہیرے اور جواہرات کی خریدوفروخت	ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی	١٥٥
جواہرات کی خریدوفروخت میں پیش آنے والے جدید مسائل	مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی	١٧٦
جواہرات کی خریدوفروخت کے بعض احکام	مفتی جمیل احمد نذیری	١٩٧
ڈائمنڈ وجواہرات کی خریدوفروخت	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	٢٠٣
جواہرات کی خریدوفروخت سے مربوط بعض مسائل	مولانا محمد ظفر عالم ندوی	٢٢١
ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت	مولانا حافظ کلیم اللہ عمری	٢٢٨
ہیرے جواہرات کی خرید وفروخت کے اہم مسائل	مولانا جنید بن محمد فلاحی	٢٣٥
جواہرات کی خریدوفروخت سے متعلق سوالات کے جوابات	مولانا محمد عثمان بستوی	٢٤٧

دلالی اور جواہرات کی خریدوفروخت سے متعلق چند اہم مسائل	قاضی محمد حسن ندوی	۲۷۸
جواہرات کے متعلق سوالات کے جوابات	مفتی عبد القیوم قاسمی	۳۲٤
جواہرات کی تجارت سے متعلق چند مسائل	مولانا محمد ابرار خان ندوی	۳۳۳
ہیرے اور جواہرات کی خریدوفروخت	مولانا نثار احمد گودھروی	۳٤٦
جواہرات کی خریدوفروخت سے متعلق نئے مسائل	مولانا عمر بن یوسف کوکنی	۳٥۹
ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت کے اہم مسائل	مولانا عبد المنان قاسمی	۳۷٤
جواہرات کی خریدوفروخت کی جدید صورتیں	مولانا صابر حسین ندوی	۳۸۰
ڈائمنڈ وجواہرات کی خریدوفروخت	مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا	٤۰۸
جواہرات کی خریدوفروخت سے مربوط فقہی مسائل	مولانا ابراہیم فلاحی	٤۱۸
باب سوم: مناقشہ		
مناقشہ		٤۲۹

پیش لفظ

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا اٹھائیسواں سمینار ہندوستان کے مشہور شہر جے پور میں منعقد ہونے والا تھا، یہ شہر مختلف صنعتوں کے لئے جانا جاتا ہے، ان میں ایک ہیرے اور جواہرات کی تجارت بھی ہے، جب یہاں سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تو جواہرات کے تاجروں نے ان کو پیش آنے والے مسائل کو بھی موضوع بحث بنانے کی گزارش کی؛ چنانچہ جے پور میں جواہرات کے تاجروں کے ساتھ بیٹھک رکھی گئی، معلوم ہوا کہ ہیروں کے تجار زیادہ تر سورت میں ہیں؛ لہٰذا سورت میں بھی ان تجار کے ساتھ نشست ہوئی؛ تاکہ اس شعبہ کے تاجروں کو جو مسائل در پیش ہیں، ان کو سمجھا جائے، اور اس کی روشنی میں ایک تفصیلی سوال نامہ مرتب کیا گیا، جو چار محاور اور ۲۶؍سوالات پر مشتمل ہے، بعض مجبوریوں کی وجہ سے اگرچہ یہ سیمینار جے پور کے بجائے راجستھان کے ایک اور شہر میل کھیڑلا بھرتپور(میوات) میں منعقد ہوا؛ لیکن یہ موضوع سمینار میں شامل رہا۔

موضوع سے متعلق ۱۹؍مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے، یہ مقالات،مختلف محاور سے متعلق چار عرض، شرکاء سمینار کا مناقشہ اور اکیڈمی کا فیصلہ ان سب کے مجموعہ کوعزیز گرامی ٔقدر مولانا امتیاز احمد قاسمی(رفیق شعبۂ علمی) نے خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب کا درجہ رکھتی ہے، جس میں بنیادی مسائل کے ساتھ ساتھ اس شعبہ سے مربوط تجار کو پیش آنے والی زیادہ سے زیادہ جزئیات کا بھی احاطہ ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور اکیڈمی جس تسلسل اور اعتدال کے ساتھ عصر حاضر میں پیدا ہونے والے احکام شرعیہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اس کو کامیاب فرمائے۔

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۱ھ
۱۳؍ستمبر ۲۰۱۹ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

* * *

پہلا باب

تمہیدی امور

سوالنامہ:

جواہرات کی خرید و فروت

اللہ تعالی نے جہانانسان سے دنیا میں بہت سی ضرورتیں متعلق رکھی ہیں، وہیں اس میں ایک جذبہ زیبائش وآرائش کا بھی رکھا گیا ہے، اس جذبہ کی تسکین کے لئے انسان نت نئے ڈیزائن کے لباس تیار کرتا ہی ہے، بالوں کی تراش وخراش کرتا ہے، رنگ پیدا کرنے والے مواد سے بھی استفادہ کرتا ہے، لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ وہ قدرتی پتھروں، دھاتوں اور مصنوعی اشیاء کے زیورات کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو سنوارتا ہے، اسی جذبہ حسن آرائی نے ان پتھروں کو جن سے نہ انسان کا پیٹ بھرسکتا ہے اور نہ جسم کی ستر پوشی ہوسکتی ہے، لوگوں کے لئے مرغوب بنادیا ہے اور مہنگی قیمتوں میں ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔

جواہرات کی تراش وخراش ، زیورات کی بناوٹ اور ان کی خرید و فروخت میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کام کرتی ہے، اور معاشی اعتبار سے بھی یہ ان کے لئے ایک نفع بخش کاروبار ہے، اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ۲۸ویں فقہی سمینار کے لئے جن عنوانات کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں جواہرات کی خرید و فروخت بھی ہے؛ چنانچہ اس سے متعلق چند اہم سوالات پیش خدمت ہیں، جن میں بعض کا تعلق زیورات کی بناوٹ سے ہے اور بعض کا ان کی تجارت سے، امید کہ آں محترم تفصیل سے اس کا جواب لکھیں گے، آپ کی تحریر انشاء اللہ شرکاء سمینار کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

محور اول:

۱-بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بائع مثلاً سو روپئے میں بیچنا چاہتا ہے، خریدار ۷۵ روپئے میں خریدنا چاہتا ہے اور بروکر کوشش کر کے خریدار کو ۷۵ روپئے ہی میں خریدنے پراور بیچنے والے کو ۶۵ روپئے میں بیچنے پر تیار کرلیتا ہے، دونوں میں جو دس روپئے کا فرق ہوتا ہے ،وہ بروکر بائع اور مشتری کو نہیں بتاتا، خود رکھ لیتا ہے،جبکہ اس کو اپنی دلالی کی فیس ۴؍فیصد الگ سے ملتی ہے، کیا اس کی گنجائش ہے؟

۲-اس صورت میں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع جس قیمت پر تیار ہوا، دلال خود اس قیمت پر اس سے مال خرید لیتا ہے، اور خریدار جس قیمت پر تیار ہوا تھا، اس قیمت پر اس کو فروخت کردیتا ہے، گویا اس کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی ہوجاتی ہے، اور یہ بات دلال کے اختیار میں ہوتی ہے کہ وہ چار فیصد اپنی فیس نہ لے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلال نے بائع کو ساٹھ روپئے سے بیچنے پر تیار کرلیا اور خریدار تیار کیا جو ستر روپئے میں خریدنے پر آماد ہ تھا؛ لیکن دلال نے بائع سے حقیقی مشتری کو ملانے کے بجائے ایک فرضی خریدار تیار کر کے اس سے بائع کی بات کرادی، اور جب وہ چیز ۶۰؍روپئے میں حاصل ہوگئی تو خریدار سے ۷۰؍روپئے میں فروخت کیا اور دس روپیہ کا فائدہ خود رکھ لیا، نیز ایسے معاملات میں بعض دفعہ بروکر چار فیصد دلالی فیس اس فرضی خریدار کو دے دیتا ہے، کیا یہ صورت درست ہوگی؟

۳-ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاریگر حضرات قیمتی جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مالک کے علم و اطلاع کے بغیربچالیتے ہیں اور اس طرح کا مال ایک خاص مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں، جس میں چوری کا مال بھی ملتا ہے، اور درست مال بھی، تو کیا اس مارکیٹ سے مال خریدا جاسکتا ہے، جبکہ متعین طور پریہ بات معلوم نہ ہو کہ یہی مال چوری کا ہے، اور اگر ہے تو کس شخص کا مال چوری کیا گیا ہے، یعنی اس کا اصل مالک کون ہے؟

۴-زیدنے ایک شخص سے اس کا لایا ہوا مال خریدا، کسی وجہ سے اس کو شبہ پیدا ہوا کہ یہ مال چوری کا ہے، اس نے بیچنے والے سے دریافت کرلیا کہ کہیں یہ مال چوری کا تو نہیں ہے، اس نے کہا : درست مال ہے، چوری کا نہیں ہے، تو کیا ایسا مال لیاجاسکتا ہے؟

۵-ایسا بھی ہوتا ہے کہ زید نے ایک شخص سے خرید کیا ہوا سامان اپنے قبضہ میں لے لیا، ابھی قیمت ادا نہیں کی اور اگلے شخص سے زیادہ قیمت میں اسے فروخت کردیا، اور جو پیسے آئے ،اس میں سے جس شخص سے ادھار خریدا تھا، اس کو پیسہ ادا کردیا اور جو پیسے بچ گئے ،اس کو اپنے نفع کے طور پر رکھ لیا، کیا یہ صورت جائز ہے؟

۶-ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک بائع سے کسی متعینہ سامان کی قیمت دریافت کی، ابھی خرید و فروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا اور نہ اس شئ پر قبضہ حاصل ہوا، البتہ وہ دوسرے شخص سے جو اس طرح کا سامان خریدنا چاہتا ہے، معاملہ طے کرلیتا ہے، اور اس سے زیادہ قیمت طے ہوتی ہے، اب وہ سابق شخص سے سامان حاصل کر کے اپنے خریدار کو فروخت کردیتا ہے اور دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کو اپنا نفع تصور کرتا ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟

محور دوم:

۱-ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار نے اپنے ذمہ واجب الادا رقم کی جو پرچی بائع کو دی، دلال بائع سے اس پرچی کو نقد پیسہ دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلیتا ہے، اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے حاصل کرتا ہے ،کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

۲-ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع سے ایک سامان خریدا، قیمت کی ادائیگی کا مقررہ وقت پورا ہوگیا، خریدار سامان فروخت نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے قیمت ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہے، اب یا تو بائع کے اصرار کی وجہ سے وہ خود سودی قرض

لے کر اپنی عزت بچانے کے لئے پیسہ حاصل کرتا ہے، یا اپنے کسی دوسرے ساتھی سے کہتا ہے کہ تم سودی قرض لے کربائع کا پیسہ ادا کردو، تم کو جو سود دینا پڑے گا ،وہ میں ادا کردوں گا، تو اس مقصد کے لئے سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز ہوگا؟

۳-ایک صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ پانچ سو روپئے کیرٹ کے حساب سے مال خریدنے کی بات طے کرتا ہے، اور اگلے شخص کو سات سو روپئے کے حساب سے فروخت کرنے کی بات طے کرتا ہے، نیز پہلے شخص سے مال لے کر دوسرے شخص کو فروخت کر کے اس سے قیمت وصول کرتا ہے، اب وہ بیچنے والے کوپوری قیمت ادا کرنے کے بجائے اس سے کہتا ہے کہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں تھا؛ اس لئے اس کی قیمت کم کرو، مثلاً اسے چار سو روپئے فی کیرٹ پر آمادہ کرلیتا ہے تو کیا شرعا یہ صورت جائز ہوگی؟

۴-ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سامان کو خرید کرتے ہوئے اس مال کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے؛ تاکہ بیچنے والا کم سے کم قیمت پر راضی ہوجائے؛ لیکن جب اسی مال کو فروخت کرتا ہے تو ڈھیر ساری تعریفیں کرتا ہے، کیا اس عمل کی گنجائش ہے؟

۵-اِس مال کی تیاری میں ملاوٹ کی بھی کافی گنجائش ہوتی ہے، مال تیار کرانے والا کہتا ہے کہ مجھے سستا مال چاہئے؛ لہذا مال تیار کرنے والا شیشے کو شامل کرتے ہوئے مال بناتا ہے ،یا رنگ ڈالتے ہوئے مال تیار کرتا ہے، پھر مال بنوانے والا، اس مال کو تاجر کے ہاتھ بیچتا ہے -اب ایک شکل تو یہ ہے کہ تاجر کو بتا دیاجائے کہ اس مال میں ملاوٹ ہے؛ لیکن اس نے کہا کہ مجھے سستامال چاہئے، ملاوٹ رہنے نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں۔دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو عیب سے مطلع ہی نہیں کیا گیا، ان صورتوں کا کیا حکم ہوگا؟

۶-قیمتی پتھروں کی تجارت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز ایک روپیہ میں بھی فروخت کی جاسکتی ہے، اورایک ہزار روپئے میں بھی، تو کیا شرعا اس کی کوئی تحدید ہے کہ مخصوص تناسب تک نفع لینا درست ہو، اس سے زیادہ نفع لینا درست نہیں ہو؟

محور سوم:

۱-بیع میں مثلا مبیع کی قیمت ایک لاکھ مقرر کی گئی اور بائع نے تیس فیصد ڈسکائونٹ کا وعدہ کیا؛ بشرطیکہ ایک ماہ میں قیمت ادا کردی جائے، اب اگر ایک ماہ میں قیمت اداء نہیں کی گئی، تو اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف-معاملہ طے پاتے وقت ہی خریدار کے سامنے یہ بات رکھ دی گئی تھی؟

ب-یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی ، مگر مارکٹ کا چلن یہی ہو۔

ج-نہ یہ شرط طے پائی اور نہ ہی اس قسم کا عرف ہے۔

ان صورتوں میں بائع کی طرف سے ڈسکائونٹ یعنی کم کردینا شرعا درست ہوگا؟

٢-کاریگر مطلوبہ شئ تیار کر کے دیتا ہے؛ لیکن مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جاتی ہے،بنوانے والا اس شئ کو حاصل کرلیتا ہے اور اسے فروخت بھی کرتا ہے؛ لیکن کاریگر کو اس کی کوئی اجرت ادا نہیں کرتا ہے، اس کو تاجروں کی اصطلاح میں ''ٹال '' کہتے ہیں، یعنی (Reject)کیا ہوا مال، کیا بنوانے والے کا یہ عمل درست ہے، جب کہ مارکٹ میں یہ طریقہ معروف اورمروج ہے؟

٣-قانونی مصلحت کے تحت عام طور پر قیمت درج کرتے ہوئے ایک زیرو کم کردیاجاتا ہے، جیسے ٣٠٠٠(تین ہزار)ہے تو ٣٠٠(تین سو) لکھا جاتا ہے، تاجر بھی اپنی یادداشت میں ٣٠٠(تین سو) ہی لکھتا ہے؛ لیکن فریقین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد تین ہزار ہے، تو کیا یہ عمل جائز ہوگا؟

٤-ایکسپورٹ میں اصل قیمت کے بجائے مثلاً دس فیصد قیمت ہی لکھی جاتی ہے، جوبینک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، بقیہ رقم کسی اور طریقہ پر وصول کی جاتی ہے؛ لیکن یہ فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور فریقین اس پر راضی بھی ہوتے ہیں، شرعا اس کا کیا حکم ہے؟

٥-کاریگر جب جواہرات کو زیور وغیرہ کے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو کچھ ذرات اور ٹکڑے نکل آتے ہیں، یہ کاریگر کے پاس ہی رہ جاتے ہیں، زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی مینچلی گئی، کیا یہ بچے ہوئے ذرات کاریگر کے لئے جائز ہوں گے؟

٦-قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں، بازار میں ان کا وزن دس گرام ماناجاتا ہے، دس گرام سے زیادہ جو وزن ہوگا، وہ پتھر کا ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ دھاگے آٹھ گرام کے ہوتے ہیں، اور خریدنے والے تاجرکو بتایاجاتا ہے؛ لیکن وہ اس کو ماننے سے انکار کردیتا ہے، اور اس کا وزن دس گرام ہی مانتا ہے، گویا دو گرام پتھر بھی دھاگوں کے ریٹ میں فروخت ہوتا ہے، کیا خریدار کا یہ عمل درست سمجھاجائے گا؟

٧-بعض دفعہ ایک مال مثلاً ایک قیراط پانچ سنٹ کا ہوتا ہے؟ لیکن خریدنے والا تاجر ایک قیراط مال پر اس کی پرچی بناتا ہے، پانچ سینٹ کی قیمت ادا نہیں کرتا ؛البتہ چونکہ پہلے بائع کے لئے صرف ایک قیراط کی قیمت کی پرچی لکھی گئی تھی؛ اس لئے وہ مجبورا اس پر راضی ہوجاتا ہے؛ لیکن خود وہ جب کسی اور سے اس مال کو فروخت کرتا ہے تو پورے ایک قیراط پانچ سینٹ کی قیمت لگاتا ہے، شرعا اس کا کیا حکم ہوگا؟

٨-بعض دفعہ ایک شخص مختلف لوگوں سے مال لے کرباہر چلاجاتا ہے؛تاکہ اسے فروخت کرے، اب خدا ناترس حضرات غلط بیانی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ مال ڈوب گیا؛ لہذا اب پچیس فیصد قیمت لے لو، اور بیچنے والا اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا

ہے؛کیونکہ لکھی ہوئی قیمت اس سے بہت کم ہوتی ہے، ایک زیرو کم کرنے کی وجہ سے اسی قیمت کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے،مجبوری میں قبول کرنے کی وجہ سے شرعا کیا اس شخص کے لئے یہ مال حلال ہوگا؟

محور چہارم:

جے پور سے ہیرے کے بعض تاجروں نے مندرجہ ذیل سوالات بھیجے ہیں، یہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کئے جارہے ہیں:

۱-ڈائمنڈ کا مال ہم عامۃً دو مہینے کی ادھاری پر فروخت کرتے ہیں، توکیا ہم اس کو نقد ۶ یا۸ فیصد لیس (تخفیف) کر کے بیچ سکتے ہیں؟

۲-دو مہینے کی ادھاری پر ہم نے مال فروخت کیا، لیکن کیاایک مہینے کے بعد پیسوں کی فوری ضرورت پیش آنے پر کچھ فیصد قیمت میں سے تخفیف کر کے پیسے لئے جاسکتے ہیں؟

۳-ڈائمنڈ کے اصل یا نقل ہونے کا دارومدار سرٹیفکیٹ پر ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا کاروبارعام طور سے سرٹیفکیٹ پر ہوتا ہے، چنانچہ سرٹیفکیٹ ہے تب تو خیر! لیکن بعض مرتبہ بغیرسرٹیفکیٹ کے صرف دیکھ کر خریدنے پر اکتفا کرنے کی نوبت بھی آتی ہے، اس صورت میں اگر بائع نے گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچ دیا اور مشتری نے بائع پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو اعلی سمجھ کر خریدلیا، پھر رپورٹ نکالنے پر معلوم ہوا کہ وہ ڈائمنڈ تو گھٹیا تھے، توکیا اب بائع سے طے شدہ قیمت میں کمی کرواسکتے ہیں یا نہیں؟

۴-ڈائمنڈ کی ایک قسم ہے ''ریئل ڈائمنڈ ''(یہ اصل ڈائمنڈ ہیں) دوسری قسم CVD(Chemical Vapor Deposition)اس دوسری قسم کو کیمیکل کے ذریعہ بنایاجاتا ہے، ریئل ڈائمنڈ کے مقابلہ میںCVDڈائمنڈ کی ویلو ۲۵؍فیصد سمجھی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جوہری سے الف نے ''ریئل ڈائمنڈ '' طلب کئے، اور جوہری نے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے رِئل ڈائمنڈ کے نام سے CVDڈائمنڈ تھما دیئے، الف نے جب رپورٹ نکلوائی، تو ریئل ڈائمنڈکے بجائے وہCVDڈائمنڈ نکلے، تو اس صورت میں وہ جوہری کو ڈائمنڈ واپس لوٹا سکتا ہے؟

۵-میں نے ایک ڈائمنڈ ۲؍لاکھ روپئے میں خریدا اور میں نے زید کو وہ ڈائمنڈ بتایا، اس نے اس کی قیمت ڈھائی لاکھ روپئے بتلائی، اب میں نے اس سے کہا کہ کیا تومیرے ساتھ اس ڈائمنڈ میں سوا دو لاکھ روپئے میں شرکت کے لئے تیار ہے کہ اس کی قیمت کا ایک حصہ تم ادا کردو اور یہ چیز ہم دونوں میں مشترک ہوجائے پھر نفع میں بھی دونوں کی شرکت ہو، کیا یہ صورت درست ہے یا نہیں؟

۶-الف نے ب کو ایک ڈائمنڈ بیچنے کے لئے پیش کیا، ب نے کہا میں اس کی قیمت مارکیٹ میں پوچھ کربتائوں گا، اب ب نے وہ ڈائمنڈ ج کو بتایا، ج نے اس کی قیمت ڈھائی لاکھ روپئے بتائی، تو ب نے ج سے کہا کہ تو میرے ساتھ اس ڈائمنڈ میں سوا دو لاکھ

روپئے میں شرکت کرنا چاہتا ہے؟ تو کیایہ شرکت درست ہوگی؟ اور ب نے الف سے سوا دو لاکھ روپئے سے کم مثلاً دو لاکھ روپئے میں وہ ڈائمنڈ خریدا تو ب کی ج کے ساتھ سوا دو لاکھ میں شرکت درست ہوگی؟نیز اس مسئلہ میں ب کی اصل خریداری قیمت ٢،لاکھ روپئے ہے، تو یہ قیمت ج کو بتلانے یا نہ بتلانے سے مسئلہ میں کوئی فرق پڑے گا یا نہیں؟

* * *

تجاویز:

جواہرات کی خریدوفروخت

۱- بروکر امین ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ بائع یا مشتری کو دھوکہ دیتے ہوئے کوئی رقم اپنی مقررہ فیس کے علاوہ رکھ لے۔
۲- بروکر جس کے لیے کام کر رہا ہے، اسے بتلانے کے بعد خود اپنے لیے خرید سکتا ہے، البتہ فروخت کرتے وقت خریدار کے سامنے اپنی حیثیت کو بھی واضح کردینا ضروری ہے۔
۳- بروکر کے لیے فرضی خریدار تیار کرکے بائع سے کم قیمت میں لے کر حقیقی خریدار کو زیادہ قیمت میں بیچنا جائز نہیں ہے۔
۴- جس مارکیٹ میں جائز و ناجائز دونوں طرح کے مال فروخت ہوتے ہوں، اس مارکیٹ سے مال خریدنا جائز ہے جب تک کہ یقینی طور پر یہ نہ معلوم ہو کہ وہ چوری کا ہے۔
۵- خریدار کو اگر فروخت کرنے والے کی بات پر اعتماد ہو کہ وہ چوری کا مال نہیں ہے تو خریدنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔
۶- ادھار خرید کر مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد نفع کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔
۷- خرید و فروخت کا معاملہ مکمل کرنے سے قبل دوسرے کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں، البتہ وعدۂ بیع کرسکتا ہے۔
۸- بروکر یا کسی شخص کا واجب الاداء رقم کی پرچی کو کم قیمت میں خریدنا جائز نہیں ہے۔
۹- سامان کی قیمت ادا کرنے کے لیے عام حالات میں سودی قرض لینا یا دوسرے کے قرض کی ادائیگی کے لیے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے۔
۱۰- سامان خریدنے کے بعد بائع کی رضامندی سے قیمت کم کرانا خریدار کے لئے جائز ہے، لیکن جھوٹ بول کر اور فریب دے کر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔
۱۱- جو سامان نقص و عیب سے خالی ہو، ایسے سامان کے اندر خریدتے وقت عیب و نقص نکال کر کم پیسے میں خریدنا اخلاقی و شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اسی طرح کسی چیز میں جو خوبیاں نہیں ہیں، ان کو بیان کرکے زیادہ قیمت میں فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔
۱۲- مال تیار کرانے والا اگر سستے مال کا مطالبہ کرے او راس کی تیاری میں ملاوٹ کی ضرورت پڑے تو تاجروں کے عرف میں جس قدر ملاوٹ معلوم و مشہور ہو

اتنی مقدار ملاوٹ کی گنجائش ہے، البتہ زائد ملاوٹ کی صورت میں اس سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔

۱۳- شریعت اسلامی میں نفع کا کوئی تناسب متعین نہیں ہے، باہمی رضامندی سے جو بھی قیمت طے ہوجائے وہ درست ہے، البتہ مارکیٹ کی رائج قیمت سے زائد لینا تقاضۂ مروت اور اسلامی اخلاق کے خلاف ہے۔

۱۴- بیع و شراء کے وقت ہی ڈسکاؤنٹ متعین ہوجائے یا اس کا عرف و رواج ہو تو خریدار کے لیے شرط اور عرف کے مطابق ڈسکاؤنٹ کے مطالبہ کا حق ہے۔

۱۵- اگر اس کا عرف نہ ہو اور نہ ہی عقد کے وقت ایسی شرط لگائی گئی ہو تو خریدار ڈسکاؤنٹ کا مطالبہ نہیں کرسکتا، البتہ فروخت کرنے والا خود ڈسکاؤنٹ کردے تو حرج نہیں ہے۔

۱۶- جو سامان بنوایا گیا ہو، اگر اس کے طے شدہ معیار میں کمی رہ جاتی ہے اور سامان بنوانے والا وہ سامان حاصل کرلیتا ہے تو مقدارِ اجرت میں تاجروں کا عرف ملحوظ ہوگا۔

۱۷- کسی مصلحت کے تحت سامان پر قیمت کم لکھنے میں حرج نہیں، بشرطیکہ عاقدین اس لکھی ہوئی قیمت کی مراد کو اچھی طرح سمجھتے ہوں ۔

۱۸- زیور بناتے وقت جو کارآمد ذرات کاریگر کے پاس رہ جاتے ہیں، اصلاً وہ بنوانے والے کے ہیں، لیکن اگر کسی علاقہ میں اس کو کاریگر کی اجرت یا اجرت کا جز سمجھا جاتا ہو تو کاریگر کے لئے اس کو رکھنا جائز ہے۔

۱۹- قیمتی پتھروں کو پرونے والے دھاگے اگرچہ کم وزن کے ہوں لیکن باہمی رضامندی سے ان کو زیادہ وزن کے درجہ میں رکھ کر قیمت طے کرلی جائے تو یہ درست ہے۔

۲۰- دباؤ بناکر حقیقی وزن سے کم لکھوانا شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ اگر تاجروں کے عرف میں کچھ مقدار کی قیمت نہ لگائی جاتی ہو تو اس کے بقدر قیمت کم کرکے لکھنے کی گنجائش ہے۔

۲۱- تاجر کے لیے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مقررہ قیمت سے کم ادا کرنا شرعاً ناجائز ہے، اور اس پر لازم ہے کہ قیمت ادا کرے، خواہ پرچی پر کسی مصلحت سے کم قیمت لکھی گئی ہو۔

۲۲- نقد و ادھار کی بنیاد پر قیمت کی کمی و بیشی شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین بوقت عقد ایک ثمن پر متفق ہوجائیں۔

۲۳- دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو اس کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہوگا جبکہ یہ چھوڑنا تعجیل کے عوض کے طور پر مشروط نہ ہو، بلکہ تبرعاً ہو۔

۲۴- گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلیٰ ڈائمنڈ بتاکر بیچنا جائز نہیں ہے، اور اگر بیچ دیا گیا تو جب تک وہ ڈائمنڈ خریدار کی ملکیت میں بعینہ موجود ہو تو اس وقت تک قیمت کم کرانے کا

اختیار نہیں، البتہ معاملہ کو ختم کرکے اپنا پیسہ واپس لینے یا از سر نو معاملہ کرنے کا اختیار ہوگا، نیز اگر اس ڈائمنڈ میں کوئی ایسی شکل پیدا ہوجائے کہ واپس کرنا ممکن نہ ہو تو بقدر نقصان قیمت کم کرانے کا اختیار ہوگا۔

۲۵- حقیقی ڈائمنڈ کی جگہ کیمیکل کے ذریعہ بنایا گیا ڈائمنڈ (C-VD)دے دے تو سامان کو واپس کرکے خریدار کو پورا ثمن واپس لینے کا اختیار ہے۔

۲۶- کوئی سامان خرید کر کسی دوسرے کو اس کا کچھ حصہ کسی بھی متعین قیمت پر فروخت کرکے اس کو شریک کرلینا جائز ہے۔

۲۷- خریدنے سے پہلے کسی سے شرکت کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ شرکت کا وعدہ کرسکتا ہے۔

* * *

تلخیص مقالات:

جواہرات کی خریدوفروخت

مفتی امتیاز احمد قاسمی•

إن الحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی آلہ وصحبہ جمیعاً۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اٹھائیسویں فقہی سمینار میں جن چار اہم موضوعات پر بحث وتحقیق اور مناقشہ ہونا ہے ان میں ایک موضوع ''جواہرات کی خریدوفروخت '' ہے، جس میں چار محاور کے تحت ۲۶؍سوالات قائم کئے گئے ہیں، اور اہل علم وتحقیق سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن وسنت، آثار صحابہ اور اجتہادات فقہاء کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

چنانچہ اکیڈمی کو اس موضوع پر کل ۱۹؍مقالات موصول ہوئے ،جس کی تلخیص کی ذمہ داری اکیڈمی نے مجھے دی ہے، تاکہ ایک دوسرے کی آراء اور دلائل سے واقف ہوا جاسکے، ان مقالات میں سے بعض بہت مفصل ہیں، جس میں موضوع کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ ہے، بلکہ بہت سے متعلقات بھی ذکر کئے گئے ہیں جن سے اصل مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بعض مختصر ہیں، لیکن سوالا ت کے مکمل جوابات مع دلائل موجود ہیں، جبکہ بعض مقالے بہت ہی مختصر ہیں، یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موضوع کے مقالہ نگار حضرات میں سے بعض نے دو محاور کے جوابات تحریر فرمائے، بعض نے تین محاور کے، جبکہ بیشتر نے مکمل چاروں محاور کے جوابات قلم بند کئے ہیں، جن کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی، ڈاکٹر محمد محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا جمیل احمد نذیری، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مفتی عثمان حلیمی بستوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد القیوم قاسمی پالنپوری، مفتی جنید محمد فلاحی پالنپوری، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی عبدالمنان پرمائی ویٹی، مولانا قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی عبد اللہ خالد لوناواڑہ، مولانا ابراہیم بن سلیمان فلاحی۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر ۱: بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بائع مثلاً سو روپئے میں بیچنا چاہتا ہے،

• رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

خریدار ۷۵ روپئے میں خریدنا چاہتا ہے اور بروکر کوشش کر کے خریدار کو ۷۵ روپئے ہی میں خریدنے پراور بیچنے والے کو ۶۵ روپئے میں بیچنے پر تیار کرلیتا ہے، دونوں میں جو دس روپئے کا فرق ہوتا ہے ،وہ بروکر بائع اور مشتری کو نہیں بتاتا، خود رکھ لیتا ہے، جبکہ اس کو اپنی دلالی کی فیس ۴٪فیصد الگ سے ملتی ہے، کیا اس کی گنجائش ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ بائع اور مشتری کو بغیر بتائے اپنی دلالی کی فیس کے علاوہ درمیانی دس روپئے کو بروکر کے لئے خود رکھ لینے کی شرعاً گنجائش نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی وغیرہ]۔

دلائل:

بروکر کا ایسا کرنا فریب، دھوکہ اور نجس ہے اور امانت میں خیانت ہے اور باطل طریقہ پر مال کھانا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱- ‘‘ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل و تدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم و أنتم تعلمون’’ (سورہ بقرہ: ۱۸۸)، [دیکھئے مذکورہ حضرات کے مقالے]۔

۲- ‘‘لا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه’’ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۵۴۲۷) [مقالہ: مولانا اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۳- بروکر اگر عقد کو انجام دے رہا ہے تو وہ اس حالت میں وکیل ہے اور وکیل امین ہوتا ہے، لہٰذا اسے جو نفع ہوگا وہ مؤکل کا ہوگا:

- ‘‘إذا وكله ببيع عبد فباعه بألفين جاز لأن الزيادة هناك بدل ملك المؤكل فيكون له’’ (ہدایہ)۔

- ‘‘ولا يجوز أن يستحقه الوكيل لا بإذن المؤكل ولا بغير إذنه و لهذا لو قال بع ثوبي هذا على أن ثمنه لك لا يصح’’ (نتائج الأفكار ۴۴٫۸) [مقالہ: مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

- ‘‘وهبة بائع لوكيل اشترى منه، كنقص من الثمن فتلحق بالعقد، لأنها لمؤكله’’ (مطالب أولى النهى ۱۳۲٫۳، طبع دمشق) [مقالہ: مفتی شاہ جہاں ندوی]۔

۴- ‘‘وليس للوكيل شراء عين شراءه لنفسه أو لمؤكل آخر، لأنه يؤدى إلى تغرير الآمر من حيث أنه اعتمد عليه’’ (فتاوی ہندیہ)۔

- ‘‘ليس لمن وكل باشتراء شئ معين أن يشترى ذلك الشئ (بالثمن الذى عينه المؤكل أو بأقل منه) لنفسه حتى لا يكون له، و إن قال عند اشترائه اشتريت هذا لنفسى، بل يكون للمؤكل، إلا أن يكون قدر اشتراه بثمن أزيد من الثمن الذى عينه المؤكل أو بغبن فاحش’’ (شرح درر

الحکام ۵۹۳٫۳)، ‘‘وإن وکل بشراء شئ بغیر عینہ فالشراء للوکیل إلا إذا نواہ للمؤکل وقت الشراء أو شراہ بمالہ أی بمال المؤکل’’ (الدر المختار ۵۱۸٫۵) [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

۵- دام بڑھاکر مشتری کو اور دام گھٹاکر بائع کو مغالطہ اور فریب میں مبتلا کرکے خرید و فروخت کے درمیانی قیمت کے فرق سے دس روپئے کی حرام خوری کرتا ہے، جو گناہ کبیرہ ہے۔

- ‘‘عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:و قال قتیبۃ:یبلغ بہ النہی صلی اللہ علیہ وسلم قال:‘‘لاتناجشو’’، وقال الترمذی: والعمل علی ہذا عند أہل العلم کرہوا النجش، و النجش أن یأتی الرجل الذی یبصر السلعۃ إلی صاحب السلعۃ، فیستام بأکثر مما تسوی، و ذلک عند ما یحضرہ المشتری یرید أن یغتر المشتری بہ و لیس من رأیہ الشری، إنما یرید أن ینخدع المشتری بما یستام و ہذا ضرب من الخدیعۃ’’ (جامع الترمذی ۲۴۴٫۱) (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

۶- ‘‘المسلمون عند شروطہم’’ (صحیح البخاری، کتاب الاجارہ، باب أجرۃ السمسرہ) (مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۷- حضرت تھانویؒ نے اسی طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا: ‘‘یہ مال چھ روپئے من کو فروخت ہوا ہے، یہ سب روپیہ مالکوں کا حق ہے، کیونکہ ان کے مال کا بدل ہے اور اس میں سے بیوپاری مذکور کو فی من ایک روپیہ رکھنا جائز نہیں، ہاں اگر مالکوں کو خبر ہوجائے اور وہ اس کو معاف کریں تو بعد معاف کردینے کے اس کو حلال ہوجاوے گا، اگر مالکوں کو خبر نہ ہوتی یا وہ معاف نہ کرتے تو وہ روپیہ حرام رہتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ‘‘ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجار ۃ عن تراض منکم’’ (امداد الفتاوی ۴۰۷٫۳) (مفتی عثمان بستوی)۔

دوسری ایک خرابی یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں بروکر مبیع کا مالک نہیں ہے، اور نہ ہی وہ بائع کا وکیل ہے اور نہ ہی اسے ولایت حاصل ہے، اور نہ وہ چیز اس کے ضمان میں آرہی ہے اور نہ یہ فضولی کی قبیل سے ہے، ایسی صورت میں وہ بائع کے قبضہ سے لے کر مشتری کے حوالے کررہا ہے اور بائع کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ ۶۵میں فروخت کی گئی ہے ،جبکہ مشتری کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ ۷۵میں خریدی گئی ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

ومنہا : الملک والولایۃ فلا تنعقد اجارۃ الفضولی لعدم الملک والولایۃ؛ لکونہ ینعقد موقوفا علی اجازۃ المالک عندنا...ثم الاجازۃ انما تلحق الاجارۃ الموقوفۃ بشرائط (بدائع الصنائع ۲۰٫۴)۔

البتہ بعض مقالہ نگار حضرات نے کچھ شرائط و قیود کے ساتھ اس کی گنجائش نکالی ہے۔

مثلاً مفتی عثمان بستوی اور مولانا عبد المنان آسام کی رائے ہے کہ اگر وہ بائع کو

باخبر کردے اور بائع اس کے اس فعل پر بغیر کسی جبر و دباؤ کے راضی ہوجائے تو اس کی گنجائش ہے۔

اسی طرح مولانا ظفر عالم ندوی اور قاضی محمد حسن ندوی لکھتے ہیں کہ اگر بائع سے یہ معاملہ ہو کہ یہ سامان ۶۵ روپئے میں فروخت کرو، اگر اور زیادہ میں فروخت کروگے تو فائدہ تمہارا ہوگا تو یہ صورت جائز ہوگی۔

قال ابن عباس: ''لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب فما زاد على كذا و كذا فهو لك'' (صحيح البخاری، كتاب الاجاره، باب أجرة السمسرة)۔

مولانا عمر بن یوسف کوکنی لکھتے ہیں: عامتاً عاقدین بروکر کی اس چالاکی سے باخبر رہتے ہیں، یا ابتداء واقف نہ ہوں، لیکن اطلاع کے بعد عاقدین کی طرف سے صراحۃ یا دلالۃ رضامندی کا اظہار ہوتا ہے --- اس لئے کہ عاقدین میں سے کسی کا بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوتا جو دونوں کے درمیان باعث نزاع ہو، اسی وجہ سے ایسے موقع پر بعد میں عاقدین عقد کو فسخ نہیں کرتے، بلکہ اس کو نافذ ہی کرتے ہیں، اس لئے دونوں کو ایک مناسب قیمت پر آمادہ کرکے ان کے درمیان مثلاً ۱۰ روپئے کا جو فرق ہوتا ہے وہ رقم بروکر کے لئے جائز ہے۔

''ولا بأس أن يقول شخص لآخر بع هذا الشئ بكذا و ما زاد فهو لك أو بيني و بينك'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۳۳۲۶،۵)۔

مولانا اقبال محمد ٹنکاروی نے سمسرہ کی تعریف، اس کی شکلیں اور حیثیتیں، مذکورہ صورت کی مختلف خرابیاں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں غرر فاحش کی وجہ سے یہ معاملہ ختم ہونا چاہئے اور بروکر صرف اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

اسی طرح مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عثمان بستوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جنید پالنپوری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی اور مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا وغیرہ نے ابتداء دلالی اور سمسرہ کی تعریف، تاریخ اور اس کی مختلف شکلیں اور حیثیتں، غرر یسیر اور غرر فاحش پر مفصل گفتگو کی ہے۔

سوال ۲: اس صورت میں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع جس قیمت پر تیار ہوا، دلال خود اس قیمت پر اس سے مال خرید لیتا ہے، اور خریدار جس قیمت پر تیار ہوا تھا، اس قیمت پر اس کو فروخت کردیتا ہے، گویا اس کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی ہوجاتی ہے، اور یہ بات دلال کے اختیار میں ہوتی ہے کہ وہ چار فیصد اپنی فیس نہ لے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سوال کے جوال میں اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جب سوال میں یہ ذکر ہے کہ دلال کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اول اور بائع ثانی کی ہوجاتی ہے اور بائع اپنی بتائی ہوئی قیمت پر دلال سے بیچنے کے لئے راضی اور تیار ہے تو شرعی اعتبار سے اس

میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ صورت جائز ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مفتی شاہ جہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد المنان آسام، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی وغیرہ)۔

دلائل:

١- نبی کریمﷺ نے فرمایا: ''البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما وإن کتما وکذبا محقت البرکۃ من بیعہما'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ٣٤٥٩) [ڈاکٹر کلیم اللہ مدنی]۔

٢- ''و إن أمرہ المؤکل أن یبیعہ من نفسہ أو أولادہ الصغار أو ممن لا تقبل شہادتہ لہ، فباع منہم جاز'' (رد المحتار ٣٣٢،٧، طبع بیروت)۔

- ''إلا إذا أجاز المؤکل بعد البیع فلا یرد ما ذکرہ'' (حوالہ سابق) [مقالہ: ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی]۔

٣- ''أما الدلال فإن باع العین بنفسہ بإذن ربہا فأجرتہ علی البائع و إن سعی بینہما و باع المالک بنفسہ یعتبر العرف و تمامہ فی شرح الوہبانیۃ'' (در مختار)۔

- ''(قولہ فأجرتہ علی البائع) و لیس لہ أخذ شئ من المشتری لأنہ ہو العاقد حقیقۃ، شرح الوہبانیۃ، و ظاہرہ أنہ لا یعتبر العرف ہنا لأنہ لا وجہ لہ'' (قولہ یعتبر العرف) فتجب الدلالۃ علی البائع أو المشتری أو علیہما بحسب العرف جامع الفصولین'' (الدر المختار و رد المحتار ٤٦،٤) [مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

٤- ''و إن أمرہ المؤکل أن یبیعہ من نفسہ أو أولادہ الصغار أو من لا تقبل لہ شہادتہ فباع منہ جاز'' (الفتاوی البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ٤٧٥،٥)۔

- ''ولا یجوز للوکیل أن یبیع سلعۃ المؤکل علی بیعہا لنفسہ --- أما إذا أذن المؤکل بأن یبیع لنفسہ أو لابنہ الصغیر ففیہ رأیان:

أحدہما: أنہ لایجوز، لأن العاقد فی ہذہ الحالۃ یکون واحداً، ثانیہما: أنہ یجوز و یظہر أن الذی یقول بعدم الجواز لعلۃ کون العاقد واحداً لایمنع أن یبیع الوکیل السلعۃ لأجنبی، ثم یشتہریہا منہ، ثانیا لأنہ فی ہذہ الحالۃ یکون البائع غیر المشتری'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ١٤٥،٣) [مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

جبکہ باقی دوسرے مقالہ نگار کی رائے ہے کہ سوال نمبر ایک کی طرح یہ صورت بھی درست نہیں ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

دلائل:

١- ایک ہی شخص وکیل، مشتری اور بائع نہیں ہوسکتا ہے۔

‘‘و إذا وکل الرجل الرجل أن یبتاع لہ طعاما فابتاعہ ثم وکلہ أن یبیع لہ من غیرہ... فہو جائز .... و إن وکلہ أن یبیعہ من نفسہ لم یجز البیع من نفسہ’’ (کتاب الأم ۸۸،۳)۔

‘‘ولذلک لایصح لشخص أن یتولی طرفی العقد، و لا یصح للوکیل أن یشتری لنفسہ ما توکل فی بیعہ و لا أن یبیع ما یملکہ لمن وکلہ بالشراء’’ (المعتمد فی الفقہ الشافعی ۱۷،۳)، [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

مولانا عمر کوکنی مزید لکھتے ہیں: صورت مذکورہ میں ایک قسم کا دھوکہ دہی بھی معلوم ہوتی ہے جو معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ نصیحت کے تقاضہ کے خلاف ہے۔

مولانا اقبال محمد ٹنکاروی کی نظر میں دلال کی حیثیت واضح نہ ہوکر مشکوک ہی رہی، لہٰذا اس صورت کا حکم مذکورہ بالا صورت کی طرح ہونا چاہئے۔

البتہ تمام مقالہ نگار کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں دلال کے لئے دلالی کی فیس لینا جائز نہیں ہے۔

مفتی جنید محمد پالنپوری لکھتے ہیں کہ یہ صورت درست ہے، البتہ اصل مشتری کے سامنے کسی بھی طرح یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ وہ براہ راست دلال سے مبیع خرید رہا ہے اور دلال یہ مبیع بائع سے خرید کر مجھے بیچ رہا ہے الخ۔

صورت مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے مفتی عثمان بستوی اور قاضی محمد حسن ندوی نے دلال کی حیثیت اور اس سے متعلق احکام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

سوال نمبر ۲ (ب): ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلال نے بائع کو ساٹھ روپئے سے بیچنے پر تیار کرلیا اور خریدار تیار کیا جو ستر روپئے میں خریدنے پر آماد ہ تھا؛ لیکن دلال نے بائع سے حقیقی مشتری کو ملانے کے بجائے ایک فرضی خریدار تیار کر کے اس سے بائع کی بات کرادی، اور جب وہ چیز ۶۰؍روپئے میں حاصل ہوگئی تو خریدار سے ۷۰؍روپئے میں فروخت کیا اور دس روپیہ کا فائدہ خود رکھ لیا، نیز ایسے معاملات میں بعض دفعہ بروکر چار فیصد دلالی فیس اس فرضی خریدار کو دے دیتا ہے، کیا یہ صورت درست ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نگار کے علاوہ تمام کی رائے ہے کہ فرضی خریدار کھڑا کرکے دلالی کی فیس کے ساتھ مزید دس روپے اینٹھ لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ باطل طریقہ پر مال کمانا، امانت میں خیانت اور دھوکہ وفریب ہے [دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی وغیرہ]۔

دلائل:

۱۔ حدیث میں ہے: ‘‘من غش فلیس منا’’ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۱۵) [مولانا

ظفر عالم ندوی]۔

٢۔ وکیل مؤکل کے لئے امین ہوتا ہے: ‘‘الوکیل لا یؤکل إلا بإذن آمرہ لوجود الرضا’’ (الدر المختار ٥٢٧،٥)۔

*المراد أنہ لا یؤکل فیما وکل فیہ’’ (رد المحتار٥٢٧،٥) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

٣۔ مذکورہ شکل نجش کے دائرہ میں آتی ہے اور نجش والی تمام علتیں اس میں بھی موجود ہیں، اس لئے مذکورہ طریقہ سے خریدنا شرعاً جائز نہیں۔

‘‘النجش أما معناہ فی الاصطلاح الفقہی فہو أن یزید الرجل فی ثمن السلعۃ لا لرغبۃ نفسہ فی شراءہا بل لیخدع غیرہ لیرغب فیہا ویشتریہ بثمن زائد وقد ورد النہی فی الحدیث الصحیح ..... ولذلک أجمع الفقہاء علی حرمتہ، فإن کان الناجش فعل ذلک من عند نفسہ ولم یعلم بہ البائع أو لم یأمرہ فالإثم علی الناجش وحدہ، وإن وقع ذلک بمواطاۃ من قبل البائع فالإثم علیہما’’ (فقہ البیوع٩٨٨،) [مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد حسن ندوی]۔

۴۔ کیوں کہ وہ اس سامان کا مالک نہیں ہے، مالک فرضی خریدار ہے [مفتی جمیل احمد نذیری]۔

۵۔ اس صورت میندلال کا یہ عمل اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ دلال کا مقصد ہی دس روپے کا فائدہ اٹھانا ہے جو اجرت دلالی کے علاوہ ہے، اس کا وہی حکم ہوگا جو حکم شہری کا دیہاتی کے مال خریدنے میں ہے اور اس کی نظیر ‘‘بیع حاضر لباد ’’ والی حدیث ہے: ‘‘عن ابن عباسؓ: نہی النبیﷺ أن یتلقی الرکبان ولا یبیع حاضر لباد، یا ابن عباس ما قول لا یبیع حاضر لباد؟ قال: لا یکون لہ سمسار’’ (صحیح البخاری، کتاب الاجارہ، حدیث نمبر: ٢٢٧۴)۔

* اسی حدیث کے تحت منع کی وجہ کے سلسلہ میں ملا علی قاری لکھتے ہیں:

‘‘إذا جاء البدوی بطعام إلی بلد لیبیعہ بسعر یومہ ویرجع فیتوکل البلدی عنہ لیبیعہ بالسعر الغالی علی التدریج وہو حرام عند الشافعی ومکروہ عند أبی حنیفۃ، وإنما نہی عنہ لأن فیہ سد باب المرافق علی ذوی البیاعات’’ (مرقاۃ المفاتیح ۶٨،۶) [قاضی محمد حسن ندوی]۔

۶۔ ‘‘وإذا وکل الرجل أن یبتاع لہ طعاماً فابتاعہ ثم وکلہ أن یبیع لہ من غیرہ ....فہو جائز .....وإن وکلہ أن یبیعہ من نفسہ لم یجز البیع من نفسہ’’ (کتاب الام ٨٨،٣) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

مولانا نثار احمد گجراتی لکھتے ہیں:

ایک آدمی کی دوحیثیتیں ایک ساتھ نہیں ہوسکتی ہیں کہ آدمی بائع بھی ہو اوردلال بھی ہو، کیونکہ بائع کا تعلق خریدوفروخت سے ہے، جبکہ دلال کا تعلق اجارہ سے ہے۔

رہا اس فرضی مشتری کو دلال کی حیثیت سے پیش کرنا تو یہ بھی دھوکہ ہے جو جائز نہیں، نیز یہ معاملہ اجارہ کے اصول سے بھی درست نہیں۔

مفتی جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں:

فرضی خریدار تیار کرنے کی صورت میں اگر فرضی خریدار اور بائع کے درمیان ایجاب وقبول ہوگیا اور فرضی خریدار نے حقیقی مشتری کو سامان بیچ دیا اور نفع لے لیا تو اس کے لئے جائز ہے، لیکن دلالی لینا جائز نہیں، کیونکہ وہ خود عاقدین کے لئے دلال نہیں ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد لکھتے ہیں:

چونکہ بیع وشراء میں عاقد حقیقت میں وہ ہوتا ہے جو ایجاب وقبول کرتا ہے، اس لئے اگر بروکر کسی فرضی خریدار کو لاتا ہے اور اسی کو خریدار ظاہر کرتا ہے نیز فرضی خریدار ہی سودا کرتا ہے تو ''عاقد '' اسی فرضی شخص کو سمجھا جائے گا، بروکر کی حیثیت دلال اور ایجنٹ کی ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ اس صورت میں تاجر کو دھوکہ دیا جارہا ہے، اللہ کے رسول نے جن بیوع سے منع فرمایا ہے، ان بیوع میں یا تو دھوکہ وغرر پایا جاتا ہے یا ضرر ونقصان، یہ دونو نہی امر قابل ترک ہیں، انہی بیوع ممنوعہ میں سے تلقی جلب، بیع الحاضر للبادی، اور تناجش وغیرہ ہیں، اللہ کے نبی کا ارشاد ہے:

''لا یبتاع المرء علی بیع أخیہ ولا تناجشوا ولا یبع حاضر لباد'' (بخاری۱،۲۸۹ کتاب البیوع، باب لا یشتری حاضر لباد بالسمسرہ)۔

مولانا عبد المنان لکھتے ہیں:

اس صورت میں فرضی خریدار دلال کا دلال ہوا، لہذا اس کو چار فیصد مل گیا، دلال اول اگر قبضہ کرکے فروخت کرے تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ اصل بائع کے سامنے خریدار متعین نہیں ہے، اور دلال قبضہ کرکے دے تو کوئی شبہ نہیں رہتا۔

لیکن اصل بائع سے فرضی مشتری کو ملا دینا یہ دھوکہ دہی کی صورت ہے۔

جبکہ مفتی جنید محمد پالنپوری اور مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت ان کے نزدیک جائز ہے، چنانچہ مفتی جنید پالنپوری لکھتے ہیں:

سوال دو کی دوسری صورت بھی ہو بہ ہو اسی طرح ہے، بس فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں دلال خود خریدوفروخت کا عمل کررہا ہے اور دوسری صورت میں فرضی یعنی ڈمی شخص کو کھڑا کرکے مبیع خرید رہا ہے اور پھر بیچ رہا ہے، الخ۔

''(باب الوکالۃ بالبیع والشراء) (إن عمت) أی الوکالۃ جزاء الشرط قولہ الآتی صحت، قال فی الہدایۃ: من وکل بشراء شئ فلا بد من تسمیۃ جنسہ وصفتہ أو جنسہ ومبلغ ثمنہ لیصیر الفعل المؤکل بہ معلوماً لیمکنہ الائتمار إلا أن یکون وکالۃ عامۃ الخ'' (درر الحکام شرح غرر الاحکام)۔

اسی طرح مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی لکھتے ہیں:

دوسری صورت میں بھی دلال کے لئے دس روپے کا فائدہ خود رکھ لینا جائز ہے، اس لئے کہ یہاں بھی بیع ہی کی صورت ہے، اگرچہ فرضی مشتری کے ذریعہ سے بیع وجود میں آئی ہے۔

حالانکہ تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اس صورت میں دلال چار فیصد

دلالی کا بھی حقدار نہیں ہوگا۔

سوال نمبر ۳: ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاریگر حضرات قیمتی جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مالک کے علم و اطلاع کے بغیربچالیتے ہیں اور اس طرح کا مال ایک خاص مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں، جس میں چوری کا مال بھی ملتا ہے، اور درست مال بھی، تو کیا اس مارکیٹ سے مال خریدا جاسکتا ہے، جبکہ متعین طور پریہ بات معلوم نہ ہو کہ یہی مال چوری کا ہے، اور اگر ہے تو کس شخص کا مال چوری کیا گیا ہے، یعنی اس کا اصل مالک کون ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاران کی آراء مختلف شرائط وقیود کے ساتھ یہی ہے کہ ان چھوٹے ٹکڑوں کو رکھ لینا اور اس کو فروخت کرنا حرام ہے، چنانچہ قاری ظفر الاسلام صدیقی کی رائے ہے کہ:

اگر اس طرح کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لینے پر مالک کی طرف سے مطالبہ نہ کرنے کا تعامل ہو تو اصول فقہ کے تحت اس کا خریدنا درست ہے۔

اسی طرح مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابرار خان ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا قبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبد المنان، مولانا صابر حسین ندوی اور عمر بن یوسف کی رائے ہے کہ کاریگر کا مالک کے علم کے بغیر جواہرات کے ان ٹکڑوں کا بیچنا حرام ہے، کیوں کہ یہ ان کا مال نہیں ہے، بلکہ چھپا کر رکھنا اور چوری کرنا ہے، جس کی فروختگی ہرگز جائز نہیں ہے، حدیث میں ہے:

* ‘‘عن أبی حرة الرقاشی عن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ: ‘‘لا یحل مال امرء مسلم إلا بطیب نفس منہ’’ (مشکوة المصابیح، باب الغصب والعاریۃ،۲۵۵، مرقاة المفاتیح ۳۵۰،۳)۔

* ‘‘ومنہا أن یکون مملوکا لأن البیع تملیک فلا ینعقد فی ما لیس بمملوک’’ (بدائع الصنائع۳۴۰،۴)۔

* ‘‘من اشتری سرقة وہو یعلم أنہا سرقة فقد شرک فی عارہا وإثمہا’’ (فیض القدیر ۵۶۵۴،۱۱)۔

* اس طرح کا سامان خریدنے میں معصیت پر تعاون ہے، جبکہ اس سے منع کیاگیا ہے، ‘‘ولا تعانوا علی الإثم والعدوان’’ (سورہ مائدہ)۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد المنان، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی اور مولانا عمر بن یوسف کوکنی کی رائے ہے: اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ کون سا مال چوری کا ہے اور کون سا نہیں، اس صورت میں احتیاط اس مارکیٹ سے نہ خریدنے میں ہے، حدیث میں ہے:

* ‘‘ دع ما یریبک إلی ما لا یریبک، فإن الصدق طمانینۃ وإن الکذب ریبۃ’’ (سنن

الترمذی، حدیث نمبر: ۲۵۱۸)۔

*''الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات فمن اتقی الشبہات استبرء لدینہ وعرضہ'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۱۷۸، مشکوۃ ۲۴۱)۔

* ملا علی قاری اس حدیث کی بابت تحریر فرماتے ہیں:

''ہذا الحدیث سبب عظیم موقعہ أنہ ﷺ نبہ فیہ علی صلاح المعظم والمشرب والملبس وغیرہا بأن یکون حلالاً وأرشد إلی معرفۃ الحلال'' (مرقاۃ المفاتیح ۹،۶)۔

*''إن ما اشتبہ أمرہ فی التحلیل والتحریم ولا یعرف لہ أصل متقدم فالورع أن یترکہ ویجتنبہ .....'' (مرقاۃ المفاتیح ۳۷،۶)۔

* ''من وقع فی الشبہات وقع فی الحرام'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۱۷۸، مرقاۃ المفاتیح ۹،۶)۔

* ''وأما مسئلۃ ما إذا اختلط الحلال بالحرام فی البلد فإنہ یجوز الشراء والأخذ إلا أن تقوم دلالۃ علی أنہ الحرام'' (الاشباہ والنظائر ۱۴۸،۱)۔

جبکہ بیشتر مقالہ نویس حضرات نےاس کی حلت وحرمت کا مدار غلبہ ظن پر رکھا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

اگر خریدار کو گمان غالب ہو کہ وہ صحیح مال خرید رہا ہے تو اس کےلئے خریدنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہوگا[دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا نثار احمد گجراتی، مولانا عبد اللہ خالد اور مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* حدیث میں ہے: ''من اشتری سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ فقد شرک فی عارہا وإثمہا'' (المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: ۲۲۵۳)۔

* علامہ سید سابق فرماتے ہیں: ''یحرم علی المسلم أن یشتری شیئاً وہو یعلم أنہ أخذ من صاحبہ بغیر حق، لأن أخذہ بغیر حق ینتقل الملکیۃ من ید مالکہ، فیکون شراءہ لہ شراء ممن لا یملک، مع ما فیہ من التعاون علی الإثم والعدوان'' (فقہ السنہ ۱۳۰،۳)۔

لہذا اگر مدار غلبہ ظن نہ ہو اور اصل مالک کا علم نہ ہو تو ایسی صورت میں خریدنا صحیح اور درست ہے، ورنہ حرج عظیم پایا جائے گا، جو شرعاً ممنوع ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

*''ولنا أن الغلبۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ فی إفادۃ الإباحۃ، ألا تری أن أسواق المسلمین لا تخلو عن المحرم المسروق والمغصوب ومع ذلک یباح التناول اعتماداً علی الغالب وہذا لأن القلیل لایمکن الاحتراز عنہ ولا یستطاع الامتناع منہ فسقط اعتبارہ دفعاً للحرج کقلیل النجاسۃ وقلیل الانکشاف'' (ہدایہ مع نتائج الافکار ۵۱۸،۱۰)۔

* فقہاء کے یہاں ظن غالب ملحق بالیقین ہے: ''وغالب الظن عندہم ملحق بالیقین وہو

الذی یبتنی علیہ الأحکام، یعرف ذلک من تفصح کلامہم فی الأبواب" (الاشباہ والنظائر،۶۳)۔

*"والمال الحرام إذا اختلط بالمال الحلال فإن حکمہ الغالب منہا:فإن غلب الحرام حرام وإن غلب الحلال جاز ما لم یتیقن إن ما یعاملہ بہ: فإن تیقن من المال الحرام حرم علیہ وہذا قول الحنفیۃ وابن القاسم والمالکیۃ والحنابلۃ فی قول، وشیخ الإسلام ابن تیمیۃ" ۔

* علامہ ابن تیمیہ کا ماننا ہے: "الأموال المغصوبۃ والمقبوضۃ بعقود لا تباح بالقبض إن عرفہ المسلم:اجتنبہ، فمن علمت أنہ سرق مالا أو خانہ فی أمانتہ أو غصبہ فأخذہ من المغصوب قہراً بغیر حق، لم یجز لی أن أخذہ منہ، لا بطریق الہبۃ ولا بطریق المعاوضۃ ولا وفاء عن أجرۃ ولا ثمن مبیع، فإن ہذا عین مال ذلک المظلوم" (مجموعۃ الفتاوی ۲۹،۳۲۳)۔

*"ولو خلط المغصوب بغیرہ وأمکن التمییز لزمہ وإن شق" (منہاج الطالبین،۲۹۵)۔

*"أما إذا کان المال مختلطاً من حرام وحلال فلا تحرم مبایعتہ ولکن یکرہ التعامل معہ للشبہۃ فیہ" (المعتمد فی الفقہ الشافعی۳،۶۷) [ان دلائل کے لئے دیکھئے مقالہ: مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا عبد اللہ لونا واڑہ، مفتی جمیل احمد نذیری، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا صابر حسین ندوی وغیرہ]۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جنید پالنپوری، مولانا عبد اللہ خالد اور مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی کی رائے ہے کہ اگر خرید لیا تو اس کو واپس لوٹانا واجب ہے۔

* "والحاصل أنہ إن علم أرباب الأموال وجب ردہ علیہم وإلا فإن علم عین الحرام لا یحل لہ" (فتاوی شامی ۷،۳۰۱)۔

* "ولو باع السارق المسروق من إنسان أو ملک منہ بوجہ من الوجوہ فإن کان قائماً فلصاحبہ أن یأخذہ لأنہ عین ملکہ وللمأخوذ منہ أن یرجع علی السارق" (بدائع الصنائع۷،۸۵)۔

سوال نمبر ۴ : زیدنے ایک شخص سے اس کا لایا ہوا مال خریدا، کسی وجہ سے اس کو شبہ پیدا ہوا کہ یہ مال چوری کا ہے، اس نے بیچنے والے سے دریافت کرلیا کہ کہیں یہ مال چوری کا تو نہیںہے، اس نے کہا : درست مال ہے، چوری کا نہیں ہے، تو کیا ایسا مال لیاجاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ صورت مذکورہ میں اگر بائع کی بات پر یقین یا ظن غالب ہو تو اس کی بات کا اعتبار کرتے ہوئے ایسا مال خریدنا درست ہے [دیکھئے مقالہ: قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر کوکنی، مولانا عبد اللہ

خالد، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

ان حضرات نے اس طرح استدلال کیا ہے:

۱۔ ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا واجب ہے: ''یا أیہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن إن بعض الظن إثم'' (سورہ حجرات: ۱۲) [مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

۲۔ ''لو لا إذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بأنفسہم خیراً'' (سورہ نور: ۱۲) [مفتی محمد شاہجہا ں ندوی]۔

۳۔ ''إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۶۰۶۴، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۶۳) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

۴۔ جب کسی کے مال کے بارے میں شک وشبہ ہونے لگے تو ایسی صورت میں قرائن پر عمل کرنے کا حکم ہے: ''إن المدار علی غلبۃ الظن فلینظر المبتلی فی القرائن'' (رد المحتار ۴۹۸٫۹ طبع زکریا) [مفتی عثمان بستوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

۵۔ اعتماد اور بھروسہ پر ہی سارا کام چلتا ہے، اس لئے حسن ظن رکھنا چاہئے: ''الیقین لا یزول بالشک'' (الاشباہ والنظائر ۲۷٫) [مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ابرار خان ندوی]۔

۶۔ ''المثبت المقدم علی النافی'' (القواعد الفقہیہ ۱۲۲٫) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

۷۔ ''الأصل فی الأشیاء الإباحۃ'' (حوالہ سابق) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

۸۔ ''إذا کان غالب حال المہدی حلالاً فلا بأس بقبول ہدیتہ وأکل مالہ ما لم یتبین أنہ حرام، وإن کان غلب مالہ الحرام لا یقبلہا ولا یأکل إلا إذا قال: إنہ حلال ورثہ أو استقرضہ'' (الاشباہ والنظائر ۳۰۹٫۱) [مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی]۔

۹۔ ''أمور المسلمین علی السداد حتی یظہر غیرہ'' (قواعد الفقہ ۶۳) [قاضی محمد حسن ندوی]۔

۱۰۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں نقل کیا ہے کہ حکم کا اصل تعلق ظاہر ہی سے ہے، حتی کہ حضور ﷺ بھی صاحب وحی ہونے کے باوجود ظاہر کا اعتبار کرتے تھے: ''فإن أصل الحکم بالظاہر مقطوع بہ فی الأحکام خصوصاً، وبالسنۃ إلی الاعتقاد فی الغیر عموماً أیضاً، فإن سید البشر ﷺ مع إعلامہ بالوحی یجری الأمور علی ظواہرہا فی المنافقین وغیرہم وإن علم بواطن أحوالہم ولم یکن ذلک بمخرجۃ عن جریان الظواہر علی ماجرت علیہ'' (الموافقات ۲۷۱٫۲) [مولانا صابر حسین ندوی]۔

۱۱۔ علامہ ابن تیمیہ نے ایک طویل فتوی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے: ''.....فتقبل منہ علانیتہ وتوکل سریرتہ إلی اللہ، فإنا لم نومر أن ننقب عن قلوب الناس ولا نشق بطونہم'' (مجموع الفتاوی ۱۴۹٫۴) [مولانا صابر حسین ندوی]۔

۱۲۔ ''وسئل عن الرجل یشتری سلعۃ بمال حلال، ولم یعلم أصل السلعۃ، ہل ہو حرام أو

حلال؟ ثم كانت حراماً فی الباطن، ہل یأثم أولا ؟

فأجاب: متی اعتقد المشتری أن الذي مع البائع ملکہ ، فاشتراہ منہ علی الظاہر، لم یکن علیہ اثم فی ذلک۔ وان کان فی الباطن قد سرقہ البائع، لم یکن علی المشتری إثم، ولا عقوبۃ؛ لا فی الدنیا، ولا فی الآخرۃ، والضمان والدرک علی الذي غرہ وباعہ، وإذا ظہر صاحب السلعۃ فیما بعد ردت إلیہ سلعتہ،ورد علی المشتری ثمنہ ، وعوقب البائع الظالم؛ فمن فرق بین من یعلم ومن لا یعلم فقد أصاب، ومن لا أخطأ ۔ واللہ أعلم''(مجموعۃ فتاوی ابن تیمیہ ۲۹۳،۲۹) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

انہیں میں سے بعض مقالہ نویس نے مزید شرائط کا ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مولانا اقبال محمد ٹنکاروی نے لکھا ہے:

اگر بائع سماج میں ذی مروت اور عزت دار ہو اور اس کے قول کی سچائی کا ظن غالب ہو تو اس کا مال خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بہ صورت دیگر اجتناب ضروری ہے:

''(قولہ بشہادۃ فاسق نفذ) قال فی جامع الفتاوی وأما شہادۃ الفاسق فإن تحری القاضی الصدق فی شہادتہ تقبل وإلا فلا، فقال: وفی الفتاوی القاعدیۃ ہذا إذا غلب علی ظنہ صدقہ، وہوممـا یحفـظ دور أول کتـاب القضـاء، وظـاہر قولـہ ہـو ممـا یحفـظ اعتمـادہ الـخ'' (رد المحتار ۳۷۲،۴)۔

مفتی عثمان بستوی لکھتے ہیں:

لہذا بازار میں فروخت ہونے والے مال سے متعلق مسلم وغیر مسلم دونوں کی خبر اطمینان قلب کی شرط کے ساتھ معتبر ہوگی:

''ویقبل قول کافر ولو مجوسیاً قال: اشتریت اللحم من کتابی فیحل أو قال: اشتریتہ من مجوسی فیحرم ولا یردہ دبقول الواحد وأصلہ إن خبر الکافر مقبول بالإجماع فی المعاملات لا فی الدیانات .....'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴۹۷،۹)۔

سوال نمبر ۵ : ایسا بھی ہوتا ہے کہ زید نے ایک شخص سے خرید کیا ہوا سامان اپنے قبضہ میں لے لیا، ابھی قیمت ادا نہیں کی اور اگلے شخص سے زیادہ قیمت میں اسے فروخت کردیا، اور جو پیسے آئے ،اس میں سے جس شخص سے ادھار خریدا تھا، اس کو پیسہ ادا کردیا اور جو پیسے بچ گئے ،اس کو اپنے نفع کے طور پر رکھ لیا، کیا یہ صورت جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ صورت مذکورہ میں اگر ادھار خریدکردہ سامان کو قبضہ میں لے کر دوسرےسے نقد بیچ دے اور حاصل شدہ رقم سے ادھار ثمن ادا کرکے باقی پیسے اپنے نفع کے طور پر رکھ لے تو ایسا کرنا جائز ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد

قاسمی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبداللہ خالد لونا واڑا وغیرہ]۔

دلائل:

۱۔ ''لواشتری ثوباً ولم ینقد ثمنہ ثم باعہ مرابحۃ جاز'' (المحیط البرہانی ۱۸۵،۱۰) [مولانا ابرار خان ندوی]۔

۲۔ بیع ایجاب وقبول سے مکمل ہوجاتی ہے، ''البیع ینعقد بالإیجاب والقبول'' (ہدایہ ۲۱،۳ طبع بیروت) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا محبوب فرو غ احمد قاسمی]۔

۳۔ یہ دین حال ہے، اس لئے اسے فروخت کرکے اس کی قیمت واپس کرنا اور نفع رکھ لینا درست معلوم ہوتا ہے [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۴۔ کیونکہ ثمن کی تاخیر انعقاد عقد کے لئے مانع نہیں ہے [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

۵۔ بیع کا اصلی حکم یہ ہے کہ فوری طورسے مبیع میں خریدار کی ملکیت اور ثمن میں بائع کی ملکیت ثابت ہوجائے: ''ثبوت الملک للمشتری فی المبیع وللبائع فی الثمن للحال'' (بدائع الصنائع۲۳۳،۵) [مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۶۔ حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ آپ ایسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے: ''عن ابن عمرؓ أن رجلاً باع من رجل سرجاً ولم ینقد ثمنہ، فأراد صاحب السرج الذی اشتراہ أن یبیعہ، فأراد الذی باعہ أن یأخذ بدون ما باعہ منہ، فسأل عن ذلک ابن عمر، فلم یر بہ بأساً وقال ابن عمر: فلعلہ لو باعہ من غیرہ باعہ بذلک الثمن أو أنقض'' (سنن البیہقی ، حدیث نمبر: ۱۰۸۰۲) [مولانا عمرکوکنی]۔

۷۔ بیع وشراء میں ثمن ادھار رکھا جاسکتا ہے: ''البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطہ صحیح'' (مجلۃ الاحکام العدلیہ،۵۰، دفعہ: ۲۴۵) [مفتی عثمان بستوی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۸۔ اگر سامان منقولات میں سے ہو اور اس پر قبضہ ہوجائے تو پھر اسے دوسرے سے بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے: ''وبیع منقول قبل قبضہ'' (الدر المختار ۱۴۷،۵) [مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

۹۔ حدیث میں ہے: ''من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یستوفیہ'' (صحیح البخاری ۲۸۶،۱، کتاب البیوع) اور طعام کی تفسیر حنفیہ کے نزدیک منقول اشیاء سے کی جاتی ہے (فتح القدیر ۱۳۷،۶) [مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

۱۰۔ ''وصح بثمن حال وہو الأصل أو مؤجل إلی معلوم لئلا یفضی إلی النزاع'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲۵،۴) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۱۱۔ امام بخاری نے اس پر باب قائم کیا ہے: ''باب من اشتری بالدین ولیس عندہ ثمن''

یعنی مبیع فروخت کرنے کے وقت بائع کی مملوک ہونا تو ضروری ہے، لیکن مشتری کے لئے خریدتے وقت ثمن کا مملوک ہونا ضروری نہیں ہے (انعام الباری ٦٦٩،٧) [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

١٢۔ ''البیع یلزم بإیجاب وقبول أی حکم البیع یلزم بہما'' (البحر الرائق ٣٦٢،٥) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

١٣۔ ''قال القدوری: فإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع ویثبت الملک لکل منہا، وفیہ إشارۃ إلی أن البیع یتم بہما ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل إذا کان الأجل معلوماً'' (قدوری) [مفتی نثار احمد گجراتی]۔

١٤۔ ''إذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع'' (ہدایہ٣،٢٠) [مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑہ)۔

١٥۔ ''عن أبی بحر عن شیخ لہ قال: رأیت علی علیٍّ إیزاراً غلیظاً قال: اشتریت بخمسۃ دراہم فمن اربحنی فیہ درہماً بعتہ إیاہ'' (السنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر: ١٠٩٤٤) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

١٦۔ علماء کویت کی کمیٹی کا فتوی بھی جواز کا ہے:

''أجابت اللجنۃ بما یلی:

لا مانع شرعاً من شراء السیارۃ أو أی سلعۃ أخری بالأقساط مؤجلۃ وبیعہا بثمن حال، سواء کان أکثر من ثمنہا المؤجل أو أقل، شریطۃ أن تباع بغیر من اشتریت منہ أولا، وہذہ الصورۃ تسمی عند الفقہاء ''التورق'' واللہ أعلم'' (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ ١٤٦،١٠) [مولانا ابرار خان ندوی]۔

١٧۔ عرف وتعامل میں زیادہ تر معاملات اسی طرح ہورہے ہیں۔

البتہ حافظ کلیم اللہ عمری اور مولانا شاہین جمالی کی رائے ہے کہ بشرطیکہ معاملہ شروع سے ہی واضح اور طے شدہ ہو کہ بیع مؤجل ہے یا معجل، تاکہ کسی طرح کا نزاع نہ ہو۔

مولانا صابر حسین ندوی صاحب ایک خطرہ کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

البتہ حکمت اور اندیشہ کے تحت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عمومی رواج اس طرح کے کاروبار کا پڑجائے تو معیشت کے لئے خطرہ ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ طویل ترین ہوجائے اور ہر بائع قیمت سے محروم ہو، ایسے میں ممکن ہے کہ نزاع کا باعث بنے، چنانچہ کبھی ایسی صورت پائی گئی تو اسے درست نہیں کہا جائے گا۔

مفتی عبد القیوم پالنپوری تمہیداً بیع مساومہ، بیع مرابحہ اور تولیہ کی وضاحت کرتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں:

اور اگر اس ادھار خریدنے والے نے مبیع کو قبضہ میں لے کر دوسرے کو عقد مرابحہ سے بیچا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ وضاحت کرے کہ یہ چیز ادھار اتنے میں، میں نے خریدی ہے اور اتنے فیصد نفع کے ساتھ تم کو بیچ رہا ہوں۔

سوال نمبر۶ : ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک بائع سے کسی متعینہ سامان کی قیمت دریافت کی، ابھی خرید و فروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا اور نہ اس شئ پر قبضہ حاصل ہوا، البتہ وہ دوسرے شخص سے جو اس طرح کا سامان خریدنا چاہتا ہے، معاملہ طے کرلیتا ہے، اور اس سے زیادہ قیمت طے ہوتی ہے، اب وہ سابق شخص سے سامان حاصل کر کے اپنے خریدار کو فروخت کردیتا ہے اور دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کو اپنا نفع تصور کرتا ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں زیادہ تر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ خریدوفروخت کا معاملہ مکمل ہونے سے پہلے اور منقولہ سامان پر قبضہ سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کردینا درست نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال محمدٹنکاروی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد المنان آسام، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا عبد اللہ خالد، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

دلائل:

۱۔ حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی میرے پاس آتا ہے جو مجھ سے بیع کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور میرے پاس وہ چیز نہیں ہوتی جو وہ طلب کررہا ہوتا ہے، کیا میں اسے بیچ دوں، پھر اسے بازارسے خرید کر حوالہ کردوں، تو آپﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا تبع ما لیس عندک'' (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۴۶۱۳، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۵۰۳) [مفتی محمدشاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا، مفتی ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

۲۔ ''عن عبد اللہ بن عمرؓ أن رسول اللہﷺقال:من اشتری طعاماً فلایبعہ حتی یستوفیہ ویقبضہ'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۷۲۷) [مولانا ظفرعالم ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر یوسف کوکنی]۔

۳۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے: ''المنع من بیع المبیع قبل قبضہ سواء فی ذلک الطعام أو العقار أو غیرہما، وسواء بیع الطعام کیلا أو وزناً أو جذافاً واستثنی من ذلک بیع المبیع قبل قبضہ لبائعہ خلافاً للمشہور من مذہب الحنابلۃ'' (مجموع الفتاوی ۵۱۳٫۲۹، الفروع ۱۳۴٫۴، الانصاف ۴۶۱٫۴-۴۶۶) [مولانا صابر حسین ندوی]۔

۴۔ جو چیز ضمان میں نہ ہو اس سے نفع اٹھانا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے، ''ولا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندک'' (سبل السلام ۸۰۹٫۳)[مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا اقبال

محمد ٹنکاروی]۔

۵۔ ''وبیع ما لیس فی ملکہ لبطلان بیع المعدوم ومالہ خطر العدم (قولہ لبطلان بیع المعدوم .....) إذ من شرط المعقود علیہ أن یکون موجوداً مالاً متقوماً مملوکاً فی نفسہ .....وأن یکون مقدور التسلیم'' (الدر المختار مع رد المحتار ٢٨٦،٧) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

۶۔ ''یلزم أن یکون المبیع موجوداً'' (مجلۃ الاحکام العدلیہ،٢٩، دفعہ: ١٩٧) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

۷۔ ''القبض فی بیع المشتری المنقول فلا یصح بیعہ قبل القبض لما روی أن النبیﷺ نہا عن بیع ما لم یقبض'' (بدائع الصنائع٣٩٤،٤)[مولانا ظفر عالم ندوی]۔

۸۔ ابھی مبیع پر تخلیہ وتمکن ہوا ہے اور نہ قبضہ حسی وحکمی، سرے سے مبیع مشتری کے قبضہ میں آئی ہی نہیں ہے[قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۹۔ اس طرح سے بیچنے میں عقلی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ جو چیز رسک میں نہ آئی ہو اس سے نفع حاصل کرنا لازم آرہا ہے، جو درست نہیں ہے [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

جبکہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی اور مولانا ابرار خان ندوی کی نظر میں کسی شخص کا بائع سے صرف متعینہ سامان کی قیمت دریافت کرنا عقد بیع نہیں ہے، بلکہ یہ شکل یا تو عقد سلم ہے یا بیع استصناع ہے اور یہ دونوں شرعاً جائز ہیں۔

* ''أما بیان حکم السلم فہو ثبوت الملک لرب السلم فی المسلم فیہ مؤجلاً بمقابلۃ ثبوت الملک فی رأس المال المعین أو الموصوف معجلاً للمسلم إلیہ'' (فتاوی ہندیہ١٧٣،٣، درمختار ورد المحتار ٤٥٥،٧) [مولانا شاہین جمالی]۔

*''المبیع فی الاستصناع ہو العین لا عمل الصانع وعلی ذلک فلو أتی الصانع للمستصنع بخف من صنعہ أو من صنع غیرہ قبل الاستصناع وقبلہ کان صحیحاً'' (درر الحکام ٣٥٩،٣)۔

* ''حکم ہذہ الاتفاقیات أنہ إن کان محل التورید شئ یحتاج إلی صنعۃ فیمکن تقعیدہا علی أساس الاستصناع..... وإن کان المستورد یعجل الثمن بکاملہ عند العقد فہذا عقد یأخذ حکم السلم، أما إذا کان محل التورید شئ لا یحتاج إلی صنعۃ ولا یمکن تخریجہ علی أساس السلم فلایجوز أن تعتبر الاتفاقیۃ عقداً باتاً للبیع أو الشراء لأنہ عقد مضاف إلی المستقبل .....فالصحیح أن اتفاقیۃ التورید تعدو من الناحیۃ الشرعیۃ من أن تکون تفاہماً ومواعدۃ من الطرفین، أما البیع الفعلی فلاینعقد إلا عند تسلیم المبیعات'' (فقہ البیوع٩٥،١) [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

مولانا ابرار خان ندوی نے اس مسئلہ کی دو صورتیں ذکر کی ہیں: ایک صورت آرڈر یا استصناع کی جو اجماع امت جائز ہے اور دوسری بیع ما لم یملک کی جو بسبب حدیث منہی عنہ ہے، لیکن اپنی رائے نہیں دی ہے۔

مفتی جنید محمد پالنپوری لکھتے ہیں:

البتہ بعض مرتبہ آدمی کے پاس کاروبار کے لئے رقم نہیں ہوتی، نیز مارکیٹ میں

کریڈٹ نہیں ہوتا کہ کوئی مال پر قبضہ بغیر ثمن اور ادھاری پر دیدیں اور سامنے مال خریدنے والا تیار ہوتا ہے، مگر یہاں غیر مملوک کی بیع کی وجہ سے معاملہ درست نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں اس معاملہ کو جواز کے دائرہ میں داخل کرنے کے لئے بیع سلم سے تبدیل کیا جاسکتا ہے، تاکہ لوگوں کے لئے راحت ہو۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا نے مختلف وجوہ بیان کرتے ہوئے اس بیع کو فاسد، ممنوع اور ناجائز قرار دیا ہے، البتہ اخیر میں لکھتے ہیں:

ہاں دوسرے شخص سے صرف آرڈر لیا ہو، باقاعدہ ایجاب وقبول کرکے معاملہ طے نہیں کیا ہو تو اس میں گنجائش ہوگی، کیونکہ آرڈر ایک وعدہ ہوتا ہے، وعدۂ بیع کا وہ حکم نہیں ہوتا جو بیع کا ہوتا ہے، تقریباً یہی بات مفتی عبد القیوم پالنپوری نے لکھی ہے۔

مفتی جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں:

جب بائع اول سے خرید کر اور قبضہ کرکے دوسرے کو بیچتا ہے تو بیچنا جائز ہے اور اس کا نفع بھی صحیح ہے، نفع کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

محور دوم:

سوال نمبر ۱: ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار نے اپنے ذمہ واجب الادا رقم کی جو پرچی بائع کو دی ،دلال بائع سے اس پرچی کو نقد پیسہ دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلیتا ہے، اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے حاصل کرتا ہے ،کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

مولانا صابر حسین ندوی کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مذکورہ صورت جائز نہیں ہے، ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

دلائل:

۱۔ اس صورت میں دین کو نقد سے یعنی دین کی جنس سے بیچا جارہا ہے جو ربا الفضل اور ربا النسیئۃ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، ربا الفضل کے ممنوع ہونے سے متعلق حدیث ہے: ‘‘لا تبیعوا الذہب بالذہب إلا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضہا علی بعض، ولا تبیعوا الورق بالورق إلا مثلاً بمثل ولا تشفوا بعضہا علی بعض ولا تبیعوا منہا غائباً بناجز’’ (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۱۷۷، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۸۴) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابرار خان ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی وغیرہ]۔

۲۔ نیز اس میں ربا النسیئۃ بھی پایا جارہا ہے کہ مال ربوی کو اس کے بدل کو مؤخر ادا کرنے کےساتھ بیچا جارہا ہے جو بالاتفاق حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

‘‘أحل اللہ البیع وحرّم الربا’’ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

‘‘یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ، وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون’’ (سورہ بقرہ:

۲۷۸۔۲۷۹) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

۳۔ یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے، جو حنفیہ اور جمہور کے نزدیک نہیں ہے۔

''اختلف الفقہاء في حكم تمليک الدين لغير مَنْ عليہ على أربعۃ أقوال:

أحدہما: روايۃ عن أحمد ووجہہ عند الشافعيۃ : وہو أنہ يجوز تمليک الدين من غير مَن عليہ الدين بعوض وبغير عوض۔

والثاني: للحنفيۃ والحنابلۃ والشافعيۃ في الأظہر: وہو أنہ لا يصح تمليک الدين لغير من ہو عليہ، سواء أكان بعوض أم بغير عوض۔ كأن يقول شخص لآخر : وہبتک مالي من دين على فلان، فيقبل۔ أو يقول لہ: اشتريت منک كذا بما لي من دين على فلان، فيقبل، أو يقول لہ: استأجرت منک كذا بالدين الثابت لي في ذمۃ فلان، فيقبل ۔ فہذا كلہ غير جائز ، لأن الواہب أو المشتري أو المستأجر يہب أو يبيع ما ليس في يدہ، ولا لہ من السلطۃ شرعا ما يمكنہ من قبضہ منہ، فكان بيعا لشيئ لا يقدر على تسليمہ، إذ ربما منعہ المدين أو جحدہ، وذلک غرر، فلا يجوز۔

وقد استثنى الحنفيۃ من قاعدۃ عدم جواز تمليک الدين لغيرہ من ہو عليہ ثلاث حالات:

الأولى: إذا وكل الدائن الشخص الذي ملكہ الدين في قبض ذلک الدين من مدينہ، فيصح ذلک، ويقبض الدين من المدين باعتباره وكيلا عن الدائن، وبمجرد القبض يصير قابضا لنفسہ، وتنتقل ملكيۃ الدين إليہ۔

والثانيۃ: إذا أحال الدائن الشخص الذي ملّكہ الدين على مدينہ، فيصح ذلک ، ويقبض الدين من المدين باعتباره محالا من الدائن عليہ، وبمجرد القبض تنتقل ملكيۃ الدين إليہ۔

والثالثۃ: الوصيۃ ، فإنہا تصح بالدين لغير من ہو عليہ، لأنہا تمليک مضاف إلى ما بعد الموت، فينتقل الملک فيہ كما ينتقل بالإرث'' (الموسوعۃ الفقہيۃ : مادۃ: دين۲۱،۱۳۱،۱۳۰،ط: وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلاميۃ الكويت) [مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہين جمالی، مولانا نثار احمد گجراتی، مولانا ابراہيم سليمان فلاحی]۔

۴۔ بيع الدين من غير من ہو عليہ الدين شريعت ميں ناجائز ہے، ''بيع الدين من غير من ہو عليہ الدين لا يصح، قال مولانا فی فوائدہ: وبيع الدين لايجوز ولو باع من المديون أو وہبہ'' (رد المحتار ۳۳،۷) [مفتی عثمان بستوی]۔

۵۔ ''ولا ينعقد بيع الدين من غير من عليہ الدين لأن الدين إما أن يكون عبارۃ عن مال حكمی فی الذمۃ وإما أن يكون عبارۃ عن فعل تمليک المال وتسليمہ وكل ذلک غير مقدور التسليم فی حق البائع ولو شرط التسليم على المديون لايصح أيضاً لأنہ شرط التسليم على غير البائع فيكون شرطاً فيفسد البيع'' (بدائع الصنائع ۱۴۸،۵) [مفتی عبد القيوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابرار خان ندوی]۔

۶۔ '' لاينبغی الرجل إذا كان لہ دين أن يبيعہ حتى يستوفيہ لأنہ غرر فلا يدری أيخرج أم

لا یخرج'' (الموطا للامام محمدؒ،۳۵۴)۔

۷۔ اس معاملہ کی دوصورتیں ہیں اور وہ دونوں ممنوع ہیں: پہلی صورت: بیع پر بیع ہے جو شرعاً ممنوع ہے، نیز استغلال کی کیفیت نظر آرہی ہے وہ بھی ممنوع ہے، دوسری صورت: بیع مؤجل کو بیع معجل میں تبدیل کرکے بائع سے کم قیمت پر معاملہ ختم کرلینا اور مشتری سے پوری قیمت حاصل کرنا گویا یہ صورت سود سے مشابہ ہے یعنی: ''کل قرض جر نفعاً فہو ربا'' (السنن الکبری للبیہقی۵،۳۵۰) [حافظ کلیم اللہ عمری، نیز دیکھئے مقالہ: مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

۸۔ زائد رقم وصول کرنا دلال کی طرف سے زیادتی کے ساتھ قرض لوٹانے کی شرط کے مشابہ ہے:''إذا اشترط المقرض رد زیادة علی قدر القرض أو شرط رد الصحیح عن المکسر أو الجید عن الردئ أو شرط منفعة فیفسد العقد بذلک علی الصحیح، لأنہ یحرم کل قرض جر منفعة لشبہہ بالربا، لقولہ ﷺ: ''کل قرض جر منفعة فہو ربا'' (سنن البیہقی، حدیث: ۱۰۹۳۳، المعتمد ۳،۱۷۳) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

۹۔ یہاں دلال کم میں پرچی لیتا ہے اور مشتری سے پرچی کے مطابق لیتا ہے تو یہ ربا ہے اور ربا حرام ہے، اس لئے یہ صورت ناجائز ہے، جیسے بیع صرف میں تفاضل ناجائز ہے:

''فإذا کان بیع عین بعین، فإنہ یجب علی العاقدین التسلیم معاً تحقیقاً للمساواة فی المعاوضة المقتضیة للمساواة .... وکذلک إن تبایعا دیناً بدین کما فی عقد الصرف'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴،۱۷۶) [قاضی محمد حسن ندوی]۔

۱۰۔ یہ دین مؤجل کی فروختگی غیر مدیون (یعنی دلال) سے کم قیمت کے عوض نقد ہے، یہ درست نہیں ہونا چاہئے جدہ انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی کی قرار داد: ۱۰۱ (۱۱،۴) ملاحظہ ہو:

''دین مؤجل (دیر سے ادا کیا جانے والا دین) کی فروختگی غیر مدیون سے نقد معجل (فوری ادا کی جانے والی نقد) کے عوض خواہ (خواہ یہ نقد معجل اسی (پہلے) کی جنس سے ہو یا دوسری جنس سے جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ ربا تک جا پہنچتا ہے '' (ص، ۳۱۶، طبع ایفا) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۱۱۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کی ایک تجویز سے اس مسئلہ کا حکم واضح ہوتا ہے:

''قرض کی دستاویز (رسیدات ، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہوجائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق واجب رقم سے کم لے کر اس معاملہ سے علیحدہ ہوجاتا ہے، اس طرح کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے ''(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ،۱۷۰)۔

ہاں اگر تیسرے شخص کے بجائے عاقدین کے مابین فوری ادا کرنے پر بائع دین میں کم کرے تو یہ ''ضع وتعجل'' کی بنیاد پر درست ہوگا (حوالہ سابق ،۱۶۸) [قاضی محمد حسن

ندوی، مولانا ابرار خان ندوی]۔

۱۲۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلے میں ہے:

''ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار'' (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے،۱۲۶) [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

۱۳۔ یہ معاملہ سودی ہے جو کسی حال میں جائز نہیں، فقہ البیوع میں ہے:

''الکمبیالۃ و ثیقۃ یکتبھا المشتری فی غالب الاحوال لصالح البائع فی بیع مؤجل یعترف بھا أن الثمن وجب فی ذمتہ وأنہ یلزم أداہ فی تاریخ أجل وأن حلول ھذا التاریخ الأجل یسمی فی الاصطلاح نضج الکمبیالۃ وإن البائع ربما یرید استعجال الحصول علی مبلغھا فلا ینتظر إلی تاریخ نضبح الکمبیالۃ بل یبیعھا إلی طرف ثالث والرائح فی السوق الرأسما لیہ أن المشتری الکمبیالۃ یشتریہا بأقل من قیمتھا الاسمیۃ، والظاہر أن حکم الکمبیالۃ بھذا الطریق تعامل ربوی لا یجوز بحال'' (فقہ البیوع) [مقالہ: مولانا نثار احمد گجراتی]۔

۱۴۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

''دس ہزار کی چٹھی ساڑھے نو ہزار روپے میں خریدنا گویا روپیہ کا تبادلہ روپیے سے ہوا، ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار اور ایک طرف سے زیادہ اور دوسری طرف سے کم، یہ دونوں صورتیں ناجائز او رگناہ ہے اور سود میں داخل ہے، لہذا یہ صورت جائز نہیں '' (کتاب الفتاوی ۳۴۳،۵) [مقالہ: مولانا نثار احمد گجراتی]۔

مولانا صابر حسین ندوی کی رائے ہے کہ یہ معاملہ درست اورجائز ہے، انھوں نے الفقہ الاسلامی وادلتہ کی تفصیلی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''صورت مسئولہ میں یہ بات واضح ہے کہ حامل پرچی ایک خاص ملکیت کا مالک ہے،وہ پرچی ہی اس کی ملکیت پر قبضہ کی دلیل بھی ہے،جسے عرفا تسلیم کیا جاتا ہے،ایسے میں اگر وہ پرچی کو فروخت کرتا ہے،تو گویا وہ مالک اپنی ملکیت مینتصرف کر رہا ہے ،جس کا اسے پورا حق ہے،نیز مالک سے کوئی باز پرس نہیں کہ وہ کم قیمت پر فروخت کرے یا زیادہ،رہی یہ بات کہ پرچی کو خریدنے والا متعینہ رقم لیتا ہے،تو یہ بھی گویا اس کے بیع وشراء کا ایک حصہ ہے جو دونوں فریق نے برضا تسلیم کیا ہے،اور یہ ظاہر ہے کہ معاملات میں متعاقدین کی رضا مندی ہی اصل ہے '' ۔

مفتی عثمان بستوی صاحب نے انعام الباری کے حوالہ سے اس کے جائز پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لیکن جب اس صورت میں دوسری جہت سے بھی نظر غائر ڈالی جائے تو گنجائش اور جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ پرچی خریدنے والا دلال یا تو بائع کا وکیل ہوگا یا مشتری کا یا دونوں کا '' (انعام الباری ۴۵۳،۶) الخ۔

مولانا اقبال محمد ٹنکاروی صاحب ایک جائز متبادل صورت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر یہ دلال بیع کی صورت میں نفع لینا چاہے تو بہتر صورت یہ ہے کہ وہ بائع سے نقد ثمن دے کر کم قیمت پر مشتری کو مطلوب مبیع خرید لے اور مشتری کو ادھار میں زیادہ قیمت میں بیچ دے، یا دلال کا جو کمیشن بنتا ہو، وہ بائع کو بتلا دے، تاکہ بائع ومشتری کے درمیان عقد مکمل ہوجانے کے بعد وہ بائع سے اسی مقدار میں کمیشن لے سکے۔

اسی طرح مولانا نثار احمد گجراتی نے بھی جائز متبادل شکلوں کی طرف رہنمائی کی ہے:

''متبادل اور جائز صورت یہ ہیکہ تاجر خریدار سے اپنا دین وصول کرنے کے لئے تیسرے شخص کو اپنا دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور اس پر وکالت کی اجرت مقرر کر دے، پھر اس پرچی میں لکھی ہوئی رقم اس کے پاس سے قرض لے لے، اس صورت میں دونوں معاملات الگ الگ ہونگے، پہلا معاملہ متعین اجرت کے بدلہ میں وکیل بنانے کا ہوگا اور دوسرا معاملہ اس سے قرض لینے کا ہوگا، البتہ اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط اور مربوط نہ ہو، ورنہ ایک عقد میں دو معاملے کرنے کی خرابی لازم آتی ہے جو کہ شرعًا ناجائز ہے ''۔

سوال نمبر ٢ : ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع سے ایک سامان خریدا، قیمت کی ادائیگی کا مقررہ وقت پورا ہوگیا، خریدار سامان فروخت نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے قیمت ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہے، اب یا تو بائع کے اصرار کی وجہ سے وہ خود سودی قرض لے کر اپنی عزت بچانے کے لئے پیسہ حاصل کرتا ہے، یا اپنے کسی دوسرے ساتھی سے کہتا ہے کہ تم سودی قرض لے کربائع کا پیسہ ادا کردو، تم کو جو سود دینا پڑے گا ،وہ میں ادا کردوں گا، تو اس مقصد کے لئے سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ سامان کی قیمت ادا کرنے کے لئے عام حالت میں سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کی ادائیگی کے لئے سود ادا کرنا جائز نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا عبد المنان، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا وغیرہ]۔

سود کی قباحت وشناعت:

١۔ اسلام کی نگاہ میں سود سخت ترین سماجی اور اخلاقی جرم ہے، اللہ تعالی نے سود خور کو اعلان جنگ دیا ہے:

''یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ .....'' (سورہ بقرہ: ٢٧٨) [مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی]۔

٢۔ ‘‘یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافاً مضاعفاً واتقوا اللہ لعلکم تفلحون’’ (سورہ آل عمران: ١٣٠) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

٣۔ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے پر لعنت کی ہے:

‘‘لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا ومؤکلہ ، وکاتبہ، وشاہدیہ، وقال: ہم سواء’’ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ١٥٩٨) [مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا ابرار خان ندوی]۔

٤۔ ‘‘عن أبی ہریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الربا سبعون جزاء أیسرہا أن ینکح الرجل أمہ’’ (مشکوۃ المصابیح،٢٦٤) [مولانا ظفر عالم ندوی وغیرہ]۔

٥۔ اسی طرح کے مسئلہ سے متعلق ایک مستفتی نے افتاء کونسل کویت سے سوال کیا، جس کا جواب یہ ہے:

‘‘لا یجوز الاقتراض بالربا وہو من المحرمات التی شددت الشریعۃ فی الزجر عنہا، وإنما السبیل المدین أن یسد حاجتہ بالقرض الحسن أو بالأخذ من سہم المغارمین فی الزکاۃ، فإن السائل من المغارمین حیث توجہتم علیہ المطالبۃ وعجز عن السداد’’ (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ ١٠،٢٠٦-٢٠٧) [مولانا ابرار خان ندوی]۔

٦۔ جبکہ بعض مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر واقعی مشتری بائع کو کسی جائز سبب سے وقت پر ثمن ادا نہ کرسکے تو بائع کو چاہئے کہ وہ مشتری کو مہلت دے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:‘‘إن کان ذو عسرۃ فنظرۃ إلی میسرۃ’’، اگر مشتری مشتری کے لئے اس کے علاوہ کوئی شکل نہ ہو اور سخت مشقت وحرج میں مبتلا ہو اور اس رقم کی ادائیگی نہ کرسکنے کی صورت میں سخت دشواری اور ضرر لاحق ہو یا اضطراری حالت ہوتو ایسی حالت میں وہ سودی قرض لے کر واجب الاداء رقم کی ادائیگی کرسکتا ہے [دیکھئے مقالہ: قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی اور مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

ان حضرات نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مشتری کو ایسے وقت میں سودی قرض لینے کی اجازت ہے، جبکہ بغیر اس کے جان بچانا دشوار ہو یا سخت مشقت میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو۔

‘‘یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح’’ (الاشباہ والنظائر ١،٣٢٧) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا شاہین جمالی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی شافعی]۔

* ‘‘الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ أو خاصۃ’’ (شرح المجلہ لسلیم رستم باز،٣٣) [مولانا شاہین جمالی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا ابراہیم

سلیمان فلاحی]۔

* ‘‘فإن لم یجد وسیلۃ إلا ہذا فاقدم علیہ غیر باغ ولا عاد فإن اللہ غفور رحیم’’ (الحرام والحلال فی الاسلام۲۱۹) [مولانا شاہین جمالی]۔

* فتاوی محمودیہ میں حضرت مفتی محمود حسنؒ لکھتے ہیں:

‘‘حرام کا ارتکاب اضطرار کی حالت میں معاف ہے، پس اگر جان کا قوی خطرہ ہو یا عزت کا قوی خطرہ ہو، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں، مثلاً جائیداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے ’’ (فتاوی محمودیہ ۳۰۶،۱۶) [مولانا شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* منتخبات نظام الفتاوی میں ہے:

‘‘اپنے جائز روپیہ سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہوکر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمارہوکر ضبطی وغیرہ ہورہا ہو تو قانونی رو سے اپنے حلال روپے کو بچانے کے بقدر مجبوری میں بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے ’’ (۱۸۹،۱) [مفتی عثمان بستوی]۔

مفتی عثمان بستوی کی رائے میں پہلے شخص کو اگر کسی وجہ سے قرض نہ مل سکے تو دوسرے شخص کے لئے مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے کر اس کا تعاون کرنا شرعاً جائز ہے۔

جبکہ ان کے علاوہ تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ دوسرے کو اس طرح کے سودی معاملہ مینمبتلا کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی جنید محمد پالنپوری کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں معاملہ ہی کو فسخ کردیا جائے۔

سوال نمبر۳ : ایک صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ پانچ سو روپئے کیرٹ کے حساب سے مال خریدنے کی بات طے کرتا ہے، اور اگلے شخص کو سات سو روپئے کے حساب سے فروخت کرنے کی بات طے کرتا ہے، نیز پہلے شخص سے مال لے کر دوسرے شخص کو فروخت کر کے اس سے قیمت وصول کرتا ہے، اب وہ بیچنے والے کوپوری قیمت ادا کرنے کے بجائے اس سے کہتا ہے کہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں تھا؛ اس لئے اس کی قیمت کم کرو، مثلاً اسے چار سو روپئے فی کیرٹ پر آمادہ کرلیتا ہے تو کیا شرعا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سوا ل کے جواب میں مقالہ نگار کی دورائیں ہیں: بعض مقالہ نویس کی رائے ہے کہ اگر فروخت کنندہ بخوشی مقررہ قیمت سے کم کردے تو یہ صورت جائز ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا

عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔
دلائل:
١۔ سامان کی قیمت میں خریدار اپنی طرف سے اضافہ کردے یا بائع قیمت کم کردے تو اس کی گنجائش ہے۔
''وصح الحط منہ ولو بعد ہلاک المبیع وقبض الثمن، والزیادۃ والحط یلحقان بأصل العقد بالاستناد، فبطل حط الکل'' (الدر المختار مع رد المحتار ٥،١٥٤۔١٥٥) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔
٢۔ ''حط البائع مقداراً من الثمن المسمی بعد العقد صحیح ومعتبر، مثلاً لو بیع مال بمائۃ قرش ثم قال البائع بعد العقد حططت من الثمن عشرین قرشاً کان للبائع أن یأخذ مقابل ذلک ثمانین قرشاً فقط.....'' (شرح المجلہ لعلی حیدر ١،٢٠٦) [مفتی عثمان بستوی]۔
٣۔ ''یجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک، فالزیادۃ والحط یلحقان بأصل العقد عندنا'' (ہدایہ) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔
٤۔ ''إذا کان الإیجاب من المشتری فقبل البائع بأنقص من الثمن أو کان من البائع فقبل المشتری بأزید إن عقد، فإن قبل البائع الزیادۃ فی المجلس جازت کما فی التاتارخانیۃ .....وأما شرائط اللزوم بعد الانعقاد والنفاذ فخلوہ من الخیارات الأربعۃ المشہورۃ ویزاد خیار الکمیۃ وخیار الغبن إذا کان فیہ غرور'' (البحر الرائق ٥،٢٨٠، ٢٨٢، ہکذا فی الفتاوی الہندیہ٣،٣، الدر المختار مع الطحطاوی ٧،٣٤) [مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔
ان حضرات نے اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی اگر مشتری نے دھوکہ دہی، جھوٹ اور صریح دروغ گوئی سے کام لیا تو یہ حرام اور قابل رد ہے، اور ایسا معاملہ بے برکتی کا شکار ہوگا، جیسا کہ حضور اکرمﷺ کاارشاد ہے:
''البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما، وإن کتما وکذبا محقت برکۃ بیعہما'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ٢٠٧٩، ٢٠٨٢، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ١٥٣٢) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید پالنپوری، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی وغیرہ]۔
جبکہ دوسرے بعض حضرات کی رائے ہے کہ مشتری نے ٧٠٠ روپے فی کیرٹ فروخت کرکے قیمت وصول کرلیا اور پھر اس کا مال میں نقص نکال کر کہنا کہ یہ اتنے کا نہیں تھا صریح جھوٹ اور دروغ گوئی ہے، اس لئے ایسا مطالبہ کرنا اور کم کرانا شرعاً جائز نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا عبد المنان آسام اور مفتی نثار احمد گجراتی وغیرہ]۔

ان کے دلائل:

١۔ کیونکہ بائع کو مبیع میں تصرف کے بعد رجوع بالنقصان کا حق حاصل نہیں رہا، ورنہ ظہور عیب کے بعد وہ کل ثمن کے ساتھ واپس کرسکتا تھا ....

''من وجد بمشتریہ ما ینقص الثمن أخذ بکل الثمن أو ردہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: إلا أن یرضی بالضرر فیخیر المشتری حینئذ بین الرد والإمساک من غیر رجوع بنقصان'' (رد المحتار۴؍۸۰، ۸۹) [مولانا شاہین جمالی]۔

٢۔ کم کرائی ہوئی رقم مشتری اول کے لئے حلال نہ ہوگی، اس لئے کہ حدیث ہے:

''ألا لا تظلموا ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفسہ'' (رواہ البیہقی والدارقطنی بحوالہ مشکوۃ ۱؍۲۵۵) [مفتی جمیل احمد نذیری]۔

٣۔ خرید کردہ مال کی قیمت واقعتاً مارکیٹ میں ۵۰۰ روپے فی کیرٹ یا اس سے زیادہ ہے تو خریدار کا بائع سے غلط بیانی کرکے قیمت کم کرانے کی کوشش کرنا جائز نہیں، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''وإذا اشتری شیئاً لم یعلم بالعیب وقت الشراء ولا علمہ قبلہ والعیب یسیر أو فاحش فلہ الخیار: إن شاء رضی بجمیع الثمن وإن شاء ردہ، کذا فی شرح الطحاوی، ولیس لہ أن یمسکہ ویأخذ النقصان کذا فی شرح القدوری'' (فتاوی ہندیہ۳؍۶۶) [مفتی عبد القیوم پالنپوری، مفتی نثار احمد گجراتی]۔

۴۔ یہ سراسر جھوٹ ہے جو ناجائز ہے، حدیث میں ہے:

''ثلاثۃ لاینظر اللہ إلیہم یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب ألیم .....المنفق سلعتہ بالکذب'' (سنن النسائی، حدیث نمبر: ۶۶۵۹) [مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابرار خان ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی]۔

۵۔ ''عن حکیم بن حزام قال: قال رسول اللہ ﷺ: البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما، وإن کتما وکذبا محقت برکۃ بیعہما'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۰۷۹) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

البتہ قاضی محمد حسن ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا ابرار خان ندوی کی رائے میں اگر مشتری بائع اول سے درخواست کرے، کذب بیانی سے کام نہ لے اور بائع بطیب خاطر کچھ کم کردے تو وہ مال مشتری کے لئے جائز ہوگا۔

سوال نمبر ۴ :ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سامان کو خرید کرتے ہوئے اس مال کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے؛ تاکہ بیچنے والا کم سے کم قیمت پر راضی ہوجائے؛ لیکن جب اسی مال کو فروخت کرتا ہے تو ڈھیر ساری تعریفیں کرتا ہے، کیا اس عمل کی گنجائش ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ خریدتے وقت سامان کے اندر نقص نکالنے اور عیب دار قرار دینے کی کوشش کرنا اور اسی سامان کو

فروخت کرتے وقت خوشنما بنا کر پیش کرنا نہ صرف اصول تجارت کے اعتبار سے ممنوع ہے، بلکہ اخلاقی اور شرعی اعتبا رسے بھی یہ جائز نہیں ہے۔

دلائل اور وجوہ:

١۔ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہرحال میں سچا اور حقیقت پسند رہے، چاہے تجارت میں ہو یا ملازمت میں، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریمﷺ بازار میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کا غلہ کا ڈھیر تھا، سو نبی کریمﷺ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر داخل لیں اور آپﷺ کو تری کا احساس ہو، تو ارشاد فرمایا: ''ما ہذا یا صاحب الطعام؟ فقال: أصابتہا السماء یا رسول اللہ، قال: أفلا جعلتہ فوق الطعام کی یراہ الناس، من غش فلیس منی'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ١٠٢، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ٣٤٥٢) [مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی، مولانا عمر بن یوسف، مولانا عبد اللہ خالد]۔

٢۔ یہ ایک طرح کا خداع اور دھوکہ ہے، نبی کریمﷺ نے فرمایا:

''المکر والخدیعۃ والخیانۃ فی النار'' (المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث نمبر: ٨٧٩٥) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

٣۔ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:''التاجر الأمین الصدوق مع النبیین والصدیقیین والشہداء '' (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ١٢٠٩، سنن دارمی، حدیث نمبر: ٢٥٤٢) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

٤۔ یہ تلقی رکبان کے مشابہ ہے، حافظ ابن حجرؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''وہو خداع فی البیع والخداع لایجوز ..... أجاز أبو الحنیفۃؒ التلقی وکرہہ الجمہور''۔

امام الحرمین نے اس کی تعریف یوں کی ہے: ''فی صورۃ التلقی المحرم أن یکذب فی سعر البلد ویشتری منہم بأقل من ثمن المثل ..... وذکر أبو إسحاق الشیرازی: أن یخبرہم بکساد ''۔

حضرت امام اعظمؒ نے بھی دوشرطوں کی موجودگی ''أن یضر بأہل البلد''، ''وأن یلتبس السعر علی الواردین'' میں کراہت کا قول فرمایا ہے (دیکھئے فتح الباری ٤٧١،٤، ٤٧٢) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

٥۔ یہ باطل طریقہ ہے، ایسا عمل اسلام میں حرام ہے:

''لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (سورہ بقرہ) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

٦۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

''المسلم أخو المسلم لا یخونہ ولا یکذبہ ولا یخذلہ، کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ ومالہ ودمہ، التقوی ہہنا، یحسب امرئ من الشر أن یحتقر أخاہ المسلم'' (جامع الترمذی١٤،٢) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

٧۔ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: جو عیب کو چھپائے وہ اللہ کی ناراضگی میں

رہتا ہے: ‘‘من باع معیباً لم ینبہ علیہ لم یزل فی مقت اللہ أو قال لم تزل الملائکۃ تلعنہ’’ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ٢٢٤٧) [مفتی محمد عثمان بستوی، قاضی محمد حسن ندوی]۔

٨۔ ‘‘المسلم أخو المسلم لا یحل لمسلم إن باع من أخیہ بیعاً فیہ عیب أن لا یبینہ لہ’’ (المستدرک للحاکم٢،١٠) [مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی جنید پالنپوری، مفتی نثار احمد گجراتی]۔

٩۔ یہ تطفیف اور نجس کے قبیل سے ہے جو بائع کے حقوق کو تلف کرنے کے مترادف ہے، نیز اس کے مال کو باطل طریقہ پر حاصل کرنا ہے اور یہ دونوں ناجائز ہیں:

‘‘والذین لا یعدل بین الناس فی العطاء ..... والموظف الذی لا یعطی الدولۃ حقہا من العمل أو یأخذ حقا لیس لہ أکثر مما ہو لہ .... کل أولئک من المطففین ومن الذین ینجسون الناس أشیاءہم’’ (موسوعۃ الاقتصاد الاسلامی١،٢٦١) [قاضی محمد حسن ندوی]۔

١٠۔ ‘‘لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام لقولہ علیہ السلام: من باع معیباً لم ینبہ لم یزل فی لعنت اللہ ویلعنہ الملائکۃ’’ (الدر المختار) [مفتی نثار احمد گجراتی]۔

١١۔ ‘‘عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا تتلقوا الرکبان ولا یبیع حاضر لباد’’ (مختصر صحیح البخاری ١،٢٢٤) [مولانا ابرار خان ندوی]۔

١٢۔ ‘‘صور الغش: أن یمدح السلعۃ بما لیس فیہا لیروجہا’’ (رد المحتار مع الدر المختار ٥،١٠١) [مولانا صابر حسین ندوی]۔

البتہ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی کہتےہیں کہ بیع تو نافذ ہوجائے گی، لیکن اخلاقی طور پر یہ عمل بہت برا اور قبیح ہے اور دھوکہ اور کذب بیانی کی وجہ سے وہ گنہ گار ہوگا۔

اسی طرح مفتی عثمان بستوی کی رائے ہے کہ اگر مارکیٹ قیمت بھی نہ لگ رہی ہو تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔

اسی طرح قاری ظفر الاسلام اعظمی نے اس بیع کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

سوال نمبر ٥ :اِس مال کی تیاری میں ملاوٹ کی بھی کافی گنجائش ہوتی ہے، مال تیار کرانے والا کہتا ہے کہ مجھے سستا مال چاہئے؛ لہذا مال تیار کرنے والا شیشے کو شامل کرتے ہوئے مال بناتا ہے ،یا رنگ ڈالتے ہوئے مال تیار کرتا ہے، پھر مال بنوانے والا، اس مال کو تاجر کے ہاتھ بیچتا ہے -اب ایک شکل تو یہ ہے کہ تاجر کو بتا دیاجائے کہ اس مال میں ملاوٹ ہے؛ لیکن اس نے کہا کہ مجھے سستامال چاہئے، ملاوٹ رہنے نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں۔دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو عیب سے مطلع ہی نہیں کیا گیا، ان صورتوں کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے اندر دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت کے بارے میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اگر ملاوٹ اور عیب سے مطلع کردیا گیا اور خریدار تاجر اس کے ساتھ لینے پر راضی ہوگیا تو پھر فروخت کنندہ پر اس سلسلہ میں کوئی الزام نہیں ہوگا۔

دلائل:

١۔ ''الرضا بالعیب بعد العلم بہ؛ لأنہ حق الرد لفوات السلامۃ المشروطۃ فی العقد دلالۃ، ولما رضی بالعیب بعد العلم بہ دلّ أنہ ما شرط السلامۃ'' (بدائع الصنائع٥،٢٨٢) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

٢۔ ''إذا باع مالا علی أنہ برئ من کل عیب ظہر فیہ لا یبقی للمشتری خیار عیب'' (شرح المجلہ، مادہ: ٣٤٢) [مفتی عثمان بستوی]۔

٣۔ ''من اشتری مالا وقبلہ بجمیع العیوب لا تسمع منہ دعوی العیب بعد ذلک .....'' (حوالہ سابق، مادہ: ٣٤٣) [مفتی عثمان بستوی]۔

٤۔ ''وفی الملتقط: لا بأس ببیع المغشوش إذا بین، أو کان ظاہراً یری'' (الفتاوی التاتارخانیہ ٨،٣٠٤) [مولانا ابرار خان ندوی، مفتی عثمان بستوی]۔

جبکہ دوسری صورت کے بارے میں بھی تقریباً تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر تاجر کو عیب سے مطلع نہیں کیا گیا تو اسے اختیار ہوگا، چاہے تو پورے ثمن کے ساتھ اسے لے لے یا واپس کردے [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جنید پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

* عیب کو بیان کئے بغیر بیچنے والا دھوکہ دینے کا گنہ گار ہوگا اور باطل طریقہ پر مال کھانے والا ہوگا۔

* حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''المسلم أخو المسلم ولا یحل لمسلم باع من أخیہ بیعاً فیہ عیب إلا بینہ لہ'' (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ٢٢٤٦، المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث نمبر: ٢١٥٢) [مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مولانا شاہین جمالی، مفتی جنید پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمدقاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابرار خان ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* ''عن أبی ہریرۃؓ أن النبی ﷺ .....ثم قال: من غش فلیس منا'' (سنن الترمذی١،٢٤٥) [مولانامحفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

* ''وإذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فہو بالخیار إن شاء أخذہ بجمیع الثمن وإن شاء ردہ، لأن مطلق العقد یقتضی وصف السلامۃ فعند فواتہ یتخیر، کیلا یتضرر بلزوم ما لا یرضی بہ'' (ہدایہ ٣،٣٥) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی جنید پالنپوری، قاضی محمد حسن ندوی]۔

* لا يحل كتمان العيب فی مبيع أو ثمن لأن الغش حرام۔

تنبیہ:قال في البحر:وإلى هنا ظهر أن خيار العيب يسقط بالعلم به وقت البيع ، أو وقت القبض أو الرضا به بعدهما أو اشتراط البراءة من كل عيب، أو الصلح على شيئ أو الإقرار بأن لاعيب به إدا عينه كقوله ليس بآبق فإنه إقرار بانتفاء الإباق، بخلاف قوله:ليس به عيب كما مر اهـ ملخصاً۔ قوله:''لأن الغش حرام'' ذكر في البحر أول الباب بعد ذلک عن البزازية عن الفتاوى: إذا باع سلعة معيبة عليه البيان۔ وإن لم يبين ، قال بعض مشايخنا :يفسق ونرد شهادته، قال الصدر:لا نأخذ به اهـ قال في النهر:أي لا نأخذ بكونه يفسق بمجرد هذا لأنه صغيرة اهـ (رد المحتار مع الدر المختار :كتاب البيوع، باب خيار العيب ٢٣٠،٧، ط: زكريا بكڈپو ديوبند) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں:

''قال العبد الضعيف:وقال الموفق فی ''المغنی'':من علم بسلعته عيبا لم يجز بيعها حتى يبينه للمشترى، فإن لم يبينه فهو آثم عاصٍ، نص عليه أحمد، لما روى حكيم بن حزام عن النبيﷺ ، أنه قال: ''البيعان بالخيار لم يتفرقا، فإن صدقا وبينا بورک لهما، وإن كذبا وكتما محق بركة بيعهما''(متفق عليه)۔ وقال عليه السلام : ''المسلم أخو المسلم ، لا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا إلا بينه له''، وقال: ''من باع عيبا لم يبينه لم يزل فی مقت الله، ولم تزل الملائكة تلعنه'' رواهما (ابن ماجه) ، وروى ''الترمذي'' مرفوعا:''من غشنا فليس منا''، وقال: حديث حسن صحيح، والعلم عليه عند أهل العلم كرهوا الغش، وقالوا:هو حرام ، فإن باعه ولم يتبينه فالبيع صحيح فی قول أكثر أهل العلم ، منهم مالک، وأبو حنيفة ، والشافعی، وحكى عن أبی بكر بن عبدالعزيز أن البيع باطل؛ لأنه منهی عنه والنهی يقتضی الفساد، ولنا أن النبي ﷺ نهی عن التصرية، وصحح البيع۔

قال الموفق: وأنه متى علم بالمبيع عيبا لم يكن عالما به فله الخيار بين الإمساک والفسخ، سواء كان البائع علم العيب وكلمه أو لم يعلم، لا تعلم بين أهل العلم فی هذا خلافاً'' (اعلاء السنن: كتاب البيوع، ابواب بيع العيب، باب فی خيار العيب، ١٤،٥٨۔٥٩، رقم الحديث : ٤٦٣٠، ط: دار احياء التراث العربی ، بيروت لبنان) [دیکھئے مقالہ: مولانا اقبال محمد ٹنکاروی]۔

* علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

''إنه إذا اختار المشترى إمساک المعيب وأخذ الأرش فله ذلک'' (المغنی ٢٥٧،٤)۔

مفتی محمد شاہجہاں ندوی نے اس دور فریب میں اس مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔

سوال نمبر ۶ : قیمتی پتھروں کی تجارت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز ایک روپیہ میں بھی فروخت کی جاسکتی ہے، اورایک ہزار روپئے میں بھی، تو کیا شرعا اس کی کوئی تحدید ہے کہ مخصوص تناسب تک نفع لینا درست ہو، اس سے زیادہ نفع لینا درست

نہیں ہو؟

اس سوال کے جواب میں قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور قاضی محمد حسن ندوی کے علاوہ تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ شریعت اسلامی میں نفع کا کوئی تناسب مقرر نہیں ہے، بلکہ اتار چڑھاؤ اور باہمی رضامندی سے جو طے ہوجائے وہ جائز ہے۔

ان حضرات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (سورہ نساء: ۲۹) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

۲۔ ''عن أنس بن مالک قال:غلا السعر علی عہد رسول اللہ ﷺ فقالوا:یا رسول اللہ قد غلا السعر فسعرنا فقال: إن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرزاق، إنی لأرجو أن ألقی ربی ولیس أحد یطلبنی بمظلمۃ فی دم ولا مال'' (سنن ابن ماجہ) [مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

۳۔ نبی کریم ﷺ نے عروہ بن أبی الجعد بارقی کو مقام ''حلب '' سے ایک دینار دے کر بکری خریدنے پر مامور کیا، اور انہوں نے ایک دینار میں دو بکری خریدی اور راستہ میں ایک بکری ایک دینار میں بیچ دی اور ایک بکری نبی کریم ﷺ کے پاس لے کر آئے اور کہا: ''ہذا دینارکم وہذا شاتکم'' قال وصنعت کیف؟ قال: فحدثتہ الحدیث فقال: اللہم بارک لہ فی صفقۃ یمینہ'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۳۸۵) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری]۔

۴۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری کا بیان ہے:

''ویحرم التسعیر بأن یأمر الوالی السوقۃ أن لا یبیعوا أمتعۃ إلا بسعر کذا ولو فی وقت الغلاء للتضییق علی الناس فی أموالہم'' (اسنی المطالب ۹۳،۴) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

۵۔ ''الثمن المسمی ہو الثمن الذی یسمیہ ویعینہ العاقدان وقت البیع بالتراضی سواء کان مطابقاً بقیمتہ الحقیقۃ أو ناقصاً عنہا أو زائداً علیہا'' (شرح المجلہ رستم باز ۷۳،۱) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

۶۔ ''لأن الثمن حق العاقد فإلیہ تقدیرہ'' (ہدایہ۴۵۵،۴) [مولانا ابرار خان ندوی]۔

۷۔ فتاوی محمودیہ میں ہے:''کوئی حد مقرر نہیں، مگر زیادہ نفع لینا مروت کے خلاف ہے '' (۳۴۹،۱۳، فتاوی عثمانی ۲۵۳،۳) [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

۸۔ فتاوی رشیدیہ میں ہے: ''نفع لینے کی کوئی حد متعین نہیں ہے، جتنا لینا چاہے لے سکتا ہے، بشرطیکہ گاہک کو دھوکہ نہ دے '' (فتاوی رشیدیہ ۵۵۷،) [مولانا شاہین جمالی]۔

۹۔ نظام الفتاوی میں ہے:

''ہر آدمی کو اپنی مملوکہ چیز کے بارے میں اختیار ہے کہ جتنی زیادہ قیمت چاہے لے،مثلا ایک پیسے کی چیز کا سو روپیہ لے،یا ایک ہزار روپئے کی چیز کے محض سو روپئے لے ،یا اس سے بھی کم یا بالکل نہ لے سب جائز ہے ،باقی اس میں ایسی کمی یا زیادتی یا ایسا تفاوت جو تجار کے یہاں عام طور پر رائج نہ ہو خلاف رواج کہا جاتا ہے اور زیادتی فاحش خلاف مروت کہی جاتی ہے اور بعض صورتوں میں خداع تک پہونچ کر ناجائز اور ممنوع ہو جاتی ہے ''(منتخبات نظام الفتاوی۸۹،۳) [مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

۱۰۔ کتاب الفتاوی میں ہے:

''شریعت میں نفع کے لئے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا بلکہ یہ تاجرین کے عرف و رواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آ جائے مکروہ ہے اور غبن فاحش یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زیادہ سے زیادہ قیمت لگائی جاتی ہو اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے '' (کتاب الفتاوی ۲۱۳،۵) [مولانا نثار احمد گجراتی]۔

۱۱۔ کتاب النوازل میں ہے:

''آپ اپنا مال جس قیمت پر چاہے بیچ سکتے ہیں، شریعت میں اس کی کوئی قید نہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاجروں کے عرف کا لحاظ رکھا جائے، عام طور پر دوکاندار جس مال کو جس تناسب سے فروخت کرتے ہیں اس کا لحاظ رکھا جائے اور عوام الناس کے ساتھ خیر خواہی کو مد نظر رکھتے ہوئے گراں قیمت پر فروخت کرنے سے احتراز کیا جائے '' (کتاب النوازل ۴۴۷،۱۰) [مولانا نثار احمد گجراتی]۔

البتہ تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگرچہ اشیاء کی قیمت مقرر کرنے کی کوئی حد نہیں ہے، لیکن نفع مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال ضروری ہے کہ وہ عدل کے تقاضے کے مطابق ہو، ایسا غبن فاحش نہ ہو جو ظلم کے دائرہ میں داخل ہوجائے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے لکھا ہے کہ بنیادی ضروریات کے سامان جیسے غلہ، نمک، تیل، کپڑا وغیرہ سامان میں عوام کی قوت خرید سے زیادہ نفع لینا جس سے ان کو ضرر لاحق ہو ممنوع ہے۔

البتہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور قاضی محمد حسن ندوی کی رائے ہے کہ جب تجار حد سے تجاوز کرنے لگیں جس سے لوگوں کو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہوجائے تو حکومت وقت کو اشیاء کی قیمت مقرر کرنے کا حق ہے:

''لا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس لقولہ علیہ السلام:''لا تسعروا فإن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرزاق، فإن کانت أرباب الطعام یتحکمون ویتعدون عن القیمۃ تعدیاً فاحشاً وعجز القاضی عن صیانۃ حقوق المسلمین إلا بالتسعیر فحینئذ لا بأس بمشورۃ من أہل الرأی والبصیرۃ'' (ہدایہ مع تکملۃ فتح القدیر ۴۹۲،۸)۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی کی رائےمیں اشیاء کی قیمت مقرر کرنے اور نفع حاصل

کرنے میں شرعاً تحدید ہے، جب نفع غبن فاحش کی حد تک پہنچ جائے اور غبن فاحش کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے:''ما لم یدخل تحت تقویم المقومین.....'' (رد المحتار مع الدر ۳۶۳،۷)۔

محور سوم:

سوال نمبر ۱ : بیع میں مثلا مبیع کی قیمت ایک لاکھ مقرر کی گئی اور بائع نے تیس فیصد ڈسکائونٹ کا وعدہ کیا؛ بشرطیکہ ایک ماہ میں قیمت ادا کردی جائے، اب اگر ایک ماہ میں قیمت اداء نہیں کی گئی، تو اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف-معاملہ طے پاتے وقت ہی خریدار کے سامنے یہ بات رکھ دی گئی تھی؟

ب-یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی ، مگر مارکٹ کا چلن یہی ہو۔

ج-نہ یہ شرط طے پائی اور نہ ہی اس قسم کا عرف ہے۔

ان صورتوں میں بائع کی طرف سے ڈسکائونٹ یعنی کم کردینا شرعا درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرا ت کی مختلف آراء ہیں جنہیں میں بالترتیب نقل کرتا ہوں:

* ڈسکاؤنٹ کی شرط کے ساتھ بیع درست ہے اور ایک ماہ میں قیمت ادا کردینے کی صورت میں خریدار ڈسکاؤنٹ کا حقدار ہے اور یہ متعین وقت میں ادائیگی کی پابندی کرنے پر بائع کی طرف سے انعام سمجھا جائے گا [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

* ان تمام صورتوں میں اگر بائع ڈسکاؤنٹ دیتا ہے تو شرعاً درست ہے اور بائع کی طرف سے رعایت سمجھی جائے گی۔

* ''وتنزل البائع من الثمن بعد العقد تلحق بأصل العقد یعنی یصیر کأن العقد وقع علی ما حصل بعد الزیادة والحط'' (شرح المجلہ،۵۳) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عبد المنان، مولانا صابر حسین ندوی]۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ ثمن معلوم ومتعین ہو،اس میں ترددنہ ہو کہ وقت پر ادائیگی کی صورت میں یہ ثمن ہے اور ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں یہ ثمن ہے [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

* ''الف و ب '' کی دونوں صورتوں میں ڈسکاؤنٹ درست ہے جبکہ ''ج '' کی صورت میں درست نہیں ہے۔

''إنما تعتبرالعادة إذا أطردت أو غلبت'' (شرح القواعد الفقہیہ،۲۳۳) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

* دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے، جب یہ چھوڑنا تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ دائن تبرعاً کچھ دین ساقط کردے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط وکمی

جائز نہیں [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی]۔

* تیسری صورت کہ جس میں اس قسم کی نہ کوئی شرط طے کی ہے اور نہ عرف ہے اور ادھار خریدار کے رقم جلد ادا کرنے کی وجہ سے بائع کچھ ڈسکاؤنٹ دیدیتا ہے تو یہ درست اور اس کی طرف سے احسان سمجھا جائے گا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس موضوع پر لمبی بحث کی ہے (دیکھئے فقہی مقالات ۱،۱۱۴، ۱۱۶) [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

* تینوں صورتوں میں اگر متعاقدین ڈسکاؤنٹ پر راضی ہوں تو شرعاً درست ہے:
''یجوز للمشتری الحط من المبیع ویجوز للبائع الحط من الثمن إذا قبل الطرف الآخر فی مجلس الحط، ویستوی أن یکون الحط بعد التقابض أو قبلہ، فلو حط المشتری أو البائع بعض القبض کان للآخر حق الاسترداد، ولا یشترط لجواز حط البائع من الثمن أن یکون المبیع قائماً، لأن الحط اسقاط ولا یلزم أن یکون فی مقابلتہ شئ'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۹،۵۵) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی جمیل احمد نذیری]۔

* تینوں شکلیں جائز ہیں، البتہ اگر ثمن کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت متعین ہو اور پھر اس وقت سے پہلے یہ کہا جائے کہ فلاں وقت تک ادا کردو تو اتنے فیصد کم کردیا جائے گا تو یہ شکل جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ کمی اجل کا عوض ہے اور اجل کا عوض مستقلاً جائز نہیں [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

* دین مؤجل قبل از وقت ادا کرنے پر دین میں کمی کی جائے تو یہ جائز نہیں۔

لہذا ''الف'' کی صورت قطعاً جائز نہیں۔

''ب'' کی صورت میں عقد میں تو طے نہیں پایا مگر مارکیٹ میں چلن عام ہونے سے ''المعروف کالمشروط'' کے قاعدہ سے جائز نہ ہوگا (اس بات کو فقہ البیوع سے ثابت کیا ہے ۱،۵۴۵، ۵۴۶)۔

''ج'' البتہ اگر عقد میں شرط نہیں لگا اور نہ ہی اس کا عرف ہے تو بہ تراضی عاقدین ثمن میں کمی کرنا جائز ہے: ''ویجوز أن یحط عن الثمن ..... فالزیادۃ والحط یلحقان بأصل العقد عندنا'' (ہدایہ) [مفتی جنید پالنپوری]۔

* الف: اس صورت میں شرط کے مطابق رعایت کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ب: اگر تعامل تھا اور بائع نے اس کی وضاحت نہیں کی تھی تو تعامل وعرف کو قاضی مان کر اس کے مطابق ڈسکاؤنٹ کا مطالبہ خریدار کرسکتا ہے۔

ج: اس صورت میں ڈسکاؤنٹ کرنے کا قضیہ بھی پیش نہیں آئے گا [مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

* مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کی رائے کے موافق ہوں، جو درج ذیل ہے:
''لجنۃ الدائمہ(مستقل فتوی کمیٹی) کا فتوی یہ ہے کہ: ''اس مسئلہ میں اہل علم میں

اختلاف پایا جاتا ہے:صحیح قول یہی ہے کہ قرض جلد واپس کرنے کے لئے کچھ قرض معاف کرنا جائز ہے ، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے اور شیخین ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے ، اور ابن عباس ؓ کی طرف سے بھی یہ قول منسوب ہے " (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ، ١٣/١٦٨)۔

من قرارات المجمع الفقہی ٧۔١٢ ذی القعدۃ ١٤١٢ھ الموافق ٩۔١٤مایو ١٩٩٢م بہذا القول أخذ المجمع الفقہ الاسلامی بشرط الا یقع الاتفاق علی ذلک عند العقد ۔

الحطیطۃ من الدین المؤجل ، لأجل تعجیلہ ، سواء أکانت بطلب الدائن أو المدین ، (ضع وتعجل) جائزۃ شرعا لاتدخل فی الربا المحرم ،انتہی" (فتاوی یسالونک ٦،٤٤٠)۔

المجمع الفقہی کے فیصلوں میں سے یہ بھی ہے کہ مذکورہ اتفا ق عقد کے وقت طے شدہ نہ ہوتو مدت والے قرض میں سے واپس کرنے کی غرض سے کچھ قرض معاف کردینا شرعا جائز ہے ، چاہے قرض دینے والے یا لینے والے کے مطالبے سے معاف کیا جائے، یہ حرام سود میں شامل نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب " (مزید تفصیلات کے لئے، الاسلام سؤال وجواب،فتوی نمبر ، ١٣٩٤٥) [مقالہ: حافظ کلیم اللہ عمری]۔

* الف: یہ صورت درست ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے اس صورت کی گنجائش دی ہے۔

ب: اگر طے شدہ کے مطابق ایک ماہ میں مشتری نے قیمت ادا نہیں کیا ، تو چونکہ عقد میں اس پہلو سے کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن بازار میں عرف رائج ہے تو عرف وتعامل کے اعتبار سے بائع کو ڈسکاؤنٹ کرنا ہوگا۔

"أما إذا کان جری العرف والعادۃ فی ذلک المحل بإعطاء جمیع الثمن أو بعض معین منہ بعد أسبوع أو شہر لزم اتباع العادۃ وللعرف فی ذلک" (شرح المجلہ ١،١٩٩) [قاضی محمد حسن ندوی]۔

* مذکورہ مسئلہ کی بنیاد ثمن کے متعین ہونے نہ ہونے پر رکھی جائے تو تینوں صورتوں میں حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا، البتہ نقد ثمن (ایک ماہ) کے عوض معاملہ طے ہوا ہو اور ایک ماہ میں ثمن ادا نہ کرنے کی وجہ سے ٣٠فیصد کا اضافہ کرے تو یہ اضافہ درست نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ ثمن کے متعین ہونے کے بعد تاخیر (اجل) کی وجہ سے زیادتی میں سود کا شبہ ہے [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عبد القیوم پالنپوری اور مولانا ظفر عالم ندوی نے اس مسئلہ کے ضمن میں عقد مساومہ اور عقد مرابحہ پر مفصل بحث کی ہے۔

سوال نمبر ٢ : کاریگر مطلوبہ شئ تیار کر کے دیتا ہے؛ لیکن مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جاتی ہے،بنوانے والا اس شئ کو حاصل کرلیتا ہے اور اسے فروخت بھی کرتا ہے؛ لیکن کاریگر کو اس کی کوئی اجرت ادا نہیں کرتا ہے، اس کو تاجروں کی اصطلاح میں "ٹال " کہتے ہیں، یعنی (Reject)کیا ہوا مال، کیا بنوانے والے کا یہ عمل درست ہے، جب

کہ مارکٹ میں یہ طریقہ معروف اورمروج ہے؟

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جانے کے باوجود سامان بنوانے والا اس سامان کو حاصل کرلیتا ہے تو پھر پوری اجرت دینا لازم ہے [مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

* کاریگر کی خلاف ورزی کی صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر معمولی فرق ہے تو پوری اجرت ملے گی اور اگر زیادہ فرق ہے تو کاریگر اجرت کا مستحق نہیناور اس پر سامان کی قیمت لازم ہے جسے اس نے خراب کیا ہے ، اسی طرح اگر پورا میٹریل بیکار ہوگیا ہے تو خراب مال کاریگر کو دے کر اپنے میٹریل کے ہم مثل میٹریل کاریگر سے وصول کرسکتا ہے، لیکن پورے مال کو ضبط کرکے مناسب اجرت ادا کئے بغیر فروحت کرنا مستصنع کے لئے ناجائز ہے، چاہے مارکیٹ میں یہ طریقہ معروف ومروج کیوں نہ ہو [مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا شاہین جمالی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مفتی جنید محمد پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی ، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* ان حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مالک اسی سامان کو قبول کرنے پر راضی ہوجائے تو اس پر اجرت مثل لازم ہے جو طے شدہ اجرت سے زیادہ نہ ہو [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی جنید پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی حسن ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* ‘‘وضمن بصبغة أصفر وقد أمر بأحمر قيمة ثوب أبيض، وإن شاء المالک أخذه وأعطاه ما زاد الصبغ فيه، ولا أجر له، ولو صبغ رديئاً، إن لم يكن الصبغ فاحشاً لا يضمن الصباغ، وإن كان فاحشاً عند أهل فنه يضمن قيمة ثوب أبيض’’ (الدر المختار مع رد المحتار ۴۲،۶) [مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

* ‘‘وفی الثانية إن شاء ضمنه قيمة ثوب أبيض، وإن شاء أخذ ثوبه وأعطاه أجر مثله لا يجاوز به المسمى أيضاً’’ (رد المحتار ۷۵،۶) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

* ‘‘ولو سلم غزلاً إلى حائک ينسج سبعاً فی أربع فحاکه أكثر من ذلک أو أصغر فهو بالخيار إن شاء ضمنه مثل غزله وسلم له الثوب، وإن شاء أخذ ثوبه وأعطاه الأجر إلا فی النقصان فإنه يعطيه الأجر بحساب ذلک، ولا يجاوز به ما تسمی’’ (المبسوط للسرخسی۱۰،۸۶، فتاوی قاسمیہ ۱۹،۶۴۷، ۶۴۸) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

* صورت مسئولہ میں رجیکٹ (Reject) مال کہہ کر کاریگر کو اجرت مثل دیئے بغیر لے لینا قطعاً جائز نہیں، یہ ایک قسم کا ظلم ہے۔

''صورة الاستصناع أن يدفع الرجل إلى رجل حديداً أو نحاساً ليصوغ له إناءاً أو نحو ذلک فإن وافق شرطه فليس للصانع أن يمتنع من الدفع ولا للمستصنع أن يمتنع عن القبول وإن خالفه كان للمستصنع الخيار إن شاء ضمنه حديداً مثل حديده والإناء للصانع ولا أجر له وإن شاء أخذ الإناء وأعطى الصانع أجر مثل عمله لا يجاوز به المسمى الخ'' (ہندیہ) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

* مال وصول کرلینے کے بعد اجرت سے بالکل محروم کرنا شرعاً جائز نہیں، نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا ضرر ولا ضرار'' (سنن ابن ماجہ،٣٤٠) [حافظ کلیم اللہ عمری]۔

* کیا آرڈر دینے والا Reject مال کو صحیح مال کے طور پر فروخت کرتا ہے یا Reject مال کےطور پر؟

پہلی صورت میں اجرت مثل ملنی چاہئے اور اگر دوسری صورت ہے تو مارکیٹ کے رواج کو فوقیت ہوگی [ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

* جب کاریگر نے مطلوبہ ومشروطہ معیار پر مال تیار نہیں کیا تو کاریگر کا یہ عمل عقد سے خالی ہے، ایسی صورت میں فقہاء کے ضابطہ کے مطابق اجرت کا استحقاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ عمل اجارہ کے تحت داخل نہیں ۔

''الأجير المشترک يضمن الضرر والخسار التی تولدت عن فعله ووصفه إن كان بتعديه وتقصيره أو لم يكن يعنی أن الأجير المشترک ضامن للخسارة التی تتولد عن فعله سواء أكان متعدياً أو لم يكن أو سواء تجاوز المعتاد أو لم يتجاوز لأن ما يدخل تحت عقد الإجارة هو العمل السليم وأما العمل الفاسد فلا يدخل تحت الإجارة وبناء عليه يكون الأجير المشترک بهذه الصورة فعل شيئاً غير داخل تحت الإجارة وليس مأذوناً يعمله بحكم الإجارة'' (شرح المجلہ،٦٠٦) [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

اس مسئلہ کے ذیل میں مفتی اقبال محمد ٹنکاروی لکھتے ہیں:

''صورت مسئلہ میں اس شخص نے مطلوبہ اوصاف کے مطابق نہ ہونے کے باوجود رد کرنے اور واپس لوٹانے کے بجائے مذکورہ شئی لے لی تو یہ اس کی طرف سے قبول ہوا، لہذا کاریگر اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

اس کے ساتھ مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، اور مولانا صابر حسین ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ مذکورہ صورت میں اجرت نہ دینے کا عرف ورواج مارکیٹ میں مروج ہو، اس لئے کہ یہ صریح حدیث کے خلاف ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے کہ اگر صانع کی طرف سے قدر، جنس اور وصف میں خلاف ورزی ہو تو کن صورتوں میں پورے مال کا ضامن ہوگا، کن صورتوں میں اجرت مثل ملے گی اور کن

صورتوں میں اجرت سے بھی محروم ہوگا؟

مولانا عبد المنان صاحب لکھتے ہیں:

جب دونوں کو معلوم ہے اور مارکیٹ میں مروج ہے تو ناجائز نہیں ہونا چاہئے۔

سوال نمبر ۳ : قانونی مصلحت کے تحت عام طور پر قیمت درج کرتے ہوئے ایک زیرو کم کردیاجاتا ہے، جیسے ۳۰۰۰(تین ہزار)ہے تو ۳۰۰(تین سو) لکھا جاتا ہے، تاجر بھی اپنی یادداشت میں ۳۰۰(تین سو) ہی لکھتا ہے؛ لیکن فریقین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد تین ہزار ہے، تو کیا یہ عمل جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ قانونی مصلحت کے تحت کم قیمت درج کرنا جائز اور مناسب نہیں ہے [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا صابر حسین ندوی]۔

ان حضرات کے دلائل:

۱۔ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ حرام ہے: ''یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین'' (سورہ توبہ: ۱۱۹) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا صابر حسین ندوی]۔

۲۔ ''المسلمون علی شروطہم'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۵۲) [مولانا صابر حسین ندوی]۔

۳۔ نبی کریم ﷺ نے کذب بیانی کی سخت مذمت کی ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وإیاکم والکذب، فإن الکذب یہدی إلی الفجور، وإن الفجور یہدی إلی النار وما یزال الرجل یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عند اللہ کذاباً'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۰۷ وغیرہ) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

۴۔ حدیث میں ہے: ''من غش فلیس منا'' (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۱۵) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

۵۔ ملکی قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے عزت وجان بھی خطرہ میں رہتی ہے، مومن کو چاہئے کہ وہ اپنی عزت وجان کی حفاظت کرے:

''لاینبغی للمؤمن أن یذل نفسہ'' (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۲۵۴) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

۶۔ جہاں تک ہوسکے ملکی قوانین جو معصیت نہ ہوں، ان پر عمل کرنا چاہئے اور قانون کی خلاف ورزی کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہے [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

۷۔ ایسا کام عام طور پر اس لئے کیا جاتا ہے، تاکہ ٹیکس سے بچا جاسکے، لیکن اگر حکومت کے ذرائع آمدنی واقعی اخراجات کے لئے کافی نہ ہوں، تو پھر ٹیکس کا عائد کرنا

صحیح ہے اور اس سے بچنے کی تدبیر نامناسب عمل اور گناہ ہے[مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

البتہ ٹیکس اور دیگر ذرائع آمدنی سے حاصل مال کو نامناسب جگہوں، فضولیات، تعیشات، گناہوں اور برائیوں میں استعمال کیا جاتا ہو تو ٹیکس سے بچنے کی ایسی تدبیر کی گنجائش ہے [مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا صابر حسین ندوی]۔

جبکہ دوسرے بعض حضرات کی رائے ہے کہ اگر عاقدین میں سے کوئی بھی دوسرے کو لکھی ہوئی قیمت پر مستقبل میں دھوکہ دے کر نقصان نہ پہنچاتا ہو تو اس صورت میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی [دیکھئے مقالہ: مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

اسی طرح مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد حسن ندوی اور مولانا عمر بن یوسف کی رائے ہے کہ اگر یہ عمل حکومت وٹیکس کے قانون کے ظلم سے بچنے کےلئے ہو تو اس کی گنجائش ہے، ورنہ درست نہیں۔

دلائل:

* ‘‘أما فی زماننا فأکثر النوائب تؤخذ ظلماً ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فہو خیر لہ’’ (رد المحتار ۶۲۲،۷) [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

* فقہاء نے مہر کے مسئلہ میں وضاحت کی ہے کہ اگر میاں بیوی آپس میں طے کچھ کریں اور اعلان کچھ کریں تو وہی معتبر ہوگا جو ان دونوں کے مابین طے ہوا ہو، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

‘‘تواضعا فی السر علی مہر ثم تعاقدا فی العلانیۃ بأکثر والجنس واحد، فاتفا علی المواضعۃ فالمہر مہر السر’’ (رد المحتار ۴۱۵،۴) [مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

* یہ بیع التلجئہ کے ہم شکل معاملہ ہے جس میں باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتا ہے، تین ہزار ۳۰۰۰ کا ایک صفر اڑا کر تین سو ۳۰۰ ظاہر کرنا محض نمائشی تعداد ہے، جس کا کوئی اعتبار نہیں، درپردہ قیمت ہی معتبر ہے:

‘‘بیع التلجئۃ : للبیع الصوری أن یضطر لإظہار عقدو إبطان غیرہ مع إرادۃ ذلک الباطن کان یظہر بیع دارہ لابنہ لئلا یستولی علیہا السلطان’’ (معجم لغۃ الفقہاء،۱۱۳، قواعد الفقہ،۲۱۳) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

علامہ نووی کے کلام سے اس پر اس طرح روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:

‘‘بیع التلجئۃ: صورتہ: أن یخاف غصب مالہ أو الإکراہ علی بیعہ فیبیعہ لإنسان بیعاً مطلقاً، وقد توافقا قبلہ علی أنہ لدفع الشر لا علی حقیقۃ البیع والصحیح صحتہ’’ (روضۃ الطالبین ۲۳،۳) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

سوال نمبر ۴ :ڈائمنڈ کی ایک قسم ہے ''ریئل ڈائمنڈ ''(یہ اصل ڈائمنڈ ہیں) دوسری قسمCVD(Chemical Vapor Deposition)اس دوسری قسم کو کیمیکل کے ذریعہ بنایاجاتا ہے، ریئل ڈائمنڈ کے مقابلہ میںCVDڈائمنڈ کی ویلو ۲۵؍فیصد سمجھی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جوہری سے الف نے ''ریئل ڈائمنڈ '' طلب کئے، اور جوہری نے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے رِئل ڈائمنڈ کے نام سے CVDڈائمنڈ تھما دیئے، الف نے جب رپورٹ نکلوائی، تو ریئل ڈائمنڈکے بجائے وہCVDڈائمنڈ نکلے، تو اس صورت میں وہ جوہری کو ڈائمنڈ واپس لوٹاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار کی مختلف آراء ہیں، بعض مقالہ نویس کی رائے ہے کہ برحق ودرست اور عادلانہ ٹیکس سے بچنے کی تدبیر کرتے ہوئے اصل قیمت کے بجائے مثلاً دس فیصد قیمت ہی لکھنا شرعاً مناسب نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی شاہجہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری]۔

* یہ بھی ایک طرح کی چوری اور دھوکہ ہے [ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، حافظ کلیم اللہ عمری]۔

ان حضرات نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ناحق ٹیکس لیا جاتا ہو یا ٹیکس کی مقدار ظالمانہ ہو یا ٹیکس کا استعمال منصفانہ طریقہ سے نہ ہو تو پھر ایسے ٹیکس سے بچنے کی باعزت تدبیر کرنے کی گنجائش ہے۔

* حضرت عقبہ بن عمر جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''لا یدخل صاحب مکس الجنۃ'' (صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر: ۲۳۳۳، مسند ابی یعلی، حدیث نمبر: ۱۷۵۶) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

* عام طور پر مال عام کا موجودہ وقت میں غلط استعمال ہوتا ہے اور اس سے مصالح عامہ کو وجود میں لانے کی جگہ حکمراں ٹولہ کے تعیش کا انتظام کیا جاتا ہے [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

* فقہاء نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ ناحق طریقہ سے عام لوگوں کے مال لینا شرعاً ظلم ہے، علامہ ابن عابدین فتح القدیر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''الجبایات المؤظفۃ علی الناس ببلاد فارس علی الضیاع وغیرہا للسلطان فی کل یوم أو شہر أو ثلاثۃ أشہر، فإنہا ظلم'' (رد المحتار ۴۸؍۵) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

ان حضرات کے علاوہ اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر قانونی مجبوری اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کی جاتی ہے اور عاقدین میں سے کوئی دوسرے کو ضرر ونقصان نہیں پہنچاتا ہے تو اس صورت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

چنانچہ شرح المجلہ میں مشہور قاعدہ ہے:

''لا ضرر ولا ضرار'' ، ''الضرر یزال'' (شرح المجلہ ۲۹؍۱، مادہ: ۱۹، ۲۰) [مولانا

اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

* اگر ایکسپورٹ، امپورٹ کے کاروبار میں یہ طریقہ معروف ہو اور عرف وعادت کے مطابق ہی کاروبار ہوتا ہو اور دونوں ادائیگی کے اس طریقہ پر راضی ہوں تو یہ جائز ہے، حکومت کی نظر سے بچنے کےلئے مناسب نہیں [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

* ‘‘المسلمون علی شروطہم إلا شرطا حرم حلالاً أو أحل حراماً’’ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ١٣٦٤) [مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

* جہاں تک ہوسکے ملکی قوانین جو معصیت نہ ہو ان پر عمل کرنا چاہئے، اور قانون کی خلاف ورزی کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہے، البتہ اگر اس طرح کے ٹیکس ظالمانہ ہوں تو اس سے بچنے کی گنجائش ہے [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

* یہ معاملہ اگرچہ شرعاً درست ہوجائے گا، لیکن انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے غلط بیانی کرنا یا اصل قیمت چھپانا درست نہیں ہے اور کراہت سے خالی نہیں، ‘‘من غش فلیس منا’’ (سنن الترمذی) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

سوال نمبر ٥ :کاریگر جب جواہرات کو زیور وغیرہ کے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو کچھ ذرات اور ٹکڑے نکل آتے ہیں، یہ کاریگر کے پاس ہی رہ جاتے ہیں، زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی مینچلی گئی، کیا یہ بچے ہوئے ذرات کاریگر کے لئے جائز ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر زیور بنوانے والے ان ذرات کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں اور اسی طرح کا چلن بھی ہے تو اس کا رکھ لینا درست ہے اور اگر اس کا مطالبہ کرنے پر کاریگر جھوٹ بول کر یہ باور کراتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی تو درست نہیں، بلکہ ان پر مالک کی ملکیت ثابت رہے گی۔

دلائل:

١۔ ‘‘لا یحل لامرئ من مال أخیہ إلا ما طابت بہ نفسہ’’ (مسند احمد، حدیث نمبر: ١٥٤٨٨)[مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

٢۔ کاریگر کا یہ باور کرانا کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی، یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ حرام ہے: ‘‘ولہم عذاب ألیم بما کانوا یکذبون’’ (سورہ بقرہ: ١٠) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

٣۔ ‘‘من اکتسب مالا بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول ففی جمیع الأحوال، المال الحاصل لہ حرام علیہ ولکن إن أخذہ من غیر عقد لم یملک، ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ إن وجد المالک وإلا ففی جمیع الصور یجب علیہ أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء’’ (بذل المجہود فی شرح ابی داؤد ٣٧٫١) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۴۔ ‘‘من اکتسب مالا بغیر حق فإما أن یکون کسبہ بعقد فاسد أو بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول .....’’ (بذل المجہود، فتاوی ہندیہ، فتاوی شامی) [مفتی جنید پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

۵۔ فتاوی محمودیہ میں ہے: ‘‘درزی کو چاہئے کہ جب کپڑا ناپے تو جتنا خرچ ہوگا ناپ کر اتنا ہی بتائے، نہ اتنا کم بتائے کہ سل کر چھوٹا رہ جائے، نہ اتنا زیادہ بتائے کہ باقی بچے اور واپسی کی نوبت آئے، تاہم اگر باقی بچے گا تو اس کو خود نہ رکھے، بلکہ واپس کردے، اس پر اگر گاہک ناراض ہوکر سخت الفاظ کہے تو جواب نہ دے خاموش رہے، اور اس کو ذخیرہ آخرت تصور کرے ’’ (فتاوی محمودیہ بترتیب جدید ۴۰۰٫۲۸ مال حرام کا حکم) [مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

۶۔ حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب فرماتے ہیں:

سوال: مزدوری پر ہیرا گھسنے والا جب تاجر سے رف ہیرے لے کر خوشنما بنا نے کے لئے گھستا ہے ،تو اس میں سے برادہ گرتا ہے ،یہ برادہ ہیروں کی پالش میں کام آتا ہے ،ہیرا گھسنے والا اس برادہ کو اپنی ملک کی طرح لے لیتا ہے اور تاجر کو اس کی اطلاع ہوتی ہے، لیکن اس پر اس کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا ،تو مزدور کے لئے یہ درست ہے ؟

الجواب : وہ برادہ بھی تاجر کی ملک ہے،اگر تاجرکی اجازت ورضامندی سے مزدور لیتا ہے تو درست ہے ،فقط واللہ تعالی اعلم (محمود الفتاوی: ہیرے کے کا روبارکے مسائل ۴۸۴٫۲،ط: مکتبہ انور ڈابھیل) [مقالہ: مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

ابتدا میں تمہیدی طور پر تمام مقالہ نویس حضرات نے لکھا ہے کہ اگر کوئی سامان بنانے کے لئے دیا جائے تو اس میں امانت ودیانت اور اعتماد کا ثبوت ہونا چاہئے، کوئی بھی چیز بچ جائے تو مالک کو واپس کردینا چاہئے، لیکن اگر وہ جھوٹ، خیانت اور دھوکہ کا سہارا لیتا ہے تو اس کا یہ عمل حرام ہے۔

سوال نمبر ۶ :قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں، بازار میں ان کا وزن دس گرام ماناجاتا ہے، دس گرام سے زیادہ جو وزن ہوگا، وہ پتھر کا ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ دھاگے آٹھ گرام کے ہوتے ہیں، اور خریدنے والے تاجرکو بتایاجاتا ہے؛ لیکن وہ اس کو ماننے سے انکار کردیتا ہے، اور اس کا وزن دس گرام ہی مانتا ہے، گویا دو گرام پتھر بھی دھاگوں کے ریٹ میں فروخت ہوتا ہے، کیا خریدار کا یہ عمل درست سمجھاجائے گا؟

اس سوال کے جواب تقریباً تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر بائع

خریدار کی باتوں سے متفق ہوکر آٹھ گرام کے دھاگے کو دس گرام فرض کرکے فروخت کردے تو یہ شرعاً جائز ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

دلائل:

١۔ ''الأصل فی العقود المالیۃ بنائہا علی التراضی'' (الأصول والقواعد للفقہ الاسلامی) [مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی جمیل احمد نذیری]۔

٢۔ ''البیع ہو مبادلۃ المال بالمال بالتراضی'' (النہر الفائق) (مفتی جنید پالنپوری]۔

٣۔ بائع کو اختیار ہے کہ اپنے سامان کو جس قیمت پر چاہے فروخت کرے:

''لأن الثمن حق العاقد فإلیہ تقدیرہ فلا ینبغی للإمام أن یتعرض لحقہ إلا إذا تعلق بہ دفع ضرر العامۃ'' (ہدایہ ٤٧١،٤) [مولانا ظفر عالم ندوی]۔

٤۔ یہ بیع مجازفت کی قبیل سے ہے، کیوں کہ اس میں موتی کو دھاگے سمیت اولا وزن کیا جاتا ہے پھر دھاگے سمیت فروخت کیا جاتا ہے، بعدہ دھاگے کا وزن فرض کرکے قیمت کم کردی جاتی ہے، یہ صورت مجازفت یا حط ثمن کی ہے، لہذا اگر بائع راضی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

مفتی عثمان بستوی اس کے ساتھ لکھتے ہیں:

البتہ خریدوفروخت میں تعبیر اس طرح استعمال کرنی چاہئے کہ اس دھاگے میں جو پتھر ہیں ان کو اتنی قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے، یہ نہ کہا جائے کہ ان پتھروں کا اتنا وزن ہے: ''والحیلۃ فی جوازہ أن لا یعقد العقد إلا بدون وزنہ تحریاً للصحۃ، فیقول بعد الوزن بعتک ما فی ہذا الظرف بکذا ویقول الآخر قبلت فیکون ہذا من بیع الجزاف وہو الصحیح'' (رد المحتار ٢٧١،٧)۔

٥۔ ''إذا اختلفا فی قدر الثمن أو جنسہ أو صفتہ .....فإن کان لأحدہما بینۃ قضی بہا ..... وإلا توقفنا إلی ظہور الحال وإن لم تکن بینۃ تخالف'' (روضۃ الطالبین ٢٣٠،٣) [مولانا عمربن یوسف کوکنی]۔

٦۔ اگر پتھر کی تجارت میں دھاگوں کی کمی بیشی کی شناخت کا کوئی معیار ہو تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بصورت دیگر بازار میں چلن کو ہی مانا جائے گا (قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

٧۔ تاہم بائع جس قیمت میں بیچے، تاجر کو رضامندی کی صورت میں بائع کی بیان کردہ قیمت کے مطابق خریدنا لازم ہوگا، اس میں تاجروں کے رواج کے مطابق بیان کردہ قیمت میں کمی کرنا اور بائع کے نہ چاہتے ہوئے زائد پتھروں کو دھاگے کی قیمت میں خریدنا مناسب نہیں۔

''کل یتصرف فی ملکہ کیف شاء، لکن إذا تعلق بہ حق الغیر یمنع المالک من تصرفہ

بوجہ الاستقلال، فلو کان السفل لواحد والعلو لآخر فلصاحب العلو حق القرار علی السفل ..... والحاصل أن لکل منہما فعل ما لا یضر بالآخر" (شرح المجلہ ۱،۶۵۵، مادہ: ۱۱۹۲) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۸۔ ''وإن اشتری خاتم فضۃ أو خاتم ذہب فیہ نص أو لیس فص بکذا فلسا ولیست الفلوس عندہ فہو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم یتقابضا لأن ہذا بیع'' (فتاوی ہندیہ۳،۲۲۴، طبع زکریا) [مفتی اقبال ٹنکاروی]۔

۹۔ فتاوی عثمانی کے ایک جواب سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے:

''بیچنے والے کو شرعاً اختیار ہے کہ وہ اپنی مملوک چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے، لہذا اگر کوئی زرگر سونے کے ٹانکے کو بھی سونے کی قیمت پر فروخت کرے تو جائز ہے، بشرطیکہ تلبیس نہ کرے اور دھوکہ نہ دے، یعنی بتا دے کہ اس میں ٹانکے کی قیمت بھی شامل ہے '' (فتاوی عثمانی ۳،۱۶۰) [مفتی اقبال ٹنکاروی]۔

۱۰۔ اگر تاجروں کے عرف میں دس گرام دھاگے کا وزن طے شدہ ہو تو تاجر کا آٹھ گرام دھاگے والے زیور کو دس گرام مان کر خریدنا درست ہوگا۔

''أما لو جری العرف بہ کبیع النعل مع شرط تشریکہ أو ورد الشرع بہ کخیار شرط فلا فساد، کشرط أن یقطعہ البائع ویخیطہ قباء، مثال لما لا یقتضیہ العقد، وفیہ نفع للمشتری، أو یستخدمہ مثال لما فیہ نفع للبائع'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵،۸۵) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

جبکہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا محبوب فروغ قاسمی اور قاضی محمد حسن ندوی کی رائے ہے کہ خریدوفروخت کے اس معاملہ میں بہ ظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس لئے کہ جب خریدار کو بنا دیا گیا کہ قیمتی پتھر کی آرائشی چیز میں جو دھاگے لگائے گئے ہیں، وہ آٹھ گرام کے ہیں ، تو اسے مان لینا چاہئے، لیکن عام طور پر مارکیٹ کے عرف میں ان دھاگوں کا وزن دس گرام مانا جاتا ہے۔

البتہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ مبیع یا ثمن کےعیب کو نہ چھپائے، جیسا کہ علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

''لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵،۴۷) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی]۔

جبکہ مفتی عبد القیوم پالنپوری اور مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی کی رائے ہے کہ مذکورہ صورت میں خریدار کا یہ عمل درست نہیں ہے۔

سوال نمبر ۷ :بعض دفعہ ایک مال مثلاً ایک قیراط پانچ سنٹ کا ہوتا ہے؟ لیکن خریدنے والا تاجر ایک قیراط مال پر اس کی پرچی بناتا ہے، پانچ سینٹ کی قیمت ادا نہیں کرتا ؛البتہ چونکہ پہلے بائع کے لئے صرف ایک قیراط کی قیمت کی پرچی لکھی گئی تھی؛ اس لئے وہ مجبورا اس پر راضی ہوجاتا ہے؛ لیکن خود وہ جب کسی اور سے اس مال کو فروخت کرتا ہے

تو پورے ایک قیراط پانچ سینٹ کی قیمت لگاتا ہے، شرعا اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نویس حضرات کے علاوہ تمام حضرات کی رائے ہے کہ حقیقی وزن کو کم کرکے لکھوانا اور پرچی بنوانا شرعاً جائز نہیں ہے [دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا ابراہیم سلیمان فلاحی]۔

دلائل :

١۔ بائع کو کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل، إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (سورہ نساء: ٢٩) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابراہیم فلاحی]۔

٢۔ حدیث میں ہے:''لا ضرر ولا ضرار فی الإسلام'' (المسند للامام احمد، حدیث نمبر: ٢٣٤١، التمہید٤،٢٨٤) [مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

٣۔ جب خود خریدار اسی سامان کو دوسرے سے پورے ایک قیراط پانچ سینٹ کی قیمت لگاتا ہےاور بیچتا ہے تو پہلے بائع کے مال کے وزن کو کم کرنے کی صورت میں اس پر تطفیف کی وعید لازم آتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''ویل للمطففین الذین إذا اکتالوا علی الناس یستوفون وإذا کالوہم أو وزنوہم یخسرون'' (سورہ مطففین: ١، ٢، ٣) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، قاضی محمد حسن ندوی]۔

٤۔ مال کے اصل وزن کا اعتبار ہوگا، نہ کہ پرچی کا، گو کہ بائع بدرجہ مجبوری ایک قیراط میں راضی ہوجائے۔

٥۔ چونکہ یہ بیع بطیب خاطر نہیں ہے، بلکہ ظلماً ہے، اس لئے جائز نہیں [قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری]۔

٦۔ قرآن مجید میں صحیح وزن کے ساتھ لین دین کی بڑی تاکید آئی ہے:

''أوفوا الکیل ولا تکونوا من المخسرین، وزنوا بالقسطاس المستقیم'' (سورہ شعراء: ١٨١، ١٨٢) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

٧۔ یہ بیع ہی نہیں ہوئی، کیونکہ تراضی طرفین نہیں ہے، جبکہ بیع کی تعریف ہے:

''أما تعریفہ مبادلۃ المال بالمال بالتراضی، کذا فی الکافی'' (فتاوی ہندیہ٣،٢) [مفتی جمیل احمد نذیری]۔

٨۔ یہ بائع کی رضامندی کے بغیر حط ثمن ہے جو ناجائز ہے اور غصب کے حکم میں ہے: ''من غش فلیس منا'' (سنن الترمذی)۔

٩۔ ‘‘من اکتسب مالا بغیر حق فإما أن یکون کسبہ بعقد فاسد أو بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول، ففی جمیع الأحوال المال الحاصل لہ حرام علیہ، ولکن إن أخذہ من غیر عقد لم یملکہ، ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ’’ (بذل المجہود) [مفتی جنید پالنپوری]۔

١٠۔ پانچ سینٹ کے بقدر مال خریدار کے پاس غیر کا مال ہوگا، اس لئے وہ مال خبیث ہے۔

١١۔ بیع وشراء کے صحیح ہونے کے لئے عاقدین کی رضامندی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ‘‘إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم’’ (نساء: ٢٩)۔

* ‘‘إنما البیع عن تراض’’ (سنن بیہقی ٦،١٧)۔

* ‘‘لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ’’ (مجمع الزوائد ٤،١٧٢) [مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی]۔

جبکہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد المنان اور مفتی عثمان بستوی کی رائے اس مسئلہ میں مختلف ہے:

* اگر دونوں اس قیمت پر اپنی رضا مندی سے عقد لازم کرلیتے ہیں تو یہ سمجھا جائے گا کہ بائع مبیع میں پانچ سینٹ کم کرنے پر راضی ہوگیا اور عقد تام ہوگیا، اب آگے خریدار تاجر ایک قیراط پانچ سینٹ میں یہ مال بیچتا ہے تو ‘‘بیع مرابحہ ’’ ہے اور شرعاً جائز ہے، پرچی کا کوئی اعتبار نہیں ، اصل ثمن وہ ہے جسے متعاقدین آپس میں طے کرتے ہیں:

‘‘الثمن المسمی ہو الثمن الذی یسمیہ ویعینہ وقت البیع بالتراضی سواء کان مطابقاً لقیمتہ الحقیقیۃ أو ناقصاً عنہا أو زائداً علیہا’’ (شرح المجلہ ١،٧٣) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد المنان آسام]۔

* اگر زائد سینٹ کی قیمت نہ لگانے کا عرف ہو تو عرف کی وجہ سے اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی، اس لئے کہ وہ وصف کے درجہ میں ہوجائے گا، اور اگر زائد سینٹ کی قیمت لگانے کا عرف ہو تو اس کی قیمت لگائی جائے گی، اس لئے کہ عرف کی وجہ سے وہ اصل کے درجہ میں ہوجائے گا:

‘‘المعروف عرفاً کالمعروف شرطاً’، المعروف بین التجار کالمشروط بینہم’’ (شرح المجلہ، مادہ: ٤٤) [مفتی عثمان بستوی]۔

* تھوک خریدار کے مال میں جو ٹکڑے ہوتے ہیں ان کو حذف کرکے قیمت لگانے کا دستور ورواج ہے، اس لئے تھوک خریدار ٹکڑوں کی قیمت نہ لگائے اور ان کو اصل کے تابع مان لے تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی [مفتی عثمان بستوی]۔

سوال نمبر ٨ : بعض دفعہ ایک شخص مختلف لوگوں سے مال لے کرباہر چلاجاتا ہے؛ تاکہ اسے فروخت کرے، اب خدا ناترس حضرات غلط بیانی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ مال ڈوب گیا؛لہذا اب پچیس فیصد قیمت لے لو، اور بیچنے والا اس کو قبول کرنے پر

مجبور ہوجاتا ہے؛کیونکہ لکھی ہوئی قیمت اس سے بہت کم ہوتی ہے، ایک زیرو کم کرنے کی وجہ سے اسی قیمت کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے،مجبوری میں قبول کرنے کی وجہ سے شرعا کیا اس شخص کے لئے یہ مال حلال ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ خریدار کے لئے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ایسا کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے ، خریدار پر لازم ہے کہ لوگوں کے پورے ثمن ان کو ادا کرے، خواہ پرچی پر قانونی مصلحت سے کم قیمت لکھی گئی ہو اور خواہ خریدار کا مال ڈوب گیا ہو۔

دلائل:

١۔ جب بیع تمام ہوگئی اور خریدار نے سامان پر قبضہ کرلیا تو پھر اس پر لازم ہے کہ پوری قیمت ادا کرے [قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبد القیوم پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

٢۔ اگر فروخت کردہ سامان ہلاک بھی ہوجائے تو خریدار کو پوری قیمت دینی پڑے گی:

''أما إذا ہلک کلہ بعد القبض، فإن ہلک بآفۃ سماویۃ أو بفعل المبیع لا ینفسخ البیع والہلاک علی المشتری وعلیہ الثمن، لأن البیع تقرر بقبض المبیع، فتقرر الثمن، وکذلک إن ہلک بفعل أجنبی لما قلنا'' (بدائع الصنائع٥؍٢٣٩) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی]۔

٣۔ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ناحق طریقہ سے مال کھاناہے:

''لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (سورہ بقرہ: ١٨٨) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید پالنپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

٤۔ اس میں عہد شکنی اور وعدہ خلافی ہے، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''وأوفوا بالعہد إن العہد کا ن مسئولا'' (سورہ اسراء: ٣٤)۔

٥۔ امام طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وأوفوا بالعقد الذی تعاقدون الناس فی الصلح بین أہل الحرب والإسلام، وفیما بینکم أیضاً والبیوع والأشربۃ، والإجارات وغیر ذلک من العقود ''إن العہد کان مسئولا .....'' (جامع البیان فی تاویل القرآن ١٧؍٤٤٤، طبع بیروت) [مفتی محمد شاہجہاں ندوی ، مفتی عثمان بستوی]۔

٦۔ ''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ'' (سنن الدارقطنی) [مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا صابر حسین ندوی]۔

٧۔ ''عن ابن عمرؓ أن النبیﷺ نہی عن النجش'' (صحیح البخاری، حدیث: ٢١٤٢)۔

٨۔ ''أرأیتک أن منع اللہ الثمرۃ بم یستحل مال أخیک'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ١٥٥٥) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

٩۔ اگر خریدار اپنے قول میں جھوٹا ہے تو اس کے لئے یہ پچیس فیصد قیمت دے کر باقی ماندہ مال حرام ہے:

''عن أبی حمید الساعدی أن رسول اللہﷺ قال: لا یحل لامرئ أن یأخذ مال أخیہ بغیر حقہ، وذلک لما حرم اللہ مال المسلم علی المسلم'' (مسند احمد ابن حنبل ٤٢٥،٥، حدیث نمبر: ٣٤٠٠، مجمع الزوائد ١٧١،٤) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

١٠۔ اور اگر یہ شخص اپنی سچائی پر حلف اٹھا سکتا ہے، تو یہ کل ثمن میں سے جتنی ادائیگی پر قادر ہو وہ ادا کرنا واجب ہے اور جتنے حصہ ثمن کی ادائیگی سے عاجز ہو اس کو اپنے بائع سے معاف کرالینا ضروری ہے، ادھار مال دینے والے کے لئے قیمت کم کردینا جائز ہے:

''والحط منہ أی حط البائع بعض الثمن ولو بعد ہلاک المبیع'' (مجمع الزوائد ١١٥،٣) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

١١۔ ''والحنفیۃ قالوا: کل ما یدعیہ أحد الشرکاء فی مقدار الربح والخسران وفقد المال والدفع إلی شریکہ یصدق فی قولہ بعد أن یحلف الیمین'' (الفقہ علی المذاہب الاربعہ٧٤،٣) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

قاضی محمد حسن ندوی کی رائے ہے کہ اگر صاحب مال اپنی ضرورت اور کاغذی مجبوری کی بنا پر اصل قیمت کے بجائے پچیس فیصد لے کر آپس میں رفع دفع اور مصالحت کر لیتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

محور چہارم:

سوال نمبر١ :ڈائمنڈ کا مال ہم عامۃً دو مہینے کی ادھاری پر فروخت کرتے ہیں، توکیا ہم اس کو نقد ۶ یا٨ فیصد لیس(تخفیف) کر کے بیچ سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ ائمہ اربعہ، جمہورفقہاء ومحدثین کے نزدیک نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمت کی کمی بیش شرعاً وعرفاً جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین بوقت عقد کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں۔

دلائل:

١۔ ''یجوز البیع بثمن حال ومؤجل إذا کان الأجل معلوماً'' (ہدایہ کتاب البیوع) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

٢۔ ''ألا تری أنہ یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (البحر الرائق١٩٠،۶) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

٣۔ ''صح بثمن حال وہو الأصل ومؤجل إن أجل معلوم'' (فتح القدیر٢٤٣،۶) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۴۔ ''وقد فسر بعض أہل العلم، قالوا:بیعتین فی بیعۃ أن یقول أبیعک ہذا الثوب بنقد بعشرۃ وبنسیئۃ بعشرین، ولا یفارقہ أحد البیعین، فإن فارقہ علی أحدہما فلا بأس إذا کانت العقدۃ علی

أحد منہما" (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ١٣٣١) [مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

۵۔ انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے میں مذکور ہے:''نقد قیمت کی بہ نسبت ادھار قیمت میں زیادتی جائز ہے '' (١٧٩، ٢١٣) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۶۔ ''وإذا عقد العقد علی أنہ إلی أجل کذا بکذا وبالنقد کذا أو قال إلی شہرین بکذا فہوفاسد ..... وہذا إذا افترقا علی ہذا، فإن کان یتراضیان بینہما ولم یتفرقا حتی قاطعہ علی ثمن معلوم وأتما العقد علیہ فہو جائز" (المبسوط للسرخسی ١٣،٨، ٩) [مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

۷۔ ڈائمنڈ کا مال ہو یا کوئی اور مال، تاجر کو نقد اور ادھار دونوں میں سے نقد کی فی الحال قیمت یا ادھار کی تعیین مدت کے ساتھ مقررہ قیمت پر بیچنا جائز ہے [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۸۔ مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے (فقہی مقالات ١،٨٢، ٨۴) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۹۔ قاری ظفر الاسلام اعظمی نے مختلف کتب فقہیہ کے حوالہ کے ساتھ لکھا ہے:

''فقیہ عصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی علامہ ابوبکر کاسانی کی تحریر ''لا مساواۃ بین النقد والنسیئۃ'' اور فقہاء شافعیہ میں سے امام رافعی کی ''إذا اشتراہ بثمن مؤجل وجب الإخبار عنہ للتفاوت الظاہر بین المعجل والمؤجل فی المالیۃ''، اور ابن قدامہ کی تحریر ''وقد عرف ..... إن التفاوت فی الأسعار المؤجلۃ والمعجلۃ حقیقۃ ثابتۃ وأمر معروف" کے تحت جواز ذکر فرمایا ہے '' (نوازل فقہیہ معاصرہ ١،٣٥١، ٣۵٢)۔

١٠۔ حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''ایک چیز کی قیمت نقد فروخت کرنے میں کم اور ادھار فروخت کرنے میں زیادہ لی جاسکتی ہے، زیادتی قیمت کو کسی مدت پر محمول نہ کریں کہ جیسے جیسے مدت بڑھتی جائے قیمت بھی بڑھتی جائے، اس لئے کہ یہ جائز نہیں '' (منتخبات نظام الفتاوی ٣،٣٩) [قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

١١۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

''ادھار خریدوفروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی ربا کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید وفروخت میں جو بھی قیمت ہو وہ مبیع یعنی خرید کردہ سامان کے مقابل ہوتی ہے، اس طرح ادھار خرید وفروخت کے مقابلہ میں طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے مقابلہ میں ہوتی ہے '' (دسواں فقہی سمینار منعقدہ: ممبئی) [مفتی نثار احمد گجراتی]۔

البتہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مفتی عثمان بستوی نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ تردید کے ساتھ بلا تعین نقد اتنے پر اور ادھار اتنی قیمت پر بیچتا ہوں کہہ کر عقد بیع کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی صورت میں ثمن مجہول رہ جاتا ہے اور مجہول ثمن فساد عقد کو مستلز م ہے:

‘‘رجل باع على أنہ بالنقد بكذا وبالنسيئۃ بكذا وإلى شہر بكذا وإلى شہرين بكذا لم يجز’’ (فتاوی ہندیہ ۱۳۶٫۳، نیز دیکھئے: المبسوط ۸٫۱۳) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی]۔

سوال نمبر ۲ :دو مہینے کی ادھاری پر ہم نے مال فروخت کیا، لیکن کیا ایک مہینے کے بعد پیسوں کی فوری ضرورت پیش آنے پر کچھ فیصد قیمت میں سے تخفیف کر کے پیسے لئے جاسکتے ہیں؟

اس سوال کےجواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہوگا جب یہ چھوڑنا تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ حصہ دین ساقط کردے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں [دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

دلائل:

۱۔ ‘‘ومن أجاز من السلف إذا قال: عجل لی أوضع عنک فجائز أن يكون أجازوہ إذا لم يجعلہ شرطا فيہ، وذلک بأن يضع عنہ بغير شرط، ويجعل الآخر الباقی بغير شرط’’ (احکام القرآن للجصاص ۴۶۷٫۱) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۲۔ یہ کمی اجل کا عوض ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں [مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

۳۔ ‘‘لأن المعجل خير من المؤجل وہو غير مستحق بالعقد فيكون بإزاء ما حطہ وذلک اعتياض عن الأجل وہوحرام’’ (ہدایہ ۲۵۱٫۳) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

۴۔ ‘‘ومما يتعامل بہ بعض التجار فی الديون المؤجلۃ أنہم يسقطون حصۃ من الدين بشرط أن يعجل المديون باقية قبل حلول الأجل مثل أن يكون لزيد على عمرو ألف، فيقول زيد ‘‘عجل لی تسع مائۃ وأنا أضع عنک مائۃ’’ وإن ہذہ المعاملۃ معروفۃ فی الفقہ باسم ‘‘ضع وتعجل’’ وہذا التعجيل إن كان مشروطاً بالوضع من الدين، فإن المذاہب الأربعۃ متفقۃ على عدم جوازہ’’ (ہدایہ مع فتح القدير، فقہ البيوع ۵۴۵٫۱، ۵۴۶) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

۵۔ ‘‘ولو صالح من عشرۃ حالّة على خمسۃ مؤجلۃ برئ من خمسۃ وبقيت خمسۃ حالّةً؛ لأنہ سامح بحط البعض ووعد بتأجيل الباقي، والوعد لا يلزم والحط صحيح، ولو عكس بأن صالح من عشرۃ مؤجلۃ على خمسۃ حالّة لغا الصلح؛ لأن صفۃ الحلول لا يصح الحاقها والخمسۃ الأخرى إنما تركها في مقابلۃ ذلک فإن لم يحصل الحلول لا يصح الترك’’ (مغنی المحتاج ۲۲۲٫۲)۔

۶۔ نیز دکتور وہبہ زحیلیؒ کا عمدہ کلام ملاحظہ ہو:

۷۔ ‘‘قاعدة (ضع وتعجل) إن أخِذ مال من المقترض مقابلَ تعجيل بقية القرض بالنص على ذلك في عقد القرض حرام أيضًا عند أئمة المذاهب الأربعة،لأن نقص ما في الذمة لتعجيل الدفع شبيه بالزيادة؛ لأن المعطيَ جعل للزمان مقداراً من الثمن بدلًا منه’’ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۷۲۶،۵، نیز دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۳۹،۲) [مفتی عمر بن یوسف کوکنی]۔

۸۔ علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

‘‘إذا كان عينه دين مؤجل، فقال لغريمه:ضع عني معضه، وأعجل لک بقيته لم يجز، كرہ زيد بن ثابت، وابن عمر والمقداد وسعيد بن المسيب، وما لم والحسن وحماد والشافعی ومالک والثوری وہشیم وابن علیۃ وإسحاق وأبوحنيفة’’ (المغنی لابن قدامہ المقدسی)۔

‘‘وبہذا نأخذ من وجب لہ دين على إنسان إلى أجل، فسئل أن يضع عنه وعجل لہ ما بقی، لم ينبغ ذلک، لأنہ يعجل قليلاً بكثير دينا، فكأنہ يبيع قليلاً نقداً بكثير دينا’’ (المؤطا للامام محمد ۳۳۲،۱) [مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑا]۔

۹۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ مندرجہ ذیل ہے:

‘‘اگر اصل معاملہ میں اداء دین کی مدت معین ہو تو جس پر دین واجب ہے وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الادا دین کم کررہا ہے تو اس طرح کا معاملہ جائز نہیں۔

اگر اداء دین کی کوئی مدت معین نہ ہوتو یہ ایک طرح کا تبرع ہے، جو جائز اور درست ہے ’’ (دسواں فقہی سمینار، منعقدہ ممبئی) [مفتی نثار احمد گجراتی]۔

۱۰۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

‘‘اگر خریدار یا فروخت کرنے والے کی طرف سے شرط لگائی جائے کہ خریدار قیمت مقررہ وقت سے پہلے ادا کردے گا، تو اسکو اتنا ڈسکائونٹ دیا جائے گا، تو یہ صورت جائز نہیں، گویا یہ مہلت کی قیمت ادا کرنی ہے، اس لئے اس میں سود کا شبہ پیدا ہو جاتا ہے،فقہاء کی اصطلاح میں اسکو ضع وتعجل کہتے ہیں، البتہ اگر فریقین میں سے کسی کی طرف سے شرط نہ ہواور بیچنے والا اپنے طور پر پیسے کم کردے ،یا خریدار خود پیسے پہلے ادا کردے اور بیچنے والا کچھ پیسے واپس کردے، تو یہ صورت جائز ہوگی؛ کیونکہ یہ صورت رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے پیسے کم کر دینے کی ہوگی،جس کی اجازت ہے ’’ (کتاب الفتاوی۹،۹۔۴۰۸)۔

* مفتی عثمان بستوی نے اپنے مقالہ میں مفصل بحث کے بعد لکھا ہے:

‘‘چونکہ روایت اولی مؤول ومحتمل ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں، اس لئے جمہور نے روایت ثانیہ سے استدلال کرتے ہوئے ضع وتعجل کو ناجائز فرمایا ہے، عدم جواز کی وجہ ظاہر ہے کہ اجل کے مقابل میں اصالۃً عوض مقرر کیا جارہا ہے جو سود ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے، سود میں بھی اجل ہی کا عوض وصول کیا جاتا ہے، اس لئے ضع وتعجل کا اصول شریعت کے ضابطہ کے مطابق ناجائز وحرام ہے، ‘‘لأن

المعجل خیر من المؤجل وہو غیر مستحق بالعقد فیکون بإزاء ما حطہ وذلک اعتیاض عن الأجل وہو حرام" (ہدایہ۳،۲۵۱)۔

جبکہ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا صابر حسین ندوی اور مفتی جمیل احمد نذیری کی رائے میں مذکورہ صورت درست ہے اور اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ان حضرات کے دلائل:

۱۔ ".....وإلا فیما إذا کان الإیجاب من المشتری فقبل البائع بأنقص من الثمن صح، وکان حطاًأو کان من البائع فقبل المشتری بأزید صح وکان الزیادۃ إن قبلہا فی المجلس لزمت" (رد المحتار علی الدر ۴۴،۷) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۲۔ مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اگر مدیون اپنا قرضہ مقررہ وقت سے پہلے ادا کردے تو سودی نظام میں سود کم ہوجاتا ہے ....." (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲۷۲،۲) [مفتی اقبال ٹنکاروی]۔

۳۔ "ویجوز أن یحط عن الثمن" (ہدایہ ۷۵،۳) [مفتی جمیل احمد نذیری]۔

اس سلسلہ میں مفتی عبد القیوم پالنپوری لکھتے ہیں:

"میری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دین مؤجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ وقیمت ساقط کرنا بیع مساومہ میں ناجائز ہے، البتہ بیع مرابحہ میں متاخرین حنفیہ کا فتوی یہ ہے کہ بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مدت مقررہ تک جتنے ایام باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن (قیمت جلد ادا کرنے کی صورت میں) چھوڑنا پڑے گا " (رد المحتار ۱۶۰،۵، فقہی مجلات ۱۱۴،۱، ۱۱۶)۔

مولانا عبد المنان آسام کی رائے ہے کہ دونوں سہولت ورضامندی سے عقد کی تجدید کرلے۔

"ضع وتعجل " پر فقہاء وائمہ کے اصول اور ان کے اختلاف پر مفتی عثمان بستوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی اور مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے اپنے اپنے مقالہ میں مفصل گفتگو کی ہے جس سے بعد میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر ۳ :ڈائمنڈ کے اصل یا نقل ہونے کا دارومدار سرٹیفکیٹ پر ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا کاروبارعام طور سے سرٹیفکیٹ پر ہوتا ہے، چنانچہ سرٹیفکیٹ ہے تب تو خیر! لیکن بعض مرتبہ بغیرسرٹیفکیٹ کے صرف دیکھ کر خریدنے پر اکتفا کرنے کی نوبت بھی آتی ہے، اس صورت میں اگر بائع نے گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچ دیا اور مشتری نے بائع پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو اعلی سمجھ کر خریدلیا، پھر رپورٹ نکالنے پر معلوم ہوا کہ وہ ڈائمنڈ تو گھٹیا تھے، توکیا اب بائع سے طے شدہ قیمت میں کمی کرواسکتے ہیں یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نگار کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں اصولی طور پر نقلی اور گھٹیا ڈائمنڈ لوٹا دینا چاہئے اور اگر استعمال کرچکا ہو تو دونوں کی

رضامندی کے ساتھ گھٹیا اور بڑھیا ڈائمنڈ کے درمیان قیمت میں جتنا فرق ہو اتنا ہی قیمت میں سے کمی کروا سکتے ہیں [مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبد المنان، مفتی نثار احمد گجراتی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

دلائل:

۱۔ ''فإن ظہر عیب قدیم عند المشتری آخر رجع بالنقصان، کثوب شراہ فقطعہ فاطلع عیب ولیس لہ للرد إلا أن یرضی البائع بأخذہ وتحتہ ''مجمع الأنہر'' لأن تعذر الرد بسبب العیب الحادث، وطریق معرفتہ أن یقول وبہ ہذا العیب ثم یقوم وہو سالم، فإذا عرف التفاوت بین القیمتین یرجع علیہ بحصتہ من الثمن الخ'' (الدر الملتقی مع مجمع الانہر ۲۴٫۳، ۲۶، النہر الفائق ۳۹۸٫۳) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۲۔ ''(ولو قبض زیفاً بدل جید) کان لہ علی آخر (جاہلاً بہ) فلو علم وأنفقہ کان قضاء اتفاق (ونفق أوأنفقہ) فلو قائماً ردہ اتفاقاً فہو قضاء لحقہ، وقال أبو یوسف: إذا لم یعلم، یرد مثل زیفہ ویرجع بجیدہ استحساناً کما لو کان ستوقۃ واختارہ للفتوی بن الکمال، قلت:ورجحہ فی البحر والنہر والشرنبلالیۃ'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴۸۷٫۷، ۴۸۸) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۳۔ ''وإذا حدث عند المشتری عیب، فاطلع علی عیب، کان عند البائع، فلہ أن یرجع بالنقصان ولا یرد المبیع، لأن فی الرد إضرار بالبائع لأنہ خرج عن ملکہ سالماً ویعود معیباً فامتنع، ولا بہ من دفع الضرر عنہ، فتعین الرجوع بالنقصان، قال: إلا أن یرضی البائع أن یأخذہ بعینہ لأنہ رضی بالضرر'' (الہدایہ ۹۶۳٫۳) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۴۔ ''مطلب وجد فی الحنطۃ تراباً '' کے تحت مذکور ہے: ''وإن فحش خیر المشتری أخذ الحنطۃ بحصتہا من الثمن أو ردہا وأخذ کل الثمن'' (ردر المحتار علی الدر ۱۹۸٫۷) [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۵۔ ''وفی النسفیۃ سئل عمن اشتری من آخر نقرۃ علی أنہا خالصۃ زجرداد فقبضہا وکسرہا فلم یکن رجرداد بل لہ أن یردہا علی البائع بہذا القدر فقال نعم'' (فتاوی تاتارخانیہ۴۲۴٫۸)۔ معلوم ہوا کہ عیب فاحش کی بنیاد پر دونوں کا اختیار ہے [قاری ظفر الاسلام اعظمی]۔

۶۔ ''وکذلک الجودۃ والرداءۃ فی أسواق السلع ینضبط بدرجات معلومات فشراء سلعۃ علی أنہا من الدرجۃ الأولی أو الثانیۃ شرط جائز یثبت بہ خیار فوات الوصف، فإن ہذہ الدرجات معروفۃ الیوم فی عرف التجار بأوصاف معلومۃ .....إذا رضی المشتری بالبیع وأراد أن یمسکہ بدون الوصف المشروط فإنہ یمسکہ بجمیع الثمن، لأن الأوصاف لا یقابلہا شئ من الثمن وہذا لا خلاف فیہ، قال ابن قدامۃ: فمتی بان خلاف ما اشترطہ، فلہ الخیار فی الفسخ والرجوع بالثمن أو الرضا بہ ولا شئ لہ ولا نعلم بینہم فی ہذا خلافاً'' (فقہ البیوع ۸۷۸٫۱-۸۷۹) [مفتی

محمد عثمان بستوی]۔

۷۔ ‘‘ومقتضى خيار العيب:ثم مقتضى خيار الرد أن المشترى له أن يرد المبيع إلى البائع ويطالبه برد الثمن وهل يجوز له أن يمسك المبيع ويطالبه ببعض الثمن ضماناً للنقصان (الأرش)؟ اختلف فيه الفقهاء:فمذهب الحنفية والشافعية أنه لا يحق له أن يجبر البائع على ذلك وإنما حقه فى فسخ المبيع .....” (فقه البيوع) [مفتى جنيد پالنپورى]۔

۸۔ ‘‘صاحب خيار العيب له قبول المبيع بثمنه المسمى كله وليس له إمساكه ونقص الثمن بما يقابل العيب إلا إذا رضى البائع الخ” (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۳۳۵،۱) [مفتى جنيد محمد پالنپورى]۔

۹۔ ‘‘أجاز الحنفية هذا الخيار وهو أن يغرر البائع المشترى أو على العكس تغريراً قوليا وهو التعزير فى السعر أو تغريراً فعلياً وهو التغرير فى الوصف إذا كان الغبن فاحشاً، وحكمه إعطاء المغبون الحق فى فسخ العقد دفعاً للضرر عنه” (الوجيز فى الفقه الاسلامى ۶۴،۲) [مفتى نثار احمد گجراتى]۔

۱۰۔ ‘‘ولو شرط البراءة عن عيب عينه فإن كان مما لايعاين كزنا أو سرقة أو أباق برئ منه لأن ذكرها إعلام بها، وإن كان مما يعاين كبرص وإن أراه إياه فكذلك وإلا فلا يبرأ منه لتفاوت الأغراض ..... ويؤخذ من هذا رد ما أفتى به بعضهم فى بائع أقبضه المشترى الثمن وقال له استفده فإن فيه زيفا فقال البائع: رضيت بزيفه فظهر فيه زيف بأنه لا رد له به، ووجه رده إن الزيف لا يعرف قدره فى الدرهم بمجرد مشاهدته فلم يؤثر الرضا به’’ (حاشية الجمل مع شرح المنهج۴۸۸،۴) [مولانا عمر بن يوسف كوكنى]۔

البتہ مفتى جميل احمد نذيرى، مفتى عبد القيوم پالنپورى، اور مولانا عبد الله خالد لونا واڑا كى رائے ہے كہ اس صورت ميں مشترى كو خيار عيب حاصل ہو گا، ليكن وہ طے شدہ قيمت كو كم نہيں كراسكتا ہے، البتہ چاہے تو اس سامان كو واپس كردے:

* ‘‘وإذا اطلع المشترى على عيب فى المبيع فهو بالخيار إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء رده” (ہدايہ۷۴،۳) [مفتى جميل احمد نذيرى، مفتى عبد القيوم پالنپورى، مولانا عبد الله خالد لوناواڑا]۔

* ‘‘وإذا اشترى شيئاً لم يعلم بالعيب وقت الشراء وعلمه قبله والعيب يسير أو فاحش فله الخيار: إن شاء رضى بجميع الثمن وإن شاء رده، كذا فى شرح الطحاوى، وليس له أن يمسكه ويأخذ النقصان” (فتاوى ہنديہ) [مفتى عبد القيوم پالنپورى]۔

* ‘‘عن الشعبى فى رجل اشترى رقيقا جملة، فوجد ببعضهم عيباً، قال: يردهم جميعاً أو يأخذهم جميعاً، قال سفيان: ونحن لا نقول ذلك، نقول المشترى بالخيار، يقوم ما وجد به عيب، ويرده بعينه وإن شاء ردهم كلهم” (المصنف لعبد الرزاق، حديث نمبر: ۱۴۶۹۹) [مولانا عبد الله خالد]۔

* شامى ميں ہے: ‘‘إلا أن يرضى بالضرر فيخير المشترى حينئذ الرد والإمساك من

غیر رجوع بنقصان" (رد المحتار ۸۹٫۴) [مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

* احسن الفتاوی میں ہے: ''عیب پر مطلع ہونے کے بعد مشتری کو اختیار ہے، چاہے تو کل ثمن کے بدلے اس کو رکھے اور چاہے تو واپس کردے، معیب جانور کو رکھ کر رجوع بالنقصان کرنا جائز نہیں (احسن الفتاوی ۶۹۲٫۶) [مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑا]۔

اسی طرح انہی میں سے بعض مقالہ نویس حضرات نے اس صورت کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ پہلا عقد ختم کرکے کم قیمت پر نیا عقد کرلیا جائے۔

سوال نمبر ۴ :ڈائمنڈ کی ایک قسم ہے ''ریئل ڈائمنڈ ''(یہ اصل ڈائمنڈ ہیں) دوسری قسم CVD(Chemical Vapor Deposition)اس دوسری قسم کو کیمیکل کے ذریعہ بنایاجاتا ہے، ریئل ڈائمنڈ کے مقابلہ میںCVDڈائمنڈ کی ویلو۲۵٫فیصد سمجھی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جوہری سے الف نے ''ریئل ڈائمنڈ '' طلب کئے، اور جوہری نے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے رِئل ڈائمنڈ کے نام سے CVDڈائمنڈ تھما دیئے، الف نے جب رپورٹ نکلوائی، تو ریئل ڈائمنڈکے بجائے وہCVDڈائمنڈ نکلے، تو اس صورت میں وہ جوہری کو ڈائمنڈ واپس لوٹا سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ صورت مذکورہ میں خریدار کے لئے یہ اختیار ہے کہ چاہے تو اسی ثمن میں اس سامان کو قبول کرلے اور چاہے تو سامان لوٹا دے اور پورا ثمن واپس لے لے، اس صورت میں قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں ہوگا۔

دلائل:

۱۔ ''من اشتری ثوباً علی أنہ عشرة أذرع بعشرة دراہم، أو أرضاً علی أنہا مأة ذراع بمأة درہم فوجدہا أقل، فالمشتری بالخیار إن شاء أخذہا بجملة الثمن، وإن شاء ترکہا، لأن الذراع وصف فی الثوب، ألا تری أنہ عبارة من الطول والعرض والموصف لایقابلہ شئ من الأطراف الحیوان، فلہذا یأخذہ بکل الثمن .... إلا أنہ یتخیر لفوات الوصف المذکور لتغیر المعقود علیہ فیختل الرضا" (ہدایہ ۹۴۲٫۳، ۹۴۳) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۲۔ ''وإذا أخذہ، أخذہ بجمیع الثمن؛ لأن الأوصاف لا یقابلہا شئ من الثمن، لکونہا تابعة فی العقد علی ما عرف" (الہدایہ۹۵۶٫۳) [مفتی اقبال محمد ٹنکاروی]۔

۳۔ ''ویتضح لک مما تقدم أن المشتری إذا وجد عیباً بالمبیع یرد بہ، فلیس لہ أن یمسکہ ویطالب بالعوض عن النقص الحاصل بسبب العیب، وإنما لہ أن یرد کلہ ویأخذ الثمن کاملاً" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ۱۵۳٫۲) [مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی]۔

۴۔ ''.....فمقتضی خیار الرد أن المشتری لہ أن یرد المبیع إلی البائع ویطالبہ برد الثمن'' (فقہ البیوع) [مفتی جنید محمد پالنپوری]۔

۵۔ ''والعیب یسیر أو فاحش فللمشتری الخیار: إن شاء رضی بجمیع الثمن وإن شاء رده، ثم ینظر إن کان الاطلاع علی العیب قبل قبض المشتری فلہ أن یرده علیہ وینفسخ العقد بقولہ

رددت ولایحتاج إلی رضا البائع ولا إلی قضاء القاضی، وإن کان بعد القبض لاینفسخ إلا برضاء أو قضاء'' (ہندیہ) [مفتی عبد القیوم پالنپوری]۔

۶۔ ''قد أفتی المتأخرون من الحنفیۃ بإثبات الخیار لمن غبن فاحش بتغریر البائع، مثل أن یقول المشتری قیمتہ کذا فاشتراہ فظہر أقل فلہ الرد فأما إذا لم یغر البائع فلاخیار لہ وبہ أفتی الصدر الشہید وکذلک یثبت الخیار للبائع المغرورو راجع لہ '' الاشباہ والنظائر (تکملۃ فتح الملہم۱،۳۸۰) [مفتی نثار احمد گجراتی]۔

۷۔ ''للمشتری الخیار بظہور عیب ....کل ما ینقص العین أو القیمۃ نقصاً یفوت بہ غرض صحیح إذا غلب فی جنس المبیع عدمہ'' (منہاج الطالبین ۲،۶۴) [مولانا عمر بن یوسف کوکنی]۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی کی رائے ہے کہ اس صورت میں بھی کمی کرواسکتا ہے اور لوٹا بھی سکتا ہے۔

مفتی محمد عثمان بستوی نے اس مسئلہ پر دو پہلو سے بحث کی ہے: پہلے کے اعتبار سے یہ بیع ہی باطل ہوگئی، اور دوسرے پہلو کے اعتبار سے نقلی زیور کی جو مارکیٹ قیمت بنتی ہے اس کو ثمن سے کم کرکے بقیہ ثمن واپس لیا جائے اور اگر ثمن ادا نہیں کیا ہے تو صرف نقلی سامان کی قیمت ادا کردی جائے۔

* ''التعزیر فی بیان جنس المبیع وذلک مثل أن یقول أبع الحلیۃ إنہا حلیۃ ذہب فیتبین أنہا من فضۃ مطلیۃ بالذہب فالبیع فی مثل ہذا باطل .....'' (فقہ البیوع۱،۲۰۸)۔

* ''ولو قبض زیفاً بدل جید جاہلاً بہ فلو علم وأنفقہ کان قضاء اتفاقاً ونفق أو أنفق فلو قائماً رده اتفاقاً فہو قضاء ..... '' (الدر المختار مع الرد ۷،۴۸۸،۴۸۷) [مفتی محمد عثمان بستوی]۔

سوال نمبر ۵ :میں نے ایک ڈائمنڈ ۲،لاکھ روپئے میں خریدا اور میں نے زید کو وہ ڈائمنڈ بتایا، اس نے اس کی قیمت ڈھائی لاکھ روپئے بتلائی، اب میں نے اس سے کہا کہ کیا تومیرے ساتھ اس ڈائمنڈ میں سوا دو لاکھ روپئے میں شرکت کے لئے تیار ہے کہ اس کی قیمت کا ایک حصہ تم ادا کردو اور یہ چیز ہم دونوں میں مشترک ہوجائے پھر نفع میں بھی دونوں کی شرکت ہو، کیا یہ صورت درست ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں، مثلاً:

* مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب کی رائے ہے کہ یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ سائل نے یہاں ایک عقد بیع میں دوسرے عقد شرکت کو داخل کردیا اور یہ شریعت میں جائز نہیں ہے۔

دلیل:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا یحل بیع وسلف ولا شرطان فی بیع، قال الترمذی: ہذا حدیث صحیح، ولأن النبی ﷺ نہی عن بیعتن فی بیع .....وقال ابن مسعود: صفقتان فی صفقۃ رباً وہذا قول أبی حنیفۃ والشافعی وجمہور العلماء وجوزہ مالک وجعل العوض المذکور

فی شرط فاسداً" (الشرح الکبیر علی المقنع لثمن الدین ابن قدامہ ۵۳٫۴)۔

* مفتی اقبال محمد ٹنکاروی کی رائے ہے کہ مذکورہ صورت بیع مساومہ کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قیمت کو ملحوظ رکھے بغیر خرید وفروخت کا معاملہ کرے، چاہے نفع کے ساتھ ہو یا نقصان کے ساتھ یا برابر معاملہ ہو، اس طرح بیع مساومہ میں پہلی قیمت کا کوئی ذکر ہی نہ ہوگا، اور بقیہ تینوں صورتوں (وضعیہ، تولیہ اور مرابحہ) میں معاملہ کے وقت پہلی قیمت کا حوالہ دیا جائے گا کہ میں پہلی قیمت پر اس قدر نفع یا نقصان کے ساتھ بعینہ اس قیمت پر فروخت کررہا ہوں، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"وإن اعتبر من حیث تعلقہ بالثمن أو بمقدارہ فہو أربعۃ أیضاً، لأنہ إن کان بمثل الثمن الأول مع زیادۃ مرابحۃ أو بدون زیادۃ فتولیۃ أو أنقص من الثمن فوضعیۃ أو بدون زیادۃ ولا نقص فمساومۃ، وزاد فی البحر خامساً، وہو الإشراک أی أن یشرک غیرہ فیما اشتراہ، أی بأن یبیعہ نصفہ مثلاً، وترکہ الشارح لأنہ غیر خارج عن الأربعۃ" (رد المحتار ۹٫۷ زکریا)۔

شیخ عبد القادر رافعی تحریر فرماتے ہیں:

"(أو بدون زیادۃ ولا نقص فمساومۃ) أی بدون نظر لزیادۃ ولا نقص لما یأتی أن المساومۃ ہی البیع بأی ثمن کان من غیر نظر إلی الثمن الأول" (تقریرات الرافعی علی رد المحتار ۵۰۱٫۷)۔

*قاری ظفر الاسلام، مفتی جنید محمد پالنپوری اور مولانا عمر بن یوسف کی رائے ہے کہ شرکت دراصل قوت خرید دولاکھ پر ہونی چاہئے، نہ کہ سوا دولاکھ پر، اسی لئے مذکورہ صورت دھوکہ پر مبنی ہے۔

"التولیۃ بیع یتفق فیہ الطرفان علی أن البائع یبیع المبیع بتکلفۃ بدون أی ربح ومن أقسامہ الإشراک، وہو أن یکون أحد الطرفین اشتری شیئاً لنفسہ، ثم اشترک الآخر فی حصۃ منہ بنسبۃ من الثمن مثل أن یشتری أرضاً بمائۃ ألف، ثم یشترک غیرہ فی نصفہا بخمسین ألفاً وجاء فی المحیط ما لخصہ:

"إذا اشتری الرجل شیئاً وقال لہ الآخر:أشرکنی فیہ، فأشرکہ، فہذا بمنزلۃ البیع فإن لم یعرف الثمن، فقیل: البیع فاسد، وقیل صحیح لأن الثمن معلوم فی نفسہ وإن لم یعرف المشتری فہو کشراء ما لم یرہ" (المحیط البرہانی ۱۴٫۶)۔

"والاشتراک تولیۃ: لکنہ تولیۃ لبعض المبیع ببعض الثمن والعلم بالثمن کم شرط صحۃ البیع" (بدائع الصنائع۴۶۱٫۴، فقہ البیوع ۶۳۳٫۲)۔

البتہ اگر شرکت کے الفاظ استعمال نہ کرے، بلکہ خریدوفروخت یعنی زید سے سیدھے اس ڈائمنڈ کے آدھے حصہ کو بیچنے کی بات کرے تو اس صورت مینبہ طور مرابحہ یا مساومہ منافعہ لینے کا جواز ہوگا اور لفظ شرکت میں بیع تولیہ یعنی نہ نفع نہ خسارہ (No Loss No Profit) کی بنیاد پر شریک کرنا ہوگا، کما مر آنفاً [مفتی جنید پالنپوری]۔

* مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مفتی عثمان بستوی، مولانا عبد المنان اور مفتی نثار احمد گجراتی کی رائے ہے کہ بائع کی تجویز زید قبول کرلے اور اس کو خرید لینے کے بعد یہ صورت جائز ہے اور خریدنے سے پہلے صرف دام معلوم کرکے ایسا کرنا دھوکہ ہے جو جائز نہیں۔

''من اشتری عبداً مثلاً فقال لہ آخر اشرکنی فیہ فقال فعلت إن قبل القبض لم یصح وإن بعدہ صح ولزمہ نصف الثمن بناء علی أن مطلق الشرکۃ یقتضی التسویۃ، قال اللہ تعالی: ''فہم شرکاء فی الثلث'' إلا أن یبین خلافہ'' (رد المحتار ۵۰۷،۶)۔

مولانا صابر حسین ندوی کی رائے ہے کہ بظاہر کوئی مفسدہ نہ ہونے کی بنا پر یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۶ :الف نے ب کو ایک ڈائمنڈ بیچنے کے لئے پیش کیا، ب نے کہا میں اس کی قیمت مارکیٹ میں پوچھ کربتائوں گا، اب ب نے وہ ڈائمنڈ ج کو بتایا، ج نے اس کی قیمت ڈھائی لاکھ روپئے بتائی، تو ب نے ج سے کہا کہ تو میرے ساتھ اس ڈائمنڈ میں سوا دو لاکھ روپئے میں شرکت کرنا چاہتا ہے؟ تو کیایہ شرکت درست ہوگی؟ اور ب نے الف سے سوا دو لاکھ روپئے سے کم مثلاً دو لاکھ روپئے میں وہ ڈائمنڈ خریدا تو ب کی ج کے ساتھ سوا دو لاکھ میں شرکت درست ہوگی؟نیز اس مسئلہ میں ب کی اصل خریداری قیمت ۲،لاکھ روپئے ہے، تو یہ قیمت ج کو بتلانے یا نہ بتلانے سے مسئلہ میں کوئی فرق پڑے گا یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں بھی مقالہ نگار کی آراء مختلف ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

* مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مفتی اقبال ٹنکاروی کی رائے ہے کہ یہ صورت بھی سابقہ (جواب نمبر ۵) صورت کی طرح جائز اور درست نہیں ہے، اس صورت میں صرف تھوڑی سے شکل بدلی ہوئی ہے۔

* مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی عثمان بستوی اور مولانا صابر حسین ندوی کی رائے ہے کہ اگر ''ب '' نے ''الف '' سے ڈائمنڈ کو خرید لیا، خواہ کسی بھی قیمت پر خریدا ہو،اس کے بعد مزید قیمت لگا کر کسی کو شریک کرکے فروخت کرنا چاہتا ہے تو شریک کرسکتا ہے، خریدنے سے پہلے کسی کو شریک کرنا درست نہیں، اس لئے کہ ''ب '' ابھی اس چیز کا مالک ہی نہیں ہوا ہے تو وہ دوسرے کو کیسے شریک کرسکتا ہے۔

''شرط انعقاد البیع أن یکون المبیع مملوکاً للبائع عند البیع، فإن لم یکن لا ینعقد ....وہذا بیع ما لیس عندہ ونہی رسول اللہ ﷺ عن بیع ما لیس عند الإنسان'' (بدائع الصنائع)۔

''والثانی: أن یکون المبیع ملک البائع فیما یبیعہ لنفسہ فلا ینعقد بیع ما لیس مملوکاً '' (الموسوعہ الفقہیہ)۔

*قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی نثار احمد گجراتی اور مولانا عمر بن یوسف

کوکنی کی رائے ہے کہ شرکت اصل قوت خرید دولاکھ پر ہی ہونی چاہئے۔

* جبکہ مفتی عبد القیوم پالنپوری کی رائے ہے کہ:

''ب '' نے '' ج '' سے جو کہا کہ تم شرکت کرنا چاہتے ہو، اس کے جواب میں ''ج '' نے کہا ہاں شرکت کرنا چاہتا ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے لئے اس کا آدھا حصہ ایک لاکھ ساڑھے بارہ ہزار میں خریدو، پس ''ب '' ''ج '' کی طرف سے وکیل بالشراء ہے، پس ''ب '' کو آدھا حصہ ''ج '' کی بتائی ہوئی قیمت میں ملے یا اس سے کم میں موکل کے لئے خریدنا ہوگا، اپنے لئے خریدے گا تو بھی اس کا اپنے لئے نہیں ہوگا، اور اس نے دولاکھ میں خریدا تو آدھا ''ج '' کا حصہ ہے ایک لاکھ کے عوض میں، پس دونوں میں ''ب '' کے خریدنے کے بعد شرکت صحیح ہوگی، ''ج '' سے ایک لاکھ سے زیادہ وصولی نہیں کرسکتا ہے (عربی حوالہ جات اور تفصیل محور اول کے سوال اول دوم کے جواب میں ملاحظہ فرمالیں)۔

[تلخیص مقالات کے اس عمل میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ ہر مقالہ نگار کی وہی رائے لی جائے جو ان کی اصل رائے ہے، تاہم ان کی تحریروں سے رائے اختیار کرنے میں سہو اور غلطی کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے، اس لئے اگر کسی کی طرف رائے کا غلط انتساب ہوجائے تو میں ان سے معذرت خواہ ہونگا]۔

* * *

عرض مسئلہ:

جواہرات کی خریدوفروخت
(محور اول)

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی•

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وإمام المتقین، وعلی آلہ وصحبہ وذریاتہ وأزواجہ، والتابعین لہم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد

محو راول:

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اٹھائیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ''جواہرات کی خرید وفروخت '' ہے، اکیڈمی نے اس موضوع کے محور اول مکمل پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم پر ڈالی ہے،چنانچہ اکیڈمی کے توسط سے اس موضوع پر مجھے کل ۱۵؍مقالات دستیاب ہوئے، مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی طوالت کی وجہ سے ترک کررہا ہوں۔

اس موضوع کے ''محور اول '' کا پہلا سوال یہ ہے کہ ''بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بائع مثلاً سو روپئے میں بیچنا چاہتا ہے، خریدار ۷۵ روپئے میں خریدنا چاہتا ہے اور بروکر کوشش کر کے خریدار کو ۷۵ روپئے ہی میں خریدنے پراور بیچنے والے کو ۶۵ روپئے میں بیچنے پر تیار کرلیتا ہے، دونوں میں جو دس روپئے کا فرق ہوتا ہے ،وہ بروکر بائع اور مشتری کو نہیں بتاتا، خود رکھ لیتا ہے،جبکہ اس کو اپنی دلالی کی فیس ۴؍فیصد الگ سے ملتی ہے، کیا اس کی گنجائش ہے؟''

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ بروکر(Broker)کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی دلالی کی فیس کے علاوہ کوئی رقم لے، لہذا خریدار ۷۵ روپئے میں خریدنے اور فروخت کنندہ ۶۵ روپئے مینبیچنے پر تیار ہوگیا، تو دس روپئے کا یہ نفع دلال کے لئے درست نہیں ہے۔

اس نقطہ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-بروکر جس کے لئے کام کر رہا ہے اس کے حق میں امین ہے، لہذا دوسرے فریق کے ساتھ دام کم یا زیادہ کرنے کا اتفاق کرلینا اس کے لئے درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ فریب اور امانت میں خیانت اور باطل طریقہ سے مال کھانا ہے، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد

• شیخ الحدیث والفقہ، جامعہ سید احمد شہید، کٹولی، ملیح آباد، لکھنؤ۔

ہے:''ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام، لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون''(سورۂ بقرہ: ۱۸۸)(اپنے درمیان باطل طریقہ سے مال نہ کھائو، اور نہ حکام رسی کے لئے مال استعمال کرو کہ لوگوں کے مال وجائداد مینسے کوئی حصہ جانتے بوجھتے ، گناہ کرتے ہوئے تم ہڑپ کرلو) (دیکھئے:مقالہ مفتی جنید پالنپوری، مولانا محمد حسن ندوی اور راقم الحروف محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲-شریعت میں یہ فعل نجش ہے اور دام بڑھا کرمشتری کو اور دام گھٹا کر بائع کو مغالطہ اور فریب میں مبتلا کر کے خرید و فروخت کی قیمت کے درمیانی فرق سے دس روپیہ کی حرام نفع خوری ہے، جو گناہ کبیرہ ہے اور شریعت میں اس کی گنجائش نہیں ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''لاتنا جشوا'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۲۷، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۱۳) (خریدار ی کے ارادہ کے بغیر دام مت بڑھائو)(دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

۳-بروکر بائع اور مشتری کے درمیان صرف واسطہ ہوتاہے، لہذا دونوں کے درمیان جس قیمت میں مبیع کی خرید و فروخت طے ہوئی ہے اسی پر معاملہ کروانا ضروری ہے، دونوں کو دھوکہ میں رکھ کر درمیان میں اپنے لئے رقم نکالنا حرام اور ناجائز ہے(مقالہ: مفتی محمد جنید پالنپوری)۔

۴-اگر بروکر ہی عاقدین میں سے کسی ایک کی طرف سے عقد کو انجام دے رہا ہو، تو وہ اس حالت میں وکیل ہے، اور وکیل امین ہوتا ہے، لہذا اسے جو نفع ہوگا، وہ موکل کا ہوگا، مصطفی رحیبانی حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں:''وہبۃ بائع لوکیل اشتری منہ، کنقص من الثمن، فتلحق بالعقد؛ لأنہا لموکلہ'' (رحیبانی، مطالب أولي النہی ۳؍۱۳۲، دمشق، المکتب الإسلامی ۱۹۶۱)(فروخت کنندہ نے اس وکیل کو ہبہ کیا جس نے اس سے خریدا، تو یہ ثمن کم کرنے کی طرح ہے، لہذایہ اصول عقد سے مل جائے گا، اس لئے کہ یہ اس کے موکل کے لئے ہے)۔

متفرق آراء:

۱-مولانا عمر بن یوسف کوکنی صاحب لکھتے ہیں: عامۃ عاقدین بروکر کی اس چالاکی سے باخبر رہتے ہیں، یاابتداءً واقف نہ ہوں، لیکن اطلاع کے بعد عاقدین کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً رضامندی کا اظہار ہوتا ہے؛ کیونکہ بروکر کے اس تصرف میں بائع کو اپنے منشا کے مطابق ثمن حاصل ہوا ہے، اور مشتری بھی مناسب قیمت میں مبیع پر قادر ہوا ہے، یعنی بہ ظاہر دونوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا جو دونوں کے درمیان باعث نزاع ہو، اسی وجہ سے ایسے موقع پر بعد میں عاقدین عقد کو فسخ نہیں کرتے ،بلکہ اس کو نافذ ہی رکھتے ہیں؛اس لئے دونوں کو ایک مناسب قیمت پر آمادہ کر کے ان کے درمیان مثلاً ۱۰؍روپئے کا جو فرق ہوتا ہے، وہ رقم بروکر کے لئے جائز ہے۔

اس درمیان فرق کی رقم کا جواز اس وقت ہے ،جبکہ بائع نے ۷۵؍روپئے میں بیچنے

کی تعیین نہ کی ہو، اور اس سے کم میں بیچنے سے منع نہ کیا ہو،''وإن قال:بعد ہذا بمائۃ لم یبع بأقل منہا، ولو یسیراً، وإن کان بثمن مثلہ؛لأنہ مخالف للإذن'' (خطیب شربینی، مغنی المحتاج۲؍۲۸۳،بیروت العلمیۃ)۔

۲-مفتی محمد عثمان بستوی صاحب تحریر فرماتے ہیں: اگر دلال بائع کے متعین کردہ ثمن سے زائد میں فروخت کردے، تو وہ زیادتی بائع کا حق ہے...لیکن اگر وکیل متعینہ ثمن سے زائد میں فروخت کرے، اور کوئی شرط نہ لگی ہو، اور موکل وہ زیادتی وکیل کو اپنی رضا اور خوشی سے دے دے تو پھر ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔

ترجیح:

بیشتر مقالہ نویس حضرات کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے؛کیونکہ مسلمانوں کے معاملات میں شفافیت رہنی چاہئے، نیز جھوٹ اور دھوکہ و فریب شرعا ناجائز ہیں، اور دل کے جبر کے ساتھ معاف کردینے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لہذا بروکر پر لازم ہے کہ وہ مالک سامان کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرے، اور پورا دام اسے دے، تاکہ اس کا عمل غرر اور خداع سے خالی رہے۔

سوال نمبر۲-الف: ''اس صورت میں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع جس قیمت پر تیار ہوا، دلال خود اس قیمت پر اس سے مال خرید لیتا ہے، اور خریدار جس قیمت پر تیار ہوا تھا، اس قیمت پر اس کو فروخت کردیتا ہے، گویا اس کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی ہوجاتی ہے، اور یہ بات دلال کے اختیار میں ہوتی ہے کہ وہ چار فیصد اپنی فیس نہ لے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟ ''

اس شق کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نویس حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر دلال اپنی دلالی کی حیثیت بائع کے سامنے ختم کردے اور خریدار کی حیثیت سے اس سے سامان خریدلے اورا س پر شرعی قبضہ کے بعد دوسرے خریدار کو فروخت کردے تو یہ جائز ہے، لیکن اس نئے معاملہ کے بعد دلالی کی فیس لیناناجائز ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ جب دلال اور بائع دلالی کو ختم کرنے کے لئے تیار ہیں، اور بائع اپنی بتائی ہوئی قیمت پر دلال سے بیچنے کے لئے تیار ہے، تو پھر شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

البتہ ایک مقالہ نگار مولانا عمر بن یوسف کوکنی صاحب لکھتے ہیں: دلال کا بائع سے خود ہی مال خریدکر خریدار کے ہاتھ اس مال کو فروخت کرنا درست نہیں ہے، علامہ نووی ؒ تحریر فرماتے ہیں:''وکذا لا یبیع من نفسہ علی الصحیح المعروف...والوکیل بالشراء کالوکیل في البیع في أنہ لا یشتري من نفسہ'' (نووی، روضۃ الطالبین ۳؍۵۳۸، بیروت العلمیہ)(اور ایسے ہی مشہور اور صحیح قول کے مطابق فروختگی کا وکیل خود سے بیچ نہیں سکتا ہے...اور خریداری کا وکیل فروختگی کے وکیل کی طرح ہے، اس سلسلہ میں کہ وہ خود سے خرید نہیں سکتا ہے)۔

لیکن یہ قول کمزور معلوم ہوتا ہے؛کیونکہ بروکر بائع اور مشتری کے درمیان صرف رابطہ کنندہ ہوگا یا وکیل بھی ہوگا، اس کی جو بھی حیثیت ہو، اس نے چونکہ اپنی اس حیثیت کو اس کے سامنے ختم کردیا ہے جس کے لئے کام کر رہا ہے، لہذا خریدار بن کر اس کا خریداری کرنا صحیح ہے۔

سوال نمبر ۲ کی شق(ب)- ''ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلال نے بائع کو ساٹھ روپئے سے بیچنے پر تیار کرلیا اور خریدار تیار کیا جو ستر روپئے میں خریدنے پر آماد ہ تھا؛ لیکن دلال نے بائع سے حقیقی مشتری کو ملانے کے بجائے ایک فرضی خریدار تیار کر کے اس سے بائع کی بات کرادی، اور جب وہ چیز ۶۰؍روپئے میں حاصل ہوگئی تو خریدار سے ۷۰؍روپئے میں فروخت کیا اور دس روپیہ کا فائدہ خود رکھ لیا، نیز ایسے معاملات میں بعض دفعہ بروکر چار فیصد دلالی فیس اس فرضی خریدار کو دے دیتا ہے، کیا یہ صورت درست ہوگی؟''

اس شق کے جواب میں دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں:

پہلا نقطہ نظر:

پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ بروکر کے لئے جائز نہیں ہے کہ فرضی خریدار تیار کر کے بائع سے کم قیمت میں اپنے لئے خرید کرزیادہ قیمت میں اصلی خریدار سے بیچ دے، اس نقطہ نظر کے حاملین کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عبد اللہ خالد لوناواڑۃ، مفتی محمد عثمان حلیمی بستوی، مولانا قاضی محمد حسن ندوی، راقم الحروف محمد شاہجہاں ندوی، اور مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی۔

اور اس نقطہ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-دلال جس کے لئے کام کر رہا ہے اس کے حق میں امین ہے، لہذا فرضی خریدار کھڑے کرنے میں دھوکہ اور امانت میں خیانت ہے، اور ارشاد الہی ہے:''إن اللہ لا یحب الخائنین''(سورۂ انفال:۵۸)(یقینا اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)(مقالہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور راقم الحروف محمد شاہ جہاں ندوی)۔

۲-اس میں ''نجش '' کی علت پائی جاتی ہے، یعنی ارادہ خریداری کے بغیر دوسرے گاہک کو دھوکہ دینے کا عمل جو شرعا ممنوع ہے(مقالہ: قاضی محمد حسن ندوی،مفتی محمد عثمان بستوی)، چنانچہ فرضی خریدار کھڑاکرنا بھی اسی کے حکم میں ہے۔

۳-اس میں مال مسلم کو طیب خاطر کے بغیر حاصل کرنا پایاجاتا ہے، جو شرعا ممنوع ہے(مقالہ مفتی محمدعثمان بستوی)۔

اس نقطہ نظر کے حاملین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ چونکہ فرضی خریدار دلال

نہیں ہے ،بلکہ دھوکہ باز ہے ،اس نے بائع کو دھوکہ دیا ہے، اس لئے ۴ فیصدی بہ طور اجرت لینا بھی اس کے لئے ناجائز ہے۔

اسی طرح اس نقطہ نظر کے حاملین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس خریداری کے ذریعہ جو نفع کمایا ہے وہ خبیث ہے، لہذا اس کا تصدق یا رد علی المالک واجب ہے،یا بیع کو فسخ کر کے از سر نو بغیر خداع اور دھوکہ کے بیع کرنا لازم ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:ایک شخص کوئی سامان لینا نہیں چاہتا، لیکن قیمت بڑھ کربولتا ہے، تاکہ دوسرا گاہک اس کو زیادہ قیمت میں خرید لے اور دھوکہ کھاجائے،اس صورت میں اس کے حرام اور گناہ ہونے پر اتفاق ہے، لیکن یہ امام مالک کے یہاں بیع باطل ہوگی، لیکن ائمہ ثلاثہ کے یہاں درست ہے، البتہ دھوکہ دہی کی وجہ سے گنہگار ہوگا (رحمانی، قاموس الفقہ ۳۶۲،۲، مقالہ:قاضی محمد حسن ندوی)۔

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ فرضی ،یعنی ڈمی شخص کو کھڑا کر کے مبیع خریدنا اور بیچنا جائز ہے، اس نقطہ نظر کے حاملین ہیں؛ مفتی جنید محمدپالنپوری، مولانا ابراہیم بن سلیمان فلاحی اور مفتی عبد المنان آسام، البتہ ان کے نزدیک ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، لہذا اس کے لئے یہ کراہت سے خالی نہیں ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ فرضی بائع اور مشتری اس دلال کا وکیل بالبیع والشراء ہے، چنانچہ اس خرید وفروخت میں ہونے والے منافع دلال جو دراصل مؤکل ہے لیتا ہے۔

ترجیح:

بیشتر مقالہ نویس حضرات کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے؛کیونکہ فرضی گاہک کو لا کر تاجر کو دھوکہ دیاجارہا ہے، نیز موکل کی اجازت کے بغیر وکیل کسی دوسرے کووکیل نہیں بنا سکتا ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:''الوکیل لا یوکل إلا بإذن آمرہ لوجود الرضا''(حصکفی، الدرالمختار ۵۲۷،۵)(وکیل کسی دوسرے کو وکیل نہیں بنا سکتا ہے، مگر اپنے حکم دینے والے موکل کی اجازت ہے، اس لئے کہ اس صورت میں رضامندی موجود ہے)،اور علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں:''المراد أنہ لا یؤکل فیما وکل فیہ''(ابن عابدین، ردالمحتار ۵۲۷،۵)(مراد یہ ہے کہ اس کام میں وکیل نہیں بنائے گا جس میں اسے وکیل بنایاگیا ہے)۔

سوال نمبر۳-''ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاریگر حضرات قیمتی جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مالک کے علم و اطلاع کے بغیربچالیتے ہیں اور اس طرح کا مال ایک خاص مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں، جس میں چوری کا مال بھی ملتا ہے، اور درست مال بھی، تو کیا اس مارکیٹ سے مال خریدا جاسکتا ہے، جبکہ متعین طور پریہ بات معلوم نہ ہو کہ یہی مال چوری کا ہے، اور اگر ہے تو کس شخص کا مال چوری کیا گیا ہے، یعنی اس

کا اصل مالک کون ہے؟''

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اس کا دارومدار غلبہ ظن پر ہے، لہذا اگر خریدار کو گمان غالب ہو کہ وہ صحیح مال خرید رہا ہے تو اس کے لئے خریدنا جائز ہے، اور اگر اس کو گمان غالب ہو کہ وہ چوری کا مال خریدرہاہے، خواہ مالک معلوم نہ ہو، تو اس کے لئے اس مارکیٹ سے خریدنا جائز نہیں ہے، اس رائے کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها وإثمها''(حاكم، المستدرک على الصحيحين حديث نمبر:۲۲۵۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)(جو چوری کا مال خریدے حالانکہ اسے معلوم ہو کہ یہ چوری کردہ مال ہے، تو وہ اس کے ننگ وعیب اور گناہ میں شریک ہے)۔

اس حدیث میں حکم کا دارومدار علم و یقین پر رکھاگیا ہے، اور غلبہ ظن کا بھی یہی حکم ہے، چنانچہ فقہاء نے عام طور سے صراحت کی ہے کہ ''وغالب الظن عندهم ملحق باليقين، وهو الذي يبتنى عليه الأحكام، يعرف ذلک من تصفح كلامهم في الأبواب'' (ابن نجيم، الأشباه والنظائر،ص۷۳، بيروت، العلميه، ۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء، عدد الأجزاء: ۱)(فقہاء کے نزدیک گمان غالب یقین کے ساتھ لاحق ہے، اور اسی پر احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے، چنانچہ مختلف فقہی ابواب میں فقہاء کے کلام کی چھان بین سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے)۔

۲-علامہ ابو الحسین علی مرغینانی(و:۵۹۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:''الغلبة تنزل منزلة الضرورة في إفادة الإباحة، ألاترى أن أسواق المسلمين لا تخلوعن المحرم المسروق والمغصوب، ومع ذلک يباح التناول اعتمادا على الغالب''(مرغینانی، الہدایہ ۴،۲۷۰،بیروت، المکتبۃ الاسلامیہ)(غلبہ اباحت کا فائدہ دینے میں ضرورت کا قائم مقام ہوجاتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ مسلمانوں کے بازار چوری کردہ اور غصب کردہ حرام سے خالی نہیں، اس کے باوجود غالب کا اعتماد کرتے ہوئے وہاں سے سامان لینا مباح ہے)۔

۳-علامہ ابن عابدین شامیؒ رقم طراز ہیں:''وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام، ولا يعلم أربابه، ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه''(ابن عابدین، ردالمحتار۵،۹۹)(اور اگر حرام کے ساتھ جمع شدہ اور مخلوط مال ہو، اور وارث اس کے مالک کو نہ جانتا ہو، اور نہ ہی اس میں سے کسی متعین چیز کا حرام ہونا معلوم ہو، تو اس کے لئے قضاءاً حلال ہے، اور دیانتاً بہتر یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرے)۔

ان حضرات کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ ایسی مارکیٹ سے نہ خریدے جہاں چوری اور غیرچوری دونوں طرح کا مال ملتا ہو۔

دوسری رائے:

دوسری رائے مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب کی ہے کہ اصولی طور پر جس مال کے مخلوط ہونے کا یقین ہو، جیسا کہ ان مارکٹوں کا حال ہے وہاں سے مال

خریدنا اور نفع حاصل کرنا دونوں حرام ہے؛کیونکہ حلال و حرام کی دونوں جہتیں مشتبہ ہیں، جس چیز کو بھی خریدار حلال سمجھ کر خریدے گا جب اس میں حرام کا احتمال موجود ہوگا تو حلت کا یقین پیدا ہو ہی نہیں سکتا جو جواز کی اصل بنیاد ہے، لہذا خریدار کم از کم چوری کے علم احتمالی سے بری نہیں ہوسکتا ہے۔

لیکن مولانا کی رائے کا اگر تجزیہ کیاجائے تو یہ فتوی سے زیادہ تقوی سے تعلق رکھتا ہے، نیز انہوں نے جو دلائل دیئے ہیں ان کا بھی تعلق تقوی اور دین میں احتیاط اختیار کرنے سے ہے، مثلا:''دع ما یریبک إلی مالا یریبک''(سنن نسائی حدیث نمبر:۵۷۱۱، سنن ترمذی حدیث نمبر:۲۵۱۸، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)(جو چیز تمہیں شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کرو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے)۔

ساتھ ہی ان کا یہ کہنا کہ جب اس میں حرام کا احتمال موجود ہوگا تو حلت کا یقین پیدا ہو ہی نہیں سکتا، محل نظر ہے ؛کیونکہ ایسی صورت میں غلبہ ظن پیدا ہوسکتا ہے، اور حکم کا مدار بنانے کے لئے یہ کافی ہے؛ اس لئے کہ غلبہ ظن یقین کے درجہ میں ہے، خود فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے:''وأما مسألۃ ما إذا اختلط الحلال بالحرام في البلد؛ فإنہ یجوز الشراء، والأخذ، إلا أن تقوم دلالۃ علی أنہ من الحرام''(ابن نجیم، الأشباہ والنظائر،ص۱۱۳)(بہرحال شہر میں حلال چیز کے حرام کے ساتھ گڈ مڈ ہوجانے کا مسئلہ ہے، تو اس کو خریدنا اور لینا جائز ہے، مگر یہ کہ اس مال کے حرام میں سے ہونے پر دلیل قائم ہوجائے)۔

سوال نمبر:۴-''زیدنے ایک شخص سے اس کا لایا ہوا مال خریدا، کسی وجہ سے اس کو شبہ پیدا ہوا کہ یہ مال چوری کا ہے، اس نے بیچنے والے سے دریافت کرلیا کہ کہیں یہ مال چوری کا تو نہیںہے، اس نے کہا : درست مال ہے، چوری کا نہیں ہے، تو کیا ایسا مال لیاجاسکتا ہے؟''

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگار حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فروخت کنندہ کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے اس طرح کا مال خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس کی خبر پر اطمینان ہو، اور اگر اطمینان نہ ہو تو خبر کے مقبول اور معتبر ہونے کے لئے عدد یا عدالت شرط ہوگی، نیز غیر مسلم کی طرف سے مستقلا حلت و حرمت کی خبر تو معتبر نہیں، لیکن اگر حلت و حرمت کی خبر ضمنی طور پر ہوتوغیر مسلم کی طرف سے بھی مقبول ہے، لہذا بازار میں فروخت ہونے والے مال سے متعلق مسلم وغیر مسلم دونوں کی خبر اطمینان قلب کی شرط کے ساتھ معتبر ہوگی، جیسا کہ فقہاء نے عام طور سے اس کی صراحت کی ہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:''ویقبل قول کافر، ولو مجوسیا، قال: اشتریت اللحم من کتابي فیحل، أو قال:اشتریتہ من مجوسي فیحرم، ولا یرد بقول الواحد، وأصلہ أن خبر الکافر مقبول بالإجماع في المعاملات لا في الدیانات، وعلیہ یحمل قول الکنز:''ویقبل قول الکافر في الحل والحرمۃ یعني الحاصلین في ضمن

المعاملات لا مطلق الحل والحرمۃ''(حصکفی، الدرالمختار۶؍۳۴۴)(کافر کا قول، خواہ مجوسی ہوقبول کیاجائے گا، جو یہ کہے کہ میں نے کتابی سے گوشت خریدا ہے تو حلال ہوگا،یا یہ کہے کہ میں نے مجوسی سے خریدا ہے تو حرام ہوگا، اور فرد واحد کے قول ہونے کی وجہ سے اسے مسترد نہیں کرے گا، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کافر کی خبر بہ اتفاق معاملات میں مقبول ہے ،نہ کہ دینی امور میں، اور ''الکنز ''کے قول کو اسی پر محمول کیاجائے گاکہ:حلت و حرمت میں کافر کا قول مقبول ہے، یعنی جو معاملات کے ضمن میں حاصل ہو، نہ کہ مطلق حلت و حرمت میں)۔

اور علامہ ابن عابدین شامی ''فتاوی قاعدیہ '' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:''ہذا إذا غلب علی ظنہ صدقہ، وہو مما یحفظ''(ابن عابدین، ردالمحتار۵؍۴۶۶)(قاضی کے خیال میں فاسق کی شہادت کی سچائی ظاہر ہو تو قبول کی جائے گی، یہ بات اس وقت ہے، جبکہ اس کی سچائی کا غالب گمان ہو، اور ظن غالب کی قید کے ساتھ اس قول کے معتبر ہونے کو یاد رکھنا چاہئے)۔

خیال رہے کہ جب کسی مال کے بارے میں شبہ پیدا ہونے لگے تو ایسی صورت میں قرائن پر عمل کرنے کا حکم ہے، اور فروخت کنندہ کی خبر کسی قرینہ سے کم نہیں، لہذا اگر اطمینان ہو تو اس پر اعتبار کرنا جائز ہے،''المدار علی غلبۃ الظن، فلینظر المبتلی في القرائن''(ابن عابدین، ردالمحتار۶؍۳۴۵)(ظن غالب پر دارومدار ہے، لہذا مبتلی شخص کو قرائن میں غور و فکر کرنا چاہئے)۔

البتہ مفتی جنید بن محمد پالنپوری صاحب لکھتے ہیں:جس مارکیٹ مینیادوکان میں چوری کا مال بیچے جانے کا اندیشہ ہو، تو تمام تاجروں کو چاہئے کہ اس مارکیٹ یا دوکان سے مال خریدنا ہی چھوڑ دیں، وہ مارکیٹ والے یا دوکان دار وضاحت بھی کریں کہ آپ کو جو مال دے رہا ہوں چوری کا نہیں ہے، تب بھی تنبیہا اس سے مال نہ خریداجائے ،تاکہ درست کاروبار کرنے والوں کو حوصلہ ملے۔

سوال نمبر: ۵-''ایسا بھی ہوتا ہے کہ زید نے ایک شخص سے خرید کیا ہوا سامان اپنے قبضہ میں لے لیا، ابھی قیمت ادا نہیں کی اور اگلے شخص سے زیادہ قیمت میں اسے فروخت کردیا، اور جو پیسے آئے ،اس میں سے جس شخص سے ادھار خریدا تھا، اس کو پیسہ ادا کردیا اور جو پیسے بچ گئے ،اس کو اپنے نفع کے طور پر رکھ لیا، کیا یہ صورت جائز ہے؟''

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نویس حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صورت جائز ہے کہ ادھار خرید کر سامان کو قبضہ میں لے کر دوسرے سے نقد بیچ دے، اور پھر حاصل شدہ رقم سے ادھار ثمن ادا کرکے باقی پیسے اپنے نفع کے طور پر رکھ لے؛کیونکہ خریدنے اور قبضہ کرلینے کے بعد مبیع پر مشتری کی کامل ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور اسے ہر طرح تصرف کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔

اور بیع میں ثمن ادھار رکھا جاسکتا ہے، جیسا کہ تمام فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ''وصح بثمن حال، وہو الأصل، ومؤجل إلی معلوم، لئلا یفضي إلی النزاع''(حصکفی،

الدر المغار مع تنویر الأبصار ۵۳۱٫۴)(نقد قیمت پر خرید و فروخت جائز ہے، اور اصل نقد قیمت ہی ہے، اور مدت متعینہ پر قیمت کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ ادھار عقد بھی درست ہے، تاکہ بلا تحدید مدت عقد کی صورت میں معاملہ باہمی نزاع کا سبب نہ بنے)۔

سوال نمبر۶-''ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک بائع سے کسی متعینہ سامان کی قیمت دریافت کی، ابھی خرید وفروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا اور نہ اس شئ پر قبضہ حاصل ہوا، البتہ وہ دوسرے شخص سے جو اس طرح کا سامان خریدنا چاہتا ہے، معاملہ طے کرلیتا ہے، اور اس سے زیادہ قیمت طے ہوتی ہے، اب وہ سابق شخص سے سامان حاصل کر کے اپنے خریدار کو فروخت کردیتا ہے اور دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کو اپنا نفع تصور کرتا ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟''

اس سوال کے جواب میں بھی تمام مقالہ نگار حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خرید و فروخت کے معاملہ سے پہلے ہی متعینہ سامان کو بیچ دینا شرعاجائز نہیں ہے کہ یہ اپنے لئے غیر مملوک اور غیر موجود کی بیع ہے جو صحیح نہیں ہے، اور اس طرح نفع کمانا بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول!ایک آدمی میرے پاس آتا ہے جو مجھ سے بیع کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور میرے پاس وہ چیز نہیں ہوتی جو وہ طلب کر رہا ہوتا ہے، کیا میں اس سے بیچ دوں، پھر اسے بازار سے خرید کر حوالہ کردوں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''لا تبع ما لیس عندک''(سنن نسائی حدیث نمبر:۴۶۱۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)(جو چیز تیرے پاس نہ ہو اسے فروخت نہ کرو)۔

اور اس طرح بیچنے میں عقلی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ جو چیز رسک میں نہ آئی ہو، اس سے نفع حاصل کرنا لازم آرہا ہے جو درست نہیںہے۔

البتہ ایسی صورت میں مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مفتی جنید بن محمد پالنپوری صاحبان کے نزدیک سلم کا طریقہ اس کی شرائط کے ساتھ اختیار کیاجاسکتا ہے، لیکن کم از کم ایک ماہ کی مدت کی لازمی شرط کو امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے کالعدم کیاجاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے ابتلاء عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے قول پر عمل کی گنجائش پیدا کی ہے۔

اور مفتی عبدا للہ خالد لوناواڑہ اور مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کے نزدیک دوسرے شخص سے صرف آرڈر لیا ہو اور باقاعدہ خرید وفروخت کا معاملہ نہ کیا ہو، تو اس کی گنجائش ہے؛کیونکہ آرڈر ایک وعدہ ہوتا ہے، لہذا وعدہ بیع کا وہ حکم نہ ہوگا جو بیع کا ہوتا ہے، اور یہی رائے مفتی محمد عثمان بستوی صاحب کی بھی ہے۔

* * *

عرض مسئلہ:

جواہرات کی خرید و فروخت
(محور دوم)

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی•

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وبعد

اس عاجز کو ‘‘جواہرات کی خرید و فروخت ’’ کے محور دوم پر عرض کا حکم دیا گیا تھا، چنانچہ اس موضوع سے متعلق کل ۱۵ مقالات موصول ہوئے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی عبد اللہ خالد لوناواڑۃ، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا ابراہیم بن سلیمان فلاحی، مولانا قاضی محمد حسن ندوی، مفتی عبد المنان پرمائی ، راقم الحروف ظفر الاسلام صدیقی۔

سوال نمبر ۱-‘‘ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار نے اپنے ذمہ واجب الادا رقم کی جو پرچی بائع کو دی ،دلال بائع سے اس پرچی کو نقد پیسہ دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلیتا ہے، اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے حاصل کرتا ہے ،کیا یہ صورت جائز ہوگی؟’’

پندرہ مقالہ نگاروں میں سے ۱۴ حضرات عدم جواز کے قائل ہیں، مگر مولانا محمد صابر حسین ندوی کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:‘‘پرچی کا حامل گویا ایک خاص ملکیت کا مالک ہے، وہ پرچی ہی اس کی ملکیت پر قبضہ کی دلیل ہے، یہ عرفا قبضہ تصور کیاجائے گا، مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا حق ہوتا ہے ،کوئی اس سے باز پرس نہیں کرسکتا، چاہے وہ کم قیمت پر فروخت کرے یا زیادہ، رہی یہ بات کہ پرچی بیچنے والا متعینہ رقم لیتا ہے تو یہ بھی گویا اس کے بیع و شراء کا ایک حصہ ہے جسے دونوں فریق نے بہ رضا تسلیم کیا ہے۔

بعدہ۱۴حضرات میں سے پانچ مقالہ نگاروں نے اس کا متبادل بھی پیش کیا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا ابراہیم بن سلیمان فلاحی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی محمد عثمان بستوی۔

• سابق شیخ الحدیث وپرنسپل دار العلوم مئو۔

اول الذکر لکھتے ہیں :''اگر دلال کی طرف سے زیادتی کے ساتھ قرض لوٹانے کی شرط نہ ہو اور ایسے معاملات میں اس قسم کا عرف رائج ہو تو درست ہوگا ،لیکن پھر بھی کراہت ہے،''فإذا جری العرف بردالزیادة أو تقدیم المنفعة، فیکرہ تقدیم الزیادة، و یکرہ قبولہا''(المعتمد۳،۱۷۲)،بعدہ لکھتے ہیں:''چونکہ زائد رقم وصول کرنے میں سود ہونے کا احتمال ہے ،اس لئے عدم جواز ہی احوط ہے، موصوف نے استدلال میں علامہ ماوردی کی تحریر:''والتنزہ عن قبول الہدیۃ من المقترض أولی فی جمیع الخدمات''(بحوالہ الحاوی الکبیر۵،۳۸۵)اور خطیب شربینی کی تحریر''إذا کان شخص لغیرہ اقترض فی مأة، ولکن علی عشرة فہوقرض و جعالة صحیحان فلواقترضہ من مالہ لم یستحق العشرة'' (مغنی المحتاج۲،۱۵۱)وغیرہ پیش فرمائی ہے۔

مولانا ابراہیم و مفتی جنید محمد پالنپوری ومولانا نثار احمد راقم ہیں:''ہاں البتہ گناہ سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جاسکتا ہے کہ بائع دلال سے واجب الادا رقم سے کم مقدار بنام قرض لے لے اور دلال سے کہے کہ فلاں تاریخ کو اس پرچی کے ذریعہ خریدار سے مقررہ قیمت وصول کر کے لانا تو اس میں سے بائع کو قرض میں سے جو رقم دی ہے وہ وصول ہوجائے گی اور زائد رقم دلال کی اجرت ہوجائے گی ''؛ مگر آخرالذکر لکھتے ہیں:''یہ خیال ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط ومربوط نہ ہو ،ورنہ ایک عقد میں دو معاملہ کرنے کی خرابی لازم آئے گی، جو شرعا ناجائز ہے، ان حضرات کے دلائل (امداد الفتاوی۳،۱۶۹ اور فتاوی قاسمیہ) میں ہیں۔

مفتی محمدعثمان بستوی صاحب کی بھی رائے اسی سے ملتی جلتی ہے، استدلال میں (ردالمحتار۷،۳۷۶) کی عبارت:''لا یجوز تملیک الدین من غیر من علیہ الدین إلا إذا سلطہ علیہ واستثنی من الأشباہ من ذلک ثلاث صور، الأولی إذا سقطہ علی قبضہ، فیکون وکیلا قابضا للمؤکل ثم لنفسہ''نقل کی ہے۔

سوال نمبر۲-''ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع سے ایک سامان خریدا، قیمت کی ادائیگی کا مقررہ وقت پورا ہوگیا، خریدار سامان فروخت نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے قیمت ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہے، اب یا تو بائع کے اصرار کی وجہ سے وہ خود سودی قرض لے کر اپنی عزت بچانے کے لئے پیسہ حاصل کرتا ہے، یا اپنے کسی دوسرے ساتھی سے کہتا ہے کہ تم سودی قرض لے کربائع کا پیسہ ادا کردو، تم کو جو سود دینا پڑے گا ،وہ میں ادا کردوں گا، تو اس مقصد کے لئے سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز ہوگا؟''

۱۵حضرات بشمول قاضی محمد حسن ،مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا ابراہیم ، مفتی نثا ر احمد گودھروی کے یہاں دونوں صورتیں جائز ہیں، مگر مولانا عمر بن یوسف کوکنی اور راقم سطور ظفر الاسلام صدیقی نے صورت اول کے تعلق سے جواز کا قول تو نقل کیا ہے، لیکن دوسری صورت سے تعرض نہیں کیا، ہاں ان

دونوں حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ جلد از جلد سود ادا کرنے کی کوشش کرے اور جب تک ادا نہ کرسکے تو بہ اور استغفار بھی کرتا رہے، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی کے خیال میں خود تو سود اضطراراً جائز ہے ،لیکن دوسرے شخص کو سودی قرض میں مبتلا کرکے خود سودی قرض ادا کرنا دو طرفہ گناہ ہے، اس لئے جائز نہیں، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد ظفر عالم ندوی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عبد اللہ خالد ، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری صاحبان کے یہاں دونوں صورتیں درست نہیں،مولانا عبد اللہ خالد لکھتے ہیں: شریعت میں ضرورت کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن ہر ضرورت معتبر نہیں ، بلکہ اس کے کچھ شرائط و ضوابط ہیں،مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب (المصباح،ص۵۵۸) سے دو شرطیں ''إن الضرورة قائمة لا منتظرة الخ''اور:''أن لا يكون لدفع الضرر وسيلة أخرى فى المباحات الخ''پیش فرمائی ہے، مفتی محمد ظفر عالم ندوی نے سود کی حرمت سے متعلق مختلف آیات و روایات پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ربا کی تمام صورتوں سے بچاجائے ''، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا خیال ہے کہ ''مقروض کی اگر اس سے بے عزتی ہورہی ہے تو وہ اس درجہ کی نہیں ہے کہ سود جیسی لعنتی شئ کا ارتکاب کیاجائے اور اس کو شرعی ضرورت و حاجت قرار دے کر جائز کردیاجائے ''،مفتی جنید و مولانا عبد المنان کے چند اقوال ہیں:۱-معاملہ کو فسخ کردیاجائے اگرفسخ نہ کرسکے تو استیفاء ثمن کے تعذر کی صورت میں خود ہی معاملہ فسخ ہوجاتا ہے،''لأنه مما تعذر استيفاء الثمن من المشترى فات رضى البائع فيشبه بفسخه''(ہدایہ۳،۱۴۷)،۲-یا مہلت لے لے، ان دونوں میں سے کوئی ممکن نہ ہو تو اجبار کی حالت کی تحقیق کر کے مقامی مفتی کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں،۳-کبھی سود لینے دینے کی مجبوری ہو تو خفیۃً سود لینے کا حکم ہوسکتا ہے، راقم سطور کا رجحان قائلین اول کی جانب ہے، دونوں صورتوں کے جواز کے نہیں۔

سوال نمبر۳-''ایک صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ پانچ سو روپئے کیرٹ کے حساب سے مال خریدنے کی بات طے کرتا ہے، اور اگلے شخص کو سات سو روپئے کے حساب سے فروخت کرنے کی بات طے کرتا ہے، نیز پہلے شخص سے مال لے کر دوسرے شخص کو فروخت کر کے اس سے قیمت وصول کرتا ہے، اب وہ بیچنے والے کوپوری قیمت ادا کرنے کے بجائے اس سے کہتا ہے کہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں تھا؛ اس لئے اس کی قیمت کم کرو، مثلاً اسے چار سو روپئے فی کیرٹ پر آمادہ کرلیتا ہے تو کیا شرعا یہ صورت جائز ہوگی؟''

۸حضرات بشمول مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محمدصابر حسین، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی محمد جنید پالنپوری، مولانا ابراہیم و راقم سطور ظفر الاسلام صدیقی کے نزدیک یہ جائز اور درست ہے، لیکن ثانی الذکر احادیث و فقہاء کے نصوص پیش فرمانے کے بعد جائز مع الکراہت

کے قائل ہیں، مولانا فلاحی کی پیش کردہ عبارت: ''إذا کان الإیجاب من المشتری...جازت، کما فی التاتارخانیہ''صورت مسئولہ سے متعلق نہیں، بلکہ معاملہ کرتے وقت عاقدین کے کمی وبیشی کرنے سے متعلق ہے، جیسا کہ اس میں ذکر کردہ لفظ(المجلس) دلالت کرتا ہے،مفتی عبد اللہ خالد نے اس کا جواب نہیں دیا، مولانا عبد المنان لکھتے ہیں:یا تو وہ سامان واپس کردے یا طے شدہ قیمت ادا کردے، مفتی نثار احمد گودھروی لکھتے ہیں:اگر مبنی بہ حقیقت ہو اور اس پر کوئی قرینہ ہوتو کم کرواسکتا ہے،مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ''بطیب خاطر آمادہ کرلے تو درست ہے'' بقیہ حضرات عدم جواز کے قائل ہیں۔

سوال نمبر۴-''ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سامان کو خرید کرتے ہوئے اس مال کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے؛ تاکہ بیچنے والا کم سے کم قیمت پر راضی ہوجائے؛ لیکن جب اسی مال کو فروخت کرتا ہے تو ڈھیر ساری تعریفیں کرتا ہے، کیا اس عمل کی گنجائش ہے؟''

اس سوال کے جواب میں سبھی مقالہ نگار متفق ہیں کہ یہ عمل شرعا درست نہیں، کسی نے دھوکہ دہی، کسی نے خیانت اور کسی نے تطفیف ونجش وغیرہ کے مشابہ قرار دیا ہے، مفتی جنید محمد پالنپوری کی تحریر سے ایسا لگتا ہے کہ وہ غیر ضروری باتیں ہیں اور ''ما نحن فیہ'' سے خارج ہیں۔

سوال نمبر۵-''اِس مال کی تیاری میں ملاوٹ کی بھی کافی گنجائش ہوتی ہے، مال تیار کرانے والا کہتا ہے کہ مجھے سستا مال چاہئے؛ لہذا مال تیار کرنے والا شیشے کو شامل کرتے ہوئے مال بناتا ہے ،یا رنگ ڈالتے ہوئے مال تیار کرتا ہے، پھر مال بنوانے والا، اس مال کو تاجر کے ہاتھ بیچتا ہے -اب ایک شکل تو یہ ہے کہ تاجر کو بتا دیاجائے کہ اس مال میں ملاوٹ ہے؛ لیکن اس نے کہا کہ مجھے سستامال چاہئے، ملاوٹ رہنے نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں۔دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو عیب سے مطلع ہی نہیں کیا گیا، ان صورتوں کا کیا حکم ہوگا؟''

قاضی محمد حسن ندوی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی صاحبان کے یہاں اگر اطلاع دیئے بغیر فروخت کردیا تو نقص کی صورت میں اسے اختیار ہوگا وہ سامان پوری قیمت میں لے گایا اس کو واپس کردے گا ''، قاضی محمد حسن اپنے مدعا پر پیش کرتے ہیں:''وإذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فہو بالخیار إن شاء أخذہ لجمیع الثمن وإن شاء ردہ'' (ہدایہ۳،۲۳)،مولانا محمد صابر حسین ندوی لکھتے ہیں:''اگر بتلائے بغیر فروخت کردیا تو نقص معلوم ہونے پر پیمنٹ بل کے ذریعہ کاروائی کی جاسکتی ہے ''،مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کے نزدیک ''عیب بتلائے بغیر فروخت کرنا اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں...اگر دونوں قسم کے زیورات ہوں تو دونوں قیمتونکا فرق واضح کردیاجائے تو عیب کا بیان ہوسکتا ہے ''، مفتی محمد عثمان بستوی فرماتے ہیں کہ اگر ملاوٹ کا دستور نہ ہو یا عرف سے زیادہ ملاوٹ کی جائے تو بتلانا واجب ہے، البتہ اگر ملاوٹ ظاہر ہو تو ایسی

ملاوٹ کا بیان کرنا لازم و ضروری نہیں...حاصل یہ کہ مذکورہ شکل میں ملاوٹ سے باخبر کرنا ضروری نہیں۔

مولانا عبداللہ خالد کی رائے ہے کہ اگر مارکیٹ میں سستا مال سے مراد ملاوٹ والا مال ہی ہے تو بتلانے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس طرح مراد نہ ہو تو ملاوٹ کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

مولانا محمد ظفر عالم ندوی ،مولانا ابراہیم فلاحی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی کے نزدیک عیب چھپا کر بیچنا جائز نہیں ہے، مفتی نثار احمد گودھروی کی بھی یہی رائے ہے، بشرطیکہ یہ بات معروف نہ ہو، مولانا عبد المنان کے نزدیک اگر سستا مال رواج و عرف کے مطابق تیار کیا گیا ہے تو اسے عیب بتلائے بغیر صرف سستا مال کہہ کر فروخت کرناجائز ہوگا۔

راقم سطور ظفر الاسلام صدیقی کی رائے ہے کہ اگر عرف کے مطابق ملاوٹ ہے تو بتلانے کی ضرورت نہیں، نیز بغیر بتلائے ملاوٹ والا مال اصل مال کی قیمت میں اگر فروخت کردیا تو رجوع یا نقصان بھی کرسکتا ہے، اور معاملہ رد بھی کرسکتا ہے۔

سوال نمبر۶-''قیمتی پتھروں کی تجارت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز ایک روپیہ میں بھی فروخت کی جاسکتی ہے، اورایک ہزار روپئے میں بھی، تو کیا شرعا اس کی کوئی تحدید ہے کہ مخصوص تناسب تک نفع لینا درست ہو، اس سے زیادہ نفع لینا درست نہیں ہو؟''

اکثر مقالہ نگاروں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ روایات وآثار میں کوئی تحدید نہینہے ،لیکن مصلحت عامہ و دفع ضرر وغیرہ کی خاطر ناجائز و مکروہ وغیرہ قرار دیاجاسکتا ہے، مگر حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی صاحبان کے نزدیک نفع لینے کی سرے سے کوئی تحدید نہیں ہے،واضح رہے کہ تحدید کے قائلین کا مقصد ایک ہی ہے، مگر تعبیرات جداگانہ ہیں، مثلاً مفتی محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: کسی چیز کی قیمت بہت زیادہ لگا دینا ،جبکہ دھوکہ دہی نہ ہو جائز خلاف اولی ہے، (قضایا فقہیہ معاصرہ،۸، فتاوی عثمانی ۱۶۰،۳)،مفتی محمد ظفر عالم ندوی صاحب رقم طراز ہیں:''مناسب ہے کہ مفاد عامہ کا خیال رکھا جائے... اورگراں قدر قیمت سے احتراز کیاجائے ''، مولانا محمد صابر حسین ندوی اسی کو استحصال اور تعدی فاحش سے تعبیر کرتے ہیں، جبکہ مولانا عمر بن یوسف کوکنی کے الفاظ یہ ہیں:''ماہرین اقتصادیات کی طرف سے اور مصلحت عامہ کی غرض سے تحدید ہونی چاہئے، ایسی تحدید حدیث میں وارد ممنوعہ تسعیر میں داخل نہ ہوگی ''، مفتی نثار احمد، مولانا ابراہیم ،مفتی جنید محمد کی رائے ہے ''غبن فاحش کے ساتھ معاملہ کرنا مکروہ ہے ''،مولانا عبد المنان کی بھی قریب قریب یہی رائے ہے، بر خلاف اس کے مولانا عبد اللہ خالد رقم طراز ہیں:''ایسی زیادتی جو تجار کے یہاں رائج نہ ہو وہ خداع تک پہنچ کر ناجائز اور ممنوع ہوتی ہے ''، مولانامحفوظ

الرحمن شاہین جمالی نے بھی بنیادی ضرورت کے سامان غلہ، نمک ، تیل وغیرہ میں عوام کی قوت خرید سے زیادہ نفع لینے کو جس سے انہیں ضرر لاحق ہو ممنوع قرار دیا ہے ، لیکن موصوف کے یہاں زینت کے سامان میں نفع لینے کی کوئی تحدید نہیں۔

ناچیز کی یہ رائے ہے کہ اتنا نفع لیا جائے جو غبن فاحش تک مفضی نہ ہو، کیونکہ بعض اوقات دھوکہ دہی اور غرر کثیر کے باعث معاملہ رد کردیاجاتا ہے،''أما فی مغبون غر یکون لہ حق الرد '' (الرد مع الدر۷٫۳۶۳)۔

* * *

عرض مسئلہ:

جواہرات کی خرید فروخت
(محور سوم)

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی•

ذمہ داران اکیڈمی کی جانب سے اس ناچیز کو ''جواہرات کی خرید و فروخت '' کے محور سوم کا عرض مسئلہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ، اس موضوع سے متعلق تادم تحریر جو تحریریں موصول ہوئیں ان کی تعداد ١٥ ہیں، جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانامحفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد عثمان بستوی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمر مدنی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی عبد اللہ خالد لونا واڑہ، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی،مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی عبد المنان آسام، مولانا ابراہیم فلاحی، راقم الحروف محبوب فروغ احمد قاسمی۔

چونکہ مولانا ابراہیم فلاحی صاحب نے محور سوم سے تعرض نہیں کیا ہے، اس لئے ہمارے عرض کے لئے مقالہ نگار حضرات کی تعداد صرف ١٤ ہی رہ جاتی ہیں، امکانی حد تک سب سے استفادہ کی کوشش کی گئی ہے، نیز کوشش یہ بھی کی گئی ہے کہ ہر ایک کی رائے سامنے آجائے ،لیکن غلطی سے براء ت کا دعوت بہر حال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر ١- ڈسکائونٹ کا مسئلہ:

بیع میں مثلا مبیع کی قیمت ایک لاکھ مقرر کی گئی اور بائع نے تیس فیصد ڈسکائونٹ کا وعدہ کیا؛ بشرطیکہ ایک ماہ میں قیمت ادا کردی جائے، اب اگر ایک ماہ میں قیمت اداء نہیں کی گئی، تو اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف-معاملہ طے پاتے وقت ہی خریدار کے سامنے یہ بات رکھ دی گئی تھی؟

ب-یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی ، مگر مارکٹ کا چلن یہی ہو۔

ج-نہ یہ شرط طے پائی اور نہ ہی اس قسم کا عرف ہے۔

ان صورتوں میں بائع کی طرف سے ڈسکائونٹ ،یعنی کم کردینا شرعا درست ہوگا؟

اس سوال کی چار شقیں ہیں:١-مقررہ مدت مثلاً ایک ماہ میں قیمت ادا کرنے پر ڈسکائونٹ جائز ہے یا نہیں، ٢-مقررہ مدت میں ادا نہ کرنے کی صورت میں قیمت کم کرنا درست ہے یا نہیں،جبکہ معاملہ طے پاتے وقت ہی وضاحت ہوگئی تھی کہ مقررہ مدت کے

• استاذ حدیث و فقہ جامعہ حسینیہ، کایم کلم، کیرالہ۔

بعد ڈسکائونٹ نہیں ہوگا، ۳-متعینہ مدت میں ادا کرنا مشروط نہیں تھا ،مگر مارکیٹ کا عرف یہی ہے کہ اس بات کے بعد ڈسکائونٹ نہیں ہوتا، یا متعینہ مدت کا تذکرہ نہیں ہوا تھا، لیکن مارکیٹ میں اس کے بعد بھی ڈسکائونٹ کا چلن ہے،۴-نہ ڈسکائونٹ کا عرف ہے اور نہ کوئی شرط طے پائی۔

مجموعی طور پر مقالہ نگارحضرات نے پہلی شق کے علاوہ تینوں شقوں کا جواب دیا ہے ،البتہ پہلی شق کا جواب بھی بہت سے مقالہ نگار حضرات کے مقالوں سے مستفاد ہورہا ہے۔

مفتی عبداللہ خالد نے محور سوم کے سوال نمبر ۱ کا جواب نہیں دیا ہے، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب نے اس شق سے تعرض نہیں کیا ہے، بقیہ حضرات نے اپنی رائے ظاہر کی ہے، چنانچہ مفتی جنید پالنپوری کی رائے میں یہ جائز نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:دین مؤجل میں قبل از وقت ادا کرنے پر دین میں کمی کی جائے تو جائز نہیں ہے۔

مولانا محمد ظفر عالم ندوی اور مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحبان کے نزدیک اگر تعجیل کی شرط نہ ہوتو جائز، مولانا محمد ظفر عالم صاحب لکھتے ہیں:دین کا حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے ، جب یہ چھوڑنا تعجیل کی شرط کے ساتھ نہ ہو ،بلکہ تبرعا ہو، علامہ جصاص نے ''ضع وتعجل ''کے جواز سے متعلق تمام آثار و روایات کو اسی پر محمول کیا ہے۔

ان کے علاوہ بقیہ ۹ مقالہ نگار حضرات نے مطلقا جواز کا رجحان ظاہر کیا ہے کیونکہ:

الف-ثمن میں تخفیف یہ بائع کا خالص حق ہے(راقم الحروف)۔

ب-یہ ایک وعدہ ہے اور ایک جانب سے ہے(مفتی نثار احمد گودھروی)۔

ج-احادیث میں مہلت دینے، گنجائش پیدا کرنے اور معاف کردینے کی فضیلت وار د ہوئی ہے(مولانا محمدصابر حسین ندوی)۔

د-بائع کی طرف سے انعام ہے(ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی)۔

ھ-مقتضائے عقد کے موافق جن شرطوں کا تذکرہ فقہاء کرتے ہیں ان میں ایک شرط حط شئ من ثمن المبیع بھی ہے، جیساکہ شرح المجلہ(۱۳۶،۱) میں ہے(مفتی محمد عثمان بستوی)۔

چونکہ یہ معاملہ عقد کے وقت ہی طے ہورہا ہے، اس لئے اس کو ''دین مؤجل ''میں قبل از وقت ادائیگی ، یا ''ضع وتعجل '' کے زمرے میں نہیں رکھاجائے گا۔

اجزائے ثلاثہ کے جوابات:

مفتی جنید پالنپوری اور غالبا مولانا ظفرعا لم ندوی صاحبان کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات سوال کے بقیہ تینوں اجزاء کی بابت ڈسکائونٹ کے جواز کا رجحان رکھتے ہیں، ہاں مفتی جنید سوال کی آخری شق ،یعنی اگر عقد میں نہ شرط لگی ہو اور نہ ہی اس کا عرف ہو تو بتراضی عاقدین ثمن میں کمی کرنے کو جائز کہتے ہیں، لیکن اول دونوں شقوں میں ڈسکائونٹ کو ناجائز کہتے ہیں، کیونکہ دیون مؤجلہ میں اجل کے عوض تخفیف جائز نہیں ہوتی، نیز ''المعروف کالمشروط'' کے قاعدے سے جس صورت میں چلن ہو اس کا بھی

حکم مشروط ہی جیسا ہوگا، آخری شق سے متعلق قاضی محمد حسن ندوی کی رائے ناچیز کے سامنے واضح نہیں ہوسکی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے اس شق کو ناجائز قرار دیا ہے۔

جن حضرات نے ان صورتوں کو جائز قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

الف-''تنزيل البائع من الثمن بعد العقد يلحق بأصل العقد، يعنى يصير كأن العقد وقع على ما حصل بعد الزيادة والحط''(مجلہ الأحكام العدليہ،۵۳، مقالہ ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی)۔

ب-یہ بائع کی طرف سے تبرع و احسان ہے، نیز اس میں کسی کانقصان بھی نہیں ہے،'' احسن الفتاوی ''کے ایک فتوی سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے(مفتی محمد عثمان بستوی)۔

ج- ''شرح القواعد الفقہیہ ''میں ہے:''إنما تعتبر العادة إذا اطردت أو غلبت''(ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

د-یہ بائع کی طرف سے اسقاط ہے:''ولا يشترط لجواز حط البائع من الثمن أن يكون المبيع قائما؛ لأن الحط إسقاط ولا يلزم أن يكون في مقابلته شئ''(الموسوعۃ۹،۵۵ مقالہ:مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

ھ-حافظ کلیم اللہ عمری مدنی نے ''المجمع الفقہی ''کی قرارداد کا حوالہ دیا ہے: ''الحطيطة من الدين المؤجل لأجل تعجيله سواء أكانت بطلب الدائن أو المدين(ضع وتعجل) جائزة شرعا لا تدخل في الربا المحرم''۔

مجوزین کی رائے راجح بھی معلوم ہوتی ہے؛کیونکہ معاملہ دیون مؤجلہ کا نہیں ہے، بلکہ عقد کے وقت قیمت کے تخفیف کا ہے، اگر بائع کی طرف سے شرط بھی لگائی گئی ہو، یا تخفیف وڈسکائونٹ کا معاملہ تجار کے مابین معروف و مشہور ہو، دونوں ہی صورت میں معاملہ صلب عقد کی طرف ہی لوٹے گا، اور کہا جائے گا کہ بائع خالص اپنے حق میں تصرف کر رہاہے، جس کے جوازمیں کلام نہیں، اگر بالفرض معاملہ دیون مؤجلہ کا بھی ہو تو تعامل و عرف کی وجہ سے بہت سے فاسد معاملات بھی جائز قرار دے دئے جاتے ہیں، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ خریدار کو بھی ڈسکائونٹ کا مطالبہ کرنے کا حق ہو، ہاں آخری شق جس میں نہ توعرف ہو اور نہ ہی بائع نے شرط لگائی ہو اس میں خریدار کو ڈسکائونٹ کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، لیکن بائع از خود ڈسکائونٹ کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس اسقاط و ابراء سے کون روک سکتا ہے، نیز جب وقت موعود پر ادائیگی نہیں ہوپائی تو اب وہ دین حال بن گیا، اور دین حال میں ڈسکائونٹ میں تو ایسے بھی اتفاق ہے۔

۲-ریجیکٹ مال لے لینا اور کاریگر کو قیمت نہ دینا:

کاریگر مطلوبہ شئ تیار کر کے دیتا ہے؛ لیکن مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جاتی ہے،بنوانے والا اس شئ کو حاصل کرلیتا ہے اور اسے فروخت بھی کرتا ہے؛ لیکن کاریگر کو اس کی کوئی اجرت ادا نہیں کرتا ہے، اس کو تاجروں کی اصطلاح میں ''ٹال '' کہتے ہیں، یعنی (Reject)کیا ہوا مال، کیا بنوانے والے کا یہ عمل درست ہے، جب کہ مارکٹ

میں یہ طریقہ معروف اور مروج ہے؟

مقالہ نگار حضرات کے اس سوال کے جواب میں بنیادی طور پر دو نقطہائے نظر ہیں:

۱-مولانا عمر کوکنی، مولانا محمد عثمان بستوی، مفتی عبد المنان آسام، مفتی نثا احمد گودھروی کی رائے میں کاریگر کے لئے اجرت واجب نہیں ہے؛کیونکہ اجرت کا استحقاق یا تو عقد سے ہوتا ہے یا عرف سے، عرف تو کاریگر کو اجرت نہ دینے کا ہے، لہذا عرف کی وجہ سے اجرت واجب نہیں، اسی طرح کاریگر نے مطلوبہ معیار کے مطابق سامان تیار نہیں کیا ، لہذا یہ عمل عقد سے بھی خالی ہوا ،اس لئے اجرت کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا ہے، مفتی محمد عثمان بستوی نے شرح المجلہ(۶۰۶) کی عبارت پیش کی ہے:

''لأن ما يدخل تحت عقد الإجارة ہو العمل السليم، وأما العمل الفاسد، فلا يدخل تحت الإجارة، وبناء عليہ يكون الأجير المشترک بہذا الصورة فعل شيئا غير داخل تحت الإجارة، وليس مأذونا يعلمہ بحكم الإجارة''۔

مولانا عمر کوکنی ''مغنی المحتاج ''(۴۲۸،۲) کی عبارت سے استدلال کرتے ہیں:''لو أعطاہ ثوبا يخيطہ فخاطہ قباء وقال: أمرتني بقطعہ قباء، فقال: بل قميصا، فالأظہر تصديق المالک بيمينہ ولا أجرة عليہ أي المالک للخياط؛ لأن عمل الخياط صار حينئذ غير ماذون فيہ''۔

مفتی نثار گودھروی لکھتے ہیں:اگر تارجوں کے عرف و عادت میں عیب اور ٹال مٹول سمجھا جاتا ہو اور اس سے قیمت میں بھی نقص آتا ہو تو کاریگر ضامن ہوگا...مگر اجرت وضمان جمع نہیں ہوسکتے ،اس لئے مستاجر اجیر کو ضامن نہ بناتے ہوئے اجرت نہ دے تو یہ درست ہے، ''الأجر والضمان لا يجتمعان''۔

۲-اگر مقررہ معیار کے مطابق زیور نہیں بن سکا ،مگر بنوانے والے نے اس کو لے کر فروخت کردیا تو مکمل اجرت مثل واجب ہوگی، جو مقررہ اجرت سے زائد نہیں ہوگی، اس رائے کے حاملین ہیں ، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، راقم الحروف محبوب فروغ احمدقاسمی۔

لیکن مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد صابرحسین ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری اور مفتی عبدا للہ خالد کے خیال میں اگر بنوانے والے کا نقصان ہوا ہو تو اجرت میں کمی، نقصان کے حساب سے کی جائے گی، ان حضرات نے مندرجہ ذیل عبارت اور ضابطہ سے استدلال کیا ہے:

''مبسوط سرخسی ''میں ہے:''ولو سلم غزلا إلى حائک ليسنج لہ سبعا في أربع فحاكہ أكثر من ذلک أو أصغر فہو بالخيار إن شاء ضمنہ مثل غزلہ وسلمہ الثوب، وإن شاء أخذ ثوبہ وأعطاہ الأجر إلا في النقصان، فإنہ يعطيہ الأجر بحساب ذلک ولا يجاوزبہ ما سمى''(مفتی عبدا للہ خالد، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

مشہور قاعدہ ہے:''لا ضرر ولا ضرار''،اور ''الضرر يدفع بقدر الإمكان''۔

جن حضرات نے مکمل اجرت مثل کو لازم کیا ہے، ان حضرات کی رائے میں:

اجرت دیئے بغیر لے لینا ظلم ہے،''إن اللہ لا یحب الظالمین''(ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری)۔

اجرت نہ دینا''لا ضرر ولا ضرار''کے خلاف ہے(قاضی محمد حسن ندوی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی نے لکھا ہے کہ '' فتاوی دارالعلوم ''(۳۰۳،۱۴)میں اجرت کا وجوب ایک ایسے ہی معاملہ میں تسلیم کیا گیاہے۔

مولانا لکھتے ہیں: اس کی وجہ سے کاریگر کو اجرت دینا ضروری اور اسے ٹال کہنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہوگیا...مارکیٹ میں جو طریقہ رائج ہوگیا ہے وہ شرعا عرف فاسد ہے جس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اسی قسم کی بات قاضی محمد حسن ندوی نے بھی لکھی ہے، لکھتے ہیں: ''اسی طرح مذکورہ صورت میں کاریگر کو اجرت نہ دینے کا عرف ہے جو نص کے خلاف ہے، اس لئے شرعا اس کا عتبار نہیں ہوگا ''۔

عارض ناچیر کا خیال ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ کاریگر کی حیثیت اجیرمشترک کی ہے، اجیر مشترک شرائط کی خلاف ورزی کرتاہے جس کی وجہ سے مستاجر کا نقصان ہوتا ہے تو علامہ کاسانی کے بیان کے مطابق اس کی خلاف ورزی کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ہر صورت کا حکم الگ الگ ہوتا ہے۔

اگر شرائط کی خلاف ورزی سے جنس کی تبدیلی ہوگئی ،مثلاً کپڑا دیا قمیص بنانے کے لئے اس نے پاجامہ بنادیا، یا کپڑادیا سرخ رنگ میں رنگنے کے لئے اس نے سیاہ رنگ میں رنگ دیا، ایسی صورت میں اگر آرڈر دہندہ کا نقصان ہوا، یعنی کپڑے کی قیمت کم ہوگئی تو ضمان بالنقصان کاریگر کی اجرت سے ہوگا، یہی حکم اس وقت بھی ہوتا ہے، جبکہ مقدار میں شرائط کی خلاف ورزی ہوئی ہو، مثلاً سوت دیا کہ سات بائی چار کا کپڑا بن دے، اس نے اس کے خلاف کیا تو اب مالک کو اختیار ہے ، چاہے تو سوت کا ضامن بنادے اور چاہے تو اجرت مثل دے کر لے لے اور اگر نقصان ہوا تو نقصان کے بقدر ضمان بھی لے سکتا ہے۔

لیکن وصف میں خلاف ورزی ہوئی تو اب مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ سامان کاریگر کے پاس چھوڑ دے اور اصل مال کی مالیت کے بقدر قیمت وصول کرلے، اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ اس سے لے لے ، مگر اجرت مثل دینی ہوگی، علامہ کاسانی کی عبارت ہے:

''فإذا كان الخلاف فئ الصفة نحو إن دفع إلى صباغ ثوبا يصبغه بصبغ مسمى فصبغه بصبغ آخر، لكنه من جنس ذلك اللون فلصاحب الثوب أن يضمنه قيمته أبيض ويسلم إليه الثوب، وإن شاء أخذ الثوب وأعطاه أجر مثله لا يجاوز به ما سمى''(بدائع۸۲،۴ كتاب الإجارة، باب استيجار الصناع)۔

زیر بحث مسئلہ میں کاریگر نے جواہرات سے زیور تو بنا یا ہے، مگر مقررہ معیار

کے مطابق نہیں بنا سکا جس کی وجہ سے وصف فوت ہوا ، لہذا مکمل اجرت مثل واجب ہوگی، اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ ‘‘جواہرات ’’ کی مالیت کا ضامن بنا کر زیور کاریگر کے پاس چھوڑ دے۔

‘‘شرح المجلہ ’’کی عبارت کا مطلب ناچیز کے خیال میں یہ ہے کہ جب تک شرائط مطلوبہ کے مطابق سامان تیار نہ ہو مستاجر پر اس کو قبول کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا لازم نہیں ہوگا، واللہ اعلم

اس مسئلہ میں ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کی ایک منفرد رائے بھی ہے کہ اگر بنوانے والے نے اس مال کو ریجکٹ مال کے طور پر فروخت کیا ہے تو کاریگر کو اجرت نہیں ملے گی، اور اگر صحیح مال کے طور پر فروخت کیا ہے تو اجرت مثل ہوگی، ڈاکٹر صدیقی صاحب نے اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے کہ محاکمہ ہوسکے۔

سوال نمبر۳-قانونی مصلحت کی خاطر قیمت کم کر کے لکھنا:

قانونی مصلحت کے تحت عام طور پر قیمت درج کرتے ہوئے ایک زیرو کم کردیاجاتا ہے، جیسے ۳۰۰۰(تین ہزار)ہے تو ۳۰۰(تین سو) لکھا جاتا ہے، تاجر بھی اپنی یادداشت میں ۳۰۰(تین سو) ہی لکھتا ہے؛ لیکن فریقین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد تین ہزار ہے، تو کیا یہ عمل جائز ہوگا؟

دو مقالہ نگارحافظ کلیم اللہ عمری اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی اس طرح کے عمل کو ناجائز کہتے ہیں، تقریبا یہی رائے مولانا ظفر عالم ندوی کی بھی لگتی ہے، ان حضرات کے پیش نظر بنیادی طور پر یہ حدیث: ‘‘من غشنا فلیس منا’’ہے، اسی طرح ان حضرات کا خیال ہے کہ یہ ایک قسم کی چوری ہے، نیز حکومت کی طرف سے جو ٹیکس عائد ہوتے ہیں، ان سے راہ فرار اختیار کرنا ہے جو کہ جائزنہیں، چوری اگر پکڑی گئی تو عزت وجان بھی خطرے مینپڑسکتی ہے، جبکہ اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا ہے:‘‘لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه’’(ترمذی)،قاضی محمد حسن ندوی نے اس صورت میں جائز کہا ہے، جبکہ ٹیکس واقعتا ظالمانہ ہو، ان کے نزدیک جو اجرت زبانی طے ہوئی ہے اس کا رقم کرنا بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی اس عمل کو نامناسب قرار دیتے ہیں، البتہ ٹیکس کا صحیح استعمال نہ ہو تو پھر اس سے بچنے کی ایسی تدبیر کی گنجائش بھی دیتے ہیں، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی کے دلائل کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ یہ جھوٹ ہے جس کی سخت مذمت واردہوئی ہے، نیز حکومت کی جانب سے عائد کردہ ٹیکس اگر ظالمانہ نہیں ہے تو اس کو ادا کرنا لازم ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا نامناسب عمل اور گناہ ہے۔

ان کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے میں اس طرح قانونی مصلحت کی خاطر اگر سامان پر قیمت کم لکھی جائے ،لیکن اس کی مراد سے عاقدین اچھی طرح واقف ہوں، نیز کوئی حق بھی ضائع نہ ہو تا ہو تو اس طرح طرز کتابت میں کوئی حرج نہیں،

کیونکہ خرید و فروخت کے صحیح ہونے کے لئے ایجاب و قبول کے علاوہ مبیع وثمن کا شرعی طور پر صحیح ہونا ضروری ہے، نیز قیمت کے صحیح ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ عاقدین کے مابین معلوم و متعین ہو، اور نزاع کا باعث نہ ہو، یہ صورت زبانی بھی طے ہوسکتی ہے اور ایسے اشارات سے بھی طے کی جاسکتی ہے جو عاقدین کے مابین معلوم و معروف ہو، لکھنا ضروری نہیں ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''فذہبوا إلی صحۃ البیع إذا عقد علی ثمن بوزن صبخۃ وملأ کیل مجہولین عرفا وعرفہما المتعاقدان بالمشاہدۃ''(المغنی۴،۲۲۷)،اسی طرح ابن قدامہ بیع بالرقم کی تشریح کرتے ہوئے جمہور فقہاء کا قول بایں الفاظ نقل کرتے ہیں:

''قال أحمد:ولا بأس أن یبیع بالرقم ومعناہ:أن یقول:بعتک ہذا الثوب برقمہ ، وہو الثمن المکتوب علیہ إذا کان معلوما لہما حال العقد، وہذا قول عامۃ الفقہاء''،یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ حکومت سے قیمتوں کو چھپانا، بایں معنی جرم بھی نہیں ہے کہ حکومت کو عام حالات میں قیمتوں کو متعین کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا ہے۔

مفتی محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: تحریر کا حکم عام حالات میں استحبابی ہے، وجوبی نہیں، ''العبرۃ لما في الواقع لا بما کتب خلاف ذلک''(تکملہ ردالمحتار،۴۵۹)۔

مولانا عمر کوکنی نے ''بیع التلجئہ ''پر قیاس کرتے ہوئے علامہ نووی کی عبارت نقل کی ہے:

''صورتہ أن یخاف غصب مالہ أو الإکراہ علی بیعہ فیبیعہ لإنسان بیعا مطلقا، وقد توافقا قبلہ علی أنہ لدفع الشر لا علی حقیقۃ البیع، والصحیح صحتہ''(روضۃ الطالبین۳،۲۳)۔

تقریبا اسی قسم کی بات مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے بھی مختلف کتب اصول وقواعد سے نقل کی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ اگر قیمت صرف عاقدین کے مابین واضح ہو، خواہ کسی اور کو یا حکومت یا نوکرشاہو نکو معلوم نہ ہو تو دھوکہ یا جھوٹ نہیں ہوگا، اور نہ ہی اس کو چوری کے زمرے میں رکھاجائے گا، اسی طرح اصل قیمت کا زبانی طور پر طے ہوجانا کافی ہے اس کو سامان پر لکھ لینا واجب نہیں ہے۔

چونکہ جس امر کا وقوع عام ہوتاہے وہ متفق کے درجے میں ہوتا ہے، موجودہ وقت میں عموما ٹیکس ظالمانہ ہی ہوتے ہیں، علامہ شامی اپنے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں:''أما في زماننا فأکثر النوائب تؤخذ ظلما ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فہو خیرلہ''(ردالمحتار۷،۶۲۲)،حضرت تھانوی کے مختلف فتاوی میں بھی اس قسم کی تصریح موجود ہے، لہذا جن حضرات نے عاقدین کے مابین قیمت معروف ہونے کی صورت میں جائز کہا ہے ان کا قول ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

۴-ایکسپورٹ میں قیمتوں کو چھپانا:

ایکسپورٹ میں اصل قیمت کے بجائے مثلاً :دس فیصد قیمت ہی لکھی جاتی ہے،

جوبینک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، بقیہ رقم کسی اور طریقہ پر وصول کی جاتی ہے؛ لیکن یہ فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور فریقین اس پر راضی بھی ہوتے ہیں، شرعا اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں سات مقالہ نگار حضرات (مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عبد المنان، مولانا محمد صابر ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری)، عدم جواز یا نامناسب کے قائل ہیں، جبکہ دیگر سات حضرات(مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جنیدبن محمد پالنپوری، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا عبداللہ خالد، مفتی عمر کوکنی، مولانا قاضی محمد حسن ندوی، راقم الحروف محبوب فروغ احمد قاسمی جواز کے قائل ہیں۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی لکھتے ہیں: اگر ایکسپورٹ اور امپورٹ کاروبار مینیہ طریقہ معروف ہو اور اس عرف وعادت کے مطابق ہی کاروبار ہوتا ہو اور ایکسپورٹر اور امپورٹر پیمنٹ کے اس طریقے پر راضی ہوں تو یہ جائز ہے، گورنمنٹ کی نظر سے بچنا ہو تو مناسب نہیں۔

مولانا ظفر عالم ندوی کے نزدیک کراہت سے بہر حال خالی نہیں، مولانا محمد شاہجہاں ندوی کے نزدیک اگر ٹیکس ظالمانہ نہ ہو تو جائز نہیں ہے، ورنہ جائز ہے، مفتی عبد المنان نے بھی حکومتی گرفت سے بچنے کے لئے اس طرح حیلہ کرنے کوناجائز کہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جن حضرات نے ناجائز یا مکروہ ونامناسب کہا ہے ان حضرات کے مد نظر یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے عائدہ کردہ ٹیکس وواجبات اگر عدل و مساوات پرمبنی ہوں تو حکومت کو دھوکہ دینا یا اس کے سامنے کذب بیانی کرنا ہوگا اور یہ جائز نہیں ہے۔

لیکن جن حضرات نے جائز کہا ہے ان کے پیش نظر یہ ہے کہ اپنی عزت و ناموس کو بچاتے ہوئے اگر حکومتی مصلحت کی وجہ سے قیمتوں کے لکھنے میں کمی کردی جائے تو چونکہ ٹیکس ظالمانہ ہوتے ہیں ،اس لئے اس میں حرج نہیں ہوگا۔

ناچیز کی رائے میں ایکسپورٹ و امپورٹ کا معاملہ اگر قانونی طور پر کیاجائے تو حکومت سے چھپانا چونکہ ناممکن ہوتا ہے، حکومت کو سامان کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنی ہوتی ہے، جس میں قیمت کا تعین بھی ناگزیر ہوتا ہے، بعض اوقات غلط رپورٹ کو فائنل کرنے کے لئے رشوت بھی دینی پڑتی ہے، الغرض حکومت اس معاملہ میں کسی نہ کسی طرح واسطہ ضرورہوتی ہے جس کے نتیجہ میں بعض منہیات کا ارتکا ب لازم آتا ہے، اس لئے مناسب بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح کے عمل کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور کم از کم نامناسب ضرور قرار دیاجائے، وہ بھی اس وقت جبکہ مفاسد کا ارتکاب لازم نہ آئے، اور عزت و ناموس بھی محفوظ رہ سکے، حدیث میں ہے:''لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه''(ترمذی: ۲۲۵۴)۔

۵-زیورات کے بچے ہوئے کارآمد ذرات کا حکم:

کاریگر جب جواہرات کو زیور وغیرہ کے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو کچھ ذرات اور ٹکڑے نکل آتے ہیں، یہ کاریگر کے پاس ہی رہ جاتے ہیں، زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی مینچلی گئی، کیا یہ بچے ہوئے ذرات کاریگر کے لئے جائز ہوں گے؟

کارآمد ذرات کو کاریگر کے لئے رکھ لینا مولانا محمد عثمان بستوی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کے نزدیک جائز ہے، بشرطیکہ زیور بنوانے والے کی طرف سے مطالبہ نہ ہو اور اس طرح رکھ لینے کا چلن بھی ہو، مولانا محمد عثمان بستوی نے عرف و عادت کی بنا پر جائز قرار دیتے ہوئے قفیز طحان والی حدیث سے ہونے والے اشکال کا جواب بھی زیب قرطاس کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قفیز طحان اس وقت ممنوع ہے، جبکہ اجرت الگ سے متعین نہ کی جائے ،بلکہ ان ہی ذرات یا میٹریل کے ایک حصہ کو قرار دیاجائے، اسی لئے فقہ کی کتابوں میں حیلہ مرقوم بھی ہے،''والحیلۃ أن یفرز الأجر أولاً أو یسمي قفیزاً بلا تعیین، ثم یعطیہ قفیزاً منہ، فیجوز''(الدر مع الرد۹؍۷۹)،اگر بالفرض قفیز طحان میں مذکورہ بالا صورت داخل بھی ہو تو عرف کی وجہ سے مشائخ بلخ کے قول پر فتوی دیاجاسکتا ہے(یہ خلاصہ ہے مولانا محمد عثمان بستوی کے استدلال کا)۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ بارہ مقالہ نگاروں نے بچے ہوئے کار آمد ذرات کو کاریگر کے لئے جائز قرار نہیں دیا ہے؛کیونکہ جو جواہرات اس کے پاس ہیں وہ امانت ہیں، بعض ذرات کو رکھ لینا خیانت ہے، زیور بنوانے والے کویہ باور کروانا کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی جھوٹ ہے جس کی شناعت ظاہرہے؛حرام طریقے سے حاصل کیا ہوا مال ہے جو غصب کے حکم میں ہے جس کا حکم مالک تک پہنچانا اور بصورت دیگر صدقہ کردینا ہے۔

لہذا یہ کہنا کہ زیور بنوانے والے کی طرف سے مطالبہ نہیں ہورہا ہے جو رضا کی دلیل ہے مبنی بر حقیقت نہیں ہے، بالفرض مطالبہ نہیں بھی ہورہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے بچے ہوئے مال کے بارے میں علم نہیں ہے، اس لئے خاموش ہے، اس لئے یہ دلیل رضا نہیں ہے۔

اسی طرح عرف و چلن پر اس کو منحصر کردینا بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے کہ عرف کی بابت اکیڈمی قبل ازیں تجاویز مرتب کرچکی ہے جس کا ایک اہم دفعہ یہ ہے:

''ہر وہ رواج و عرف جو شریعت کی کسی نص یا مقصد و مصلحت معتبرہ سے ٹکراتا ہو وہ فاسد قرارپائے گا ''۔

لہذا ایسا عرف جس کی وجہ سے خیانت، کذب، غرر جیسے مفاسد کا ارتکاب لازم آتا ہو عرف فاسد ہوگا اور غیر معتبر ہوگا، اکابر کے فتاوے بھی اسی نظریہ کی تائید کرتے ہیں، فتاوی محمودیہ میں درزی کے چرائے ہوئے کپڑے کی بابت فتوی مرقوم ہے:

''درزی کو چاہئے کہ جب کپڑا ناپے تو جتنا خرچ ہوگا ناپ کر اتنا ہی بتائے، نہ اتنا کم بتائے کہ سل کر چھوٹا رہ جائے، نہ اتنا زیادہ بتائے کہ باقی بچے اور واپسی کی نوبت آئے، تاہم اگر باقی بچے گا تو اس کو از خود نہ رکھے، بلکہ واپس کردے الخ ''(فتاوی محمودیہ۲۸،۴۰۰ ترتیب جدید)۔

مفتی جنید بن محمد پالنپوری نے ایک صورت کو مستثنی کیا ہے اور وہ ہے جس میں ذرات کاریگر کے جسم یا چٹائی سے غیر محسوس طور پر لگ جاتے ہیں بعد میں غسل کر کے چٹائی کو دھل کر غسالہ کو بیچتے ہیں ، خریدار اس سے ذرات نکال لیتا ہے، چونکہ یہ انسانی قدرت سے باہر ہے اس لئے غصب کے دائرے میں نہیں آئے گا۔

سونے وچاندی میں تو ایسا ہوتا ہے اس کے اتنے چھوٹے ذرات بھی کارآمد ہوتے ہیں، مگر جواہرات میں بھی ایسا ہوتا ہے یہ تو اہل تحقیق ہی بتا سکیں گے۔

۶-قیمتی پتھر میں لگنے والے دھاگے کی قیمت:

قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں، بازار میں ان کا وزن دس گرام ماناجاتا ہے، دس گرام سے زیادہ جو وزن ہوگا، وہ پتھر کا ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ دھاگے آٹھ گرام کے ہوتے ہیں، اور خریدنے والے تاجرکو بتایاجاتا ہے؛ لیکن وہ اس کو ماننے سے انکار کردیتا ہے، اور اس کا وزن دس گرام ہی مانتا ہے، گویا دو گرام پتھر بھی دھاگوں کے ریٹ میں فروخت ہوتا ہے، کیا خریدار کا یہ عمل درست سمجھاجائے گا؟

اس سوال کے جواب میں مولانا قاضی محمد حسن ندوی کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو دو گرام پتھر کی قیمت بھی دھاگے کی قیمت ہوسکتی ہے؛کیونکہ اصل مدار تراضی طرفین پر ہے جو کہ حاصل ہے، اگر نقصان ہورہا ہے تو یہ ان کا اپنا قصور ہے، اگر کاریگر کو پسند نہیں ہے تو نہ دے، یا دھاگے ہی دس گرام لگائے؛کیونکہ مبیع سامنے ہو تو اس میں پائے جانے والے ظاہری عیب کے باوجود فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بیع جائز ونافذ اور لازم ہوجاتی ہے، بعد میں خیار بھی نہیں ہوتا ہے، ''محیط برہانی ''میں ہے:

''وفي الظہیریۃ اشتری سویقا علی أن البائع لتّہ بمنّ من السمن وتقابضا والمشتري ینظر إلیہ فظہر أنہ لتّہ بنصف منّ جاز البیع ولا خیار للمشتري، وہو نظیر مالو اشتری قمیصا علی أنہ متخذ من عشرۃ أذرع وہو ینظر إلیہ ثم ظہر أنہ من تسعۃ، جاز البیع''(المحیط البرہانی۸،۴۴۲ کتاب البیوع، الشرط فی الأجل)۔

مولانا محمد عثمان بستوی نے اس کی تاویل بیع مجازفت سے کی ہے یا پھر حط ثمن قرار دیا ہے، مولانا لکھتے ہیں:''اگر بائع خریدار کی بات سے متفق ہو کر آٹھ گرام کے دھاگے کو دس گرام فرض کر کے فروخت کردے تو شرعا یہ جائز ہے، یہ بیع مجازفت کی قبیل سے ہے؛کیونکہ اس میں موتی کو دھاگے سمیت اولاً وزن کیاجاتا ہے ،پھر دھاگے سمیت فروخت کیاجاتا ہے، بعدہ دھاگے کا ایک وزن فرض کر کے قیمت کم کردی جاتی ہے، یہ

صورت مجازفت یاحط ثمن کی ہے، لہذا اگر بائع راضی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں''۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:فروخت کرنے والا چونکہ دو گرام پتھر کو دھاگوں کے ریٹ میں فروخت کرنے پر راضی ہے، اس کا مطلب ہے کہ خریدار کے نہ ماننے کے باوجود اسے نفع حاصل ہورہا ہے، لہذا خرید وفروخت کے اس معاملہ میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب ''فتاوی محمودیہ '' سے ایک فتوی نقل کرتے ہیں:''یہ ناانصافی ہے، تاہم اگر طرفین اس پر رضامند ہوجائیں تو بیع درست ہوگی لعدم المفسدۃ''۔

البتہ قاضی محمد حسن ندوی تطفیف وخبس قرار دے کر معاملہ کو ناجائزقراردیتے ہیں، لکھتے ہیں:لہذا خریدار کا بائع کی بات نہ ماننا اور دو گرام پتھر کو دھاگے کی قیمت میں فروخت کرنا یہ خریدار کی طرف سے تطفیف اور خبس ہے اور قرآن میندونوں کی ممانعت ہے، اس لئے خریدار کا یہ عمل شرعا ناجائز ہوگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب عاقدین کو حقیقت حال کا علم ہے، نیز دونونمیں سے کوئی لینے دینے پرمجبور نہیں ہے، اسی طرح پتھر کی قیمت متعین تو کررہا ہے صرف اتنا ہے کہ کم کر رہا ہے، اگر بیع وشراء میں مشتری ایک قیمتی سامان کو کم قیمت میں خرید لے تو کیا یہ تطفیف ہوگی، بیع کی ایک قسم ''وضیعہ ''بھی تو ہے، جس میں قیمت کم دی جاتی ہے، لیکن دونوں راضی ہوتے ہیں۔

٧-حقیقی وزن سے کم وزن کی قیمت لگانا:

بعض دفعہ ایک مال ،مثلاً ایک قیراط پانچ سنٹ کا ہوتا ہے؟ لیکن خریدنے والا تاجر ایک قیراط مال پر اس کی پرچی بناتا ہے، پانچ سینٹ کی قیمت ادا نہیں کرتا ؛البتہ چونکہ پہلے بائع کے لئے صرف ایک قیراط کی قیمت کی پرچی لکھی گئی تھی؛ اس لئے وہ مجبورا اس پر راضی ہوجاتا ہے؛ لیکن خود وہ جب کسی اور سے اس مال کو فروخت کرتا ہے تو پورے ایک قیراط پانچ سینٹ کی قیمت لگاتا ہے، شرعا اس کا کیا حکم ہوگا؟

بنیادی طور پر مقالہ نگار دو مختلف رائے رکھتے ہیں:ایک قیراط پانچ سینٹ والے مال کی قیمت ایک قیراط لگا کر خریدار کا خریدنا جائزہے، اس رائے کے حاملین ہیں: مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا عمر کوکنی، مفتی عبد المنان آسام، مولانا محمد صابر حسین ندوی۔

مولانا محمد صابر حسین ندوی کے نزدیک حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی، وہ لکھتے ہیں: مبیع کے مالک کو اصل ریٹ سے کم دینا اور نقود زیادہ میں فروخت کرنا گرچہ ''عن تراض بینکم ''کی وجہ سے جائز ہے، لیکن اس کے اندر استحصال کی بدنما صورت بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ عند اللہ ماخوذ بھی ہوسکتا ہے۔

مفتی عمر کوکنی فرماتے ہیں: بیع کی دیگر شرائط پائی جاتی ہیں تو نفس بیع تو درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ تراضی کہاں پائی جارہی ہے، بائع تو مجبور ہے، کیونکہ

غلطی سے اس پر کم مالیت لکھی چلی گئی ۔

مفتی عبد المنان کے نزدیک یہ بیع جائز تو ہے ،مگر مکروہ ہے، البتہ بیع ثانی میں حرج نہیں۔

مفتی محمد عثمان بستوی نے اس کا مدار عرف پر رکھا ہے اور وزن کو وصف کے درجہ میں رکھ کر ''لا یعبابہ'' سمجھا ہے، لکھتے ہیں: ''اگر عرف زائد سینٹ کی قیمت نہ لگانے کا ہو تو عرف کی وجہ سے اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی، اس لئے کہ وہ وصف کے درجے میں ہوجائے گا۔

''لو باع لؤلؤ ء ة على أنها تزن مثقالا فوجدها أكثر سلمت للمشتري، لأن الوزن فيما يضره التبعيض وصف بمنزلة الزرعان''۔

محل غور یہاں یہ ہے کہ بائع وزن کو بطور وصف نہیں ،بلکہ بطور اصل پیش کر رہا ہے، اسی لئے وہ خریدار کو دینے کے لئے رضامند نہیں ہے، محض مجبورا معاملہ کر رہا ہے تو کیا اس وقت بھی ''وصف ''کے مقابلہ ثمن نہیں ہوگا؟ ''درمختار '' میں ہے:''الوصف لا يقابله شئ من الثمن إلا إذا كان مقصودا بالتناول''(الدرالمختار۳۴،۴ کتاب البیوع، طبع رشیدیہ، پاکستان)۔

بائع کا ایک قیراط پانچ سینٹ پر اصرار کرنا بتارہا ہے کہ وہ مقدار مقصود اور اصل ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ خریدارکا کم کرکے لینا ناجائز ہے، یہ غصب کے حکم میں ہے، ''لا ضرر ولا ضرار في الإسلام''کے تقاضے کے خلاف ہے، تراضی جوکہ بیع وشراء میں اہم شرط ہے مفقود ہے، اس رائے کے قائلین ہیں:ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی عبد اللہ خالد، قاضی محمد حسن ندوی او ر راقم الحروف محبوب فروغ احمد قاسمی، نیز مولانامحفوظ الرحمن شاہین جمالی۔

قاضی محمد حسن کے نزدیک یہ صورت بھی تطفیف و خبس ہے، نیز رضا بھی نہیں ہے، اس لئے ناجائز ہے، مولانا شاہین جمالی صاحب اپنے خلاصہ جواب میں لکھتے ہیں:''ایک قیراط پانچ سینٹ مال کی پرچی صرف ایک قیراط کی لکھنا مروج ہو تو اس کا اعتبار نہیں، کیونکہ یہ مبیع نہیں بلکہ اس کی رسید ہے، بائع اصل وزن ایک قیراط پانچ سینٹ پر فروخت کرتا ہے تو جائز ہے۔

البتہ خریدار اول اگر کسی اور سے فروخت ایک قیراط پانچ سینٹ کی مالیت کے حساب سے کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے،مولانا جمالی کے نزدیک جائز ہے، یہ خریدار کا تجارتی نفع ہے، اسی طرح مفتی جنیدبن محمدپالنپوری رقم طراز ہیں:البتہ یہ خریدار تاجر آگے کسی اور کو یہی مال ایک قیراط اور پانچ سینٹ کہہ کر بیچتا ہے تو یہانخریدارکے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہورہاہے، لہذا یہ بیع ثانی درست ہے۔

لیکن ناچیز کو اس میں تردد ہے، جب پہلی خرید و فروخت میں پانچ سینٹ کے بقدر

مالیت کا خریدار غاصب ٹھہرا، یا غلط طریقے پر ایک بھائی کا مال لینے والا ہوا تو وہ مقدار اس کے پاس مال خبیث ہے۔

''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ''(مجمع الزوائد۴،۱۷۲)۔

اس کی قیمت دوسرے گاہک سے وصول کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے،بلکہ اصل مالک تک اس کی قیمت پہنچائے، بصورت دیگر اتنی مقدار صدقہ کردے۔

۸-مجبورا قبول کرنا بھی تراضی کے لئے مضر ہے:

بعض دفعہ ایک شخص مختلف لوگوں سے مال لے کرباہر چلاجاتا ہے؛تاکہ اسے فروخت کرے، اب خدا ناترس حضرات غلط بیانی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ مال ڈوب گیا؛ لہذا اب پچیس فیصد قیمت لے لو، اور بیچنے والا اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے؛ کیونکہ لکھی ہوئی قیمت اس سے بہت کم ہوتی ہے، ایک زیرو کم کرنے کی وجہ سے اسی قیمت کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے،مجبوری میں قبول کرنے کی وجہ سے شرعا کیا اس شخص کے لئے یہ مال حلال ہوگا؟

تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ تاجر کے لئے جائز نہیں ہے کہ پچیس فی صد مال دے کر پچھتر فی صد مال ہضم کر جائے؛ کیونکہ تاجر کے پاس یا تو یہ امانت ہے جس کی حفاظت اپنے مال کی طرح کرنا لازم تھا، اگر حفاظت میں کوتاہی ہوتی اور ضائع ہوجاتا پھر بھی تاجر اس کا ذمہ دار تھا، یہاں تو تاجر کے پاس مال موجود ہے، محض جھوٹ بول کر دوسرے کا مال لینا چاہتا ہے،''لا یجوز التصرف في مال غیرہ بلا إذنہ ولا ولایتہ''(درمختار۵،۱۴۰)،یاپھر اس تاجر کے پاس لوگوں کا مال بحکم مال مبیع ہے، جیسا کہ بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے تو بھی تاجر مشتری پر مکمل قیمت کی ادائیگی لازم ہوگی، لکھی ہوئی قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

۱-''لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم''۔

۲-''أوفوا بالعہد إن العہد کان مسئولا''۔

۳-مسلم کی روایت ہے:''من غشنا فلیس منا''۔

۴-''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ''(دارقطنی۳،۲۲)،یہ حسن درجہ کی روایت ہے۔

۵-''فلیؤد الذي أوتمن أمانتہ ولیتق اللہ ربہ''۔

۶-''لا یحل لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي''(شامی۴،۶۱)۔

۷-''نہی عن النجش''۔

۸-''من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینہ فقد أو جب اللہ لہ النار، وحرم علیہ الجنۃ، فقال لہ رجل: وإن کان شیئا یسیراً یا رسول اللہ! قال: وإن کان قضیبا من أراک''(حدیث، موطا امام مالک)۔

* * *

عرض مسئلہ:

جواہرات کی خریدوفروخت
(محورچہارم)

مولانامحمد ظفر عالم ندویؔ•

الحمد للّٰہ ربّ العالمین والصلاۃ والسلام علی سیّد المرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین۔

حضرات! جواہرات کی خریدوفروخت کے موضوع پر تقریباً پندرہ مقالے راقم کے پاس پہنچے ہیں جن میں سے محور چہارم پر تقریباً دس مقالے ہیں، راقم کے ذمہ محور چہارم کا عرض مسئلہ ہے جو مقالہ نگاروں کی آراء، دلائل اور تجزیہ پر مشتمل ہے درج ذیل کیا جارہا ہے:

اس میں ۶؍سوالات ہیں ہرسوال سے متعلق مقالہ نگاروں کی جو آراء ہیں وہ ترتیب وار پیش خدمت ہیں:

جواب/۱ ۔سوال نمبر ۱ کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں کی رائے جواز کی ہے، تقریباً تمام ہی حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ متعاقدین بوقت عقد کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں، دلائل:

(۱) ''صحّ بثمن حال وھو الأصل ومؤجل إلی أجل معلوم'' (فتح القدیر ۲/۴۲۳)۔

(۲) ''وھٰذا إن إفترقا علی فإن کان یتراضیان بینھما فلم یتفرقا حتی قاطعہ علی ثمن معلوم وإنما العقد علیہ فھو جائز''(المبسوط ۱۳/۸)۔

(۳) ''فالأئمۃ الأربعۃ وجمھور الفقھاء والمحدثین قد أجازوا البیع المؤجل بأکثر من سعر النقد بشرط أن یبث العاقدان علی أنہ بیع مؤجّل بأجل معلوم فأما إذا قال البائع أبیعک نقداً بکذا، ونسیئۃ بکذا'' وافترقا علی ذلک دون أن یتفقا علی تحدید واحد من الشقّین، فإنہ لا یجوز'' (فقہ البیوع ۱/۵۴۲)۔

جواب /۲ ۔اس سوال کے جواب میں زیادہ تر حضرات نے عدم جواز کی رائے دی ہے اور شرائط کے ساتھ جواز کی رائے بھی پیش کی ہے، مطلق جواز کی رائے مفتی عبدالمنان صاحب نے دی ہے، لیکن انھوں نے کوئی دلیل مقالہ میں درج نہیں کی ہے، صابر حسین صاحب ندوی نے بھی جواز کا رجحان پیش کیا ہے اور بیع بالتقسیط کو نظیر بنایا ہے اور بطور دلیل المغنی کی عبارت درج کی ہے، بقیہ حضرات شرائط کے ساتھ جواز کی

• استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء،لکھنؤ۔

طرف گئے ہیں۔

ڈاکٹر ظفرالاسلام صدیقی صاحب نے اپنی رائے میں حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی رائے بطور تائید پیش کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو دین کا کچھ حصّہ اس وقت چھوڑنا جائز ہے جب کہ یہ چھوڑنا تعجیل کے لیے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کردے۔

مولانا محفوظالرحمن شاہین جمالی صاحب عدمِ جواز کی رائے دینے کے بعد استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''إلاّ یہ کہ بلاشرط مشتری پر احسان کرتے ہوئے قیمت میں سے کچھ ساقط کردے تو جائز ہے، مولانا محمدعثمان بستوی نے بھی عدم جواز کی رائے دینے کے بعد شرط کے ساتھ بعض صورتوں میں جواز کی بات کہی ہے، آپ لکھتے ہیں: البتہ اگر معاملہ کرتے وقت ادھار کی شرط نہ لگی ہو تو فی الفور ادا کرنے کی صورت میں ثمن کا کچھ حصّہ ساقط کرنے کی پیش کش کرنا شرعاً جائز ہے، اسی طرح اگر معاملہ میں ادھار کی شرط ہو اور وقت متعین ہو اور بائع وقت سے پہلے ادا کرنے کی صورت میں بلاشرط کے ثمن کا کچھ حصّہ کم دے تو یہ بھی جائز ہے۔

تقریباً زیادہ تر حضرات نے بیہقی کی روایت سے استدلال کیا ہے اور ضع وتعجل کے اصول کو سامنے رکھ کر اس معاملہ میں ائمۂ اربعہ کی رائے کے مطابق اپنا رجحان ظاہر کیا ہے، فقہاء کی تصریحات بھی پیش کی ہیں۔

دلائل:

(۱)'' لما أمر النبي ﷺبإخراج بني النضير من المدينة جاء ه ناس منهم فقالوا يا رسول اللّٰہ! إنک أمرت بإخراجهم ولهم على الناس ديون لم تحل فقال النبي ﷺ:ضعوا وتعجّلوا'' (السنن الكبرى للبيهقي ۶/۲۸)۔

(۲) ''أسلفت رجلاً مائة دينار ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول اللّٰہ ﷺفقلت له عجل لي تسعين ديناراً واحط عشرة دنانير، فقال: نعم فذكر ذلک لرسول اللّٰہ ﷺ فقال: أكلت رباً يا مقداد وأطعمته''(السنن الكبرىٰ للبيهقي ۶/۲۸)۔

ان کے علاوہ مؤطا امام مالکؒ اور مصنف عبدالرزاق کی بھی روایتیں ہیں (الموطا ۱/۶۰۶، المصنف ۸/۷۱ تا ۷۴)۔

بعض فقہی عبارتیں بھی بعض حضرات نے پیش کی ہیں۔

(۱) ''لأن المعجل خير من المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بإزار ما حطه وذلک إعتياض عن الأجل وهو حرام''(ھدایہ ۳/۲۵۱)۔

(۲) ''وفي الخانية، رجل باع شيئاً بيعاً جائزاً وأخّر الثمن إلى الحصاد والدياس قال يفسد البيع عند أبي حنيفة رحمه اللّٰہ، وعن محمد رحمه اللّٰہ لا يفسد البيع ويصح التأخير لأن التأخير

بعد البیع تبرّع فیقبل التأجیل إلی الوقت المجهول" (شامی ۷/۵۴)۔

(۳)'' وممّا یتعامل بہ بعض التجّار في الدیون المؤجلۃ أنهم یسقطون حصۃ من الدین بشرط أن یعجل المدیون باقیۃ قبل حلول الأجل مثل أن یکون لزید علی عمرو ألف، فیقول زید ''عجّل لي تسع مأۃ وأنا أضع عنک مأۃ'' وإن هذه المعاملۃ معروفۃ في الفقہ باسم ''ضع وتعجل'' وهذا التعجیل إن کان مشروطاً بالوضع من الدین، فإن المذاهب الأربعۃ متفقۃ علی عدم جوازہ''(ہدایۃ مع فتح القدیر،فقہ البیوع۱/۵۴۵ تا ۵۴۶)۔

جواب /۳ ۔ سوال نمبر ۳ کے جواب میں زیادہ تر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ مشتری کو عیب کی وجہ سے خیار رد اور حق فسخ حاصل ہوگا، مبیع رکھ کر نقصان کی تلافی کا حق نہیں ہوگا، بعض حضرات نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ جب بیع رد کرنا ممکن نہ ہو اس صورت میں رجوع نقصان کا حق حاصل ہوگا، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب نے جواب میں لکھا ہے کہ گھٹیا اور بڑھیا ڈائمنڈ کے درمیان قیمت میں جتنا فرق ہو اتناہی قیمت میں سے کمی کرواسکتے ہیں، موصوف نے بطورِ دلیل المنتقی مع مجمع الأنهر کی عبارت پیش فرمائی ہے، مولاناصابر حسین ندوی صاحب نے خیار عیب کی بنا پر اختیار کی بات کہی ہے، دلیل میں دائمی کمیٹی کا ایک طویل فتویٰ نقل کیا ہے، مفتی عثمان صاحب بستوی نے اس سوال کے جواب میں قدرے وضاحت کی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ جب تک مبیع مشتری کی ملکیت میں موجود ہے اس کو واپس کرسکتا ہے یا معاملہ کو فسخ کرکے جانبین کی رضامندی سے دوبارہ کم قیمت پر معاملہ کیا جاسکتا ہے، لیکن بغیر معاملہ کو فسخ کیے مبیع کو روک کر ثمن کو مشتری کے لیے کم کردینے کا اختیار نہیں، موصوف نے آگے ایک استثنائی صورت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: البتہ اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ مبیع کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو بقدرِ نقصان ثمن کم کرنے کا اختیار ہوگا، دلیل میں فقہ البیوع کی عبارت درج کی ہے، اور عام طور پر مقالہ نگاروں نے فقہ البیوع کی عبارت اپنے مقالوں میں درج کی ہیں:

عبارت یہ ہے:''وکذلک الجودۃ والرداء ۃ في أسواق السلع تنضبط بدرجات معلومات، فشراء سلعۃ علی أنها من الدرجۃ الأولی أو الثانیۃ شرط جائز یثبت بہ خیار فوات الوصف فإن هذه الدرجات معروفۃ الیوم في عرف التجار بأوصاف معلومۃ... إذا رضي المشتري بالمبیع وأراد أن یمسکہ بدون الوصف المشروط فإنہ یمسکہ بجمیع الثمن لأن الأوصاف لا یقابلها شئ من الثمن وهذا لا خلاف فیہ، قال ابن قدامۃ رحمہ اللّٰہ فمتی بان خلاف ما اشترطہ، فلہ الخیار في الفسخ والرجوع بالثمن أو الرضا بہ ولا شئ لہ لا نعلم بینهم في هذا خلافاً'' (فقہ البیوع ۸۷۸-۸۷۹)۔

مفتی جنید پالن پوری صاحب نے مبیع واپس کرنے کی رائے کے ساتھ یہ بات بھی

لکھی ہے کہ البتہ دونوں کو ایسی صلح کرنے کا بھی اختیار کہ مشتری مبیع اپنے پاس رہنے دے اور دونوں آپسی رضامندی سے قیمت کا کچھ کم کردیں بشرطیکہ معاملہ شریعت کی طرف سے طے کردہ صلح کی شرائط کے مطابق ہو، حوالہ میں فقہ البیوع اور دررالحکام شرح مجلۃ الأحکام کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں، جویہ ہیں:

''أما إذا رضي المتبايعان على الأرش بطريق الصلح، جرت عليه أحكام الصلح عند الحنفية، قال ابن همام رحمة الله عليه ولو وجد به عيباً فاصطلحاً على أن يدفع أو يحيط ديناراً جاز'' (فقہ البیوع)۔

''صاحب خيار العيب له قبول المبيع بثمنه المسمّى كله وليس له إمساكه ونقص الثمن بما يقابل العيب إلاّ إذا رضي البائع'' (درر الحكام شرح مجلة الأحكام ۱/۳۳۵)۔

مولانا عمر بن یوسف کنی صاحب نے تقریباً یہی رائے حاشیۃ الجمل کے حوالہ سے لکھی ہے۔

تمام مقالہ نگاروں کی آراء اور دلائل کا جائزہ لینے سے جوبات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈائمنڈ گھٹیا نکلنے کی صورت میں دیکھا جائے گا کہ مبیع مشتری کی ملک میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو دھوکہ اور غبن فاحش پائے جانے کی وجہ سے مشتری کو مبیع رد کرنے کا حق حاصل ہوگا، اور رد ممکن نہ ہو تو بقدر نقصان ثمن کم کرنے کا اختیار ہوگا، راقم کے خیال میں یہ بات فقہی اصول اور فقہاء کی تصریحات سے زیادہ قریب ہے۔

جواب /۴ ۔ اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ دھوکہ پائے جانے کی وجہ سے مشتری کو مبیع واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا، رجوع بالنقصان کا حق حاصل نہیں ہوگا، ان حضرات نے دلائل میں عام طور پر وہ فقہی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں عیب یا غرر کی وجہ سے مشتری کو مبیع واپس کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

مفتی محمدعثمان بستوی صاحب کی رائے عام حضرات سے قدرے الگ ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر جوہری سے اصلی ہیرا طلب کیا جائے اور اس نے دھوکہ دیتے ہوئے کیمیکل والا ہیرا دے دیا جو پرکھنے کے بعد کیمیکل والا ظاہر ہوگیا تو یہ بیع باطل ہوگئی، کیوں کہ جنس بیع میں تغریر بیع کے بطلان کا سبب ہے، دلیل میں فقہ البیوع کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''التغرير في بيان جنس المبيع وذلك مثل أن يقول بائع الحلية إنها حلية ذهب فتبيّن أنها من فضة مطلية بالذهب فالبيع في مثل هذا باطل، قال ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ إذا اشترى هذه الجارية فظهرت غلاماً فالبيع باطل لعدم المبيع'' (فقہ البیوع مع حاشیہ ۱/۲۰۸)۔

دوسری دلیل المحیط البرہانی کی عبارت ہے:

‘‘ولو باع دارا على أن بناء ها أجر فإذا هو لبن فالبيع باطل، الأغراض والمقاصد تتفاوت تفاوتاً فاحشاً فليلتحق بالجنس المختلف فيتعلق العقد بالمسمى والمسمى معلوم’’ (المحيط البرهاني ص: ۲۷۲)۔

نتیجہ کے اعتبار سے تقریباً تمام حضرات اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عقد میں ذکر کردہ مبیع کی جنس بدل جائے یا عمدہ کی جگہ گھٹیا قسم کی مبیع دے تو مشتری کو رد کا حق حاصل ہوگا، رجوع بالنقصان کا حق نہیں ہوگا۔

جواب /۵۔ اس سوال کے جواب میں مولانا شاہین جمالی، ڈاکٹر ظفرالاسلام صدیقی اور مولاناعمر بن یوسف صاحب کو کنی نے صراحت کے ساتھ عدم جواز کی رائے دی ہے، اور عدم جواز کی بنیادیں الگ الگ بتائی ہیں۔

البتہ مفتی جنید پالن پوری صاحب کی رائے ہے کہ یہ شرکت کا معاملہ ہے، اگر بیع کی صراحت کی جائے تو یہ بیع مرابحہ ہوگی۔

مفتی نثاراحمد گودھروی صاحب کی رائے ہے کہ مشتری کا اگر بائع سے سودا مکمل ہوچکا ہے تو یہ شرکت ہے ورنہ نہیں۔

مفتی محمدعثمان بستوی نے اس صورت کو شرکت مانا ہے اور جواز کی رائے دی ہے اور یہ لکھا ہے کہ شرکت کی یہ صورت درست ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ خریدار نے اپنے خریدے ہوئے ڈائمنڈ کے نصف حصّہ کو دوسرے سے مقررہ قیمت میں فروخت کردیا ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے، دلیل میں انھوں نے شامی، فتح القدیر اور عالمگیری کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

راقم کے خیال میں شرکت کی یہ صورت درست ہے، کیوں کہ خریدار پہلے شخص سے خریدنے کے بعد دوسرے سے معاملہ شرکت کر رہا ہے اور یہ مستقل علاحدہ معاملہ ہے جس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

جواب /۶۔ اس سوال کے جواب میں مولانا شاہین جمالی صاحب کی رائے ہے کہ یہ صورت جائز نہیں ہے، کیوں کہ ایک شریک اپنے حصّہ کا ڈائمنڈ اور دوسرا نقد ملاکر شرکت کرر ہا ہے جب کہ شرکت عنان میں دونوں طرف نقد ضروری ہے، یہی رائے مفتی جنید صاحب پالن پوری کی ہے، لیکن عدم جواز کی وجہ عدم ملک بتاتے ہیں اور استثنائی صورت جواز کی بھی تحریر کی ہے، لکھتے ہیں: البتہ اگر ج سے وعدۂ شرکت کرے اور پھر الف سے خرید کر شریک کرلے تو جائز ہے، وعدۂ شرکت کی صورت میں بیع تولیہ ہوگی اور وعدۂ بیع کی صورت میں بیع مرابحہ ہوگی۔

اور مفتی محمد عثمان بستوی صاحب کی رائے ہے کہ جب مالک کسی سے فروخت کرنے کی پیش کش کرے اور وہ خریدنے سے پہلے دوسرے سے بھاؤتاؤ کرلے، بھاؤتاؤ

کے بعد خرید کرکے جس سے بھاؤتاؤ ہوا ہے اس سے مبیع کا کچھ حصّہ فروخت کردے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن خریدنے سے پہلے دوسرے سے مبیع کا کچھ یا کل حصّہ فروخت کردینا شرعاً جائز نہیں، کیوں یہ بیع قبل الملک ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ مسئلہ کی اس شق میں بھی وہی رائے قابل ترجیح ہے جو نمبر ۵ میں ہے، یعنی بائع کی پیش کش کے بعد کسی دوسرے سے معاملہ کرے اور خریدنے سے قبل کرے، پھر مبیع کا کچھ حصّہ فروخت کردے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، ورنہ نہیں، کیوں کہ اس میں بیع قبل القبض کی صورت پیش آتی ہے جو درست نہیں ہے۔

* * *

دوسرا باب

مقالات

جواہرات کی خرید وفروخت -بعض جدید شکلیں

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی•

محور اول:

۱۔ دلال شرع میں اجیر کا نام ہے، بائع اور مشتری کو بتلائے بغیر دس روپیہ خود رکھ لینا درست نہیں ہے، جبکہ اس کو چار فیصد (۴%)دلالی فیس الگ سے ملتی ہے، یہ سراسر خداع اور دھوکہ ہے۔

۲، الف: یہ صورت درست اور جائز ہونی چاہئے۔

۲، ب: اس کی دوسری شق کا حکم بھی وہی ہے جو جواب ۱ کا ہے، یہ بھی دھوکہ دھڑی میں سے ہے، اس نے بائع اور مشتری دونوں کا کام جو اجارہ تھا اس پر عمل نہیں کیا۔

۳۔ کیا اس طرح کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے بچا لینے پر مالک حضرات اس کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اگر مطالبہ نہیں کرتے ہیں تو کیا یہ تعامل کی صورت اختیار کرچکا ہے؟ اگر تعامل کی صورت اختیار کرچکا ہے تو اصول فقہیہ ''العادۃ محکمۃ'' اور ''استعمال الناس حجۃ یجب العمل بہا'' (شرح القواعد الفقہیہ،۲۱۹۔۲۲۳) کے تحت اس کا خریدنا درست ہے، یقینی طور پر جب معلوم نہ ہو کہ کون سا مال چوری کا ہے اور کون سا نہیں، اس صورت میں احتیاط اس مارکیٹ سے نہ خریدنے میں ہے، حدیث میں آتا ہے، ''دع ما یریبک إلی ما لا یریبک''۔

۴۔ اس کا خریدنا درست ہے، معتبر بات بائع کی ہوگی۔

۵۔ مبیع پر قبضہ ہوچکا ہے، لیکن ثمن کے دینے میں کسی وجہ سے تاخیر کررہا ہے تو یہ دین حال ہے، اس لئے اسے فروخت کرکے اس کی قیمت واپس کرنا اور نفع رکھ لینا درست معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ ابھی مبیع پر تخلیہ اور تمکن نہیں ہوا یعنی قبضہ نہ تو حساً ہوا نہ حکماً، سرے سے مبیع مشتری کے قبضہ میں نہیں آتی، یہ بیع ما لیس عندک کے قبیل سے ہے، ایسا معاملہ درست نہیں ہے، لہذا دونوں قیمتوں کے فرق کو اپنا نفع تصور کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے۔

محور دوم:

۱۔ یہ دین مؤجل کی فروختگی غیر مدیون (یعنی دلال سے) کم قیمت کے عوض نقد ہے، یہ درست نہیں ہونا چاہئے، انٹرنیشنل اکیڈمی جدہ کی قرارداد ۱۰۱ (۱۱،۴) ملاحظہ ہو: ''دین

• سابق شیخ الحدیث وپرنسپل جامعہ دار العلوم مئو۔

مؤجل (دیر سے ادا کیا جانے والا دین) کی فروختگی غیر مدیون سے نقد معجل (فوری ادا کی جانے والی نقد) کے عوض خواہ (خواہ یہ نقد معجل اسی (پہلے) کی جنس سے ہو یا دوسری جنس سے جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ربا تک جا پہنچتا ہے " (۳۱۶ ،طبع ایفا پبلی کیشن)۔

۲۔ بائع کو چاہئے (اگر واقعی بائع کسی جائز سبب کے وقت پر پیسہ نہ دے سکا) مشتری کو مہلت دے ''وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة'' اگر اسے کوئی قرض بلا سود نہ دے سکے اور کوئی صورت وقت پر ادائیگی کی نہ ہو تو یہ خود ہی اضطراری حالات میں سود لے سکتا ہے، کیونکہ اسے مہلت بھی نہیں مل پارہی ہے، ساتھ ہتک عزت کا خطرہ بھی ہے، لیکن اس سود کو جلد ادا کرنے کی کوشش کرے اور جب تک سود نہ دے توبہ واستغفار کرتا رہے (دیکھئے منتخبات نظام الفتاوی۳،۱۰۱)۔

۳۔ مال کے نقص کے سبب مشتری ثمن میں کمی کرسکتا ہے جیسا کہ ماقبل میں بیان کیا جاچکا ہے، لیکن ۴۰۰ فی کیرٹ خرید کر ۷۰۰ روپے کی فی کیرٹ فروخت کرنا غبن فاحش ہے اور اس کی تفسیر انشاء اللہ جواب نمبر ۶ میں آئے گی، اس کی بنیاد پر بیع قابل رد ہے، صاحب تنویر الابصار لکھتے ہیں: ''ويفتى بالرد'' (دیکھئے الدر المختار علی الرد۷،۳۶۳ زکریا)۔

۴۔ شئی کو معیب بتلا کر (جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے) خریدنا اور پھر اسی چیز کے زیادہ سے زیادہ فضائل بیان کرکے زیادہ قیمت میں بیچنا یہ خداع ہے اور اسےتلقی رکبان کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے، حافظ ابن حجرؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''وهو خداع فى البيع والخداع لا يجوز ..... أجاز أبوحنيفةؒ التلقى وكرهه الجمهور'' ۔ امام الحرمین نے اس کی تعریف یوں لکھی ہے: ''فى صورة التلقى المحرم أن يكذب فى سعر البلد ويشترى منهم بأقل من ثمن المثل..... وذكر أبوإسحاق شيرازى أن يخبرهم بكساد ما معهم ليغنيهم''۔ حضرت امام اعظمؒ نے بھی دوشرطوں کی موجودگی ''أن يضر بأهل البلد، وأن يلتبس السعر على الواردين '' میں کراہت کا قول فرمایا ہے (دیکھئے فتح الباری۴،۴۷۱-۴۷۲) ، یہ معاملہ جائز مع الکراہت ہونا چاہئے۔

۵۔ جب اس نے کہا مجھے سستا مال چاہئے، ملاوٹ رہنے یا نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں، ان دونوں جملوں کا ایک ہی مفہوم ہے، اب اس میں تاجر کو بتلانےکی کیا ضرورت ہے، لیکن اگر اس نے یہ جملے نہیں کہے اور سستا مال بغیر اطلاع کے دیدیا گیا تو عیب کے مطلع ہونے کے بعد کیا کرنا ہے، محور چہارم کے ۳، ۴ میں انشاء اللہ معلوم ہوگا۔

۶۔ جی ہاں شرعاً تحدید ہے غبن فاحش نہ ہونے پائے۔ غبن فاحش کی تعریف ''ما لم يدخل تحت تقويم المقومين'' ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''وذلك كما لو وقع البيع بعشرة مثلاً ثم إن بعض المقومين يقول إنه يساوى خمسة وبعضهم ستة وبعضهم سبعة فهذا غبن فاحش لأنه لم يدخل تحت تقويم أحد ..... (وبه أفتى بعضهم مطلقاً) أى سواء كان الغبن بسبب التغرير

.....(ویفتی بالرد) ظاہرہ الإطلاق .....(وبہ أفتی صدر الإسلام وغیرہ) (رد المحتار علی الدر ۳۶۳٫۷ زکریا)، ایک شخص کوئی سامان دس روپیہ میں فروخت کرے؛ جبکہ قیمت لگانے والے اس کی قیمت ۵، ۶، ۷ تک لگاتے ہیں تو اس شئی کو دس روپیہ میں فروخت کرنا غبن فاحش کہلائے گا۔

محور سوم:

۱۔ الف اور ب کی دونوں صورتوں میں ڈسکاؤنٹ درست ہے، ج میں نہیں ''إ نما تعتبر العادة إذا أطردت أو غلبت'' (شرح القواعد الفقہیہ۲۳۳)۔

۲۔ کیا بنوانے والا ٹال کو صحیح مال کے طور پر فروخت کرتا ہے یا ٹال کے طور پر، پہلی صورت میں اجرت مثل ملنی چاہئے، اور اگر دوسری صورت ہے تو مارکیٹ کے رواج کو فوقیت ہوگی۔

۳۔ ایک زیروکم کرنے کا مقصد سیل ٹیکس بچانا ہے جو جائز نہیں، گورنمنٹ کی چوری بھی چوری ہے، نیز ہتک عزت کا خطرہ بھی، پھر یہ کہ پیسہ نہ ملنے کی صورت میں قانوناً اصل رقم پر کلیم (چارہ جوئی) بھی نہیں کرسکتے۔

۴۔ میرے خیال میں اس کا بھی مقصد وہی ہے جو سوال نمبر ۳ کا ہے، لہذا جواب بھی وہی ہوگا۔

۵۔ بچے ہوئے ذرات کی بابت مالک حضرات اس کا مطالبہ اگر نہیں کرتے ہیں اور اس طرح کا چلن بھی ہوچکا ہے تو اس کا رکھ لینا درست ہے اور اگر اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس وقت جھوٹ بول کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی تو درست نہیں۔

۶۔ کیا پتھر کی تجارت میں دھاگوں کی کمی وبیشی کی شناخت کا کوئی معیار ہے؟ اگر اس کا کوئی معیار ہے تواس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بصورت دیگر بازار کے چلن کو ہی مانا جائے گا۔

۷۔ مال کے اصل وزن کا اعتبار ہوگا نہ کہ پرچی کا، گو کہ بائع بدرجۂ مجبوری ایک قیراط پر راضی ہوجاتا ہے؛ چونکہ یہ بیع بہ طیب خاطر نہیں ظلماً ہے، قرآن مجید میں صحیح وزن کے ساتھ لین دین کی بڑی تاکید آئی ہے:''أوفوا الکیل ولا تکونوا من المخسرین، وزنوا بالقسطاس المستقیم'' (الشعراء: ۱۸۱-۱۸۲)۔

۸۔ سوال سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ امین ہے اور امین کے سلسلہ میں فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ''ایک مسئلہ اسی ذیل میں تضمین صانع کا بھی آتا ہے، دھوبی سے کپڑے ضائع ہوجائے، جوتا بنانے والے سے چمڑہ ضائع ہوجائے تو کیا اس سے ضمان وصول کیا جائے گا؟

حضرت نے ابتدائی عہد میں تضمین صانع کو امین مان کر ضمان نہ لینے کا قول

فرما کر لکھا ہے: ‘‘غالباً حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہلی بار یہ فتوی دیا کہ حالات ایسے بدل گئے ہیں کہ لوگ اس کو اپنی بددیانتی کے لئے ڈھال بنالینگے اس لئے صانع کو ضامن قرار دیا جائے گا، ‘‘لا یصح الناس إلا بالتضمین’’ (لوگوں کے حالات اس کے بغیر درست نہیں رہ سکتے)۔

سطور بالا کی روشنی میں راقم کا بھی یہی خیال ہے کہ ایک زیرو واضافہ کے ساتھ رقم اس پر لازم ہوگی۔

محور چہارم:

۱۔ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ قیمت بڑھانا جائز ہے؛ بشرطیکہ عاقدین بوقت عقد کسی ایک ثمن پر متفق ہوجائیں، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے، حضرت نے ترمذی شریف،۱۳۳۱ وغیرہ کتب فقہیہ سے استدلال فرمایا ہے (دیکھئے فقہی مقالات۱،۸۲۔۸۴)، انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے میں مذکور ہے: ‘‘نقد قیمت کی بہ نسبت ادھار قیمت میں زیادتی جائز ہے، نیز اس مجلہ کے ساتویں سمینار کی تجویز میں بھی یہی ہے (،۱۷۹۔۲۱۳)۔

فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم علامہ ابوبکر کاسانی کی تحریر ‘‘لا مساواۃ بین النقد والنسیئۃ’’ اور فقہاء شافعیہ میں سے امام رافعی کی ‘‘إذا اشتراہ بثمن مؤجل وجب الاخبار عنہ للتفاوت الظاہر بین المعجل والمؤجل فی المالیۃ’’ ، اور ابن قدامہ کی تحریر: ‘‘وقد عرف ..... أن التفاوت فی الأسعار المؤجلۃ والمعجلۃ حقیقۃً ثابتۃ وأمر معروف’’ جواز کے تحت ذکر فرمائی ہیں، دیکھئے نوازل فقہیہ معاصرہ ۱،۳۵۱۔۳۵۲، یہی رائے منتخبات نظام الفتاوی ۳،۳۹ پر بھی ہے۔

۲۔ شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ‘‘دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو دین کا کچھ حصہ اس وقت چھوڑنا جائز ہے؛ جبکہ یہ چھوڑنا تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کردے ’’، حضرت نے استدلال میں ابوبکر جصاص رازی کی تحریر احکام القرآن (۱،۴۶۷) سے ذکر فرمائی ہے: ‘‘ومن أجاز من السلف إذا قال عجل لی أو ضع عنک فجائز أن یکون أجازوہ إذا لم یجعلہ شرطاً فیہ وذلک بأن یضع عنہ بغیر شرط ویعجل الآخر الباقی بغیر شرط’’ (فقہی مقالات۱،۱۱۴)۔

اس کے پہلے صفحہ ۱۰۰ پر حضرت لکھتے ہیں: ‘‘اصطلاح شرع میں اسے ضع وتعجل سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعیؒ، احناف سے امام زفر بن ہذیل اور شوافع میں سے شیخ ابو ثور اس کے جواز کے قائل ہیں، عثمانی صاحب بحوالہ فقہ وفتاوی

اس کے جواز کی ایک صورت ‘‘یعنی مرابحہ کے طور پر اگر معاملہ کرلیا جائے یعنی جس میں نفع مدت کے مقابلہ میں ہو تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مقررہ مدت تک جتنے میں ایام باقی ہیں اس کے مقابل ثمن چھوڑنا ہوگا ’’ لکھ کر اس کا رد بایں الفاظ کرتے ہیں کہ تو پھر اس صورت میں بیع مرابحہ اور قسطوں پر بیع کی ان سودی معاملات سے مشابہت ہوجائے گی جو درست نہیں ہے (دیکھئے فقہی مقالات۱،۱۱۸)۔

میرے خیال میں جصاص رازی کی بات بہت بہتر ہے، جس میں دائن تبرعاً کچھ دین ساقط کردے، لیکن کیا فی زمانہ ایسا ممکن ہوسکے گا، یہ ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے، اس لئے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وامام زفرؒ وغیرہ کے مسلک پر فتوی دیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۳، ۴۔ درج ذیل جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کمی بھی کرواسکتا ہے اور لوٹا بھی سکتا ہے۔

‘‘مطلب وجد فی الحنطۃ تراباً’’ کے مذکور ہے ، ‘‘وإن فحش خیر المشتری أخذ الحنطۃ بحصتہا من الثمن أوردہا وأخذ کل الثمن’’ (رد المحتار علی الدر ۱۹۸،۷ زکریا)، ‘‘وفی النسفیۃ سئل عمن اشتری من آخر نقرۃ علی أنہا خالصۃ زجرداد فقبضہا وکسرہا فلم یکن زجر داد ہل لہ أن یردہاعلی البائع بہذا القدر فقال نعم’’ (فتاوی تاتارخانیہ ۴۲۴،۸)، معلوم ہوا کہ عیب فاحش کی بنیاد پر دونوں کا اختیار ہے۔

۵،۶۔ شرکت دراصل قوت خرید ۲،لاکھ پر ہونی چاہئے نہ کہ سوا دو لاکھ پر، مذکورہ دونوں صورتیں دھوکہ کی ہیں، دونوں کی شرکت مساوی ثمن پر جو ڈائمنڈ کی اصل قیمت ۲،لاکھ ہے اس پر ہونا چاہئے، میرا خیال یہ ہے کہ بتلانے یا نہ بتلانے سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

جواہرات کی بیع سے مربوط اہم مسائل

مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی•

محور اول:

اسلام کے عادلانہ معاشی نظام میں تجارت انسانوں میں باہمی تعاون اور خدمتِ خلق کی ایک بہترین صورت ہے، جس کے ذریعے تجارت پیشہ افراد اپنے دوسرے ابنائے جنس کو اپنی پیداکردہ یا تیار کردہ یا دور دراز سے لائی ہوئی اشیاء وخدمات بالعوض (Cost) یا بالمبادلہ (Exchange) پیش کرکے تعاونِ باہمی کا ایک نظام قائم کرتے ہیں، جہاں نفع کماناثانوی مقصد ہوتا ہے اور انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق اولین مقصد ہوتا ہے، اسی طرح تجارت وسائلِ حیات میں سے ایک اہم وسیلہ کا درجہ رکھتی ہے اور عمرانیات کی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔

تجارت کا مقصد منافع جات اور فائدوں کا تبادلہ ہے، تجارت کا یہ مفہوم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تجارت وجود میں اس لئے آئی کہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے میں دوسروں کے محتاج ہیں، ہر شخص کسی نہ کسی شئی یا خدمت کے لئے دوسرے کا محتاج ہے، ایک شخص جو نفع اور اشیاء تیار کرتا ہے یا رکھتا ہے وہ دوسرے کو نقدی کے عوض بیچ کر یا تبادلہ میں دے کر اس سے اپنی ضرورت کی اشیاء اور خدمات حاصل کرتا ہے؛ گویا یہ نفعوں کا تبادلہ ہے جو معاشرت اور معاش کی روح ہے، جس کا ذریعہ تجارت ہے ۔

اسلام نے تجارت کے بابرکت پیشہ کو پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھنے کے لئے چند ضوابط مقرر کئے ہیں اور یوں تجارکو تلقین کی ہے کہ وہ ان ضوابط کی پابندی کریں، ورنہ یہ بابرکت پیشے -جس پر ثواب وآخرت کا وعدہ بھی ہے -بعض صورتوں مینان کے لئے حرام رزق کا ذریعہ اور آخرت میں رسوائی کا ذریعہ بنے گااور بعض صورتوں میں وہ ذریعہ شکوک وشبہات کے دائرے میں آجائے گا۔

لیکن اس کے باوجود بعض مرتبہ عاقدین کے درمیان رسم ورواج کی بناء پر یا غیروں سے تجارت کے نتیجہ میں کچھ ایسی صورتیں وجود میں آجاتی ہیں، جس کا شرعی حل پیش کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی قسم کے سوالات کا حل پیش کرنے کی ذیل میں کوشش کی گئی ہے :

• شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ ،گجرات۔

جواب (۱) :

سمسرۃ کی اجرت کی ایک شکل یہ ہے کہ کوئی اجرت مقرر کرلی جائے، اجرت کی مقدار معین کردی جائے کہ تمہیں پانچ ہزارروپے دیں گے تو اس کو سبھی جائز کہتے ہیناور محقق قول کے مطابق حنفیہ کے ہاں بھی جائز ہے،لیکن عام طورسے سمسرۃ میں جو صورت ہوتی ہے وہ اس طرح اجرت معین نہیں ہوتی؛ بلکہ فیصد کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے کہ جتنے میں تم بیچو گے اس کا دو فیصد تم کو ملے گا۔

آج کل کی اصطلاح میں اس کو کمیشن ایجنٹ (Commission Agent) بھی کہتے ہیں، یعنی تم جو سامان بیچوگے اس کی قیمت کا دوفیصد تمہیں ملے گا، ایک فیصد ملے گا، اجرت فیصد کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔

بعض وہ حضرات جو سمسرۃ کو جائز کہتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اس قسم کی اجرت مقررکرنا جائز نہیں، اس لئے کہ سمسرۃ در حقیقت ایک عمل کی اجرت ہے اور سمسار کا عمل ثمن کی کمی بیشی سے کم اورزیادہ نہیں ہوتا ،وہ تو مشتری کو تلاش کررہا ہے ،اب اگر ثمن ایک لاکھ ہے تب بھی اس کو اتنا عمل کرنا پڑتا ہے اور اگر ثمن ایک ہزار ہے تب بھی اتنا ہی عمل کرنا پڑتا ہے؛ لہذا اس کو ثمن کی مقدار کے ساتھ مربوط کرکے اس کا فیصد مقرر کرنا؛ بعض نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے ۔

مفتی بہ قول : لیکن اس میں بھی مفتی بہ قول یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور علامہ شامیؒ نے بعض متاخرین حنفیہ سے نقل کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ اجرت کا عمل کی مقدار کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے ؛ بلکہ عمل کی قدروقیمت اور عمل کی حیثیت کے لحاظ سے بھی اجرت میں فرق ہوجاتا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲،۲۰۰، ط: فیصل بکڈپو دیوبند)۔

لیکن یہاں بروکر (دلال) دلالی کی اجرت چار فیصد کے علاوہ مذکور عقد میں مثلا ۱۰/ روپیہ اور کمالیتا ہے؛ جبکہ نہ وہ بائع ہے اور نہ مشتری ،مذکور بروکر اپنی محنت اور سعی کی جو اجرت متعین تھی یعنی چار فیصد ،اسی کا حقدار تھا، اب درمیان سے ۱۰/ روپیہ بائع ومشتری کے علم میں لائے بغیر لے لینا یہ دھوکہ اور بائع کو ضرر پہنچانا ہے، اور ناحق طریقے پر کسی کا مال لینا ہے، اللہ پاک فرماتے ہیں:

"یٰـأیہا الذین اٰمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم" (النساء : ۲۹)۔

اسی طرح حدیث میں بھی مذکور ہے : "ولا یحل لامرأ من مال أخیہ إلا ما طابت بہ نفسہ" (مسند احمد ۲۰۱،۱۲، رقم الحدیث: ۱۵۴۲۷، ط: دار الحدیث القاہرہ) ۔

دوسری ایک خرابی یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں بروکر مبیع کا مالک نہیں ہے، اور نہ ہی وہ بائع کا وکیل ہے اور نہ ہی اسے ولایت حاصل ہے، اور نہ وہ چیز اس کے

ضمان میں آرہی ہے اور نہ یہ فضولی کی قبیل سے ہے، ایسی صورت میں وہ بائع کے قبضہ سے لے کر مشتری کے حوالے کررہا ہے اور بائع کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ ۶۵میں فروخت کی گئی ہے ،جبکہ مشتری کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ ۷۵میں خریدی گئی ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''ومنہا:الملک والولایۃ فلا تنعقد إجارۃ الفضولی لعدم الملک والولایۃ؛ لکونہ ینعقد موقوفا علی إجازۃ المالک عندنا ..... ثم الإجازۃ إنما تلحق الإجارۃ الموقوفۃ بشرائط...'' (بدائع الصنائع ۴،۲۰، کتاب الاجارہ، باب شرائط رکن الاجارۃ ومعناہا، ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

پھر اُجر کا دیانتدارہونا بھی ضروری ہے ،اللہ پاک فرماتے ہیں: ''إن خیر من استأجرت القوی الأمین'' (القصص: ۲۶) ۔

صورت مذکورہ میں بروکر نے خیانت اس طرح کی ہے کہ مشتری کو یہ بتارہا ہے کہ بائع نے ۷۵میں بیچا ہے، جبکہ بائع کو یہ باور کراتا ہے کہ مشتری ۶۵ میں خریدنے کے لئے تیار ہے، ایسی صورت میں دونوں طرف غرر ہورہا ہے، دھوکہ کی صورت میں معاملہ تو صحیح ہوجاتا ہے، لیکن عاقد کو ختم کرنے کا اختیار رہتا ہے، جبکہ غرر کی صورت میں عقد ہی صحیح نہیں ہوتا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

غرر کی اصطلاحی تعریف مینگو اہل علم کی تعبیرات مختلف ہیں؛ لیکن حاصل ان سب کا ایک ہی ہے کہ غرروہ بات ہے جس کا انجام معلوم نہ ہو ''الغرر ما یکون مستور العاقبۃ''۔

غرر سے قریبی لفظ ''غرور ''ہے، غرور کے معنی دھوکہ کے ہیں، غرر میں دونوں فریق انجام سے بے خبر ہوتے ہیں، مثلا ایک شخص دوسرے شخص سے ایک گم شدہ جانور خرید کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جانور کی قیمت کم لگائی جاتی ہے،پس اگر خریدار اس بات سے واقف ہے کہ جانور کہاں ہے تو یہ غرور (دھوکہ) ہے اور اگر دونوں ناواقف ہوں تو ''غرر '' ہے۔

دھوکہ کی صورت میں اکثر حالات میں معاملہ منعقد ہوجاتا ہے، لیکن دھوکہ کھانے والے شخص کو اس کے رد کرنے کا اختیار رہتا ہے،بخلاف غرر کے کہ غرر کی وجہ سے معاملہ ہی صحیح نہیں ہوتا۔

غرر کا زیادہ اثر خرید وفروخت کے معاملہ پر پڑتا ہے، تجارتی معاملات میں غرر کی کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں؟ ان پر سب سے زیادہ شرح وبسط سے فقہاء مالکیہ نے گفتگو کی ہے، اس سلسلے میں علامہ باجی، ابن رشداور ان ہی کے ہم نام ان کے پوتے علامہ قرافی اور ابن جزی، وغیرہ کے نام خاص طورپر قابل ذکر ہیں۔

غرر کب اثر انداز ہوتا ہے؟

غرر کی معمولی کیفیت سے کسی معاملہ کا خالی ہونا بظاہر دشوار ہے، اس لئے شریعت میں ہر غرر کو معاملات کے لئے باعث فساد نہیں مانا گیا ہے، ڈاکٹر صدیق محمد

الامین الضریر نے فقہاء کی تصریحات کو سامنے رکھ کر غرر کے مؤثر ہونے کے لئے چار شرطیں مقرر کی ہیں:

(۱) مالی لین دین کے معاملات ہوں جیسے بیع، اجارہ، شرکت ۔

(۲) غرر کثیر ہو، معمولی غرر نہ ہو، معمولی غرر معاملات کے فاسد ہونے کا باعث نہیں ۔

(۳) غرر اس چیز میں پایا جائے جو معاملہ کی بنیاد ہے،یعنی خود معقود علیہ میں غرر ہو، جیسے زیر حمل بچہ کی بیع، اگر جانور کی مع حمل بیع کی جائے تو جائز ہے، کیونکہ یہاں پر جانور معقود علیہ ہے اور حمل تابع۔

(۴) حقیقی انسانی حاجت اس کے درست ہونے کا تقاضہ نہیں کرتی ہو، حاجت کی بناء پر شارع نے بھی اور فقہاء نے بھی مختلف مواقع پر غرر کو گوارا کیا ہے، جیسے کھیتی میں بٹائی کی اجازت وغیرہ (قاموس الفقہ ۴،۴۳۲-۴۳۰، مادہ: غرر، ط:کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں بروکرکی تین حیثیتیں ہوجاتی ہیں: (۱) دلال وبروکر،کیونکہ اس نے چار فیصد اجرت لے لی ہے،(۲) مشتری جبکہ وہ بائع کو یہ بتلاتا ہے کہ اس کا خریدار ۶۵روپے میں خریدنے والا موجود ہے،اور درحقیقت وہ خود مشتری بن جاتا ہے، (۳) بائع جبکہ وہ مشتری کو یہ بتلاتا ہے کہ یہ چیز ایک شخص ۷۵میں فروخت کررہا ہے، حالانکہ وہ خود اس کو فروخت کررہا ہے، اس لئے اس میں غرر فاحش کی وجہ سے یہ معاملہ ختم ہوجانا چاہئے، اور بروکر صرف اجرت مثل کا حقدار ہونا چاہئے ۔

جواب (۲) :

اگر اس صورت میں وہ چار فیصد دلالی کی اجرت لے اور اپنے آپ کو خریدارہی ظاہر کردے تو اس کے جواز میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، لیکن یہاں دلالی کی اجرت لینے نہ لینے میں اس کا اختیار باقی رکھا گیا، اس لئے اس کی حیثیت واضح نہ ہوکر مشکوک ہی رہی؛ لہذا اس صورت کا حکم مذکورہ بالا صورت کی طرح ہونا چاہئے ۔

جواب(۳،۴):

شریعت اسلامیہ نے اس عادلانہ نظام کی بقاء کے لئے ایسے ضوابط واصول بیان کئے جس سے فریقین کے درمیان عقد میں عدل باقی رہے، اور کسی کی حق تلفی نہ ہو، کسی کے ساتھ ظلم نہ ہو، انہیں اصول میں سے ایک جسے کام سپرد کیا جائے اس کو کام میں امانتداری کا خیال رکھنا ہے، حوالہ کی ہوئی چیز میں چوری، غصب یا بددیانتی نہ ہو، اس کا خیال رکھناہے، اسی طرح بائع بھی ایسی چیز بیچے جس کا وہ درحقیقت مالک ہے۔

اسلام نے اپنے قوانین تجارت کی بنیاد عقیدہ اور اخلاق پر رکھی ہے، اسلام تجارکو سکھاتا ہے کہ وہ اللہ کریم کے بندے ہیں، جو ان کے ہرڈھکے چھپے کو ہر وقت دیکھتا اور

جانتا ہے ۔

{إنّ اللهَ كَانَ عَليكُم رَقيبًا} (نساء: ۱۰۴) (یقینا اللہ کریم ہر ایک شئی پر نظر رکھے ہوئے ہے)۔

اور جب اسلام نے یہ سکھادیا کہ تمام مسلمان (بلکہ انسان) آپس میں بھائی بھائی ہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک بھائی کم تول کر اور زیادہ قیمت وصول کرکے اپنے بھائی کو نقصان پہنچائے اور دوسرا کم قیمت دے کر یا ناقص مال دے کر کھرے مال کی قیمت وصول کرے اوریوں اپنے بھائی کا معاشی استحصال کرے۔

اسلام چاہتا ہے کہ تجارت پیشہ افراد اخلاق حسنہ سے متصف ہوں، وہ اخلاقِ حسنہ ہیں: صدق وامانت، دیانت، معاملات کی صفائی، اور اگر معاملہ طے کرنے میں کبھی تکرار تک نوبت پہنچ جائے تو نرم گفتگو اور عزتِ نفس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، نبی کریم ﷺ نے ان اوصاف سے متصف تجارت کے لئے دعا کی ہے: ‘‘رحم الله رجلا سمحا إذا باع، وإذا اشترى، وإذا اقتضى’’ (اللہ کریم کی رحمت ہو اس شخص (تاجر) پر جو جب کبھی بیچے، خریدے اور قرض لینے کا مطالبہ کرے تو نرم گوئی سے کرے اور درگذر کا معاملہ کرے)۔

تجارتی اخلاق حسنہ کو آپ ﷺ نے ایک دوسرے انداز میں یوں ادا فرمایا: ‘‘البيعان بالخيار ما لم يتفرّقا؛ فإن صدقا وبينا بورک لهما فی بيعهما، وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما’’ (متفق علیہ) (بیوع میں خیار ہوتا ہے جب تک فریقین (بائع ومشتری) علیحدہ نہ ہوجائیں، البتہ اگر انہوں نے سچائی اختیار کی اور (مبیع یعنی فروخت اور خرید کی جانے والی شئی کے عیوب کو)واضح بیان کردیا تو انہیں ان کی تجارت میں برکت دی جائے گی، اور اگر انہوں نے عیوب کو چھپایا اور جھوٹ بولا تو ان کی بیع کی برکت مٹادی جائے گی۔

مذکورہ احادیث سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے تعلیم کردہ تجارتی ضابطہ اخلاق کے اپنا نے سے نہ صرف آخرت میں اجروثواب کا وعدہ ہے، بلکہ دنیا میں بھی ان اخلاقِ کریمانہ سے مزین تجارکو برکت اور فلاح کی خوشخبری سنادی گئی ہے (تجارت کے اسلامی اصول وضوابط، باب : ۳،تجارت کے اسلامی اصول، فصل اول، ص: ۷۷-۷۳، ط: مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی)۔

لہذا کوئی شخص چوری کا مال بیچتا ہے تو وہ درحقیقت اس کا مالک ہی نہیں ہے، اس لئے مذکورمال مسروق بیچنا اس کے لئے جائز ہی نہیں ہے، اور اگر مشتری کو یہ معلوم بھی ہو کہ یہ مال چوری کا ہے تو اس کے لئے خریدنا بھی جائز نہیں ہے، اگر خرید لیا تو وہ بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہے، حدیث میں ہے :

‘‘عن أبی ہريرة عن النبي ﷺ أنہ قال:من اشترى سرقة، وہو يعلم أنہا سرقة، فقد

اشترک فی عارہا وإثمہا، ورواہ سفیان الثوری عن مصعب بن محمد عن شیخ من أہل المدینۃ قال؛ قال رسول اللہ ﷺ: من ابتاع سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ، فقد اشترک فی عارہا وإثمہا" (السنن الکبری للبیہقي : کتاب البیوع، باب کراہیۃ مبایعۃ من اکثر مالہ من الربا۵، ۳۳۶،ط: دار الفکر۔ المستدرک للحاکم: کتاب البیوع، رقم الحدیث: ۲۲۵۳، ۳،۱۲۴، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اگر یقینی طورپر یہ معلوم ہو یا غالب گمان ہو کہ یہ مال چوری کا ہے تو اس کو خریدنا جائز نہیں ہے، اور اگر یقینی طورپر معلوم نہیں ہے کہ یہ مال چوری کا ہے، بلکہ یقین وگمان مساوی ہے یا شک ہے تو ایسی صورت میں دوحالتیں ہوگی:(۱) جو مالک سے متعلق ہو، (۲) جو ملک سے متعلق ہو۔

پہلی قسم کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں:(۱) بائع مجہول الحال ہو، اس میں ایسا کوئی قرینہ نہ ہو جس سے یہ علم ہوسکے کہ یہ مال چوری کا ہو سکتاہے، اور نہ ہی اس کے ارد گرد ایسا کوئی شخص مل سکے جس سے اس مجہول الحال کے بارے میں کوئی تحقیق ہوسکے، تو ایسی صورت میں اس کا مال خریدنا جائز ہونا چاہئے ۔

دوسرا وہ بائع جو مشکوک معلوم ہوتا ہو، بایں طورکہ اس میں ایسی علامات ہو جس سے اس کے معاملات، اور اشیاء میں عدم تقوی اور عدم اجتناب معلوم ہوتا ہے، جیسے اس نے ایسا لباس پہنا ہو جو ظالم وجابر لوگوں کا ہوسکتاہو، یا اس کی ہیئت ایسی ہو، یا ایسے امور وافعال نظر آئے جس سے یہ معلوم ہوجائے کہ یہ معاملات میں حلال وحرام کی تمیز نہیں رکھ سکتا، تو سوال کرلینا اور تحقیق وتفتیش کرنا ورع وتقوی کی قبیل سے ہوگا، اور اگر اس کے اموال میں غالب مال کا تعلق حرام اموال سے ہونے کا شک ہو جائے تو پھر نہ خریدنا چاہئے ۔

تیسرا وہ شخص جو صالح ودیانتدار معلوم ہوتا ہو، علامات وہیئت اور معاملات وگفتار سے بھی معلوم ہوجائے کہ یہ شخص دیانت دار ہے،تو خرید نے میں حرج نہیں ہے اور اگر اس کا دوسرا پہلو سامنے آئے تو پھر تحقیق کرنا ضروری ہے، اس کے بعد ہی خریدنے کی گنجائش ہوگی۔

اور اگر ایسے بازار میں مال بک رہا ہے جہاں عموما چوری ہی کا مال بکتا ہے تو اس کے لئے تحقیق کرنا لازم ہونا چاہئے ۔

حضرت فقیہ الامت تحریر فرماتے ہیں:

‘‘جس شئی کے متعلق قرائن سے غالب خیال یہ ہو کہ یہ چوری کی ہے، اس کو خریدنا درست نہیں، اگر خریدچکا ہے تو واپس کردے، اگر مالک کا علم ہو جائے تو اس کے حوالے کردے، پھر چاہے تو اس سے معاملہ کرے اورخرید لے ’’ (فتاوی محمودیہ ۱۶،۸۶، کتاب البیوع، باب البیع الباطل والفاسد والمکروہ، سوال نمبر: ۷۷۷۳، ط: دار المعارف دیوبند)۔

علامہ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں:

‘‘وإذا تبين ہذا فيقال: ما فی الوجود من الأموال المغصوبۃ والمقبوضۃ بعقود لا تباح بالقبض، إن عرفہ مسلم اجتنبہ، فمن علمت أنہ سرق مالا أو خانہ فی أمانتہ أو غصبہ فأخذہ من المغصوب، قہرا بغير حق، لم يجز لی أن آخذہ منہ، لا بطريق الہبۃ ولا بطريق العوض، ولا وفاء عن أجرۃ ولا ثمن مبيع’’ (مجموعۃ الفتاوی لابن تيميہ ۲۹،۳۲۳، كتاب البيوع، قبيل باب الشروط فی البيع)۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

‘‘وسئل عن الرجل يشتري سلعۃ بمال حلال، ولم يعلم أصل السلعۃ، ہل ہو حرام؟ أو حلال؟ ثم كانت حراماً فی الباطن، ہل يأثم أم لا؟

فأجاب:متی اعتقد المشتری أن الذي مع البائع ملكہ، فاشتراہ منہ علی الظاہر، لم يكن عليہ إثم فی ذلک، وإن كان فی الباطن قد سرقہ البائع، لم يكن علی المشتری إثم، ولا عقوبۃ؛ لا فی الدنيا، ولا فی الآخرۃ، والضمان والدرک علی الذي غره وباعہ، وإذا ظہر صاحب السلعۃ فيما بعد ردت إليہ سلعتہ، ورد علی المشتری ثمنہ، وعوقب البائع الظالم؛ فمن فرق بين من يعلم ومن لا يعلم فقد أصاب، ومن لا أخطأ، والله أعلم’’ (مجموعۃ فتاوی ابن تيميہ ۲۹،۲۹۳)۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر مارکیٹ میں چوری کا مال بھی ملتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ چوری کا مال ہے، البتہ یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا اصل مالک کون ہے؟ تو ایسا مال نہ خریدا جائے، اور اگر یہ علم ہی نہیں ہے کہ یہ چوری کا مال ہے یا اس میں شک وشبہ ہے تو اس کی وضاحت اوپر گزر چکی اور اگر بیچنے والے سے پوچھ لیا کہ یہ مال چوری کا تو نہیں ہے؟ اس نے کہا: چوری کا نہیں ہے، تو اگر وہ بائع دیانت دار اور گفتار وکردار اور ہیئت سے صادق وصالح معلوم ہوتا ہو تو خرید نے میں حرج نہیں، بصورت دیگر اجتناب ضروری ہونا چاہئے۔

جواب (۵):

زید نے ایک شخص سے مال خریدا، قیمت ادا نہیں کی اور بائع نے وہ مبیع زید کے قبضہ میں دے دی، تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بائع زید کو مذکورہ مبیع ادھار دینے پر رضامند ہوگیاہے،اب چیز اپنے قبضہ میں آنے کے بعد زید اگر وہ چیز دوسرے شخص کو نقد روپے میں بیچ دے، تو یہ ثمن اس کے لئے طیب وحلال ہونا چاہئے، اب وہ بائع اول کو اسی رقم سے واجب الاداء (ادھار قیمت) ادا کردے تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

‘‘انعقاد بیع کے لیے شرط ہے کہ بوقت عقد مبیع موجود ہو، پس بالکل نا پیدچیز کی بیع جائز نہیں، إلا یہ کہ بیع سلم یا عقدِ استصناع شرائط کے مطابق ہو ۔

انعقادِ بیع کے لیے شرط ہے کہ مبیع بائع کی مملوک ہو،لہذا بائع جس چیز کا مالک

نہ ہو ایسی چیز کی بیع باطل ہے، اسی طرح شرعاً مباح الاصل قرار دی گئی چیزوں کی بیع بھی باطل ہے،جیسے سمندر اور ندیوں کا پانی، گھانس اور آگ وغیرہ ۔

بیع کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط نہیں کہ مشتری عقد کے وقت نقود (پیسوں)کا مالک ہو،اگر بوقتِ عقدوہ پیسوں کا مالک نہیں تب بھی بیع درست ہوجائے گی اور ثمن اس کے ذمہ پر واجب ہوگا۔

اگر بیع کا ثمن نقد ہے تو بیع کی صحت کے لیے یہ شرط نہیں کہ یہ ثمن بوقتِ عقد مشتری کی ملکیت ہو، اس لیے کہ ثمن مشتری کے ذمہ پر واجب ہوتا ہے، پس یہ جائز ہے کہ ادائیگی کے وقت مالک بن جائے، خواہ بیع نقد ہو یا ادھار " (اسلامی قانون خرید وفروخت: متعاقدین سے متعلق احکام۳۵، ۳۲،ط: جامعہ علوم القرآن جمبوسر)۔

جواب(۶) :

اس صورت میں درمیانی شخص کا پہلے شخص (بائع) سے نہ عقد بیع ہوا ہے؛ نہ ہی وعدۂ بیع، اور وہ تیسرے شخص کے ساتھ اصل قیمت میں نفع ملاکر معاملہ طے کرلیتاہے، جبکہ شخص اول سے اس کا نہ بیع کا عقد ہوا اورنہ وعدۂ بیع، اور بیع کی شرائط میں سے یہ ہے کہ بائع مبیع کا مالک ہو، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''عن حكيم بن حزام قال:أتيت رسول الله ﷺ فقلت:يأتيني الرجل يسألني من البيع ما ليس عندى، ابتاع له من السوق ثم أبيعه؟ قال:لا تبع ما ليس عندک" (ترمذي : كتاب البيوع، باب ماجاء فى كراهية بيع ما ليس عندک، رقم الحديث: ۱۲۳۲، ص:۳۲۱،ط: دار الكتب العلميه بيروت)۔

اسی لئے فقہاء احناف لکھتے ہیں کہ عقد کے وقت مبیع بائع کی ملک میں ہونی چاہئے، عقد کے بعد مالک بننے کااعتبار نہ ہونا چاہئے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے :

''للمبيع شروط هي:

أن يكون المبيع موجودا حين العقد، فلا يصح بيع المعدوم، وذلک باتفاق الفقهاء، وهذا شرط انعقاد عند الحنفية۔

وأن يكون مملوكا لمن يلي العقد:

وذلک إذا كان يبيع بالأصالة، واعتبر الحنفية هذا الشرط من شروط الانعقاد، وقسموه إلى شقين: الأول: أن يكون المبيع ملوكا في نفسه، فلا ينعقد بيع الكلأ مثلا، لأنه من المباحات غير المملوكة، ولو كانت الأرض مملوكة له۔

الثانى:أن يكون المبيع ملک البائع فيما يبيعه لنفسه، فلا ينعقد بيع ما ليس مملوكا، وإن ملكه بعد، إلا السلم والمغصوب، وما إذا كان يبيعه بالوكالة، أو النيابة الشرعية، كالولي الوصي والقيم'' (الموسوعة الفقهيه: ماده : بيع۹، ۱۵،۱۴،ط: وزارة الاوقاف الكويت)۔

جو چیز کوئی شخص بیچنا چاہتا ہو تو اس میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان بھی

برداشت کرسکتا ہو، یعنی مبیع اس کے ضمان میں بھی آنی چاہئے، اگر ضمان میں ہی نہ آئے، اور اس کو نفع کے ساتھ بیچنا چاہے تو اس کے لئے یہ نفع لینا درست نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''حدثنا عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ قال:حدثنی أبی عن أبیہ، حتی ذکر عبداللہ بن عمرو أن رسول اللہ ﷺ قال : لا یحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یُضمن، ولا بیع ما لیس عندک'' (ترمذي : کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراہیۃ بیع ما لیس عندک، رقم الحدیث: ۱۲۳۴، ص: ۳۲۱،ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

اور فقہی قاعدہ ہے : ''الخراج بالضمان'' اسی کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ مصطفی احمد الزرقاء رقم طراز ہیں:

''وخراج الشیئ:ما حصل منہ، والذي یکون منہ بمقابلۃ الضمان ما کان منفصلاً غیر متولد، کالکسب والأجرۃ، والہبۃ، والصدقۃ، فإنہ یطیب لمن کان علیہ الضمان۔

فلو رد المشتري المبیع بعد قبضہ بخیار العیب، وکان قد استعملہ مدۃ لا یلزمہ أجرتہ، لأنہ لو کان قد تلف في یدہ قبل الرد لکان یتلف من مالہ۔

وکذلک لو کان آجرہ، فإن الأجرۃ تطیب لہ۔

لکن اختلف في المبیع قبل القبض إذا حدثت الزیادۃ المنفصلۃ غیر المتولدۃ، ثم رُدَّ بالعیب، فعند محمد: ہي للمشتري بلا ثمن، وعندہما: ہي للبائع، واتفقوا علی أنہا لا تطیب لمن ہي لہ، لأن طیبہا إنما یکون بالملک والضمان، وقبل القبض لم یجتمعا في أحدہما، بل الملک للمشتري، والضمان علی البائع، حتی لو ہلک المبیع، والحالۃ ہذہ، یہلک من مالہ'' (شرح القواعد الفقہیہ: رقم القاعدۃ: ۸۴،رقم المادۃ: ۸۵،ص: ۴۲۹،ط: دار القلم دمشق)۔

اور نہ ہی یہ شخص ثانی کی طرف سے شخص اول کے ساتھ وعدۂ بیع ہے،کہ اس کو شخص ثالث کے ہاتھوں فروخت کیا جائے، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

سب سے پہلے مسئلہ یہ ہے کہ ''برآمد یا ایکسپورٹ '' میں بیع منعقد ہونے کے وقت کا تعیّن شرعی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے، اور قانونی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے، یعنی وہ پوائنٹ آف ٹائم کیا ہے جس میں بیع (سیل) حقیقۃ منعقد ہوجاتی ہے، اور وہ پوائنٹ آف ٹائم کیا ہے جس میں ضمان (رسک) ایکسپورٹر سے امپورٹر کی طرف منتقل (پاس ان) ہوجاتا ہے ؟ اس وقت کا تعیّن اس لئے ضروری ہے کہ بہت سے قانونی مسائل پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اور بہت سے شرعی مسائل پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، لہذا پوائنٹ آف ٹائم کے تعیّن کے لئے دو چیزوں کے درمیان ایک واضح فرق ذہن میں رکھنا انتہائی ضروری ہے ۔

‘‘بیع ’’ اور ‘‘وعدۂ بیع ’’ کے درمیان فرق:

بیع (سیل) اور ‘‘وعدۂ بیع ’’ (ایگریمنٹ ٹو سیل) دونوں کے درمیان فرق کا ذہن میں رکھنا انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر ‘‘برآمد ’’ کے مسائل کو صحیح طورپر نہیں سمجھ سکتے، شریعت میں بھی ‘‘بیع ’’ علیحدہ چیز ہے، اور ‘‘وعدۂ بیع ’’ علیحدہ چیز ہے، اور قانون کے اعتبار سے بھی ‘‘سیل ’’(Sale) اور چیز ہے اور ‘‘ایگریمنٹ ٹو سیل ’’ علیحدہ چیز ہے، آج کل عام بول چال میں ‘‘کنٹریکٹ ’’ (Contract) معاہدہ کا جو لفظ بولا جاتا ہے، اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے، اس لئے ‘‘کنٹریکٹ ’’ (معاہدہ)سیل (بیع) کا بھی ہوسکتاہے، اور ‘‘ایگریمنٹ ٹو سیل ’’ کا بھی ‘‘کنٹریکٹ ’’ (معاہدہ) ہوسکتاہے، لیکن دونوں ‘‘کنٹریکٹس ’’ معاہدوں میں بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ‘‘شریعت ’’ اور ‘‘قانون ’’ دونوں میں الگ الگ طریقے سے متعین کیا گیا ہے، اس فرق کو سمجھنا ضروری ہے ۔

فرق یہ ہے کہ موجودہ قانون کے اعتبار سے جب کسی چیز کی ‘‘سیل ’’ (بیع) ہوجاتی ہے تو اس سیل کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ملکیت منتقل ہوجاتی ہے، بلکہ عام حالات میں اس کا رسک (ضمان، خطرہ) بھی خریدار کی طرف منتقل ہوجاتاہے، مثلا میں نے ایک ٹیپ ریکارڈر خریدا، اور ابھی یہ ٹیپ ریکارڈر بائع(سیلر)ہی کے قبضے میں رہنے دیا، -لیکن اس ٹیپ ریکارڈر کی بیع ہوچکی-اور اس بیع کے نتیجے میں اس کی ملکیت میری طرف منتقل ہوگئی تو اس صورت میں موجودہ قانون کے اعتبار سے اس ٹیپ ریکارڈر کا رسک (ضمان) بھی میری طرف منتقل ہوچکاہے، اب اگر سیلر (بائع) کے قبضے میں وہ ضائع ہوجائے،یا چوری ہوجائے یا خراب ہوجائے تو نقصان میرا ہوگا، بائع کا نہیں ہوگا، اس لئے کہ موجودہ عام قانون میں رسک (ضمان، خطرہ) کی منتقلی قبضے پر موقوف نہیں ہے، بلکہ جیسے ملکیت منتقل ہوگی، رسک(ضمان) بھی منتقل ہوجائے گا، لیکن اسلامی قانون میں یہ صورت نہیں ہے، بلکہ اسلامی قانون میں دوچیزیں الگ الگ ہیں؛ ایک ہے ٹائٹل اور ملکیت کا منتقل ہونا،اور دوسرا ہے اس کا رسک اور ضمان منتقل ہونا، اسلامی شریعت کا حکم یہ ہے کہ صرف بیع ہوجانے پر ملکیت منتقل ہونے سے رسک (ضمان، خطرہ) منتقل نہیں ہوتا، جب تک اس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوجائے، لہذا جب تک اس ٹیپ ریکارڈر کو میں اپنے قبضہ میں نہ لے لوں، یا میرا وکیل اور نمائندہ اس پر قبضہ نہ کرلے، چاہے وہ قبضہ حقیقی ہو یا عرفی ہو، اس وقت تک اس کا ضمان میری طرف منتقل نہیں ہوگا، موجودہ قانون اور شرعی قانون میں یہ فرق ہے (فقہی مقالات: عنوان: برآمدات کے شرعی احکام ۳، ۶۷-۶۵،ط: زم زم بکڈپو)۔

محور دوم:

جواب (۱):

تجارت، خرید وفروخت اور بیع وشراء کے سلسلہ میں بھی اسلام نے نہایت متوازن

اصول مقرر کئے ہیں، جس میں تاجر اور خریدار کی نفسیات اور ا ن کے جذبات کا پورا پورا لحاظ ہے،جس میں اس بات کی پوری پوری رعایت ہے کہ گراں فروشی کو روکا جائے، جس میں اس بات کا پورا پورا خیال ہے کہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہونے پائے، جس میں اس امر کا پورا پاس رکھا گیا ہے کہ طرفین کی رضامندی کے بغیر کوئی معاملہ ان پر مسلط نہ کیا جائے، اور جس میں قدم قدم پر یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ ایک فریق دوسرے کا استحصال نہ کرے،تجارت کے معاملہ کو دھوکہ دہی، فریب اور چالبازی سے محفوظ رکھا جائے، اور جہاں کوئی ایسا کرگزرے تو اس کی تلافی کی تدابیر بھی فراہم رکھی جائیں۔

بیع کے باب میں چند اصول بنیادی اور اساسی اہمیت کے حامل ہیں، مناسب ہے کہ ''اجمال '' کے ساتھ پہلے ان کا ذکر کردیا جائے ۔

بیع کی شرطیں چار طرح کی ہیں، شرائط انعقاد، شرائط نفاذ، شرائط صحت اور شرائط لزوم ۔

بعض شرطیں مبیع اور اس کے ثمن، یا دونوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہیں:

(۱) مبیع اور ثمن دونوں مال ہوں، (۲)مبیع موجود ہو، (۳) بائع کی ملکیت میں ہو،(۴) بائع مبیع کے حوالہ کرنے پر قادر ہو۔

بیع کے نافذ وجاری ہونے کے لئے دوشرطیں ہیں:

(۱) بیچنے والا اس سامان کا مالک ہو، یا ولی اور نگراں کی حیثیت سے اس کو وہ سامان فروخت کرنے کا حق حاصل ہو۔

(۲) اس سامان سے تاجر کے سوا کسی اور کا حق متعلق نہ ہو (قاموس الفقہ : مادہ : بیع، ۲، ۳۵۵-۳۵۴،ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

مذکورہ صورت میں بائع ومشتری کے درمیان ایجاب وقبول ہوا ہے، اور اس مبیع کا مالک بائع تھا، عقد کے بعد اس کا مالک مشتری بن گیا، اب درمیان میں دلال واجب الاداء رقم کی رسید بائع سے خریدے تو یہ مبیع نہیں ہے، اور نہ ہی بائع ومشتری کے اس ادھار معاملہ میں حوالہ یا کفالہ کے حوالے سے اس کا کوئی تعلق ہے، اس لئے اس طرح دَین کی خرید وفروخت درست نہ ہونی چاہئے، پرچی کوئی مبیع نہیں ہے، اور بائع عقد کے دوران مشتری کو ادھار بیچنے پر رضامند ہوچکا ہے اور واجب الاداء رقم پر دلال کا اس طرح کا معاملہ سودی معلوم ہوتا ہے ۔

اگر یہ دلال بیع کی صورت میں نفع لینا چاہے تو بہتر صورت یہ ہے کہ وہ بائع سے نقد ثمن دے کر کم قیمت پرمشتری کو مطلوب مبیع خرید لے اور مشتری کو ادھار میں زیادہ قیمت میں بیچ دے، یا دلال کا جو کمیشن بنتا ہو؛ وہ بائع کو بتلادے، تاکہ بائع ومشتری کے درمیان عقد مکمل ہوجانے کے بعد وہ بائع سے اسی مقدار میں کمیشن لے سکے ۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں مذکور ہے :

‘‘اختلف الفقہاء في حکم تملیک الدین لغیر مَنْ علیہ علی أربعۃ أقوال:

أحدہما: روایۃ عن أحمد ووجہ عند الشافعیۃ : وہو أنہ یجوز تملیک الدین من غیر مَن علیہ الدین بعوض وبغیر عوض۔

والثاني: للحنفیۃ والحنابلۃ والشافعیۃ في الأظہر: وہو أنہ لا یصح تملیک الدین لغیر من ہو علیہ، سواء أکان بعوض أم بغیر عوض، کأن یقول شخص لآخر : وہبتک مالي من دین علی فلان، فیقبل، أو یقول لہ: اشتریت منک کذا بما لي من دین علی فلان، فیقبل، أو یقول لہ: استأجرت منک کذا بالدین الثابت لي في ذمۃ فلان، فیقبل، فہذا کلہ غیر جائز، لأن الواہب أو المشتري أو المستأجر یہب أو یبیع ما لیس في یدہ، ولا لہ من السلطۃ شرعا ما یمکنہ من قبضہ منہ، فکان بیعا لشیئ لا یقدر علی تسلیمہ، إذ ربما منعہ المدین أو جحدہ، وذلک غرر، فلا یجوز۔

وقد استثنی الحنفیۃ من قاعدۃ عدم جواز تملیک الدین لغیر من ہو علیہ ثلاث حالات:

الأولی:إذا وکل الدائن الشخص الذي ملکہ الدین في قبض ذلک الدین من مدینہ، فیصح ذلک، ویقبض الدین من المدین باعتبارہ وکیلا عن الدائن، وبمجرد القبض یصیر قابضا لنفسہ، وتنتقل ملکیۃ الدین إلیہ۔

والثانیۃ: إذا أحال الدائن الشخص الذي ملّکہ الدین علی مدینہ، فیصح ذلک، ویقبض الدین من المدین باعتبارہ محالا من الدائن علیہ، وبمجرد القبض تنتقل ملکیۃ الدین إلیہ۔

والثالثۃ: الوصیۃ، فإنہا تصح بالدین لغیر من ہو علیہ، لأنہا تملیک مضاف إلی ما بعد الموت، فینتقل الملک فیہ کما ینتقل بالإرث’’ (الموسوعۃ الفقہیۃ:مادۃ: دین۲۱،۱۳۱،۱۳۰، ط: وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ الکویت)۔

جواب (۲):

ایسی صورت میں مشتری پر واجب الاداء رقم کی میعاد پوری ہوجائے اور وہ اس کی ادائیگی کے موقف میں نہ ہو تو ایسی صورت میں دوسرا شخص مذکور مشتری کے قرض کی ادائیگی کے لئے اپنے نام سے سودی قرض لے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا، مشتری کا اپنے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کو مقروض بنانا اور خصوصا سودی معاملہ میں ملوث کرنا جائز نہیں ہے، خواہ سود کی ادائیگی مشتری کرے، کیونکہ بنک میں اس سودی قرض کا جوابدہ دوسرا شخص ہی ہوگا اور دوسرے شخص کو قرض کی ادائیگی کے لئے اس حرام کے ارتکاب کی ہر گز اجازت نہیں دی جاسکتی ۔

رہا مشتری کا خود واجب الاداء رقم کی ادائیگی کے لئے سودی قرض لینا، تو یہ بھی بڑے گناہ کا کام ہے، رد المحتار میں ہے :

‘‘کل قرض جر نفعًا حرام أی إذا کان مشروطا کما علم مما نقلہ عن البحر، وعن الخلاصۃ، وفی الذخیرۃ:وإن لم یکن النفع مشروطا فی القرض، فعلی قول الکرخی؛ لا بأس بہ’’ (کتاب البیوع، باب مرابحۃ والتولیۃ۷، ۳۹۵،ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

ہاں ! مشتری کو ایسے وقت سودی قرض لینے کی اجازت ہے جبکہ بغیر اس کے جان بچانی دشوار ہویا سخت مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے :

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر : الفن الأول، القاعدۃ الخامسۃ: الضرر یزال، رقم المسئلہ : ۱،۶۲۰،۳۲۷، ط: مکتبہ فقیہ الامت دیوبند)۔

اور علامہ حموی نے لکھا ہے :

''ہہنا خمسۃ مراتب ؛ ضرورۃ وحاجۃ ومنفعۃ وزینۃ وفضول، فالضرورۃ بلوغہ حدًا إن لم یتناول الممنوع ہلک أو قارب، وہذا یبیح تناول الحرام، والحاجۃ کالجائع لو لم یجد ما یأکلہ لم یہلک، غیر أنہ یکون فی جہد ومشقۃ''۔

اگر مشتری کے لئے اس کے علاوہ کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو،اور سخت مشقت وحرج میں مبتلا ہو، اور اس رقم کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں دشواری اور ضرر لاحق ہوتو ایسی صورت ِحال میں وہ سودی قرض لے کر واجب الاداء رقم کی ادائیگی کرسکتا ہے۔

جواب(۳) :

جب یہ ہیرا فی کیرٹ ۷۰۰روپے میں بک گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کی مالیت فی کیرٹ ۵۰۰ سے زیادہ کی تھی، اس کے باوجود دلال بائع سے یہ کہے کہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں تھا، اس لئے قیمت کم کرو، تو یہ صریح دھوکہ اور دروغ گوئی ہے ۔

نیز ایک مرتبہ دونوں کے درمیان ایجاب وقبول ہوچکا تھا اور عقد مکمل ہوگیا تھا، اب بائع ثانی کی طرف سے بائع اول سے کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے ۱۰۰/روپئے کم کروانا عقد وعہد کی خلاف ورزی ہے جو اخلاقی طورپر درست نہیںہے،تاہم اگر بائع اول نے ۱۰۰/روپئے کم کردیئے تو یہ اس کی رضامندی مان لی جائے گی اور عقد درست ہی رہے گا، علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

''وإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منہما إلا من عیب أو عدم رؤیۃ'' (الہدایہ: کتاب البیوع۳، ۲۰،اشرفی بکڈپو دیوبند)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

''لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (النساء: ۲۹) وبعد الإیجاب والقبول تصدق تجارۃ عن تراض غیر متوقف علی التخییر'' (فتح القدیر: کتاب البیوع۶، ۲۳۹،ط:زکریا بکڈپو دیوبند)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''أوفوا بالعقود''، جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے، اس لئے بمعنیٰ عہود ہوگیا.....، امام جصاصؒ نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد ومعاہدہ، اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس سے دو فریق نے آئندہ

زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑ نے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں، اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں، اس میں حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں، کسی نے کہا ہے : اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالی نے اپنے بندوں سے ایمان وطاعت کے متعلق لئے ہیں، یا وہ معاہدات جو اللہ تعالی نے اپنے نازل کئے ہوئے احکام حلال وحرام سے متعلق اپنے بندوں سے لئے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہی منقول ہے اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرلیا کرتے ہیں، جیسے معاہدۂ نکاح، معاہدۂ بیع وشراء وغیرہ، مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اس طرف گئے ہیں " (معارف القرآن ۲،۴۶، سورۂ مائدہ : ۱، جزء: ۶، ط: ادارۃ اشرفی دیوبند)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں :

''وأما الحنفية والمالكية فلا يقولون بخيار المجلس، وإنما يتم عندهم البيع بالإيجاب والقبول، ولا خيار لأحدهما بعد ذلک إلا بالشرط أو الرؤية أو العيب، وهو قول أبي حنيفة ومحمد وأبي يوسف ومالک بن أنس وسفيان الثوري وإبراهيم النخعي وربيعة الرأي، كما في الجوهر النقي''(تكملة فتح الملهم: كتاب البيوع، باب ثبوت خيار المجلس للمتبايعين۷،۳۵۳ ،ط: المكتبة الاشرفيه ديوبند)۔

جواب(۴):

یہ صورت اخلاقی طورپر قبیح ہے، کسی بھی آدمی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ خرید تے وقت اس کو گھٹیا ثابت کرے اور بیچتے وقت ایک دم عمدہ، بائع کا جو حق بنتا ہو اس کے بقدر ثمن ادا کرنا چاہئے، اور بیچتے وقت اپنا جو حق بنتا ہو اس کے موافق ہی نفع لینا چاہئے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''تطفیف صرف ناپ تول ہی میں نہیں؛ بلکہ حقدار کو اس کے حق سے کم دینا کسی چیز میں وہ تطفیف میں داخل ہے ''(معارف القرآن : سورۃ تطفیف۸، ۵۳، ط: ادارۂ اشرفی دیوبند)۔

مذکورفی السوال عمل کے بارے میں لکھتے ہیں: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں، اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان کسی سے خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹلائیں نہیں، اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو تنگ نہ کریں (معارف القرآن ۲،۳۰، سورۃ نساء: آیت نمبر : ۲۹، جزء: ۵، ط:

اشرفی بکڈپو دیوبند) ۔

اس سے یہ معلوم ہورہا ہے کہ بیع تو نافذ ہوجاتی ہے، لیکن اخلاقی طورپر یہ عمل بہت ہی برا ہے، اس کذب بیانی، اور دھوکہ کی وجہ سے یہ آدمی گنہ گار ہوگا۔

جواب(۵):

ایسی صورت میں ملاوٹ والا مال کسی کو بھی بیچا جائے تو بائع کی ذمہ داری یہ ہے کہ مبیع کی حقیقی صورت حال سے مشتری کو واقف کرے، اس معاملہ میں وہ کتمان عیب، دروغ گوئی اور دھوکہ سے کام نہ لے، مبیع میں اس طرح کی ملاوٹ عیب بھی ہے، اس سے واقف کرنا اس کے لئے ضروری ہے،تاہم مشتری کے علم واطلاع میں لائے بغیر بیچ دے تو بیع نافذ ہوجائے گی ؛ البتہ مشتری کو ایسی صورت میں خیار ملنا چاہئے،، ہاں ! اگر مشتری کے علم میں لاکر بیچتا ہے اور مشتری واقفیت کے بعد بھی خرید لیتا ہے تو اب اس کو خیار نہ ملنا چاہئے ۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

‘‘لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام۔

تنبیہ: قال في البحر:وإلی ہنا ظہر أن خیار العیب یسقط بالعلم بہ وقت البیع، أو وقت القبض أو الرضا بہ بعدہما أو اشتراط البراء ۃ من کل عیب، أو الصلح علی شیئ أو الإقرار بأن لاعیب بہ إذا عینہ کقولہ لیس بآبق فإنہ إقرار بانتفاء الإباق، بخلاف قولہ:لیس بہ عیب کما مر اہـ ملخصاً۔ قولہ: ‘‘لأن الغش حرام’’ ذکر في البحر أول الباب بعد ذلک عن البزازیۃ عن الفتاوی:إذا باع سلعۃ معیبۃ علیہ البیان، وإن لم یبین، قال بعض مشایخنا :یفسق ونرد شہادتہ، قال الصدر:لا نأخذ بہ اہـ، قال في النہر: أي لا نأخذ بکونہ یفسق بمجرد ہذا لأنہ صغیرۃ اہـ

قلت:وفیہ نظر لأن الغش من أکل أموال الناس بالباطل فکیف یکون صغیرۃ، بل الظاہر في تعلیل کلام الصدر أن فعل ذلک مرۃ بلا إعلان لا یصیر بہ مردود الشہادۃ وإن کان کبیرۃ کما في شرب السکر’’ (رد المحتار مع الدر المختار :کتاب البیوع، باب خیار العیب۷؍۲۳۰، ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

‘‘ولا بأس ببیع المغشوش إذا کان الغش ظاہرا کالحنطۃ بالتراب، وإن طحنہ لم یجز حتی یبینہ’’ (کتاب البیوع، فصل في الاحتکار۳؍ ۲۱۵،ط:مکتبہ زکریا دیوبند)۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں:

‘‘قال العبد الضعیف:وقال الموفق فی ‘‘المغنی’’ :من علم بسلعتہ عیبا لم یجز بیعہا حتی یبینہ للمشتری، فإن لم یبینہ فہو آثم عاصٍ، نص علیہ أحمد، لما روی حکیم بن حزام عن النبیﷺ، أنہ قال: ‘‘البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما، وإن کذبا وکتما محق برکۃ بیعہما’’(متفق علیہ)، وقال علیہ السلام : ‘‘المسلم أخو المسلم، لا یحل لمسلم باع من

أخيہ بيعا إلا بينہ لہ''، وقال :''من باع عيبا لم يبينہ لم يزل فی مقت الله، ولم تزل الملائكۃ تلعنہ'' رواہما (ابن ماجہ)، وروی ''الترمذي'' مرفوعا:''من غشنا فليس منا''، وقال:حديث حسن صحيح، والعمل عليہ عند أہل العلم كرہوا الغش، وقالوا:ہو حرام، فإن باعہ ولم يتبينہ فالبيع صحيح فی قول أكثر أہل العلم، منہم مالک، وأبو حنيفۃ، والشافعی، وحكی عن أبی بكر بن عبدالعزيز أن البيع باطل؛ لأنہ منہی عنہ والنہی يقتضی الفساد، ولنا أن النبي ﷺ نہی عن التصريۃ، وصحح البيع''۔

قال الموفق: وأنہ متی علم بالمبيع عيبا لم يكن عالما بہ فلہ الخيار بين الإمساک والفسخ، سواء كان البائع علم العيب وكلمہ أو لم يعلم، لا نعلم بين أہل العلم فی ہذا خلافاً'' (اعلاء السنن ۱۴؍۵۸۔۵۹، كتاب البيوع، ابواب بيع العيب، باب فی خيار العيب، رقم الحديث : ۴۶۳۰، ط: دار احياء التراث العربی، بيروت لبنان)۔

حضرت مولانا مفتی محمد كفايت الله صاحبؒ تحريرفرماتے ہيں:

''اس كا مطلب يہ نہيں ہے كہ اگر مشتری خالص چاندی مانگے تو ايسی چاندی جس ميں فی تولہ آٹھ ماشے چاندی اور چار ماشے كھوٹ ہو اسے دے دے اور يہ سمجھے كہ ميں نے كوئی دھوكہ نہيں ديا اور غش نہيں كيا، بيع ميں بائع كا فرض يہ ہے كہ مبيع كی اصلی حالت اور معائب سے مشتری كو مطلع كردے، جب كہ عارضی اوصاف جو مبيع ميں عيب پيدا كرتے ہيں ظاہر كرنا ضروری ہے توايسی صورت كہ تولہ بھر زعفران ميں جو مبيع ہے چارماشے زعفران ہی ذاتاً معدوم ہے اس كی جگہ كوئی دوسری چيز ملی ہوئی ہے بغير بيان كئے كيسے جائز ہوسكتی ہے اور ''من غش فليس منا'' كے دائرے سے كيسے يہ صورت مستثنی ہوسكتی ہے، ''لا يحل كتمان العيب فی مبيع أو ثمن لأن الغش حرام'' (كفايت المفتی ۸؍۴۶، كتاب البيوع، ساتواں باب خيار عيب، ط: زكريا بكڈپو ديوبند)۔

حضرت مولانامفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت بركاتہم لكھتے ہيں:

''اگر آپ گاہكوں كو اصل حقيقت بتا ديتے ہيں تو اس تيل كی فروخت آپ كے لئے جائز ہے اور زيادہ بہتر طريقہ يہ ہے كہ آپ اصل تيل بھی اپنے پاس ركھيں، اور يہ دوسرا تيل بھی، اور گاہكوں كو دونوں دكھاكر، دونوں كی قيمتيں بتا كر اور دونوں كا فرق واضح كركے بيچا كريں ''(فتاوی عثمانی ۳؍۱۰۲، كتاب البيوع، بيع ميں دھوكا اور عيب كا بيان، ط: كتب خانہ نعيميہ ديوبند)۔

جواب(۶):

شريعت مقدسہ ميں نفع كے بارے ميں كوئی حد مقرر نہيں ہے، بلكہ اس كو فطری اتار چڑھاؤ پر ركھا ہے، ہاں رسول الله ﷺ نے اس بات كو ملحوظ ركھا ہے كہ طلب ورسد ميں تناسب وتوازن قائم رہے؛ تاكہ قيمت ميں بھی توازن برقرار رہے، البتہ كسی

سامان پر اتنا زیادہ نفع حاصل کرنا جو غبن فاحش کے زمرہ میں آتا ہو کراہیت سے خالی نہیں، اور غبن فاحش یہ ہے کہ سامان کی قیمت مقرر کرنے والوں کے دائرۂ تخمین سے بھی زیادہ ہو۔

''وعرف الفقہاء الحنفیۃ الغبن الفاحش بأنہ ما لا یدخل تحت تقویم المقومین من أہل الخبرۃ، فلو قوم السلعۃ أحدہم بمائۃ درہم، وقومہا الثاني بخمسۃ وتسعین، وقومہا الثالث بتسعین مثلاً، فبیعہا بما بین التسعین والمائۃ فیہ غبن یسیر، وبالتسعین فما دونہا غبن فاحش بالبائع، وبالمائۃ فما فوقہا غبن فاحش بالمشتری۔

ثم حدد المتأخرون من الفقہاء الغبن الفاحش للتیسیر فی الفتویٰ والقضاء والتطبیق، أنہ ما بلغ خمس القیمۃ فی العقار، وعشرہا فی الحیوان، ونصف العشر فی العروض وسائر المنقولات، وبہذا أخذت مجلۃ الأحکام العدلیۃ '' (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید : کتاب البیوع، بیع المرابحۃ والتولیۃ، خیار التغریر۴،۱۹۳،ط: دار القلم دمشق) ۔

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

''قال: ولا ینبغي للسلطان أن یسعر علی الناس لقولہ علیہ الصلاۃ والسلام : لا تسعروا فإن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرازق، ولأن الثمن حق العاقد فإلیہ تقدیرہ۔۔إلا إذا تعلق بہ دفع الضرر العامۃ۔۔فإن کان أرباب الطعام یتحکمون ویتعدون عن القیمۃ تعدیًا فاحشاً، وعجز القاضی عن صیانۃ حقوق المسلمین إلا بالتسعیر فحینئذ لا بأس بہ بمشورۃ من أہل الرأي والبصیرۃ'' (الہدایۃ : کتاب الکراہیۃ، فصل فی البیع۴، ۱۵۰۳،ط: دارالسلام القاہرہ)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

''شریعت مقدسہ نے تجارت میں مال میں منافع حاصل کرنے کی کوئی خاص حد متعین نہیں کی کہ کوئی مال خرید کر آپ صرف اتنے فیصد نفع لے کر فروخت کرسکتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں، بلکہ اس کو عاقدین پر چھوڑدیا کہ وہ باہمی رضامندی سے جس طرح چاہیں معاملہ طے کرلیں، البتہ اس حد تک منافع لینا جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو، یا لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا خلافِ مروت ہے، اس لیے حکومت وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

ہاں البتہ مال کی بے جاتعریف کرنا یا عیب چھپانا یا نقلی اور جعلی مال کو اصلی ظاہر کرکے دھوکہ دے کر زیادہ رقم وصول کرنا یہ گناہِ عظیم ہے ''۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''شریعت میں نفع کے لیے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تاجرین کے عرف ورواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آجائے مکروہ ہے، غبن فاحش یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زیادہ سے زیادہ جوقیمت لگائی جاتی ہو،اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے ''

(کتاب الفتاویٰ ۵؍۲۱۱، تجارت سے متعلق سوالات، سوال نمبر : ۱۸۲۱،ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، فتاویٰ دارالعلوم زکریا :کتاب البیوع، جائز وناجائز خرید وفروخت کے احکام۵؍ ۲۲۲-۲۲۱،ط: مجلس البحوث والافتاء، لینیشیا،جنوب افریقہ)۔

محور سوم:

جواب (۱) :

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

دین موجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ ''چھوڑنا '' تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعًا دائن کچھ دین ساقط کردے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاصؒ نے ''ضع وتعجل'' کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں، ان کو اسی پر محمول کیاہے، وہ فرماتے ہیں:

''ومن أجاز من السلف إذا قال: عجل لی أو ضع عنک، فجائز أن یکون أجازوہ إذا لم یجعلہ شرطا فیہ، وذلک بأن یضع عنہ بغیر شرط، ویعجل الآخر الباقی بغیر شرط''۔

(جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ ''تم میرا دین جلد ادا کردو، میں تمہیں کچھ دین معاف کردوں گا '' بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو،دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کردے، اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کردے)۔

مرابحہ موجلہ میں ''ضع وتعجل '' کا اصول:

دین موجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا ''بیع مساومہ '' میں تو ناجائز ہے، یعنی ان بیوع کے اندر توناجائز ہے جس میں بائع اپنا منافع بیان کیے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھائوتائو کے ذریعہ فروخت کرتاہے، ہاں ! اگر ''بیع مرابحہ '' ہو جس میں بائع مدت کے مقابلے میں ثمن میں جوزیادتی کررہا ہے، اس کو صراحۃً بیان کردے، اس کے بارے میں متأخرین احناف کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون مدت مقررہ سے پہلے اپنا دین ادا کردے، یا مدت مقررہ آنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے، تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا،اور مقررہ مدت تک جتنے ایام باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا ہوگا، چنانچہ علامہ حصکفیؒ درمختار میں فرماتے ہیں:

''قضی المدیون الدین الموجل قبل الحلول أو مات، فحل بموتہ، فأخذ من ترکتہ لا یأخذ من المرابحۃ التی جرت بینہما إلا بقدر ما مضی من الأیام، وہو جواب المتاخرین، قنیۃ، وبہ أفتی المرحوم أبوالسعود آفندی مفتی الروم، عللہ بالرفق للجانبین''۔

(اگر مدیون نے اپنا دین موجل وقت سے پہلے ادا کردیا، یا ادائیگی کا وقت آنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو اس کی موت کی وجہ سے دین کی فوری ادائیگی ہونے لگے، اب دائن جب اپنا دین اس کے ترکہ سے وصول کرے گا تو اس صورت میں دائن مرابحۃً صرف اتنا دین وصول کرسکتاہے جتنا گزشتہ ایام کے مقابل میں ہو، اور یہ متأخرین (حنفیہ)کا مسلک ہے (قنیہ)، مفتی روم علامہ ابوالسعود آفندیؒ نے بھی اس پر فتویٰ دیا، اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں جانبین کی رعایت موجود ہے)۔

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''قولہ لا یأخذ من المرابحۃ'' صورتہ:اشتری شیئاً بعشرۃ نقدًا، وباعہ لآخر بعشرین إلی أجل، ہو عشرۃ أشہر، فإذا قضاہ بعد تمام خمسۃ (أشہر) أو مات بعدہا، یأخذ خمسۃ، ویترک خمسۃ''۔

(علامہ حصکفیؒ کا یہ قول '' لا یأخذ من المرابحۃ'' اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک شخص نے ایک چیزدس درہم کی نقد خریدی، اور پھر وہی چیز دوسرے کو دس ماہ ادھار پربیس روپے میں بیچ دی، اب اگر مشتری ثانی پانچ ماہ بعد اس کی قیمت اداکرے، یا مشتری کا پانچ ماہ بعد انتقال ہوجائے تو بائع صرف پانچ روپے منافع کے لے گا،اور پانچ روپے چھوڑدے گا)۔

متأخرین حنفیہ کے اس فتویٰ نے ''بیع مساومہ '' اور اس ''بیع مرابحہ '' کے درمیان فرق کردیا ہے، جس میں بائع مدت کے سبب سے زیادتی ثمن کی صراحت کردے، لہذا ''ضع وتعجل'' کا قانون بیوع مساومہ میں توجاری کرنا جائز نہیں، البتہ بیوع مرابحہ میں جائز ہے، شاید متأخرین حنفیہ کے اس فتوے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگر چہ مدت مستقل طور پر قابلِ عوض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، لیکن ضمناً اور تبعا اس کے مقابلے میں کچھ ثمن مقرر کرنا جائز ہے، جیسے گائے کے حمل کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں، لیکن اس حمل کی وجہ سے اس گائے کی قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے، چنانچہ کئی چیزوں کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات تبعاً ان کا عوض لینا جائز ہوتا ہے، لہذا جب ''مرابحہ '' کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس میں نفع کی مقدار بیان کردی جائے، تو پھر اس میں مدت کے مقابلے میں نفع کی زیادتی کرنا بھی جائز ہے، اور اس صورت میں ''مدت '' بمنزلہ ''وصف مبیع '' کے ہوجائے گی، لہذا اگر ادائے دین کا وقت آنے سے پہلے دین ادا کردیا جائے، یا مدیون کی موت واقع ہونے کی وجہ سے ادائیگی فوری ہوجائے تو ان دونوں صورتوں میں چونکہ وہ وصف ناقص ہوجائے گا، اس لئے اس کے بقدر ثمن میں بھی کمی ہوجائے گی، علامہ ابن عابدینؒ نے اس مسئلہ کی علت بیان کرتے ہوئے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایاہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ووجہہ أن الربح فی مقابلۃ الأجل، لأن الأجل وإن لم یکن مالاً، ولا یقابلہ شئ من الثمن، لکن اعتبروہ مالاً فی المرابحۃ، إذا ذکر الأجل بمقابلۃ زیادۃ الثمن، فلو أخذ کل الثمن قبل

الحلول كان أخذه بلاعوض''۔

(اور اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی کہ نفع ''مدت '' کے مقابلے میں ہے، اس لئے کہ ''مدت'' اگر چہ مال نہیں ہے، اور اس کے مقابلے میں ثمن نہیں ہوتا ہے، لیکن بیع مرابحہ میں جب زیادتی ثمن کے مقابلے میں ''مدت '' ذکر کی جائے تو اس صورت میں اس ''مدت '' کو مال کا درجہ دے دیا جاتاہے، لہذا وقت ادائیگی سے پہلے اگر کسی نے سارا ثمن لے لیا تو یہ منافع بلاعوض ہوگا)۔

اگرچہ مندرجہ بالا توجیہہ اور علت کچھ وزن رکھتی ہے، لیکن ''ضع وتعجل'' کے قانون کے عدم جواز پر جودلائل ہم نے پیچھے ذکر کیے ہیں، وہ ہر دین موجل پر ثابت ہوتے ہیں، ان میں ''بیع مساومہ ''اور ''بیع مرابحہ '' کا کوئی فرق نہیں، اور اگر مندرجہ بالا فتوے پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں 'بیع مرابحہ '' اور قسطوں پر بیع '' کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہوجائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ، لہذا میری رائے میں ''بیع بالتقسیط '' اور 'بیع مرابحہ '' کے وہ معاملات جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں، ان میں مندرجہ بالا فتوے پر عمل کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا (اسلام اور جدید معاشی مسائل : قسطوں پر خرید وفروخت۳،۱۲۱-۱۱۷،ط: مکتبہ فیصل دہلی)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''یہ دُرست ہے کہ ''مرابحہ مؤجلہ '' میں قیمت کا کچھ حصہ ''اجل '' کے مقابلے میں ہوتا ہے، لیکن ''اجل '' کے مقابلے میں ''عوض ''کا کچھ حصہ ہونا اس وقت جائز ہے، جب یہ معاوضہ کسی بیع کے ضمن میں ہو، چنانچہ جہاں ''اعتیاض عن الأجل'' کو جائز کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اصل بیع کسی اور چیز کی ہے، اور ضمن میں ''اجل '' کی وجہ سے اس مبیع کی قیمت میں اضافہ کردیاہے، اسی کو ''ہدایۃ '' میں ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے : ''ألا تری أن الثمن یزاد لأجل الأجل'' لیکن ''اجل '' ہی کو مقصود بنا کراس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، جس کو صاحب ہدایہ نے فرمایا: ''اعتیاض عن الأجل حرام''، لہذا اگر اصل مرابحہ میں اجل کی وجہ سے مبیع کی قیمت میں اضافہ کیا گیا تو یہ ''اعتیاض عن الأجل'' ضمنی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ ''اعتیاض عن الأجل'' ہے ہی نہیں، بلکہ پورا ثمن مبیع ہی کا ہے، البتہ اس کے تعین کے وقت ''اجل '' کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

لیکن اگر متأخرین کے مذکورہ بالا فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مشتری ''اجل'' سے پہلے ادائیگی کردے تو وہ قیمت میں کمی کا حق دار ہے تو اس صورت میں یہ ''اعتیاض عن الأجل'' ضمنی نہیں، بلکہ مقصود ہوگا، کیونکہ قیمت میں کمی کے وقت سوائے اجل کے اور کوئی چیز موجود نہیں۔

یہ کہنا کہ چونکہ ثمن میں اضافہ ''اجل '' کی وجہ سے کیا گیا ہے، لہذا تعجیل کے

وقت وہ اضافہ ساقط ہونا چاہئے، اس لئے بھی محل نظر ہے کہ یہ استدلال اس وقت دُرست ہوسکتا ہے جب بائع نے اپنے طورپر مشتری کو تعجیل پر مجبور کیا ہو، لیکن جہاں مشتری خود اپنی طرف سے ثمن جلدی لے آیا، جبکہ بائع نے ایسا کوئی مطالبہ مشتری سے نہیں کیا تو یہ استدلال دُرست نہیں بنتا، کیونکہ اجل مشتری کا حق ہے اور یہ حق بائع نے اس کو دیا ہواہے،پھر مشتری اس کو استعمال کرے یا نہ کرے، اس سے عقد کے مؤجل ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی بائع اب بھی اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ اجل کو استعمال کرے، لہذا اپنی طرف سے تعجیل کی صورت میں ثمن میں کمی کا لازمی مطالبہ درست نہیں۔

مصارفِ اسلامیہ کے حالات کے پیش نظر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر وہاں اس فتوی پر عمل کیا گیا تو مآلِ کار سود کا وہی میڑچلنا شروع ہوجائے گا (فتاوی عثمانی: کتاب البیوع، قرض اور دین سے متعلق مسائل۳،۲۴۰،ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

جواب (۲) :

سوال میں مذکور صورت استصناع کی ہے، استصناع کی شرائط اور تفصیلات ہمارے فقہاء نے درج فرمائی ہے، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریرفرماتے ہیں:

استصناع کی تعریف :

استصناع کہتے ہیں کہ کسی دوسرے کوکوئی چیز بنانے کا حکم دیا جائے یا فرمائش کی جائے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک :

ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا کہنا یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی چیز بنواتا ہے تو یہ بذات خود کوئی عقد نہیں ہے ؛ بلکہ یہ ایک فرمائش ہے کہ میرے لیے بنادو، لہذا یہ بیع بھی نہیں، چنانچہ یہ عقد لازم بھی نہیں ؛ بلکہ اس کی حیثیت محض ایک وعدے کی سی ہے، مثلا میں نے کسی سے کہا کہ تم فلاں چیز بنادو،تو میں مستصنع اوروہ صانع ہوا، میں نے اس سے درخواست کی ہے اور اس نے ایک طرح سے وعدہ کیا ہے کہ ٹھیک ہے، میں تمہارے لئے بنادونگا، بس عقد کوئی نہیں، لہذا ان کے نزدیک یہ عقد لازم بھی نہیں، اور لازمی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ فرض کروکہ بنانے والا بعد میں نہ بنائے تو اس کو بنانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

عقدووعدہ:

وعدہ کا ایفاء دیانتًا تو انسان کے ذمہ ہے اور بغیر عذر کے وعدہ کو نہیں توڑنا چاہئے، اس میں اختلاف ہے کہ یہ واجب ہے یا محض مستحب ہے یا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

فقہاء کی بڑی تعداد یہ کہتی ہے کہ یہ مکارم اخلاق میں سے ہے اور اس کا ایفا مستحب ہے، واجب نہیں ہے، تو یہاں پر بھی اس کے ذمہ واجب نہیں ہے۔

اور اگر ان حضرات کا قول اختیار کیا جائے جو اس کو واجب کہتے ہیں تو زیادہ تر واجب کہنے والے لوگ بھی اس کو دیانتًا واجب کہتے ہیں قضاءً نہیں،لہذا عدالت کے ذریعے اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا،تو اس واسطے عقد ہواہی نہیں۔

دوسری طرف اگر فرض کریں کہ اس شخص نے وہ چیز بنادی، بنانے کے بعد مشتری کو اختیار ہے، چاہے خریدے یا نہ خریدے؛ کیونکہ عقد منعقد ہوا ہی نہیں، لہذا بعد میں اگر مشتری کہے کہ میں تو نہیں لیتا تو اس کو اختیار ہے، ایسی صورت میں صانع کے ذمہ ضروری ہوگا کہ وہ کسی کے ہاتھ فروخت کرے، لیکن مشتری کے ذمہ لازم نہیں ہوگا، یہ ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے ۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک :

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ عقد استصناع ہے، اور اس کے ذریعے بیع بھی ہوجاتی ہے، مثلا جب میں نے کہا کہ میرے لئے فلاں چیز بنا دو اور اس نے کہا کہ میں نے قبول کیا تو اس کے کہنے سے عقد منعقد ہوگیا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ عقد تو ہوگیا، بیع بھی ہوگئی؛ لیکن چونکہ مشتری نے ابھی تک نہیں دیکھا؛ لہذا مشتری کو خیار رؤیت حاصل ہے، یعنی جب وہ چیز بن کر تیارہوگی تو اب اس کو دیکھنے کے بعد اس کو خیار رؤیت ملے گا، اگر چاہے تو اس عقد کو باقی رکھے یا چاہے تو اس عقد کو فسخ کردے، یہ رؤیت کا مشتری کو ملنا اس کے عقد ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ خیار رؤیت بیع تام ہونے کے بعد بھی ملتی ہے ؛ لہذا یہاں بھی بیع تام ہے، لیکن اس کو خیار رؤیت ملے گی۔

امام ابویوسفؒ کا مسلک :

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ یہ دیکھا جائے گا کہ جو مواصفات عقد کے اندر طے ہوئے تھے، مثلا عقد یہ تھا کہ تم مجھے الماری بنا کر دینا، اس میں مواصفات طے ہوگئے تھے کہ فلاں قسم کی لکڑی ہوگی،اتنی اونچی الماری ہوگی،اتنی چوڑی ہوگی، اتنے اس میں طبقات ہونگے، فلاں ڈیزائن ہوگا، تمام مواصفات تھے، اگر بنانے والے نے ان مواصفات کے مطابق بنا کر دیا ہے تو پھر مشتری کو خیار رؤیت حاصل نہیں ہوگا، البتہ اگر مواصفات کے مطابق نہ بنا یا تو بے شک اس کو خیار حاصل ہوگا؛ چاہے تورد کردے کہ میں نے تو ایسا نہیں بنوایا تھا، اس لئے اس کو فسخ کردے۔

مفتی بہ قول :

جہانامام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے درمیان اختلاف ہووہاں عام طورسے فتوی امام ابوحنیفہؒ کے قول پر دیا جاتاہے، اس واسطے عام طورپر ہماری جو معروف فقہ کی کتابیں ہیں؛ ان میں مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق یہ لکھا ہوا ہے کہ اگرچہ استصناع میں بیع ہوجاتی ہے، لیکن مستصنع کو خیاررؤیت ملتا ہے ۔

جن مسائل کے اندر مجلہ کی مجلس نے معروف قول چھوڑ کر ایک ایسے قول کو اختیار کیا جو معروف نہیں تھا، ان مسائل میں سے ایک مسئلہ استصناع کا بھی ہے کہ اس میں انہوں نے امام ابوحنیفہ ؒ کے قول کے بجائے امام ابویوسف ؒ کے قول پر فتوی[1] دیا ہے ۔

اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ پہلے زمانے میں جو استصناع ہوتا تھا وہ چھوٹے پیمانے پر تھا کہ کسی نے منبر بنوالیا، کسی نے الماری بنوالی اور کسی نے فرنیچر بنوالیا، اب جو استصناع ہورہا ہے یہ بہت بڑے بڑے منصوبوں کا ہوتا ہے، کوئی مل لگاتا ہے تو اس کے لئے مشینری کا پلانٹ لگاتا ہے، اور یہ مشینری کا پلانٹ کروڑوں روپے کا بنتا ہے، اب اگر کسی نے دوسرے کو آرڈر دے دیا کہ آپ میرے لئے چینی بنانے کا پلانٹ لگادو یہ استصناع ہوا، اب جس کو آرڈر دیا ہوا تھا اس نے ہزاروں نہینلاکھوں؛ بلکہ لاکھوں سے بھی زیادہ پیسے خرچ کئے یا باہر سے چیزیں منگوائیں اور پلانٹ لگایا، پلانٹ لگانا کوئی آسان کام نہیں، اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر پلانٹ تیار کیا جو کروڑوں روپے کا تھا اور آپ کہتے ہیں کہ اب مشتری کو خیار رویت ملے گا اور مشتری نے آکر کہہ دیا کہ بھائی مجھے تو نہیں چاہئے، تو کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری، اس نے تو اپنی ساری جمع پونجی اس پر صرف کردی اور اپنی جان لگادی، اور آپ نے وجہ بتائے بغیر، باوجود اس کے کہ وہ تمام مواصفات کے مطابق تھا، کہہ دیا کہ مجھے نہیں چاہئے، یہ اتنا زبردست ضرر عظیم ہے جس کی وجہ سے صانع کا دیوالیہ نکل سکتا ہے ۔

لہذا ان حضرات نے فرمایا کہ اب اس دورمیں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ امام ابویوسفؒ کے قول کو اختیار کرکے اسی پر فتوی دیا جائے کہ یہ عقد لازم ہے۔

اس لئے استصناع کا عقد عام قواعد بیع سے ہٹا ہوا ہے، اس کی چند وجوہ ہیں:

(۱) اولا اس حیثیت سے کہ یہ بظاہر بیع معدوم ہے ؛ لیکن اس کو جائز قرار دیا گیا۔

(۲) دوسرے اس حیثیت سے کہ اس میں خیار رویت حاصل نہیں ؛ بلکہ اصل اعتبار ان مواصفات کا ہے جو طے کئے گئے تھے کہ ان مواصفات کے مطابق چیز بنی ہے یا نہیں بنی، اگر اس کے مطابق ہے تو مشتری لینے پر مجبور ہے ۔

(۳) اور اس حیثیت سے کہ عقد استصناع میں تاجر پیشہ لوگوں کے لئے بڑی سہولت ہے، اسی وجہ سے اس عقد کو آج کل جو اسلامی بینک ہیں وہ بطور آلہ تمویل کے استعمال کررہے ہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴،۶۹-۶۳،ط: فیصل بکڈپو دیوبند)۔

اس لئے مطلوبہ اوصاف کے مطابق مال تیار نہ ہونے کی صورت میں مستصنع کو واپس لوٹانے اور رد کرنے کا حق تھا، لیکن اس مال کو مفت میں قبضہ میں لینے کا حق نہ تھا، اگر مقررہ معیار میں کمی رہ گئی اور مطلوبہ اوصاف کے مطابق چیز تیار نہ کی، اس کے باوجود مستصنع نے وہ چیز لے لی تو اب کاریگرکم سے کم اجرت مثل کا توحقدار ہوناہی چاہئے، کیونکہ مستصنع کا شئی مذکورلے لینا ایجاب وقبول کی قبیل سے ہوگیا۔

''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب أو عدم رؤية''
(ہدایہ :اوائل کتاب البیوع۵،۶،۷، مکتبہ البشری کراچی، پاکستان)۔

صورت مسئلہ میں اس شخص نے مطلوبہ اوصاف کے مطابق نہ ہونے کے باوجود رد کرنے اور واپس لوٹانے کے بجائے مذکور شیئ لے لی تو یہ اس کی طرف سے قبول ہوا، لہذا کاریگر اجرت مثل کا حقدار ہونا چاہئے ۔

جواب (۳،۴):

عاقدین کے درمیان عقد سے متعلق کچھ لازمی شرائط کے علاوہ کچھ اخلاقی حدود وقیود بھی ہوتے ہیں، اس کی پاسداری عاقدین کے لئے ضروری ہونی چاہئے،جیسے :

* عاقدین آپس میں دوسروں کی بنسبت زیادہ قابل اعتماد ہے،اور دونوں کو اس بات کا بھروسہ ہے کہ کوئی فریق دوسرے فریق کو دھوکہ نہ دے گا۔
* دونوں ایک دوسرے سے امانت داری اور دیانت داری کی امید رکھتے ہیں۔

اسی امانت ودیانت کی امید اور وثوق واعتماد کی وجہ سے بعض مرتبہ زبانی قیمت اور تحریری قیمت میں فرق رکھا جاتاہے، اور بعض مرتبہ قانونی دشواریوں کی وجہ سے دونوں کے درمیان جو معاملہ ہوتا ہے وہ کاغذات حکومت کے سامنے پیش نہیں کرتے ہیں، وہاں دوسری نوعیت سے پیش کیا جاتاہے، جیسے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بل میں کم رقم لکھی جاتی ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان زیادہ رقم پر عقد تام ہوا ہے ۔

ان اخلاقی اصولوں کے پیش نظر اگر عاقدین میں سے کوئی بھی دوسرے کو لکھی ہوئی قیمت پر مستقبل میں دھوکہ دے کر نقصان نہ کرتا ہو تو تیسری صورت میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، اسی طرح سوال نمبر چار میں قانونی مجبوری اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کی جاتی ہے اور عاقدین میں سے کوئی دوسرے کو ضرر ونقصان نہیں پہنچاتا ہے، تو اس صورت میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، چنانچہ فقہی قاعدہ ہے۔

''لا ضرر ولا ضرار :

فسّره في المغرب بأن لا يضر الرجل أخاه ابتداء ولا جزاء (أشباه) أي أنه لا يجوز أن يبادئه بالضرر ولا أن يقابله به، مثلاً لا يجوز لأحد أن يهدم حائط غيره، وإن هدمه فلا يجوز للآخر أن يهدم حائطه مقابلة لذلك؛بل عليه أن يرفع الأمر إلى الحاكم۔

الضرر يزال: هذه المادة من تفرعات المادة السابقة ويبتنى عليها كثير من أبواب الفقه، مثل الرد بالعيب وجميع أنواع الخيارات والحجر والشفعة'' (شرح المجلة:المقالة الثانية فى القواعد الفقهية۱،۲۹، رقم المادة: ۱۹،۲۰، ،ط: اتحاد بكڈپو ديوبند)۔

جواب (۵):

کوئی بھی شخص کاریگر کو چیزیں تیار کرنے کے لئے مٹریل دیتا ہے، تو وہ

کاریگر پر بھروسہ اور اعتماد کرکے دیتا ہے، اس کے بعد کاریگر کی ذمہ داری ہے کہ امانت ودیانت داری کا ثبوت دے اور عمل کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچا ہوا مال ہے یا براده ہے وہ اصل مالک کے حوالے کرے ؛البتہ جو چیز معمولی اور غیر اہم ہوتی ہے اس کو لوگ خاطر میں نہیں لاتے اور اس کا براده واپس نہیں لیتے، جیسے کپڑا سینے دیا اور اس میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچ گئے جو قابل استعمال نہینہے اور کار آمد بھی نہیں ہے، تو اس کو لینے کا رواج بھی نہیں ہے اور خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں،لیکن جو چیز قابل استعمال اور کار آمد ہوتو اسے واپس لیا جاتا ہے اور نہ دینے کی صور ت میں برا بھی مانتے ہیں، اور اگر وہ چیز غیرمعمولی اور قیمتی ہو تو اس کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے،ایسی صورت میں مستصنع بچی ہوئی چیز صانع کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا، وہ اسی کی ملک سمجھی جاتی ہے، اس لئے سوال مذکورمیں محررہ صورت میں کاریگر کے پاس جو ذرات رہ جاتے ہیں اس کا مالک مستصنع ہوگا،کاریگر نہیں اور اس کا یہ باور کرانا کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی؛ بددیانتی اور کذب بیانی ہے، اس کے لئے بچے ہوئے ذرات پر قبضہ کرنا اور اسے فروخت کرنا جائز نہ ہوگا۔

اس سے پہلے چوری کے مال کو فروخت کرنے اور کسی کا مال ناحق لے لینے کے متعلق احادیث وحوالہ جات گزرچکے ہیں۔

ہاں اگر مستصنع اس براده کو اہمیت نہیں دیتا اور کاریگر براده لے لیتا ہے، وہ اس کے علم میں ہے، اور اس پر اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، اور وہ اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ براده مزدور لے لے تو درست ہے ۔

حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

سوال: مزدوری پر ہیرا گھسنے والا جب تاجر سے رف ہیرے لے کر خوشنما بنا نے کے لئے گھستا ہے، تو اس میں سے براده گرتا ہے، یہ براده ہیروں کی پالش میں کام آتا ہے، ہیرا گھسنے والا اس براده کو اپنی ملک کی طرح لے لیتا ہے اور تاجر کو اس کی اطلاع ہوتی ہے، لیکن اس پر اس کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، تو مزدور کے لئے یہ درست ہے؟

الجواب : وہ براده بھی تاجر کی ملک ہے،اگر تاجرکی اجازت ورضامندی سے مزدور لیتا ہے تو درست ہے، فقط واللہ تعالی اعلم (محمود الفتاوی ۴۸۴،۲، ہیرے کے کاروبار کے مسائل۴۸۴،۲،ط: مکتبہ انور ڈابھیل)۔

جواب (۶):

ہر ایک شخص کو اپنی ملک میں جس طرح چاہے جائز تصرفات کا حق ہے اور اپنی چیز جس قیمت میں چاہے فروخت کرسکتا ہے، اگر تاجروں کے درمیان کوئی شرط آسانی کی خاطر رائج ہو تو حتی الامکان عاقدین کو اس کا پاس لحاظ کرلینا چاہئے، لیکن اگر کوشش کے باوجود اس پر عمل نہ ہوسکا اور اس شرط یا رواج کی وجہ سے عاقدین

میں سے کسی کا نقصان یا ضرر لاحق ہورہا ہو تو ایسی صورت میں رواج پر عمل درست نہ ہونا چاہئے۔

بہت سی مرتبہ سونا چاندی کو جوڑنے کے لئے گھٹیا سونا چاندی استعمال کرنا پڑتا ہے، اس طرح پتھرونکی آرائش کے لئے بھی دھاگے لگائے جاتے ہیں، بعض مرتبہ ضرورت کے مطابق استعمال کرنے کے باوجود بھی وہ دس گرام سے بڑھ سکتا ہے اور کبھی اس سے کم بھی ہوسکتا ہے، جو بھی صورت حال ہو اس کو واضح کرنا ضروری ہے ، اور اس کے مطابق قیمت کی ادائیگی ضروری ہے، تاہم بائع جس قیمت میں بیچے تاجر کو رضامندی کی صورت میں بائع کی بیان کردہ قیمت کے مطابق خریدنا لازم ہوگا، اس میں تاجروں کے رواج کے مطابق بیان کردہ قیمت میں کمی کرنا اور بائع کے نہ چاہتے ہوئے زائد پتھروں کو دھاگے کی قیمت میں خریدنا مناسب نہیں ہے ۔

علامہ سلیم رستم باز فرماتے ہیں:

''کل یتصرف فی ملکہ کیف شاء؛ لکن إذا تعلق بہ حق الغیر یمنع المالک من تصرفہ بوجہ الاستقلال، فلو کان السفل لواحد والعلو لآخر فلصاحب العلوحق القرار علی السفل----- والحاصل أن لکل منہما فعل ما لا یضر بالآخر'' (شرح المجلہ ۱،۶۵۵، رقم المادہ: ۱۱۹۲، ط: اتحاد بکڈپو دیوبند)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وإن اشتری خاتم فضۃ أو خاتم ذہب فیہ فص أو لیس فص بکذا فلسا ولیست الفلوس عندہ فہو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم یتقابضا لأن ہذا بیع'' (الہندیہ ۳،۲۲۴، کتاب الصرف، الباب الثالث فی بیع الفلوس، ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''وللبائع أن یبیع بضاعتہ بما شاء من ثمن، ولایجب علیہ أن یبیعہ بسعر السوق دائما، وللتجار ملاحظ مختلفۃ فی تعیین الأثمان وتقدیرہا، فربما تختلف أثمان البضاعۃ باختلاف الأحوال، ولا یمنع الشرع من أن یبیع المرء سلعتہ بثمن فی حالۃ وبثمن آخر فی حالۃ أخری'' (بحوث فی قضایا معاصرۃ، البحث الاول احکام البیع بالتقسیط۱،۱۳،ط: وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ دولۃ قطر)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

سوال: زرگروں کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ جبکہ ان کے اُصول مندرجہ ذیل ہوں:

(۱) سونا اور چاندی اصلی لگاتا ہو،(۲) نہایت قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ زرگرجب کوئی زیور بناتا ہے تو اس کو جوڑ تے وقت اس میں ٹانکے لگاتاہے،یہ بھی سونا ہوتا ہے، مگر بہت خراب، بغیر اس کے زیور کو جوڑنہیں لگتا، جیسے موٹر وغیرہ کو ٹانکہ لگایا جاتاہے، اور اس ٹانکے کی قیمت بھی ہم اصل سونے کے حساب سے لیتے ہیں،

اور جب گاہک دوبارہ واپس دینا چاہتا ہے تو ہم اس ٹانکے کی قیمت اصل سونے کی نہیں دیتے، صرف اصل سونے کی قیمت ان کو دیتے ہیں۔

جواب: ‘‘بیچنے والے کو شرعا اختیار ہے کہ وہ اپنی مملوک چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے، لہذا اگر کوئی زرگرسونے کے ٹانکے کو بھی سونے کی قیمت پر فروخت کرے تو جائزہے؛ بشرطیکہ تلبیس نہ کرے اور دھوکہ نہ دے، یعنی بتادے کہ اس میں ٹانکے کی قیمت بھی شامل ہے ” (فتاوی عثمانی ۳،۱۶۰، کتاب البیوع، فصل فی بیع الصرف واحکام الحلی والاوراق النقدیۃ، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

جواب (۷):

یہ صورت بھی دھوکہ اور غرر کی ہے، کہ خریدار خریدتے وقت قیمت کم ادا کرے ؛البتہ پرچی کچھ زیادہ کی بنوائے، مثلا خریدا ایک قیراط میں اور پرچی ایک قیراط پانچ سیٹ کی بنواتا ہے، اس میں خریدار بائع کا تو نقصان کرہی رہا ہے، اور جب اس کے پاس کوئی خریدار آئے تو اس کو یہ پرچی بتاکر یہ کہے گا کہ میں نے اتنے میں خریدا ہے، یعنی ایک قیراط پانچ سینٹ میں اور پھر وہ اس پر اپنا نفع بڑھائے گا، اس طرح وہ بائع کو بھی نقصان کرتاہے، اور مشتری کو بھی، بلکہ مشتری کو دھوکہ بھی دے رہا ہے، پھر اس طرح کذب بیانی سے بیع بھی کررہا ہے، چاہے اس سے عقد صحیح ہوجاتاہو؛ لیکن اس کا فعل قبیح ہے۔

جواب (۸):

بیع میں اصل تو یہ ہے کہ خریدار اور تاجر دونوں مبیع وثمن نقد ادا کردیں اور کسی طرف سے بھی ادھارنہ ہو ؛مگر انسانی ضروریات کے پیش نظر شریعت نے اس کی گنجائش بھی رکھی ہے کہ کسی طرف سے ادھار کا معاملہ ہو، چنانچہ اگرثمن نقد ادا ہوا ہو اور مبیع کی بعد میں ادائیگی کا وعدہ ہوتو یہ بیع سلم ہے اور اگر مبیع نقد ہو اور ثمن ادھار تویہ بیع مؤجل یا بیع الی اجل ہے۔

ایجاب وقبول ہوجانے کے بعد بیع کا حکم یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تاجر کی ملک قیمت پر اور خریدار کی ملک سامان پر ثابت ہوتی ہے اور اس طرح دونوں کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔

اگر مبیع حوالے کردی گئی اور ثمن ادھار ہے تو خریدار کے ذمہ اس کی ادائیگی لازم ہے، اگر کذب بیانی ودھوکہ اور حیلہ بازی کرتے ہوئے پورا ثمن ادا نہیں کررہا ہے اور بائع کو کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے پچیس فیصد ثمن کی ادائیگی پر مجبور کرہا ہے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہے، ثمن کا باقی ماندہ حصہ ادا نہ کرکے اس کا استعمال کرنا ناجائز اور حرام ہوگا، اللہ پاک فرماتے ہیں:

‘‘ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس

بالإثم وأنتم تعلمون" (البقرة: ۱۸۸)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸میں حلال طریقہ پر حاصِل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھائو، اس میں کسی کا مال غصب کرلینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی؛ جن میں دوسرے پر ظلم کرکے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھاکر کوئی مال حاصل کرلینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگر چہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو، وہ سب حرام اور باطل ہیں ''(معارف القرآن۲،۱۰۵، ۱۰۸، البقرہ : ۱۸۸، جزء: ۲، جلد :۱،ط: اشرفی بکڈپو دیوبند)۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

''الخطاب بہذا الآیۃ یتضمن جمیع أمۃ محمد ﷺ ؛ والمعنی:لا یأکل بعضکم مال بعض بغیر حق، فیدخل فی ہذا:القمار والخداع والغصوب وجحد الحقوق، وما لا تطیب بہ نفس مالکہ، أو حرّمتہ الشریعۃ إن طابت بہ نفس مالکہ؛ کمہر البغی وحُلْوان الکاہن وأثمان الخمور والخنازیر وغیر ذلک، ولا یدخل فیہ الغبن فی البیع مع معرفۃ البائع بحقیقۃ ما باع لأن الغبن کأنہ ہبۃ۔

ومن أخذ مال غیرہ لا علی وجہ إذن الشرع فقد أکلہ بالباطل، ومِن الأکل بالباطل أن یقضی القاضی لک وأنت تعلم أنک مبطل ؛ فالحرام لا یصیر حلالا بقضاء القاضی؛ لأنہ إنما یقضی بالظاہر'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳۳۸،۲، سورۃ البقرۃ، ط: دار الکتب المصریہ)۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں :

''ینہی تبارک وتعالی عبادہ المؤمنین عن أن یأکلوا أموال بعضہم بعضا بالباطل، أی بأنواع المکاسب التی ہی غیر شرعیۃ کأنواع الربا والقمار، وما جری مجری ذلک من سائر صنوف الحیل'' (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۶۲۵،۱، سورۃ النساء، آیت: ۲۹، ط: دار الاشاعت دیوبند)۔

محور چہارم:

جواب (۱، ۲) :

ثمن یا قیمت مقرر کئے بغیر معاہدہ بیع درست نہیں، اور یہ ابہام فریقین میں تنازعہ کا موجب بن سکتا ہے اور شریعت میں ہر وہ معاہدہ ممنوع ہے جو فریقین میں تنازعہ اور

مناقشہ کا سبب بن جائے، البتہ قیمت مقرر کئے جانے کے بعد نقد بھی ہوسکتی ہے اور ادھار بھی، ہدایہ میں ہے : ‘‘ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل إذا کان الأجل معلوما’’ (ہدایہ۴،۵۴۔۵۵، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد) (بیع نقد ثمن اور ادھار ثمن دونوں کے ساتھ درست ہے بشرطیکہ ادھار ثمن کی مدت معلوم ہو)۔

بیوعات میں آدمی کوئی چیز نفع کے ساتھ بیچتا ہے، اگر کوئی شخص بائع سے ادھار خریدنا چاہے تو اس صورت میں بائع مبیع کی قیمت بڑھا کر بیچنا چاہے تو اس کی اجازت ہے، یعنی مشتری کی طرف سے نقد قیمت کی ادائیگی کی صورت میں کم قیمت میں بیچے اور ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت میں بیچے تو یہ درست ہے؛ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

‘‘ألا تری أنہ یزاد فی الثمن لأجل الأجل’’ (البحر الرائق ۶،۱۹۰، کتاب البیع، باب المرابحۃ والتولیۃ، ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمت کی کمی بیشی شرعا وعرفا جائز اور درست ہے ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ادھاری پر مال فروخت کردیا، لیکن بائع کو کوئی ضرورت پیش آگئی، اس لئے اب ادھار کی بنیاد پر جو قیمت طے کی گئی تھی، اس میں کمی کرکے مشتری سے قیمت کا مطالبہ کرنا چاہے توکرسکتا ہے ؟

قرض یا ادھار تجارتی کاروبار کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جہاں تجارت اور لین دین کا ذکر ہوگا وہاں ادھار اور قرض کا تصور بھی موجود ہوگا، تجارت کے روز اول سے لے کر آج تک ادھار لین دین کا رواج باقی ہے، اس طرح ادھار کی صورت میں قیمت میں زیادتی اور نقد کی صورت میں قیمت میں کمی کا رواج بھی قدیم ہے، لیکن ایک صورت یہ ہے کہ ادھار کی بنیاد پر ثمن میں زیادتی کرکے ایک چیز بیچ دی گئی، بعد میں بائع کو روپیوں کی ضرورت پڑی، اس لئے اس نے ایک مہینہ بعد مبیع کی قیمت میں کمی کرکے مشتری سے قیمت وصول کرنا چاہا،اور مشتری رضامند ہوگیاتو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ شامی تحریرفرماتے ہیں:

‘‘۔۔وإلا فیما إذا کان الإیجاب من المشتری فقبل البائع بأنقص من الثمن صح، وکان حطا، أو کان من البائع فقبل المشتری بأزید صح، وکان الزیادۃ إن قبلہا فی المجلس لزمت’’ (رد المحتار علی الدر المختار ۷،۴۴، کتاب البیوع، مطلب فی انعقاد البیع بلفظ واحد من الجانبین، ط: زکریا بک ڈپو دیوبند۔ الفتاوی الہندیہ۳،۲،کتاب البیوع، الباب الاول، ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

‘‘اگر مدیون اپنا قرضہ مقررہ وقت سے پہلے ادا کردے تو سودی نظام میں سود کم ہوجاتا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرابحہ کے ثمن میں کمی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں:

(۱) ایک پہلووہ ہے جس کو فقہاء کے یہاں ''ضع وتعجل '' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی مدیون اپنے دائن سے یہ کہے کہ تم دین کی کمی کرکے قبل از وقت وصول کرلو، اس کے حکم میں فقہاء کا مشہور اختلاف ہے،لیکن جمہور کے ہاں ناجائز ہے اور یہی صحیح ہے۔

(۲) بعض متاخرین حنفیہ نے مرابحہ موجلہ میں طول اجل سے پہلے ادائیگی کی صورت میں ثمن میں کمی کرنا جائز قرار دیا ہے۔

لیکن بنکوں کو اگر اس کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو مرابحہ اور سودی نظام میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، اس لئے مناسب یہ ہے کہ معاہدے میں تو یہ صراحت نہ ہوکہ پہلے ادائیگی کرنے سے قیمت کم ہوجائے گی، لیکن اگر کوئی شخص قبل از وقت ادائیگی کردے تو اس وقت کسی سابق قرار داد کے بغیر کمی کردی جائے تو مضائقہ نہیں '' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲۷۲،۷، بینکاری کے مسائل،ط: فیصل بکڈپو، دہلی)۔

جواب(۳):

عقود ومعاملات میں کبھی دیانتداری سے کام نہ لیتے ہوئے عمدا اور کبھی خطاءً کسی ایک فریق کو دھوکہ دیا جاتا ہے، کبھی عیب بتلایا نہیں جاتا، کبھی مشتری کو مرغوب وصف مبیع میں موجود نہ ہونے کے باوجود مشتری کو وہ چیز تھمادی جاتی ہے، کبھی اصلی کہہ کر نقلی وجعلی چیز بھی دے دی جاتی ہے، بعد میں مشتری کو علم ہوتا ہے کہ اسے دھوکہ ہوا ہے،تو ایسی صورت میں شریعت اسلامیہ نے قانون تجارت میں ''خیار '' کو کلیدی اہمیت دی ہے، غرر ودھوکہ کی اکثر صورتوں میں بیع کا انحصار اسی پر ہوتا ہے، چنانچہ مشتری نے بائع پر اعتماد کرتے ہوئے ڈائمنڈ کو اعلی سمجھ کر خریدا، پھر رپورٹ نکالنے پر معلوم ہوا کہ وہ ڈائمنڈ گھٹیا تھے، تو اب مشتری کیا کرے ؟

ایسی صورت میں مشتری کو اصل اور جید ڈائمنڈ میں حق حاصل ہے،اس لئے اصولی طورپر یہ نقلی ڈائمنڈ لوٹا دے اور اصلی ڈائمنڈ وصول کرے، ہاں اگر یہ ڈائمنڈ استعمال کرلیا اور ان میں کوئی ایسی کاریگری کرلی کہ اب وہ اصلی ہیئت پر باقی نہ رہا تو اصلی اور نقلی کے درمیان جو فرق ہے، اس کو مشتری وصول کرسکتا ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''(ولو قبض زیفا بدل جید) کان لہ علی اٰخر (جاہلا بہ) فلو علم وانفقہ کان قضاء اتفاق (ونفق أو أنفقہ) فلو قائما ردہ اتفاقا فہو قضاء لحقہ، وقال أبویوسف:إذا لم یعلم، یرد مثل زیفہ ویرجع بجیدہ استحسانا، کما لوکانت ستوقۃ واختارہ للفتوی ابن الکمال، قلت: ورجحہ فی البحر والنہر والشرنبلالیۃ'' (الدر المختار: کتاب البیوع، باب المتفرقات۴۸۸،۴۸۷،۷، ط: زکریا بکڈپودیوبند)۔

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

‘‘ومن لہ علی اٰخرعشرة دراہم جیاد، فقضاہ زیوفا وہو لا یعلم، فأنفقہا أو ہلکت، فہو قضاء عند أبی حنیفة ومحمد رحمہما اللہ، وقال أبو یوسف رحمہ اللہ:یرد مثل زیوفہ ویرجع بدراہمہ؛ لأن حقہ فی الوصف مرعیّ کہو فی الأصل، ولا یمکن رعایتہ بإیجاب ضمان الوصف، لأنہ لا قیمة لہ عند المقابلة بجنسہ.....” (الہدایہ۳٫۱۰۳۵، کتاب البیوع، مسائل منثورہ، قبیل کتاب الصرف،ط: دار السلام القاہرہ)۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

‘‘وإذا حدث عند المشتری عیب، فاطلع علی عیب، کان عند البائع، فلہ أن یرجع بالنقصان ولا یرد المبیع؛ لأن فی الرد إضرارا بالبائع، لأنہ خرج عن ملکہ سالما ویعود معیبا فامتنع، ولا بہ من دفع الضرر عنہ، فتعین الرجوع بالنقصان، قال:إلا أن یرضی البائع أن یأخذہ بعیبہ لأنہ رضی بالضرر” (الہدایہ۳٫۹۶۳ باب خیار العیب، ط: دار السلام القاہرہ)۔

جواب(۴) :

اسی طرح ایک صورت یہ ہے کہ ایک جوہری نے الف سے ریئل ڈائمنڈ طلب کئے، اور جوہری نے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے ریئل ڈائمنڈ کے نام سے cvd ڈائمنڈ تھما دیئے، الف نے رپورٹ نکلوائی تو وہ ریئل کے بجائے cvd ڈائمنڈ نکلے تو اس صورت میں خریدار کیا کرے؟

فقہی عبارت کی روشنی میں جب یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ بصورت مذکورہ اعلی کے بجائے ادنی ڈائمنڈ دینے کی وجہ سے مشتری کو دھوکہ ہوا اور چونکہ اعلی وادنی یہ مبیع کا وصف ہے اور وصف کے مقابلہ میں ثمن نہیں ہوتا، لہذا قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں، البتہ وصف مرغوب فوت ہونے کی وجہ سے مشتری کو اختیار ہے، اگر چاہے توپورے ثمن میں رکھ لے، ورنہ واپس کردے۔

‘‘ومن اشتری ثوبا علی أنہ عشرة أذرُعٍ بعشرة دراہم، أو أرضاً علی أنہا مائة ذراع بمائة درہم، فوجدہا أقل؛ فالمشتري بالخیار إن شاء أخذہا بجملة الثمن، وإن شاء ترکہا ؛ لأن الذراع وصف في الثوب، ألا تری أنہ عبارة من الطول والعرض، والموصفُ لا یقابلہ شیئٌ من الأطراف الحیوان، فلہذا یأخذہ بکل الثمن .....إلا أنہ یتخیر لفوات الوصف المذکور لتغیر المعقود علیہ فیختلّ الرضا” (ھدایہ ۳٫۹۴۲، ۹۴۳، کتاب البیوع، ط: دار السلام القاہرہ)۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

‘‘وإذا أخذہ، أخذہ بجمیع الثمن؛ لأن الأوصاف لایقابلہا شئ من الثمن، لکونہا تابعة فی العقد علی ما عرف” (الہدایہ ۳٫۹۵۶، کتاب البیوع، باب خیار الشرط)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

* ‘‘مشتری نے مبیع میں کسی خاص وصف کا مطالبہ کیا ہو، پھر اسے معلوم ہوکہ

مبیع میں وہ وصف مفقود ہے،مثلا بکری خریدتے وقت شرط کی تھی کہ وہ دودھ دینے والی (دُدھاری) ہو، پھر پتہ چلا کہ وہ دودھ نہیں دیتی، تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، گرچہ ایسے وصف کا معدوم ہونا تجارکے عرف میں عیب نہ سمجھا جاتا ہو،اس خیار کو خیارِ فواتِ وصف یا ''خیار خلف '' کہتے ہیں۔

* خیار عیب اور خیار فوات وصف میں فرق یہ ہے کہ خیار عیب ایسے عیب کی صورت میں ملتا ہے جو تجار کے عرف میں عیب (نقص)سمجھا جاتا ہو، جب کہ خیار وصف مشتری کو ایسی صورت میں بھی ملے گا جب کہ بیع میں تجارکے عرف کے مطابق گرچہ کوئی عیب نہ ہو، مگر مبیع میں مشتری کا وصفِ مرغوب مفقودہو، نیز خیار عیب بحکم شرع (ہرحال میں) ثابت ہوتا ہے، جب کہ خیار وصف عقد میں شرط کرنے سے ہی ملے گا،بصورتِ دیگر نہیں۔

* وصف کی شرط عقد میں صراحتًا بھی ہوسکتی ہے اور عرف یا دلالتِ حال کے مطابق بھی مانی جا سکتی ہے، مثلا قربانی کے زمانہ میں قربانی کے جانوروں کی منڈی سے جانور خریدا جائے تو جانور میں قربانی کے قابل ہونے کی شرط دلالتِ حال کے مطابق مشروط ہوگی۔

* خیار وصف ثابت ہونے کے لئے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

(الف) ''وصفِ مرغوب فیہ ''عقد میں ضروری قرار دیا گیا ہو۔

(ب) وصفِ مطلوب سے مقصود منفعت شرعًا جائز ہو۔

(ج) وصفِ مشروط میں غررنہ ہو، اگر وصف غررپر مشتمل ہو مثلا کوئی فلیٹ یا مکان اس شرط پر خریداجائے کہ وہ کرایہ داری میں متعین مقدار سے کرائے پر دیا جاسکے، یا متعینہ آمدنی کی گارنٹی (شرط) پر تجارتی دکانیں فروخت کی جائیں، یہ شرط فاسد ہے اور اس سے بیع فاسد ہوجائے گی۔

* خیار فواتِ وصف کا مقتضی یہ ہے کہ وصفِ مشروط کے فوت ہونے کی صورت میں مشتری کومبیع لوٹانے اور ثمن واپس لینے کا اختیار ہوگا،مگر خیار عیب میں مانع بننے والے کسی مانع کی وجہ سے یہاں بھی مبیع لوٹانا ممکن نہ ہوتومشتری کو حق ہوگا کہ اس وصف سے متصف اور غیر متصف مبیع کی قیمت میں پائے جانے والا فرق بائع وصول کرے ''(اسلامی قانون خرید وفروخت : خیار وصف کا بیان،ص:۷۶-۷۴)۔

جواب(۵):

پانچ نمبر میں مذکور صورت بیع مساومہ کی ہے، علامہ شامیؒ نے اس کی جو تعریف لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قیمت کو ملحوظ رکھے بغیر خرید وفروخت کا معاملہ کرے،چاہے نفع کے ساتھ ہو یا نقصان کے ساتھ، یا برابر کا معاملہ ہو، اس طرح بیع مساومہ میں پہلی قیمت کا کوئی ذکر ہی نہ ہوگا، اور بقیہ تینوں صورتوں (وضیعہ، تولیہ

اور مرابحہ)میں معاملہ کے وقت پہلی قیمت کا حوالہ دیا جائے گا کہ میں پہلی قیمت پر اس قدر نفع یا نقصان کے ساتھ یا بعینہ اسی قیمت پر فروخت کررہا ہوں۔

علامہ شامی ؒ لکھتے ہیں:

''وإن اعتبر من حيث تعلقه بالثمن أو بمقداره فهو أربعة أيضا، لأنه إن كان بمثل الثمن الأول مع زيادة فمرابحة، أو بدون زيادة فتولية، أو انقص من الثمن فوضيعة، أو بدون زيادة ولا نقص فمساومة۔ وزاد فی البحر خامسا؛ وہو الإشراک أی أن يشرک غيره فيما اشتراه: أی بأن يبيعه نصفه مثلا، وتركه الشارح، لأنه غير خارج عن الأربعة'' (رد المحتار ۹،۷، كتاب البيوع، ط: كتب خانہ زكريا ديوبند)۔

الشيخ عبدالقادر رافعی تحریر فرماتے ہیں:

''(أو بدون زيادة ولا نقص فمساومة) أی بدون نظر لزيادة ولا نقص لما يأتی أن المساومة ہی البيع بأي ثمن كان من غير نظر إلى الثمن الأول'' (تقريرات الرافعی على رد المحتار ۵۰۱،۷، كتاب البيوع، ،رقم الہامش:۶، ط: مكتبہ زكريا ديوبند)۔

علامہ شامی رقمطراز ہیں:

''(ولم يذكر المساومة) ہی البيع بأی ثمن كان من غيرنظر إلى الثمن الأول، وہی المعتادة'' (رد المحتار على الدر المختار ۳۴۹،۷ كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية)۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں سوال نمبر ۵میں درج صورت جائز اور درست معلوم ہوتی ہے ۔

جواب (۶):

صورت مسئولہ میں ''الف '' نے ''ب '' کو ڈائمنڈ بیچنے کے لئے پیش کیا، ''ب '' نے کہا : میں قیمت مارکیٹ میں پوچھ کر بتائونگا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ''ب '' ''الف '' کا وکیل ہے، اس لئے وکالت کی شرائط کا پاس ولحاظ اس کے لئے ضروری ہے، وکالت کا بنیادی حکم یہ ہے کہ وکیل کو مؤکل کے متعین کئے ہوئے دائرہ میں رہتے ہوئے تصرف کا حق حاصل ہوجاتاہے، نیز بیع کے لئے مطلقا وکیل بنایا ہوتو وکیل جس طرح بھی فروخت کرے اس کا فروخت کرنا معتبر ہوگا۔

لیکن جس شخص کو کسی چیز کے بیچنے کا وکیل بنایا گیا ہے اور وہ اس کو اپنے آپ سے یا اپنے ایسے رشتہ دار سے فروخت کرے جس کے بارے میں وہ متہم ہو،جیسے، باپ، دادا، اولاد،تو امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں، صاحبین کے نزدیک یہ جائز ہے، بشرطیکہ مناسب مروجہ قیمت لگائی گئی ہو،جیسا کہ علامہ کاسانی ؒ فرماتے ہیں:

''وكذا لا يبيع من نفسه وإن أمره الموكل بذلک لما قلنا، ولأنه متہم في ذلک، وليس له أن يبيع من أبيه وجده و ولده وولد ولده الكبار وزوجته عند أبي حنيفة، وعندہما:يجوز ذلک بمثل القيمة، وأجمعوا على أنه لا يجوز أن يبيع من عبده ومكاتبه۔

وجہ قولہما: أن البيع من ہؤلاء ومن الأجنبي سواء، لأن كل واحد منہما يملكہ أجنبي من صاحبہ ثم لا يملك البيع من نفسہ۔

ولأبی حنيفۃ : أن البيع من ہؤلاء بيع من نفسہ من حيث المعنى لاتصال منفعۃ ملك كل واحد منہما بصاحبہ، ثم لا يملك البيع من نفسہ فلا يملكہ من ہؤلاء بخلاف الأجنبي، ولہذا لا يملك البيع من عبدہ ومكاتبہ، لأن البيع من عبدہ بيع من نفسہ لأنہ لا ملك لہ، وكذا ''المكاتَبُ لأنہ صبدُ ما بقي عليہ درہم'' على لسان رسول الله ﷺ، كذا ہذا۔

يحققہ أن اتصال منافع الأملاك بينہما تورث التہمۃ، لہذا لم تقبل شہادۃ أحدہما لصاحبہ، بخلاف الأجنبي''(بدائع الصنائع ۲۹،۵، كتاب الوكالۃ، فصل بيان حكم التوكيل، ط: زكريا بكڈپو ديوبند)۔

علامہ مرغينانی فرماتے ہيں:

''والوكيل بالبيع والشراء لا يجوز لہ أن يعقد مع أبيہ وجدہ ومن لا يقبل شہادتہ لہ عند أبی حنيفۃ، وقالا :يجوز بيعہ منہم بمثل القيمۃ .....'' (الہدايہ ۱۸۸،۳، كتاب الوكالۃ، فصل فی التوكيل بالشراء،ط: اشرفی بكڈپو ديوبند)۔

اوپر ذكر كردہ صورت كے مطابق امام ابوحنيفہؒ كے قول كے بموجب، ''ب '' كو خود وكيل كے نام پر عاقد بننے سے بچنا چاہئے تھا، اور صاحبين كے قول كی روسے اس وكيل كو خود عاقد بن كر مثلی قيمت سے اتنا كم كرنا كہ مؤكل كا نقصان ہومناسب نہيں تھا، اور مثلی قيمت سے كم ميں بيچنا توباجماع جائز نہيں تھا، لہذا اس كا يہ تصرف غير معتبر ہونا چاہئے ۔

علامہ فريد الدہلویؒ فرماتے ہيں:

''الوكيل إذا باع ممن لا تقبل شہادتہ لہ؛ إن كان بأكثر من القيمۃ يجوز بلا خلاف، وإن كان بأقل من القيمۃ بغبن فاحش لا يجوز بالإجماع، وإن كان بغبن يسير لا يجوز عند أبي حنيفۃ، وعندہما يجوز، وإن كان بمثل القيمۃ فعن أبي حنيفۃ روايتان؛ فی روايۃ:الوكالۃ بالبيع لا تجوز، وفی روايۃ المضاربۃ يجوز، وبيع المضارب وشرائہ ممن لا تقبل شہادتہ بغبن يسير لا يجوز عند أبي حنيفۃ، وبيعہ بأكثر من القيمۃ وشراءہ منہ بأقل من القيمۃ يجوز بلا خلاف، وبمثل القيمۃ يجوز عندہما، وكذلک عند أبي حنيفۃ باتفاق الروايات، وفی روايۃ الطحاوی يجوز بيع الوكيل من نفسہ، أو من ابن صغير لہ، أو من عبد غير مأذون لہ، أو من أولادہ البالغين، أو من زوجتہ، أو من الزوج بأن كان الوكيل امرأۃ، وفی السغناقی:ثم المراد من عدم الجواز فی قولہ: والوكيل بالبيع والشراء لا يجوز أن يعقد من أبيہ أو جدہ أی فی مطلق الوكالۃ، فأما لو قيد الوكالۃ بتعميم المشيۃ؛ بأن قال:بع ممن شئت يجوز بيعہ من ہؤلاء بخلاف البيع من نفسہ أو من ابن صغير لہ لا يجوز، وإن قال ذلک، ہكذا صرح فی المبسوط'' (الفتاوی التاتارخانيہ ۳۷۲،۱۲، كتاب الوكالۃ، فصل فی التوكيل بالبيع، رقم المسئلہ: ۱۷۷۸۸،ط:

زکریا بکڈپو دیوبند)۔

شوافع اور حنابلہ بھی اسی کے قائل ہیں، جیسا کہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اگر وکیل نے مؤکل کے مفوضہ معاملہ میں تعدی سے کام لیا جو مؤکل کے لئے باعث نقصان ہو تو شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس سے بھی وکالت کا معاملہ ختم ہوجائے گا'' (قاموس الفقہ : مادہ، وکالت۵؍۳۱۷،ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

ہیرے اور جواہرات کی خریدوفروخت

ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی•

تمہید:

زیبائش وآرائش انسان کی فطرت میں داخل ہے، اسلام انسان کے اس فطری جذبہ کی رعایت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ‘‘قل من حرّم زینۃ اللہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل ہی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ کذلک نفصل الآیات لقوم یعلمون’’ (الاعراف: ۳۲) ((ان سے) کہئے کہ اللہ کی عطا کردہ عمدہ چیزوں کو کس نے حرام قرار دیا؟ جن کو اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، اور پاکیزہ رزق کس نے ممنوع کردیا؟ اور بتادیں کہ یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں اصلاً ایمان والوں کے لئے ہیں، اور قیامت کے دن تو خالص انہیں کے لئے ہونگے، ہم اسی طرح باتوں کو کھول کھول کر وضاحت سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے فائدہ کے لئے جو جاننا چاہتے ہیں)۔

جواہرات یعنی نفیس اور قیمتی پتھروں سے آرائش بھی انسانی سماج کا حصہ ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ اسلام نے اس سلسلہ میں کیا حدود وضوابط مقرر کئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

محور اول:

سوال نمبر ۱ کا جواب:

بروکر کا دلالی کی فیس کے علاوہ رقم لینے کا حکم:

بروکر (Broker) کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی دلالی کی فیس کے علاوہ کوئی رقم لے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ بروکر جس کےلئے کام کررہا ہے اس کے حق میں امین ہے، لہذا دوسرے فریق کے ساتھ دام کم یا زیادہ کرنے کا اتفاق کرلینا اس کے لئے درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ فریب اور امانت میں خیانت اور باطل طریقہ سے مال کھانا ہے، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بہا إلی الحکام لتأکلوا فریقاً من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون’’ (بقرہ: ۱۸۸) (اپنے درمیان باطل طریقہ سے مال نہ کھاؤ، اور نہ حکام رسی کے لئے مال استعمال کرو کہ لوگوں کے مال وجائداد میں سے کوئی حصہ جانتے بوجھتے،

• مدیر معہد الامام النورسیؒ وصدر شعبۂ فقہ وافتاء وشیخ الحدیث والفقہ جامعہ سید احمد شہید، کٹولی، ملیح آباد، لکھنؤ۔

گناہ کرتے ہوئے تم ہڑپ کرلو)۔

۲۔ اگر بروکر ہی عقد کو انجام دے رہا ہے تو وہ اس حالت میں وکیل ہے، اور وکیل امین ہوتا ہے؛ لہذا اسے جو نفع ہوگا، وہ موکل کا ہوگا، مصطفی رحیبانی حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘وہبۃ بائع لوکیل اشتری منہ، کنقص من الثمن، فتلحق بالعقد؛ لأنہا لموکلہ’’ (رحیبانی، مطالب اولی النہی۳،۱۳۲، دمشق، المکتب الاسلامی، ۱۹۴۱، ع۔أ۔: ۶) (فروخت کنندہ نے اس وکیل کو ہبہ کیا جس نے اس سے خریدا، تو یہ ثمن کم کرنے کی طرح ہے، لہذا یہ اصل عقد سے مل جائے گا؛ اس لئے کہ یہ اس کے موکل کے لئے ہے)۔

۳۔ اگر بروکر کا کام صرف وساطت یعنی بیچنے یا خریدنے والے کو بتانا ہے، اور وہ جس کا بروکر ہے اس نے دام متعین کردیا ہے، تو ایسی صورت میں زیادہ یا کم میں معاملہ کرنے پر تیار کرلینا خیانت اور دھوکہ کے باب سے ہے، اور ارشاد الہی ہے: ‘‘إن اللہ لا یحب الخائنین’’ (انفال: ۵۸) (یقینا اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

دلال کا خود بائع سے مقررہ قیمت پر خریدنے کا حکم:

الف: اصولی اعتبار سے دلال خود سے نہیں بیچ سکتا ہے، لیکن جب دلال اور بائع دلالی کو ختم کرنے کےلئے تیار ہیں، اور بائع اپنی بتائی ہوئی قیمت پر دلال سے بیچنے کے لئے تیار ہے، تو پھر شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، علامہ شامیؒ ‘‘بزازیہ ’’ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ‘‘وإن أمرہ الموکل أن یبیعہ من نفسہ، أو أولادہ الصغار، أو ممن لا تقبل شہادتہ لہ، فباع منہم جاز’’ (ابن عابدین، ردر المحتار ۳۳۲،۷، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ، ع۔أ۔ : ۸) (اور اگر موکل نے اسے حکم دیا کہ خود سے بیچ دے، یا اپنی نابالغ اولاد سے بیچ دے، یا ان رشتہ داروں سے بیچ دے جن کی شہادت اس کے حق میں مقبول نہیں، اور اس نے ان سے بیچ دیا، تو بیع نافذ رہے گی)۔

نیز آگے لکھتے ہیں:‘‘إلا إذا أجاز الموکل بعد البیع، فلا یرد ما ذکرہ’’ (مرجع سابق۳۳۲،۷) (مگر موکل بیع کے بعد اجازت دے دے، تو پھر ان کے ذکر کردہ اشکالات وارد نہیں ہوتے ہیں کہ خود سے بیچنے کی صورت میں ایک ہی آدمی خریدار اور فروخت کنندہ دونوں ہوجائے گا)۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ دلال کو اجرت لینے والے وکیل کے درجہ میں رکھا جائے، لیکن ذکر کردہ سوال میں دلال کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی مانی گئی ہے، لہذا اس صورت کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

ب: بروکر کا فرضی خریدار کے ذریعہ خود کے لئے خریدنے کے بعد اصلی خریدار سے بیچنے کا حکم:

دلال جس کے لئے کام کررہا ہے اس کے حق میں امین ہے، اس کے لئے جائز نہیں

کہ فرضی خریدار تیار کرکے بائع سے کم قیمت میں اپنے لئے خرید کر زیادہ قیمت میں اصلی خریدار سے بیچ دے؛ کیونکہ اس میں دھوکہ اور امانت میں خیانت ہے؛ حتی کہ اگر دلال ہی عقد کو انجام دینے والا ہوتا تو بھی اس کے لئے جائز نہیں ہوتا کہ فرضی خریدار کے ذریعہ اپنے لئے خرید کر اصلی خریدار سے بیچ دے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: ''الوکیل لا یؤکل إلا بإذن آمرہ لوجود الرضا'' (حصکفی، الدر المختار۵،۵۲۷) (وکیل کسی دوسرے کو وکیل نہیں بناسکتا ہے، مگر اپنے حکم دینے والے موکل کی اجازت سے؛ اس لئے کہ اس صورت میں رضامندی موجود ہے)۔

اور علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: ''المراد أنہ لا یؤکل فیما وکل فیہ'' (ابن عابدین، رد المحتار۵،۵۲۷) (مراد یہ ہے کہ اس کام میں وکیل نہیں بنائے گا جس میں اسے وکیل بنایا گیا ہے)۔

اور اگر دلال کو ''مجعول لہ '' یعنی جس کے لئے کام کے بدلہ عوض کا اعلان کیاگیا، قرار دیا جائے، تو وہ عوض کا حقدار اسی وقت ہوگا جبکہ کام کو انجام دے، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ تحریر فرماتے ہیں:''فلا یستحقہ من لم یعمل'' (ابن قدامہ: المغنی۶،۳۷۵، ط: ۱، بیروت، دار الفکر۱۴۰۵ھ، ع۔أ۔ : ۱۰) (تو وہ شخص عوض کا حقدار نہ ہوگا جس نے کام نہیں کیا)۔

خلاصہ یہ کہ فرضی خریدار کھڑا کرکے دلالی کی فیس کے ساتھ مزید رقم اینٹھ لینا باطل طریقہ سے مال کھانا ہے جو شرعاً ناجائز ہے، خواہ یہ چار فیصد دلالی فیس اس فرضی خریدار کو دے دے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''یاأیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! غلط طریقہ پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ)۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

ایسے مارکیٹ سے خریدنے کا حکم جس میں چوری اور صحیح مال دونوں ملتا ہو:

اس کا دار ومدار غلبۂ ظن پر ہے، لہذا اگر خریدار کو گمانِ غالب ہو کہ وہ صحیح مال خرید رہا ہے تو اس کےلئےخریدنا جائز ہے، اور اگر اس کو گمانِ غالب ہو کہ وہ چوری کا مال خرید رہا ہے، خواہ مالک معلوم نہ ہو، تو اس کے لئے اس مارکیٹ سے خریدنا جائز نہیں ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من اشتری سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ، فقد شرک فی عارہا وإثمہا'' (حاکم، المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر: ۲۲۵۳، بیہقی، شعب الایمان حدیث نمبر: ۵۵۰۰، مسند اسحاق بن راہویہ، حدیث نمبر: ۴۱۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (جو چوری کا مال خریدے حالانکہ اسے معلوم ہو کہ یہ چوری کردہ مال ہے، تو وہ اس کے ننگ وعیب اورگناہ میں شریک ہے)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

فروخت کنندہ کے قول پر اعتماد کرنے کا حکم:

ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا واجب ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘یاأیہاالذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن إن بعض الظن إثم’’ (الحجرات: ۱۲) (اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو، واقعہ یہ ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں)۔

اور فرمان باری تعالی ہے: ‘‘لو لا إذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بأنفسہم خیراً’’ (النور: ۱۲) (جب تم نے یہ الزام سنا تھا، تو ایمان والے مرد وخواتین کو آپس میں ایک دوسرے پر حسن ظن کا خیال رکھنا چاہئے تھا)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالمﷺ نے ارشاد فرمایا: ‘‘إیاکم والظن، فإن الظن أکذب الحدیث’’ (صحیح البخاری: حدیث نمبر: ۵۱۴۳، ۶۰۶۴، صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۲۵۶۳، مسند احمد: حدیث نمبر: ۷۳۳۷) (بدگمانی سے بچو؛ کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے)۔

لہذا ظاہر پر حکم لگانا چاہئے، اور باطن کو اللہ تعالی کے حوالہ کردینا چاہئے؛ اس لئے جب فروخت کنندہ یہ کہہ رہا ہے کہ درست مال ہے تو بہ ظاہر اس کی بات پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

ادھار خرید کر بیچنے کا حکم:

بیع ایجاب وقبول سے مکمل ہوجاتی ہے، علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں: ‘‘البیع ینعقد بالإیجاب والقبول’’ (مرغینانی: الہدایہ۳،۲۱، بیروت، المکتبۃ الاسلامیہ) (بیع ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتی ہے)، اور بیع کا اصلی حکم یہ ہے کہ ‘‘ثبوت الملک للمشتری فی المبیع، وللبائع فی الثمن للحال’’ (کاسانی: بدائع الصنائع۵،۲۳۳، بیروت، دار الکتاب العربی، ع۔أ۔ : ۷) (فوری طور سے مبیع میں خریدار کی ملکیت اور ثمن میں بائع کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے)۔

اور ثمن ادھار رکھا جاسکتا ہے، ‘‘مجلہ الاحکام العدلیہ ’’ میں ہے: ‘‘البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطہ صحیح’’ (المجلۃ ،۵۰، دفعہ: ۲۴۵) (ثمن کو ادھار اور قسط وار رکھ کر بیع کرنا صحیح ہے)۔

اور اگر سامان منقولات میں سے ہو اور اس پر قبضہ ہوجائے، تو پھر اسے دوسرے سے بیچ بھی سکتے ہیں، علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘وبیع منقول قبل قبضہ’’ (حصکفی: الدر المختار۵،۱۴۷) (اور منقولہ سامان کو اس پر قبضہ سے پہلے بیچنا صحیح نہیں ہے)۔

لہذا سوال میں ذکر کردہ صورت جائز ہے کہ ادھار خرید کر سامان کو قبضہ میں

لے کر دوسرے سے نقد بیچ دے، اور پھر حاصل شدہ رقم سے ادھار ثمن ادا کرکے باقی پیسے اپنے نفع کے طور پر رکھ لے۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

خرید وفروخت کے معاملہ کے بغیر متعینہ سامان کو بیچنے کا حکم:

خریدوفروخت کے معاملہ سے پہلے ہی متعینہ سامان کو بیچ دینا درست نہیں ہے کہ یہ اپنے لئے غیر مملوک اور غیر موجود کی بیع ہے جو صحیح نہیں ہے، اور اس طرح نفع کمانا بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی میرے پاس آتا ہے جو مجھ سے بیع کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور میرے پاس وہ چیز نہیں ہوتی جو وہ طلب کررہا ہوتا ہے، کیا میں اس سے بیچ دوں پھر اسے بازار سے خرید کر حوالہ کردوں، تو آپﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا تبع ما لیس عندک'' (سنن نسائی: حدیث نمبر: ۴۶۱۳، سنن ابی داؤد: حدیث نمبر: ۳۵۰۳، سنن ترمذی: حدیث نمبر: ۱۲۳۲، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (جو چیز تیرے پاس نہ ہو اسے فروخت نہ کرو)۔

اور ''مجلۃ الاحکام العدلیہ '' میں ہے: ''یلزم أن یکون المبیع موجوداً'' (المجلہ۲۹، دفعہ: ۱۹۷) (ضروری ہے کہ مبیع موجود ہو)۔

اور اس طرح بیچنے میں عقلی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ جو چیز رسک میں نہ آئی ہو اس سے نفع حاصل کرنا لازم آرہا ہے جو درست نہیں ہے۔

محور دوم:

سوال نمبر ۱ کا جواب:

خریدار کے ذمہ واجب الادا رقم کی پرچی کو بیچنے کا حکم:

سوال میں ذکر کردہ صورت جائز نہیں ہے، اور وہ یہ کہ دلال خریدار کے ذمہ واجب الادا رقم کی پرچی کو بائع سے نقد پیسہ دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلے، اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے وصول کرلے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اس صورت میں دین کو نقد سے یعنی دَین کی جنس سے بیچا جارہا ہے، لہٰذا اس میں دو خرابیاں لازم آرہی ہیں:

(۱) ربا فضل پایا جارہا ہے؛ اس لئے کہ خریدنے والے دلال نے کم پیسے دیئے ہیں، تاکہ اس کے بدلہ اسی کی جنس سے وقت آنے پر زیادہ پیسے حاصل کرے، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا تبیعوا الذہب بالذہب إلا مثلاً بمثل، ولا تشفّوا بعضہا علی بعض، ولا تبیعوا الورق بالورق إلا مثل بمثل، ولا تشفّوا بعضہا علی بعض، ولا تبیعوا منہا غائباً بناجز'' (صحیح البخاری: حدیث نمبر: ۲۱۷۷، صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۵۸۴) (سونے کو سونے کے بدلہ برابر برابر بیچو، اور ایک کو

دوسرے پر زیادہ نہ کرو، اور چاندی کو چاندی کے بدلہ برابر برابر بیچو، اور ایک کو دوسرے پر زیادہ نہ کرو، اور ان میں سے موجود کے بدلہ غیر موجود کو مت بیچو)۔

نیز اس میں ''ربا النسیئۃ '' بھی پایا جارہا ہے کہ مال ربوی کو اس کے بدل کو موخر ادا کرنے کے ساتھ بیچا جارہا ہے، جو بالاتفاق حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وأحل الله البيع وحرّم الربا'' (بقرہ: ٢٧٥) (حالانکہ اللہ تعالی نے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے)، اور ایک موقع سے ارشاد ہے: ''یاأیہا الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین فإن لم تفعلوا فأذنوا بحربٍ من الله ورسولہ وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون'' (بقرہ: ٢٧٨-٢٧٩) (اے ایمان والو! اللہ کے احکام کا لحاظ رکھو اور باقی سودی مطالبات ترک کردو، اگر تم مومن ہو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے (تمہارے خلاف) اعلانِ جنگ ہے، اور اگر تم تائب ہوتے ہوتو تمھیں اصل مال کا حق حاصل ہے، نہ تم زیادتی کرو، نہ تم پر زیادتی کی جائے)۔

٢۔ حضرت ابوجُحیفہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریمﷺ نے ''لعن آکل الربا ومؤکلہ'' (صحیح البخاری: حدیث نمبر: ٢٢٣٨) (سود کھانے اور کھلانے والے پر لعنت فرمائی ہے)۔

٣۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمﷺ نے ''سات ہلاک کرنے والے امور میں سے ایک سود خوری کو قرار دیا '' (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ٨٩)۔

سوال نمبر ٢ کا جواب:

سود کے ذریعہ قیمت ادا کرنے کا حکم:

اسلام کی نگاہ میں سود سخت ترین سماجی اور اخلاقی جرم ہے، اللہ تعالی نے سود خور کو اعلانِ جنگ دیا ہے، اور سرکار دوعالمﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے پر لعنت کی ہے، جیسا کہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ''لعن رسول اللہﷺ آکل الربا ومؤکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال:ہم سواء'' (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ١٥٩٨) (رسول اکرمﷺ نے سود کھانے اور سود کھلانے والے اور سودی معاملہ لکھنے والے اور سود کے گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی، اور ارشاد فرمایا: یہ سب برابر ہیں)۔

لہذا سامان کی قیمت ادا کرنے کے لئے سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

سوال نمبر ٣ کا جواب:

بائع سے قیمت کم کرانے کا حکم:

بیع کا حکم یہ ہے کہ فروخت کنندہ اور خریدار میں سے ہر ایک کی ملکیت بدلین

میں سے ایک بدل میں ثابت ہوجاتی ہے، چنانچہ مبیع پر خریدار کی اور ثمن پر فروخت کنندہ کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: ‘‘وحکمہ ثبوت الملک’’ (حصکفی: الدر المختار۴٫۵۰۵) (اور بیع پر مرتب ہونے والا اثر یہ ہےکہ خریدار اور فروخت کنندہ میں سے ہر ایک کی ایک ایک بدل میں ملکیت ثابت ہوجاتی ہے)۔

لیکن اگر قیمت میں خریدار اضافہ کردے یا فروخت کنندہ کم کردے تو اس کی گنجائش ہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:‘‘وصح الحط منہ ولو بعد ہلاک المبیع وقبض الثمن، والزیادۃ والحط یلتحقان بأصل العقد بالاستناد، فبطل حط الکل’’ (حصکفی: الدر المختار۵٫۱۵۴-۱۵۵) (اور ثمن میں سے کم کرنا صحیح ہے، خواہ مبیع کی ہلاکت اور ثمن پر قبضہ کے بعد ہو، اور اضافہ وکمی دونوں منسوب ہوکر اصل عقد سے مل جاتے ہیں (یعنی پہلے فوری طور سے ثابت ہوتے ہیں، پھر وقت عقد کی طرف منسوب ہوجاتے ہیں) لہذا مکمل ثمن کی معافی کا اصل عقد سے لاحق ہونا باطل ہے)۔

چنانچہ اگر فروخت کنندہ خوشی سے، دھوکہ کھائے بغیر چار سو روپے فی کیرٹ پر آمادہ ہوجائے، تو شرعاً یہ صورت جائز ہے۔

اور اگر جھوٹ اور دھوکہ سے کام لیا گیا تو خریدار نے حرام کا ارتکاب کیا اور بے برکتی کا شکار ہوا، جیسا کہ حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ‘‘البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما، وإن کتما وکذبامحقت برکۃ بیعہما’’ (صحیح البخاری: حدیث نمبر: ۲۰۷۹، ۲۰۸۲، صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۵۳۲) (فروخت کنندہ اور خریدار کو اختیار ہے جب تک وہ جدانہ ہوں، پھر اگر دونوں نے سچ سے کام لیا، اور عیب کو بیان کردیا، تو ان کے لئے ان کی بیع میں برکت عطا کی جائے گی، اور اگر چھپایا اور جھوٹ کے شکار ہوئے، تو ان کی بیع کی برکت ختم ہوجائے گی)۔

اور دھوکہ کی وجہ سے فروخت کنندہ کو واپسی کا حق ہوگا، حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

‘‘اگر اسے دھوکہ دے، یعنی خریدار فروخت کنندہ کو، یا برعکس صورتِ حال ہو، یا دلال دھوکہ دے، تو اسے واپس کرنے کا حق ہوگا، ورنہ نہیں، صدر الاسلام وغیرہ نے اسی پر فتوی دیا ہے ’’ (حصکفی: الدر المختار۵٫۱۴۳)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

حقیقت کے خلاف سامان میں عیب نکالنے یا تعریف کرنے کا حکم:

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ ہر حال میں حقیقت پسند رہے اور سچائی کا دامن تھامے رہے، چنانچہ خریدوفروخت کے سلسلہ میں سچ بولنا ضروری ہے، نیز یہ خیروبرکت کا سبب ہے، اور دھوکہ اور جھوٹ حرام اور بے برکتی کا ذریعہ ہیں، حضرت

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ بازار میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کا غلہ کا ڈھیر تھا، سو نبی کریمﷺ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر داخل کیں، اور آپﷺ کو تری کا احساس ہوا، سو ارشاد فرمایا: ‘‘ما ہذا یا صاحب الطعام؟ فقال:أصابتہا السماء یا رسول اللہ، قال:أفلا جعلتہ فوق الطعام کی یراہ الناس، من غشّ فلیس منی’’ (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۰۲، سنن ابی داؤد: حدیث نمبر: ۳۴۵۲، مسند احمد: حدیث نمبر: ۷۲۹۲) (یہ کیا ہے اے غلہ کے مالک!؟ تو اس نے جواب دیا کہ اس پر بارش پڑی ہے، اے اللہ کے رسول، توآپﷺ نے فرمایا: تو نے اسے غلہ کے اوپر کیوں نہیں رکھا؛ تاکہ اسے لوگ دیکھ لیں، جو دھوکہ دے وہ مجھ میں سے نہیں)، اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ‘‘المکر والخدیعۃ والخیانۃ فی النار’’ (حاکم: المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر: ۸۷۹۵، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (فریب، دھوکہ اور خیانت کا انجام جہنم ہے)۔

لہذا یہ جائز نہیں ہے کہ خریدتے وقت مال کو عیب دار قرار دینے کی کوشش کرے اور اسی کی فروخت کرتے وقت ڈھیر ساری تعریفیں کرلے؛ کیونکہ یہ دوحال سے خالی نہیں ہے، یا تو وہ عیب دار قرار دینے میں سچا ہے تو پھر وہ فروخت کرتے وقت جھوٹ بول رہا ہے، یا تو وہ عیب داد قرار دینے میں سچا ہے تو پھر وہ فروخت کرتے وقت جھوٹ بول رہا ہے، یا تو وہ عیب داد قرار دینے میں جھوٹا ہے، تو پھر وہ بیچنے والے کو دھوکہ دے رہا ہے، اور ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات صحیح نہیں ہے، لہذا جو اس کو مستلزم ہو وہ بھی غلط ہے۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

ملاوٹ کا حکم:

الف: اگر ملاوٹ اور عیب سے مطلع کردیا گیا اور خریدار تاجر اس کے ساتھ لینے پر راضی ہوگیا، تو پھر فروخت کرنے والے پر اس سلسلہ میں کوئی الزام نہیں ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: ‘‘الرضا بالعیب بعد العلم بہ؛ لأن حق الرد لفوات السلامۃ المشروطۃ فی العقد دلالۃً، ولما رضی بالعیب بعد العلم بہ دلّ أنہ ما شرط السلامۃ’’ (کاسانی: بدائع الصنائع۵؍۲۸۲، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۸۲، ع۔أ۔: ۷) (عیب کا علم ہونے کے بعد بھی اس پر راضی رہنا واپسی کے حق کو ساقط کردیتا ہے؛ اس لئے کہ واپسی کا حق اس سلامتی کے فوت ہونے کی وجہ سے ہے جو بہ طور دلالت عقد میں مشروط ہے، اور جب خریدار عیب معلوم ہونے کے بعد بھی اس پر راضی ہوگیا، تو اس سے یہ پتہ چلا کہ اس نے سلامتی کی شرط نہیں لگائی)، البتہ اگر معلوم ہو کہ خریدار تاجر دوسروں کو دھوکہ دے گا، تو پھر ایسے تاجر کے ہاتھ سے بیچنا مکروہ تنزیہی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

‘‘ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان’’ (المائدہ: ۲) (اور گناہ اور زیادتی کے کسی عمل میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

ب: اگر خریدار تاجر کو عیب سے مطلع نہیں کیاگیا، تو پھر اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو پورے ثمن کے ساتھ اسے لے لے، یا واپس کردے، علامہ مرغینانیؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘وإذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فہو بالخیار إن شاء أخذہ بجمیع الثمن، وإن شاء ردّہ؛ لأن مطلق العقد یقتضی وصف السلامۃ، فعند فواتہ یتخیر، کیلا یتضرر بلزوم ما لا یرضی بہ’’ (مرغینانی: ہدایہ۳،۳۵، بیروت، المکتبۃ الاسلامیہ) (اور اگر خریدار مبیع کے عیب پر مطلع ہو، تو اسے اختیار ہے، اگر چاہے تو اسے پورے ثمن کے بدلہ لے لے، اور اگر چاہے تو اسے واپس کردے؛ اس لئے کہ مطلق عقد سلامتی کی صفت کا تقاضا کرتا ہے، تو اس کے فوت ہونے کے وقت خریدار کو اختیار ہوگا، تاکہ ایسی چیز کے لازم ہونے سے اسے ضرر لاحق نہ ہو، جس سے وہ راضی نہیں)، اور عیب کو بیان کئے بغیر بیچنے والا دھوکہ دینے کا گنہگار ہوگا، اور باطل طریقہ سے مال کھانے والا ہوگا۔

حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:‘‘المسلم أخو المسلم، ولا یحل لمسلم باع من أخیہ بیعاً فیہ عیب إلا بینہ لہ’’ (سنن ابن ماجہ: حدیث نمبر: ۲۲۴۶، حاکم: المستدرک علی الصحیحین: حدیث نمبر: ۲۱۵۲، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اور کسی ایسے مسلمان کے لئے حلال نہیں جس نے اپنے بھائی سے بیع کی جس میں عیب ہو، مگر یہ کہ وہ اسے بتادے)۔

البتہ حنابلہ کے نزدیک چاہے تو واپس کردے اور چاہے تو نقصان کی تلافی کے حق کے ساتھ مبیع کو روک لے، علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘إنہ إذا اختار المشتری إمساک المعیب، وأخذ الأرش فلہ ذلک’’ (ابن قدامہ: المغنی۴،۲۵۷) (اگر خریدار عیب دار سامان کو روک لینا اور عیب کا عوض لینا چاہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے)۔

اس دور فریب میں حنابلہ کا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے، نیز اس لئے بھی کہ سامان کا عیب دار ہونا گویا اس میں سے ایک حصہ کم ہونا ہے، لہذا خریدار عوض کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

قیمتی پتھروں کی تجارت میں نفع کا تناسب مقرر ہے یا نہیں؟

اسلامی شریعت میں نفع کا کوئی تناسب مقرر نہیں ہے، بلکہ خریدار اور فروخت کنندہ کی باہمی رضامندی سے جو طے ہوجائے، وہ جائز ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم’’ (النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! غلط طریقہ پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ، مگر یہ کہ تمہاری رضامندی کے ساتھ تجارت ہو)۔

اور نبی کریمﷺ نے عروہ بن ابی الجعد بارقی کو مقام ‘‘حلب ’’ سے ایک دینار دےکر بکری خریدنے پر مامور کیا، اور انہوں نے ایک دینار میں دو بکری خرید ی اور راستہ میں ایک بکری ایک دینار میں بیچ دی، اور ایک بکری نبی کریمﷺ کے پاس لے کر آئے اور کہا کہ ‘‘ہذا دیناركم، وہذہ شاتكم’’ قال: وصنعت كيف؟ قال: فحدثتہ الحديث، فقال: اللہم بارک لہ فی صفقۃ يمينہ’’ (سنن ابی داؤد: حدیث نمبر: ٣٣٨٥، سنن ابن ماجہ: حدیث نمبر: ٢٤٠٢، مسند احمد: حدیث نمبر: ١٩٣٦٢، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (یہ آپ کا دینار ہے، اور یہ آپ کی بکری ہے، آپﷺ نے پوچھا، تو نے کس طرح معاملہ کیا؟ جواب میں انہوں نے کہا: میں نے واقعہ بیان کیا، یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ! اس کے ہاتھ کے معاملہ میں برکت عطا فرما)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صد فی صد نفع کی بھی گنجائش ہے۔

البتہ نفع مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ عدل کے تقاضے کے مطابق ہو، اور ظلم کے دائرہ میں داخل نہ ہوجائے، اور خلق الہی پر احسان اور شفقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘وأحسن كما أحسن اللہ إليک، ولا تبغ الفساد فی الأرض، إن اللہ لا يحب المفسدين’’ (القصص: ٧٧) (اور اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کررکھا ہے، اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اللہ تعالی بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے: ‘‘إن اللہ يحب المقسطين’’ (مائدہ: ٤٢) (بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: ‘‘واللہ لا يحب الظالمين’’ (آل عمران: ٥٧) (اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا)۔

محور سوم:

سوال نمبر ١ کا جواب:

ڈسکاؤنٹ کے وعدہ کے ساتھ خریدوفروخت کا حکم:

بیع کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے کہ مبیع اور ثمن معلوم ہوں، ‘‘مجلۃ الاحکام العدلیہ ’’ میں ہے: ‘‘يلزم أن يكون المبيع معلوماً عند المشترى’’ (المجلۃ ،٤١، دفعہ: ٢٠٠)۔

اور آگے تحریر ہے: ‘‘يلزم أن يكون الثمن معلوماً’’ (المجلۃ ،٤٩، دفعہ: ٢٣٨) (لازم ہے کہ ثمن بھی معلوم ہو)۔

اور جس شرط کا رواج ہوجائے وہ مفسد عقد نہیں ہے، علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘أما لو جرى العرف بہ .... فلا فساد’’ (حصكفی: الدر المختار٥،٨٥) (بہرحال اگر عرف میں وہ شرط جاری ہوجائے تو عقد فاسد نہ ہوگا)۔

لہذا ڈسکاؤنٹ کی شرط کے ساتھ بیع درست ہے، اور ایک ماہ میں قیمت ادا کردینے کی صورت میں خریدار ڈسکاؤنٹ کا حقدار ہے، اور یہ متعین وقت میں ادائیگی کی پابندی کرنے پر بائع کی طرف سے انعام سمجھا جائے گا۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ ثمن معلوم ومتعین ہو، اس میں تردد نہ ہو کہ وقت پر ادائیگی کی صورت میں یہ ثمن ہے، اور ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں یہ ثمن ہے، لیکن اگر ایک ماہ میں قیمت ادا نہیں کی گئی تو اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف: معاملہ طے پاتے وقت ہی خریدار کے سامنے یہ بات رکھ دی گئی تھی۔

ب: یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی، مگر مارکٹ کا چلن یہی ہو۔

ج: نہ یہ شرط طے پائی اور نہ ہی اس قسم کا عرف ہے۔

اس کے باوجود اگر بائع ان تمام صورتوں میں ڈسکاؤنٹ یعنی قیمت کم کردیتا ہے تو شرعاً یہ درست ہے، اور یہ اس کی طرف سے رعایت سمجھی جائے گی، ‘‘مجلۃ الاحکام العدلیہ ’’ میں ہے: ‘‘وتنزيل البائع من الثمن بعد العقد تلحق بأصل العقد يعنى يصير كأن العقد وقع على ما حصل بعد الزيادة والحط’’ (المجلہ،۵۳، دفعہ: ۲۵۷) (عقد کے بعد بائع کا ثمن کم کردینا اصل عقد سے لاحق ہوجائے گا، یعنی اس طرح ہوجائے گا کہ گویا عقد اس قیمت پر ہوا جو کمی یا زیادتی کے بعد حاصل ہوئی)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

ٹال یعنی (Reject) کا حکم:

جب مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جانے کے باوجود سامان بنوانے والا اس شئی کو حاصل کرلیتا ہے، تو پھر پوری اجرت دینا لازم ہے، لہذا کاریگر کو اس کی کوئی اجرت ادا نہ کرنا ظلم ہے، ‘‘والله لا يحب الظالمين’’ (آل عمران: ۵۷) (اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا)۔

کاریگر کی خلاف ورزی کی صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر معمولی فرق ہے تو پوری اجرت ملے گی، اور اگر زیادہ فرق ہے تو کاریگر اجرت کا مستحق نہیں، اور اس پر اس سامان کی قیمت لازم ہے جسے اس نے خراب کیا ہے، البتہ اگر مالک اسی سامان کو قبول کرنے پر راضی ہوجائے تو اس پر اجرتِ مثل لازم ہے جو طے شدہ اجرت سے زیادہ نہ ہوگی۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: ‘‘وضمن بصبغه أصفر، وقد أمر بأحمر قيمة ثوب أبيض، وإن شاء المالك أخذه وأعطاه ما زاد الصبغ فيه، ولا أجر له، ولو صبغ رديئاً، إن لم يكن الصبغ فاحشا لا يضمن الصباغ، وإن كان فاحشاً عند أهل فنه يضمن قيمة ثوب أبيض’’ (حصكفى: الدر المختار،۴۲،۶) (اور کپڑا کو زرد رنگنے کی صورت میں ضامن ہوگا، جبکہ مالک نے سرخ رنگنے کا حکم دیا ہو، اور یہ تاوان سفید کپڑے کی قیمت ہوگی، اور اگر مالک چاہے تو اسے لے لے اور رنگنے کی وجہ سے جو اس کی قیمت بڑھی ہو رنگنے والے کو دے

دے، اور اسے اجرت نہیں ملے گی، اور اگر گھٹیا رنگا ہو، تو اگر رنگائی بہت زیادہ خراب نہ ہو تو رنگریز ضامن نہیں ہوگا، اور اگر اس فن کے ماہرین کے نزدیک بہت زیادہ خراب ہو، تو وہ سفید کپڑے کی قیمت کا ضامن ہوگا)۔

اور علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:''وفی الثانیۃ إن شاء ضمّنہ قیمۃ ثوب أبیض، وإن شاء أخذ ثوبہ وأعطاہ أجر مثلہ لا یجاوز بہ المسمی أیضاً'' (ابن عابدین: رد المحتار۶؍۷۵) (اور دوسری صورت میں اگر چاہے تو اسے سفید کپڑے کی قیمت کا ضامن قرار دے، اور اگر چاہے تو اپنا کپڑا لے لے، اور اسے اجرتِ مثل دے دے جو طے شدہ اجرت سے زیادہ نہ ہوگی)۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

قانونی مصلحت کے تحت کم قیمت درج کرنے کا حکم:

قانونی مصلحت کے تحت کم قیمت درج کرنا مناسب نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ جھوٹ ہے، اور جھوٹ حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''یاأیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین'' (توبہ: ۱۱۹) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور راست بازوں کے ساتھ رہو)۔

۲۔ نبی کریمﷺ نے کذب بیانی کی سخت مذمت کی ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓسے مروی ہے کہ رسول کریمﷺ نے ارشاد فرمایا:''وإیاک والکذب، فإن الکذب یہدی إلی الفجور، وإن الفجور یہدی إلی النار، وما یزال الرجل یکذب، ویتحری الکذب حتی یکتب عند اللہ کذاباً'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۶۰۷، بخاری: الادب المفرد: حدیث نمبر: ۳۸۶، سنن ابی داؤد: حدیث نمبر: ۴۹۸۹، سنن ترمذی: ۱۹۷۱، مسند احمد: حدیث نمبر: ۳۶۳۸) (جھوٹ سے بچو؛ کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے، اور بدکاری جہنم کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے، اور جھوٹ کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے)۔

۳۔ ایسا عام طور سے اس لئے کیا جاسکتا ہے تاکہ ٹیکس سے بچا جاسکے، لیکن اگر حکومت کے ذرائع آمدنی واقعی اخراجات کے لئے کافی نہ ہوں، تو پھر ٹیکس کا عائد کرنا صحیح ہے، اور اس سے بچنے کی تدبیر نامناسب عمل اور گناہ ہے،البتہ اگر ٹیکس اور دیگر ذرائع آمدنی سے حاصل مال کو نامناسب جگہوں، فضولیات، تعیشات، گناہوں اور برائیوں میں استعمال کیا جاتا ہو، تو پھر ٹیکس سے بچنے کی ایسی تدبیر کی گنجائش ہے۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

ایکسپورٹ میں اصل قیمت سے کم لکھنے کا حکم:

اس کا تعلق بھی ٹیکس سے بچنے سے ہے، لہذا سرکاری خزانہ کے ذرائع آمدنی اگر لازمی خدمات اور عمومی مصالح کے لئے کافی نہ ہونتو مناسب مقدار میں ٹیکس عائد کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، اور برحق ودرست وعادلانہ ٹیکس سے بچنے کی تدبیر مناسب نہیں ہے، لہذا اصل قیمت کے بجائے دس فیصد قیمت ہی لکھنا شرعاً مناسب نہیں ہے۔

لیکن اگر ناحق ٹیکس لیا جاتا ہو، یا ٹیکس کی مقدار ظالمانہ ہو، یا ٹیکس کا استعمال منصفانہ طریقہ سے نہ ہو، تو پھر ایسے ٹیکس سے بچنے کی باعزت تدبیر کی گنجائش ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

١۔ نبی کریمﷺ نے ناحق مال وصول کرنے والے کو جنت سے محروم قرار دیا، چنانچہ عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:''لا یدخل صاحب مکس الجنۃ'' (صحیح ابن خزیمہ: حدیث نمبر: ٢٣٣٣، مسند ابی یعلی: حدیث نمبر: ١٧٥٦، مسند احمد: حدیث نمبر: ١٧٣٥٤، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

٢۔ عام طور سے مالِ عام کا موجودہ وقت میں غلط استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مصالح عامہ کو وجود میں لانے کی جگہ حکمراں ٹولہ کے تعیش کا انتظام کیا جاتا ہے۔

٣۔ فقہاء نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ ناحق طریقہ سے عام لوگوں کے مال لینا شرعاً ظلم اور ناجائز ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین ''فتح القدیر '' کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ''الجبایات الموظفۃ علی الناس ببلاد فارس علی الضیاع وغیرہا للسلطان فی کل یوم أو شہر أو ثلاثۃ أشہر، فإنہا ظلم'' (ابن عابدین: رد المحتار ٤٨،٥) (ملک ایران میں بادشاہ کے لئے روزانہ یا ماہانہ یا تین ماہ پر جائیداد وغیرہ کے سلسلہ میں لوگوں پر عائد کردہ ٹیکس ظلم ہے)۔

سوال نمبر ٥ کا جواب:

جواہرات کے بچے ہوئے ٹکڑے کاریگر کے لئے جائز نہیں:

جواہرات کو زیور وغیرہ کے سانچہ میں ڈھالتے وقت جو ذرات اور ٹکڑے بچ جاتے ہیں، وہ کاریگر کے لئے جائز نہیں ہیں، بلکہ ان پر مالک کی ملکیت ثابت ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

١۔ حضرت عمرو بن یثربی ضمریؓ سے روایت ہے کہ سرکاردوعالمﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا یحل لامرئ من مال أخیہ إلا ما طابت بہ نفسہ'' (ابن ابی عاصم، ''الآحاد والمثانی '' حدیث نمبر: ٩٧٩، مسند احمد: حدیث نمبر: ١٥٤٨٨، اور یہ صحیح لغیرہ درجہ کی حدیث ہے) (کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کے مال سے اتنا ہی حلال ہے جس پر وہ راضی ہو)۔

٢۔ بچے ہوئے ذرات کو حاصل کرنے کے لئے زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا

جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی، اور یہ جھوٹ ہے، اور جھوٹ حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘ولہم عذاب أليم بما كانوا يكذبون’’ (بقرہ: ۱۰) (اور ان کو، ان کے جھوٹ کی بنا پر دردناک سزا دی جائے گی)۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ‘‘أربع من كن فيه كان منافقاً، أو كانت فيه خصلة من الأربع، كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا حدّث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا عاہد غدر، وإذا خاصم فجر’’ (صحيح البخاری: حديث نمبر: ۳۴، ۲۴۵۹، ۳۱۷۸، صحيح مسلم: حديث نمبر: ۵۷، مسند احمد: حديث نمبر: ۶۷۶۸) (چار خصلتیں جس میں ہونگی، وہ منافق ہوگا، یا جس میں چار میں سے ایک خصلت ہوگی، اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے: (۱) جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، اور (۲) جب وعدہ کرے تو وعدہ خلاف کرے، اور (۳) جب عہد کرے تو عہد شکنی کرے، اور (۴) جب جھگڑے تو گالم گلوج کرے)۔

۳۔ بچے ہوئے ذرات کو حاصل کرنے کےلئے زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی، اور یہ دھوکہ ہے، اور دھوکہ دینا حرام ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: ‘‘الغش حرام’’ (حصكفی: الدر المختار۵؍۴۷) (دھوکہ دینا حرام ہے)۔

اور حرام ذریعہ سے جو مال حاصل ہو وہ بھی حرام ہے۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

خریدار کے اصرار کی وجہ سے دوگرام پتھر دھاگوں کے ریٹ میں فروخت کرنے کا حکم:

مسلمانوں پر لازم ہے کہ مبیع یا ثمن کے عیب کو نہ چھپائے، جیسا کہ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ‘‘لا يحلّ كتمان العيب فی مبيع أو ثمن؛ لأن الغش حرام’’ (حصكفی: الدر المختار۵؍۴۷) (مبیع یا ثمن کے عیب کو چھپانا حلال نہیں ہے؛ اس لئے کہ دھوکہ دینا حرام ہے)۔

اور علامہ شامی لکھتے ہیں: ‘‘الغش من أكل أموال الناس بالباطل’’ (ابن عابدين، رد المحتار۵؍۴۷) (دھوکہ دینا ناحق لوگوں کے مال کھانے کے باب سے ہے)۔

لہذا جب خریدار کو بتادیاگیا کہ قیمتی پتھر کی آرائشی چیز میں جو دھاگے لگائے گئے ہیں وہ آٹھ گرام کے ہیں تو اسے مان لینا چاہئے، لیکن عام طور سے مارکیٹ کے عرف میں ان دھاگوں کا وزن دس گرام مانا جاتا ہے؛ اس لئے ظاہر حال سے اس کے شک کی تائید ہوتی ہے، اس وجہ سے اگر وہ نہ مانے تو اس کی گنجائش ہے، اور فروخت کرنے والا چونکہ دوگرام پتھر کو دھاگوں کے ریٹ میں فروخت کرنے پر راضی ہے، اس کا مطلب ہے کہ خریدار کے نہ ماننے کے باوجود اسے نفع حاصل ہورہا ہے، لہذا خریدوفروخت کے اس معاملہ میں بہ ظاہر کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔

سوال نمبر ۷ کا جواب:

مال کے حقیقی وزن سے کم وزن کی قیمت لگانے کا حکم:

ایک مال مثلاً ایک قیراط پانچ سنٹ وزن کا ہے تو خریدنے والے تاجر پر واجب ہے کہ وہ اسی وزن کی پرچی لگائے، کم وزن کی پرچی لگانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! غلط طریقہ پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ، مگر یہ کہ تمہاری رضامندی کے ساتھ تجارت ہو)۔

۲۔ جب خود خریدار دوسرے سے پورے ایک قیراط پانچ سینٹ کی قیمت لگاتا ہے، تو دوسرے کے مال کے وزن کو کم کرنے کی صورت میں اس پر تطفیف کی وعید لازم آتی ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ''ویل للمطففین الذین إذا اکتالوا علی الناس یستوفون وإذا کالوہم أو وزنوہم یخسرون'' (المطففین: ۱-۳) (ہلاکت وتباہی ہے (ان حق مارنے والوں کے لئے) جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جو لوگوں سے ناپ کرلیتے ہیں ، توبھرپور ناپ لیتے ہیں، اور جب ناپ تول کردیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں)۔

۳۔ جب خریدار اپنے لئے کم وزن کو پسند نہیں کرتا، تو پھر پہلے بائع کے لئے کم وزن کو کیوں پسند کررہا ہے، حالانکہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیہ ما یحب لنفسہ'' (صحیح البخاری: حدیث نمبر: ۱۳، صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۴۵) (تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ اپنےبھائی کے لئے وہ چیز پسند کرے تو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

سوال نمبر ۸ کا جواب:

مال قبول کرنے کے سلسلہ میں مجبوری کی رضامندی کا حکم:

جب بیع تمام ہوگئی اور خریدار نے سامان پر قبضہ کرلیا، تو پھر اس پر لازم ہے کہ پوری قیمت ادا کرے، اس صورت میں اگر فروخت کردہ سامان ہلاک بھی ہوجائے تو خریدار کو پوری قیمت دینی پڑے گی، علامہ کاسانی ؒ تحریر فرماتے ہیں: ''فأما إذا ہلک کلہ بعد القبض، فإن ہلک بآفۃ سماویۃ، أو بفعل المبیع، أو بفعل المشتری لا ینفسخ البیع، والہلاک علی المشتری، وعلیہ الثمن؛ لأن البیع تقرر بقبض المبیع، فتقرر الثمن، وکذلک إن ہلک بفعل أجنبی، لما قلنا'' (کاسانی: بدائع الصنائع۵،۲۳۹)(سو اگر پورا فروخت کردہ سامان قبضہ کے بعد ہلاک ہوجائے، تو اگر آسمانی آفت، یا مبیع کے عمل یا خریدار کے عمل سے ہلاک ہو تو بیع فسخ نہیں ہوگی، اور ہلاکت کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی، اور اسے ثمن دینا ہوگا؛ اس لئے کہ بیع مبیع پر قبضہ کی وجہ سے ثابت ہوچکی ہے، تو ثمن بھی ثابت

رہے گا، اور ایسے ہی اجنبی کے عمل سے ہلاک ہو تو بھی بیع فسخ نہ ہوگی، اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے بیان کی)۔

لہٰذا خریدار پر لازم ہے کہ لوگوں کے پورے ثمن ان کو ادا کرے، خواہ پرچی پر قانونی مصلحت سے کم قیمت لکھی گئی ہو، لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو لوگوں کی جانب سے مجبوری میں قبول کرنے کی وجہ سے شرعاً اس شخص کے لئے یہ مال حلال نہیں ہوگا، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ناحق طریقہ سے مال کھانا ہے، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل’’ (بقرہ: ۱۸۸) (اپنے درمیان باطل طریقہ پر مال نہ کھاؤ)۔

۲۔ یہ لوگوں کو فریب دے کر ان کے مال سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے، جبکہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمﷺ نے ارشاد فرمایا: ‘‘من غشنا فليس منا’’ (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۰۱) (جو ہمیں دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں)۔

اور دھوکہ حرام ہے، چنانچہ اس ذریعہ سے حاصل کردہ مال بھی حرام ہے۔

۳۔ اس میں عہد شکنی ہے جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ‘‘وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً’’ (الاسراء: ۳۴) (اور عہد کو پورا کیا کرو، عہد کے بارے میں بازپرس ہوگی)۔

اور امام طبری اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ‘‘وأوفوا بالعقد الذى تعاقدون الناس فى الصلح بين أهل الحرب والإسلام، وفيما بينكم أيضاً، والبيوع والأشربة والإجارات، وغير ذلك من العقود (إن العهد كان مسئولا) يقول: إن الله جل ثناؤه سائل ناقض العهد عن نقضه إياه، يقول: فلا تنقضوا العهود الجائزة بينكم، وبين من عاهدتموه أيها الناس! فتخفروه، وتغدروا بمن أعطيتموه ذلك’’ (طبری: جامع البيان فى تاويل القرآن۱۷؍۴۴۴، ط: ۱، بيروت، مؤسسة الرسالہ، ۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء، ع۔أ۔ : ۲۴) (اور اس معاہدے کوپورا کرو جو تم حربیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلح کے سلسلہ میں لوگوں سے کرتے ہو، اور جو معاہدے تم آپس میں کرتے ہو، اور خریدوفروخت، مشروبات اور اجارہ اور دیگر معاہدے پورے کرو (بے شک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی) یعنی اللہ تعالی عہد شکنی کرنے والے سے عہد شکنی کے بارے میں باز پرس کرے گا، لہٰذا آپس کے جائز معاہدے کو مت توڑو، اے لوگو! اور نہ ان کے ساتھ عہد شکنی کرو جن سے تم عہد کرچکے ہو)۔

محور چہارم:

سوال نمبر ۱ کا جواب:

نقد خریدوفروخت میں قیمت کم رکھنے کا حکم:

ڈائمنڈ (Diamond)کے تاجر یا دیگر تاجر کے لئے جائزہے کہ نقد خریدوفروخت

کی صورت میں قیمت میں لیس (Less) یعنی تخفیف کرکے بیچے، علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد حافظ الدین نسفیؒ(م: ۷۱۰ھ) رقمطراز ہیں: ‘‘وصحّ بثمن حال وبأجل معلوم’’ (نسفی: کنز الدقائق مع البحر الرائق ۳۰۱٫۵، بیروت، دار المعرفہ) (نقد قیمت پر نیز متعینہ مدت میں قیمت کی ادائیگی کی شرط پر بیچنا صحیح ہے)، البتہ تردید کے ساتھ تعیین کے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے، مثلاً یوں کہے کہ میں نے نقد اتنی قیمت پر اور ادھار اتنی قیمت پر بیچا، علامہ شمس الدین ابوبکر محمد بن ابی سہل سرخسیؒ (م: ۴۹۰ھ) سپرد قرطاس فرماتے ہیں:‘‘بالنقد بکذا، وبالنسیئۃ بکذا، وذلک غیر جائز’’ (سرخسی: المبسوط ۳۲٫۱۴، ط: ۱، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ۲۰۰۰ء، تحقیق: خلیل میس) (بیع میں دوشرط لگانے کی صفت یہ ہے کہ یہ کہے کہ نقد اتنی قیمت پر اور ادھار اتنی قیمت پر بیچا، اور یہ جائز نہیں ہے)۔

واضح رہے کہ مارکیٹ ریٹ سے ۶ یا ۸ فیصد لیس کرکے بیچنے کی صورت میں یہ حقیقت میں لیس نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل طور پر نقد قیمت ۹۴ روپے متعین کرکے مثلاً بیچنا ہے، لہٰذا اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے، خلاصہ یہ کہ کسی چیز کی مارکیٹ ریٹ ۱۰۰ روپے ہو اور کوئی اسے ۹۴ روپے میں بیچے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

ادھار خریدوفروخت میں مدت سے پہلے قیمت میں تخفیف کرنے کا حکم:

ادھار معاملہ میں متعینہ مدت سے پہلے ادائیگی کی صورت میں ثمن کم کرنے کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں اور یہ کمی مدت کا عوض ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے، اسے فقہی اصطلاح میں ‘‘کچھ کم کرو اور جلدی حاصل کرلو ’’ یعنی ‘‘ضع وتعجل ’’ کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں دو متعارض مرفوع حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں، جواز والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ساتھ ‘‘ضع وتعجل ’’ والے اصول پر عمل ہوا۔

لیکن طبرانی کی ‘‘المعجم الاوسط ’’ (حدیث نمبر: ۸۱۷) جس میں ‘‘ضعوا وتعجلوا’’ وارد ہے ضعیف ہے (دیکھئے: ہیثمی، مجمع الزوائد۲۳۴٫۴، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۲ھ، ع۔أ۔: ۱۰)۔

اور ساتھ ہی اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہود کے یہ دیون سودی تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے اصل سرمایہ سے زائد کو ساقط کرنے کا حکم دیا، اس لئے احتمال کی وجہ سے یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے۔ ہاں عدم جواز والی روایت بھی ضعیف ہے، جس میں حضرت مقداد بن الاسود کہتے ہیں: ‘‘أسلفت رجلاً مائۃ دینار، ثم خرج سہمی فی بعثٍ بعثہ رسول اللہ ﷺ فقلت لہ: عجّل لی تسعین دیناراً، وأحط عشرۃ دنانیر، فقال: نعم، فذکر ذلک لرسول اللہ ﷺ فقال: أکلت ربا یا مقداد، وأطعمتہ’’ (بیہقی: السنن الکبری ۲۸٫۶، حدیث نمبر:

۱۰۹۲۴، مکہ مکرمہ، مکتبہ دار الباز، ۱۴۱۴ھ۱۹۹۴ء، ع۔أ۔: ۱۰) (ایک شخص کو میں نے سو دینار قرض دیا، پھر میری باری ایسے دستہ میں آئی جسے رسول اللہﷺ نے روانہ فرمایا، سو میں نے مقروض سے کہا: مجھے نوے دینار نقد دے دو، اور میں دس دینار کم کردونگا، تو اس شخص نے کہا: ہاں میں ایسا کرنے کےلئے تیار ہوں، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر رسول اللہﷺ سے کیا گیا، تو آپﷺ نے فرمایا: اے مقداد! تو نے سود کھایا، اور اسے کھلایا)۔

لیکن عدم جواز کا قول اس لئے راجح معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ دین کی تعجیل اور جلدی ادائیگی کی صورت میں دین کے اندر کمی کرنے میں بھی مدت کے بدلہ عوض لینا ہے، لہذا یہ بھی ایک طرح سے سود ہے، جس طرح دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں شامل ہے۔

لہذا ابن عباس، ابراہیم نخعی، امام زفر اور علامہ ابوثور کے مقابلہ جمہور اہل علم وفقہ کا مسلک راجح ہے کہ فوراً ادا کرنے کی شرط پر ثمن کم کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر دین کی مقدار فی الفور ادا کرنے کی صورت میں کم کرنا شرط نہ ہو، اور دائن بہ طور تبرع کچھ ساقط کردے، تو اس کی گنجائش ہے۔

اسی طرح قرض میں کمی کی شرط کے ساتھ مطالبہ کرنا صحیح ہے، کیونکہ قرض میں تاجیل لازم نہیں ہوتی ہے، ایسے ہی دین مؤجل نہ ہو، اور بعد میں بائع نے کوئی مہلت دی ہو تو ثمن کا کچھ حصہ ساقط کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ بعد کی مہلت تبرع ہے، لہذا ثمن میں سے کچھ کم کرنا مدت کے مقابل میں نہیں ہے کہ یہ صورت ربا یا شبہ ربا میں داخل ہو، بلکہ یہ قرض کے حکم میں ہے جس میں حنفیہ کے نزدیک تاجیل لازم نہیں ہوتی ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''التأخیر بعد البیع تبرع فیقبل التأجیل'' (ابن عابدین: رد المحتار۴؍۵۳۲، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ۲۰۰۰ء، ع۔أ۔: ۸) (بیع کے بعد دی جانے والی مہلت تبرع ہے، لہذا یہ تاجیل کو قبول کرے گی)۔

البتہ بیع کے اندر بعد العقد کی اس مہلت کا لزوم وعدہ میں شامل ہونے کی وجہ سے ہے؛ اس لئے بیع کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور بیع صحیح رہے گی خواہ کٹائی وغیرہ مجہول وقت کے ساتھ مہلت دی گئی ہو، اور یہ امام محمد کا مسلک ہے (دیکھئے: ابن نجیم، البحر الرائق۶؍۹۷، بیروت، دار المعرفہ)۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچنے کا حکم:

گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچ دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ دھوکہ ہے اور دھوکہ شریعت میں حرام ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے

ارشاد فرمایا: ‘‘من غشنا فلیس منا’’ (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۰۱) (جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں)۔

البتہ اگر عقد کے اندر اعلی کی شرط لگانے کے باوجود فروخت کنندہ گھٹیا مال دے دے، تو اس صورت میں اس نے گھٹیا کو اعلی کہہ کرکے خریدار کو دھوکہ دیا ہے، اور چونکہ گھٹیا ڈائمنڈ اور اعلی ڈائمنڈ میں قیمت کا زبردست تفاوت ہوتا ہے، لہذا متاخرین احناف کے مطابق خریدار کو عقد فسخ کرنے کا حق ہوگا، فقیہ علی حیدر تحریر فرماتے ہیں: ‘‘إذا غرّ أحد المتبایعین الآخر، وتحقق أن فی البیع غبناً فاحشاً فللمغبون أن یفسخ البیع حینئذ’’ (علی حیدر: درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام۱؍۳۱۴، بیروت، دار الکتب العلمیہ) (اگر فروخت کنندہ اور خریدار میں سے کوئی دوسرے کو دھوکہ دے، اور یہ بات ثابت ہوجائے کہ بیع کے اندر زبردست غبن ہے، تو جسے نقصان ہوا ہے وہ اس وقت بیع کو فسخ کرسکتا ہے)۔

البتہ اگر مبیع میں تغیر پیدا ہوجائے، یا وہ عیب دار ہوجائے، تو ایسی صورت میں نقصان کی تلافی کے بغیر اس کا خیار ساقط ہوجائے گا (مرجع سابق۱؍۳۱۶)۔

اور اس کی تخریج مبیع میں وصف مرغوب فیہ کے فوت ہونے پر کی جاسکتی ہے، اور اس صورت میں خریدار کو خرید کردہ سامان کو پورے ثمن کے ساتھ لینے یا واپس کرنے کا حق ہوگا، لہذا صورت مسئولہ میں ثمن کم کرانے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ عقد اول کو فسخ کردے اور نئے سرے سے معاملہ کرے۔

البتہ فسخ کرنے سے روکنے والی کوئی چیز پیدا ہوجائے تو پھر نقصان کے بقدر رجوع کرنے کا حق ہوگا، یعنی اعلی اور گھٹیا کے بیچ کی قیمت بائع کو واپس کرنی ہوگی، علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:‘‘أخذہ بکل الثمن إن شاء أو ترکہ... ولو امتنع الرد بسبب ما قوم کاتباً وغیر کاتب ورجع بالتفاوت فی الأصح’’ (حصکفی: الدر المختار ۴؍۵۸۷-۵۸۸، بیروت، دار الفکر، ۱۳۸۶ھ، ع.أ.: ۶) (اگر چاہے تو اسے پورے ثمن کے ساتھ لے لے، یا چھوڑ دے، اور اگر واپسی کسی وجہ سے دشوار ہوجائے، تو غلام کے لکھنے والے اور نہ لکھنے والے ہونے کی قیمت لگائی جائے گی، اور صحیح تر قول کے مطابق خریدار دونوں کے درمیان کے تفاوت کو وصول کرلے گا)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

ریئل ڈائمنڈ (Real Diamond) کی جگہ کیمیکل ڈائمنڈ دینے کا حکم:

اگر ‘‘ریئل ڈائمنڈ’’ یعنی اصلی الماس کی جگہ (Chemical VaporDeposition: CVD) یعنی نقلی ہیرے کو بیچ دیا، تو چونکہ مبیع کی جنس بدل گئی، لہذا عقد باطل ہوگیا، لہذا ایسی صورت میں خریدار جوہری کو نقلی ڈائمنڈ واپس کرکے پوری قیمت واپس لے لے گا، علامہ مرغینانی (م: ۵۹۳ھ) رقمطراز ہیں: ‘‘من اشتری فصاً علی أنہ یاقوت، فإذا ہو

زجاج، لا ینعقد العقد لاختلاف الجنس" (مرغینانی، الہدایہ۱؍۲۱۰، بیروت، المکتبۃ الاسلامیہ) (جو نگینہ اس شرط پر خریدے کہ وہ یاقوت (ایک قیمتی پتھر) کا ہوگا، لیکن وہ شیشہ کا ہو، تو عقد منعقد نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ جنس بدل گئی)۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

ڈائمنڈ خرید کر اس میں دوسرے کو شریک کرنے کا حکم:

عقد مکمل ہوجانے کے بعد خریدار اس ڈائمنڈ کا مالک ہوچکا ہے، لہذا اسے حق ہے کہ اپنی مملوکہ چیز کے ایک حصہ کو جس قیمت پر چاہے بیچ کرکے دوسرے کو شریک کرلے، لہذا شرعی اعتبار سے اس شرکت میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ کیونکہ یہ مطلق شرکت کا معاملہ نہیں ہے کہ خرید کردہ قیمت کا لحاظ ضروری ہو، بلکہ متعین قیمت کے ساتھ سامان کے ایک حصہ کو بیچ کر اس میں شریک کرنا ہے، لہذا فقہاء کی تصریح کے مطابق یہ شرکت درست ہے۔

اور سوال سے واضح ہے کہ ڈائمنڈ کا مالک ڈائمنڈ کے ایک حصہ کو بیچ کر زید کو شریک کررہا ہے، شروع سے زید کے ساتھ شرکت کا معاملہ نہیں کررہا ہے، جو تولیہ کے حکم میں ہوتا ہے یعنی جتنی قیمت میں شریک کرنے والے نے خریدا ہے اسی قیمت میں دوسرے کو شریک کرنا لازم ہوتا ہے، علامہ کاسانی (م: ۵۸۷ھ) تحریر فرماتے ہیں: "أما الإشراک فحکمہ حکم التولیۃ، لا أنہ تولیۃ حقیقۃ، لکنہ تولیۃ بعض المبیع ببعض الثمن" (کاسانی: بدائع الصنائع۵؍۲۲۶، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۸۲ء، ع۔أ۔: ۷) (بہرحال شریک کرنا تو اس کا حکم "تولیہ" کا حکم ہے، نہ یہ کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے تولیہ ہے، لیکن یہ بعض مبیع کو بعض ثمن کے ساتھ نہ نفع نہ خسارہ کے طور پر بیچنا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ اگر شرکت کا لفظ استعمال کرے گا تو ڈائمنڈ میں بہ طور بیع تولیہ شریک کرنا سمجھا جائے گا یعنی جتنی قیمت میں خریدا ہے اتنی ہی قیمت میں شریک کرنا لازم ہوگا۔

ہاں اگر شرکت کے الفاظ استعمال کرنے کی جگہ براہ راست ڈائمنڈ کے آدھے حصے کو فروخت کرنے کی بات کرے، تو پھر اس صورت میں نفع لینا جائز ہے، جیسا کہ سوال میں یہی صورت مذکور ہے کہ ڈائمنڈ کا مالک زید سے سوادولاکھ روپے کی قیمت کی بنیاد پر ڈائمنڈ کا ایک حصہ بیچ کر اسے شریک کررہا ہے، لہذا سوال میں ذکر کردہ صورت میں نفع لینے کی گنجائش ہے اور یہ مساومہ کی شکل ہے جس میں خریدار کو اپنی خریدی ہوئی قیمت بتانا ضروری نہیں ہے۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

خریدنے سے پہلے شرکت کا معاملہ کرنے کا حکم:

چونکہ (ب) ڈائمنڈ کا مالک نہیں ہے، لہذا اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ (ج) کو

ڈائمنڈ میں شریک کرے؛ کیونکہ شریک کرنا بیع تولیہ کے حکم میں ہے، اور بیع کے انعقاد کی شرط یہ ہے کہ خرید وفروخت کے وقت مبیع بائع کی ملکیت میں ہو، اگر وہ خود کے لئے بیچ رہا ہو، علامہ علاء الدین سمرقندیؒ (م: ۵۳۹ھ) تحریر فرماتے ہیں: ''الإشراک وہو بیع التولیۃ فی بعض المبیع من النصف والثلث وغیر ذلک'' (سمرقندی: تحفۃ الفقہاء ۲؍۱۰۵، بیروت، العلمیہ، ۱۴۰۵ھ۱۹۸۴ء) (''شریک کرنا '' یہ بعض مبیع یعنی نصف یا تہائی وغیرہ میں بیع تولیہ یعنی نہ نفع نہ نقصان کے طور پر بیچنا ہے)۔

البتہ (ب) کے لئے نفع لینے کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ وہ (ج) سے وعدۂ بیع کرے، اور پھر (الف) سے خرید کر بہ طور مرابحہ (ج) سے بیچ دے، لیکن اس صورت میں (ب) پر لازم ہوگا کہ وہ (ج) کو اصل قیمت جس پر خریدی گئی، بتادے؛ کیونکہ مرابحہ بیع امانت میں سے ہے جس میں اصل قیمت کا بتانا واجب ہے، اسی طرح شرکت کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ (ب) کو چاہئے کہ (ج) سے وعدۂ شرکت کرے، اور پھر (الف) سے خرید کر (ج) کو شریک کرلے، لیکن اس صورت میں یہ بیع تولیہ کے حکم میں ہوگا، لہذا ثمن اول پر شریک کرنا لازم ہوگا۔

جواہرات کی خریدوفروخت میں پیش آنے والے جدید مسائل

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی•

برو کر خریدار فراہم کرنے کے لیے ہوتے ہیں:

جواب نمبر۱ : عرف و عادت یہی ہے کہ بروکریادلال بائع اور مشتری کے درمیان اپنی محنت وکوشش سے متعین اجرت پر خریدار فراہم کرنے کے لیے ہوتے ہیں، وہ کسی اجرت پر خود بیچنے یا خریدنے کے ذمہ دار نہیں ہوتے، اگر وہ اجرت پر خود خرید وفروخت کریں تو یہ جائزنہیں ہے، کیونکہ استیجاردوسرے کے بغیر پورا نہیں ہوتا اور یہ دوسرا شخص مجہول ہے، پتہ نہیں وہ (خریدار) فراہم ہو سکے گا یا نہیں، البتہ اس کے جواز کا حیلہ یہ ہے کہ اس کو ایک دن کی خدمت پر اجیررکھ لیا جائے اور اس سے خرید وفروخت کا کام لے لیا جائے۔

''والسمسار المتوسط بین البائع والمشتری (یجبران علیہ)؛ لأنہما یعملان بأجرۃ عادۃ بلا استیجار؛ إذ لواستاجرلیبیع أو لیشتری، لم یجز؛ لأنہ لایتم إلا بغیرہ، والحیلۃ أن یستاجرہ للخدمۃ یوماً، ویستعملہٗ فی البیع والشراء، ولوعمل بلاشرط وأعطاہ شیئاً لابأس، بہ جرت العادۃ'' (سکب الأنہرعلی ہامش مجمع الأنہر۳؍۴۵۸، کتاب المضاربۃ، اِمدادیہ ملتان)۔

صورتِ مسئولہ بالا میں جب بروکر(دلال) بائع کو۶۵؍روپئے میں تیار کرتا ہے اور خریدار کو ۷۵روپئے میں خریداری کراتا ہے تو وہ بائع اور مشتری دونوں کو دھوکہ دے کر دس روپئے ناجائز طور پر اپنے لئے حاصل کرتا ہے، شریعت میں یہ فعل نجش ہے اور دام بڑھا کر مشتری کو اور دام گھٹاکر بائع کو مغالطہ اور فریب میں مبتلا کرکے خریدوفروخت کے درمیانی قیمت کے فرق سے دس روپیہ کی حرام نفع خوری کرتا ہے، جو گناہ کبیرہ ہے، بروکر کے لئے صرف اپنی متعین دلالی فیس ۴؍فیصد ہی لینا جائز ہے، مذکورہ معاملہ کی شریعت میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔

''عن أبی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال:قال رسول اللہ ﷺ:وقال فتیبۃ یبلغ بہ النہی ﷺ قال:''لا تناجشوا''، وقال الترمذی:والعمل علی ہذا عند أہل العلم کرہوا النجش، والنجش أن یأتی الرجل الذی یبصر السلعۃ إلی صاحب السلعۃ، فیستام بأکثر مما تسویٰ، وذلک عند ما یحضرہ المشتری یرید أن یغترّ المشتری بہ ولیس من رأیہ الشری، إنما یرید أن ینخدع المشتری بما یستام، وہذا ضرب من الخدیعۃ''(جامع الترمذی۱؍۲۴۴، ابواب البیوع باب فی

• شیخ الحدیث مدرسہ امدادالاسلام میرٹھ یوپی۔

کراہۃ النجش،سعید)۔

دلال مشتری بن کر خریداری کرے تو کیا حکم ہے:

جواب نمبر۲ :(الف) اگر دلال،دلالی کامعاملہ کینسل کرکے بائع کے سامنے واضح کردیتا ہے کہ میں بحیثیت دلال آپ سے معاملہ نہیں کر رہا ہوں، اور بائع اس معاملہ کی تنسیخ پر راضی ہو جائے اور پھر الگ سے بائع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی کے اصول پر معاملہ کرے، اوردلال، مشتری کی حیثیت سے خریداری کرے اور مال پر قبضۂ شرعی کے بعد وہ دوسرے خریدارکو فروخت کردے تو یہ جائز ہے، اس صورت میں دلالی کی فیس لینا یا نہ لینا اس کے اختیار پر موقوف نہیں، بلکہ اس نئے معاملہ کے بعد وہ فیس کا حقدار ہی نہیں ہے، اگر وہ لینا بھی چاہے تو جائز نہیں۔

البتہ اگر بحیثیت دلال وہ معاملہ کرتا ہے تو یہ ‘‘نجش ’’ کی صورت ہے اور فریب و دھوکہ دہی کی وجہ سے ناجائز ہے، کیونکہ دلال اپنی حیثیت تبدیل کئے بغیر نہ مشتری بن سکتا ہے اور نہ بائع، اس کی دلیل جواب نمبر۱؍میں پیچھے گزر چکی ہے، تاہم فریب خوردہ خریدار کی خریداری درست ہوگی، حنفیہ،شافعیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے (رحمۃ الامۃ؍۱۸۳-۱۸۲، باب بیوع المنہی عنہا، قاموس الفقہ۲؍۳۶۲)۔

فرضی خریداری کا شرعی حکم:

جواب نمبر۲:- (ب) یہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہی صورت مسئلہ ہے جس کا ذکر سوال نمبر۱؍میں آچکا ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ سوال نمبر۱؍میں دلال خودخریدار (مشتری)بن کر طے کردہ خریدار سے سامان بیچ کر دس روپیہ کا نفع حاصل کرتا ہے، اور یہاں فرضی خریدارکے ذریعہ وہی نفع حاصل کرتاہے، دلال کی طرف سے دھوکہ دہی کی وہی صورت یہاں بھی پائی جا رہی ہے، لہٰذا یہ صورت بھی مذکورہ بالا دلیل شرعی کی رو سے ناجائز ہے۔

یہاں دلال چونکہ بائع اور اصل مشتری کے درمیان واسطہ نہیں رہا، بلکہ فرضی مشتری کے واسطہ سے خود نقلی مشتری بن بیٹھا اور ناجائز طور پر دس روپیہ کی نفع خوری کے لئے اس نے یہ حیلہ کیا، اس لیے وہ دلالی کی فیس کا حقدار نہیں رہا، اور چونکہ فرضی خریدار دلال نہیں ہے، دھوکہ باز ہے، اس نے بائع کو دھوکہ دیا ہے، اس لئے ۴؍فیصدی بطوراجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

جواہرات کے ٹکڑوں کو چوربازار سے خریدنا؟

جواب نمبر۳ : سب سے پہلے قابل غوربات یہ ہے کہ جس مارکیٹ میں حلال وحرام مال کی خریدوفروخت ہو یا عرف عام میں جسے ‘‘چور بازار کا مال ’’ کہا جاتا ہے فقہی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت کیا ہے؟’’ (۱)مال مخلوط،(۲)مال مشتبہ، (۳)مال مغصوب، (۴)ما ل بحکم عقدِ فاسد،(۵)مال مثل مالِ حربی الذی دخل فی دارنابعقدامان، (۶)مال مثلِ

جائزۃ السلطان، (۷) مال مثل شاۃ مصلیہ التی اُطعمت الاساری، (۸)مال مثل شعیرالیہودی۔

فقہاء کی مختلف عبارات اور متنوع الجہات تعبیرات سے ان سب گوشوں کا الگ الگ حکم معلوم ہوتا ہے، زیادہ تر فقہاء کی نگاہ ساتویں تعبیرپر ہے، جس سے استنباط ہوتا ہے کہ:

''إن ما اشتبۃ أمرہٗ فی التحلیل والتحریم ولا یعرف لہٗ أصل متقدم فالورع أن یترکہ ویجتنبہ ویدخل فی ہذا الباب معاملۃ من فی مالہٖ شبہۃ أو خالطہٗ ربا فالأولیٰ أن یحترز عنہا ویترکہا ولا یحکم بفسادہا ما لم یتیقن أن عینہٗ حرام فإن النبی ﷺ رہن درعہٗ من یہودی بشعیرٍ أخذہ لقوتِ أہلہٖ مع أنہم یربون فی معاملاتہم ویستحلون أثمان الخمور'' (ملا علی القاری: مرقاۃ المفاتیح۶؍۳۷)۔

(تحلیل و تحریم کے بارے میں جو چیز مشتبہ ہو اور پہلے سے اس کی اصل معلوم نہ ہو تو پرہیزگاری (تقویٰ) یہی ہے کہ اس کو ترک کردیا جائے اور اس سے بچا جائے اور اس حکم میں وہ بھی شامل ہے جس کے مال میں شبہ ہو یا اس میں سود مخلوط ہو تو بہتر یہی ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے اور اس کو چھوڑ دیا جائے، تاہم اس کے فساد کا حکم نہ لگایا جائے، جب تک یہ یقین نہ ہو کہ بعینہٖ وہ مال حرام ہے ۔

دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک یہودی کے پاس اپنی درع(زرہ) رہن رکھ کر اس سے چند صاع جَوْ گھر والوں کی خوراک کے لیے لیا تھا، اس علم کے باوجود کہ یہودی لوگ سودخوری کا معاملہ کرتے ہیں اور شرابوں کی قیمت لینے کو حلال سمجھتے ہیں)۔

یہی رجحان بیشتر فقہاء احناف نے ظاہر کیا ہے:

''وأما مسألۃ ماذا اختلط الحلال بالحرام فی البلد فإنہ یجوزالشراء والأخذ إلا أن تقوم دلالۃً علی أنہ من الحرام'' (الاشباہ والنظائر۱؍۱۴۸)۔

(بہرحال مسئلہ یہ ہے کہ جب شہر میں حلال چیز حرام کے ساتھ گڈمڈ (مخلوط) ہوجائے تو خرید و فروخت اور اس کو لینا جائز ہے، مگر جب اس مال کے حرام ہونے پر دلیل قائم ہو جائے تو جائز نہیں)۔

احناف کا مذہب بھی اس صورت میں جواز کا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ فقیہ ابو اللیثؒ فرماتے ہیں:

''اختلف الناس فی أخذ الجائزۃ من السلطان قال بعضہم یجوزمالم یعلم أنہ یعطیہ من حرام''۔

''قال محمد رحمہ اللہ تعالی وبہٖ نأخذ ما لم نعرف شیئا حراما بعینہٖ وہو قول أبی حنیفۃؒ وأصحابہٗ کذا فی الظہیریۃ'' (الفتاوی الہندیہ۵؍۳۴۲، الباب الثانی عشرفی الہداياوالضیافات)۔

(بادشاہِ وقت کے ہدیے اور انعامات کے سلسلے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے: ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ مالِ حرام سے ہی دے رہا ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم اسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں کہ جب تک بعینہٖ اس مال کے حرام ہونے کا علم نہ ہولینا جائز ہے، یہی قول حضرت امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب کا ہے)۔

قائلین جواز کی نظر ان اصولوں پر ہے کہ:

(۱) اشیاء میں اصل حلت و اباحت ہے، لہٰذا جب تک اس کے خلاف دلیل حرمت قائم نہ ہو وہ حلال ہے، ''وفی شرح المنار للمصنف:الأصل فی الأشیاء الإباحۃ وفی الہدایۃ فی فصل الحداد الإباحۃ أصل'' (نورالبصائرشرح الاشباہ والنظائر ۱،۳۶۴بڑودہ)۔

(۲) دلالت حال سے پتہ چلے کہ وہ (بائع،سلطان،مُہدی)حلال مال دے رہا ہے، مثلاً مال مخلوط کے علاوہ اس کے پاس حلال مال بھی ہے،یا دوسرا کاروبار بھی ہے، یا کھیتی باڑی ہے۔

''قولہ إلا إذاعلم بأن کان صاحب تجارۃ أوزرع فلا بأس'' (الاختیار۴،۱۷۶)۔

(۳) مال حلال میں مال حرام ملا دینے سے مال حرام پر بائع کی ملکیت وتصرف ثابت ہو جاتی ہے اور خرید و فروخت جائز ہو جاتی ہے، مگر اس سے انتفاع حرام ہوتا ہے جب تک اس کا ضمان، مال موجود ہو تو مال سے، موجود نہ ہو تو اس کی قیمت ادا نہ کرے (طحطاوی علی الدرالمختار ۴،۱۹۲، ردالمختار۲،۲۹۲)۔

شاۃ مصلیہ والی حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے (بدائع الصنائع۷،۱۵۳، البنایہ۲،۸۴۹، عنایۃ علی ہامش نتائج الافکار ۷،۳۷۸)۔

(۴)حلت کا ظنِ غالب ہو تو بیع وشراء حلال ہے ورنہ نہیں۔

''إن علم أن العین التی یغلب علی الظن أنہم أخذوہامن الغیربالظلم قائمۃ وباعوہافی الأسواق لاینبغی شراء ہامنہم وإن تداولتہٗ الأیدی'' (طحطاوی علی الدر۴،۱۹۲)۔

وإن کان غالب مالہ حلالا لا بأس بقبول ہدیتہٖ والأکل منہا کذا فی الملتقط'' (الفتاوی الہندیہ ۵،۳۴۳ زکریایوبند)۔

زیربحث مسئلہ میں قولِ فیصل:

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دورکے چور بازار اورخاص مارکیٹ جس میں حلال وحرام مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے جیسے موٹر پارٹ یا اونی کاروبار کی مارکیٹ چوری اور حرام ذرائع سے حاصل شدہ مالوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے، اور ان میں حرام و حلال مالوں کا اختلاط متیقن ہوتا ہے وہاں سے خالص حلال مال کو چھانٹ کر خریدنا ممکن ہی نہیں ہے، ایسی صورتِ حال میں حلال مال کی خریداری کا یقین یاظن غالب ہونا بھی ناممکن ہے، نیز بائع کی جانب سے ضمان مثل کی ادائیگی یا متعلق فریق کی رضا کا علم بھی متصور نہیں ہے اور اصولی طور پر جس مال کے مخلوط ہونے کا یقین ہو جیسا کہ ان مارکٹوں کا حال ہے وہاں سے مال خریدنا اور نفع حاصل کرنا دونوں حرام ہے، کیونکہ

حلال و حرام کی دونوں جہتیں مشتبہ ہیں، جس چیز کو بھی خریدار حلال سمجھ کر خریدے گا جب اس میں حرام کا احتمال موجود ہوگا تو حلت کایقین پیدا ہوہی نہیں سکتا جو جواز کی اصل بنیاد ہے، لہٰذاخریدار کم از کم چوری کے علم احتمالی سے بری نہیں ہوسکتا۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من اشتریٰ سرقۃ وہویعلم أنہا سرقۃ فقد شرک فی عارہا وإثمہا'' (شعب الایمان، دارالکتب العلمیہ بیروت۳۸۹،۴، رقم: ۵۵۰۰، المصنف لابن ابی شبیہ، جدید موسستہ علوم القرآن ۳۳۸،۱۱، رقم: ۲۲۴۹۵)۔

(جوچوری کا مال خریدے یہ جانتے ہوئے کہ وہ چوری کا مال ہے تو وہ شخص چوری کے شرم و گناہ میں شریک ہوگا)۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرح کے مال کی خریداری میں دل مینجو کھٹک اور تردد پیداہوگا اور گناہ کا جو احساس ابھرے گا، اس کو کسی مفتی کا فتویٰ جواز ہرگز دو رنہیں کرسکتا، رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے:

''دع ما یریبک إلی ما لایریبک''۔

(جو چیزشبہ میں مبتلا کرے اسے چھوڑکر اس چیز کو اختیار کرو جس میں شبہ نہ ہو)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات لا یعلمہا کثیر من الناس، فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہٖ وعرضہٖ، ومن وقع فی الشبہات کراعٍ یرعیٰ حول الحمیٰ یوشک أن یواقعہٗ'' (الحدیث) (صحیح بخاری ۱۳،۱نعیمیہ دیوبند)۔

(حلال بھی واضح ہے حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہ والی چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو پاک صاف کرلیا)۔

علامہ کرمانی نے مشبہات کے معنی بتائے ہیں:

''معناہٗ مشبہات أنفسہا بالحلال یعنی لایعلم حکمہا علی التعیین'' (حاشیہ بخاری۱۳،۱)۔

اس کا مطلب ہے نفس حلال کے سلسلہ میں پیداشدہ مشبہات جن کے حلال ہونے کا متعین طور پر علم نہ ہو۔

غور کیا جائے کہ چوربازار کے سامان کا ٹھیک ایسا ہی معاملہ ہے یا نہیں؟ خود دل گواہی دے گا کہ ایسا ہی ہے۔

بلکہ صحیح فتویٰ بھی یہی ہے کہ اس مارکیٹ کا مشتبہ مال خریدنا اور استعمال کرنا حرام ہے اور جواز کے فتویٰ کی ساری روایات قول مرجوح پر مبنی ہیں (احسن الفتاویٰ ۳۳۵،۸)۔

مفتیان کرام اس پر غور فرمائیں کہ اگرچوربازار کے سامان کی خرید وفروخت کے جواز کا فتویٰ صادر کیا جائے تو اس سے چور بازاری کو کس قدر فروغ حاصل ہوگا اور اس کی حوصلہ افزائی ہوگی، اور قانونی گرفت میں آنے پر اسلام اور مسلمانوں کی عزت وآبروپر کتنا حرف آئے گا، آج کل اس کا مشاہدہ بھی عام ہے جبکہ ہمارے فقہاء ایسے امور مینسدّباب کے طور پر عدم جواز کا فتویٰ دیتے اور جزر و توبیج فرماتے تھے، تاکہ لوگ اس کے ارتکاب سے رک جائیں۔

''ولا ینبغی للناس أن یأکلوا من أطعمۃ الظلمۃ لتقبیح الأمرعلیہم وزجرہم عما یرتکبون وإن کان یحل'' (الفتاویٰ الہندیہ۵،۳۴۳)۔

کسی مال کے بارے میں شبہ پیدا ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

جواب نمبر۴:- اگر بائع سماج میں ذی مردت، عزت دارہو، اور اس کے قول کی سچائی کا ظن غالب ہو تو اس کا مال خرید نے میں کوئی حرج نہیں۔

''قال العلامۃ ابن عابدین رحمہٗ اللہ تعالیٰ (قولہ بشہادۃ فاسق نفذ)قال فی جامع الفتاویٰ وأماشہادۃ الفاسق فإن تحری القاضی الصدق فی شہادتہٖ تقبل وإلّا فلا اہ فقال وفی الفتاویٰ القاعدیۃ ہذا إذا غلب علی ظنہ صدقہ، وہو مما یحفظ درر أول کتاب القضاء، وظاہر قولہ ہومما یحفظ اعتمادہ اھ'' (ردالمختار ۴،۳۷۲)۔

(علامہ ابن عابدین رحمہٗ اللہ نے (بشہادۃ فاسق نفذ کے قول کے سلسلے میں)فرمایا کہ جامع الفتاویٰ میں شہادتِ فاسق سے متعلق یہ ہے کہ قاضی کے خیال و گمان میں اس کی شہادت کی سچائی ظاہر ہوتو قبول کی جائے گی ورنہ نہیں، علامہ نے فرمایا کہ فتاویٰ قاعدیہ میں یہ ہے کہ یہ بات اس وقت ہے جب غالب گمان اس کی سچائی کاہو،ظن غالب کا اعتبار قابل لحاظ ہے، علامہ کہتے ہیں مما یحفظ کے قول سے ظاہر ہے کہ یہی بات معتبر اور قابل اعتماد ہے)۔

اسی طرح اگر بائع کا بیک گرائونڈ اور اس کی اجنبیت کے سبب اس کے شخصی حالات نامعلوم ہوں مگر ظاہری صورتِ حال اس کے قول کی تصدیق کرتی ہو تب بھی اس پراعتبار کرتے ہوئے اس کا مال لیا جاسکتا ہے، صحیح بخاری کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے:

''عن عائشۃ رضی اللہ عنہا أن قوماً قالوا للنبی ﷺ:إنَّ قوماً یأتوننا باللحم لا ندری أذکر اسم اللہ علیہ أم لا، قال سموا علیہ أنتم وکلوہ، قالت وکانوا حدیثی عہد بالکفر'' (صحیح بخاری۲،۸۲۸، باب ذبیحۃ الاعراب، نعیمیہ دیوبند)۔

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کچھ لوگوں (صحابہ) نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کچھ دیہاتی نو مسلم ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں،ہمیں پتہ

نہیں کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا تھا یا نہیں ؟آپ ﷺ نے فرمایا کہ (جب وہ مسلمان ہیں اگرچہ تازہ تازہ کفر سے نکلے ہیں تو ان کی ظاہری حالت تسمیہ پڑھنے کی ہے، تم اس کا اعتبار کرو اور اپنے شبہ کو دور کرنے کے لئے) تم بسم اللہ پڑھ کر کھالو)۔

اگر اسی طرح کے معاملہ میں کسی غیر مسلم سے سابقہ ہو اور اس کے قول کی ظاہری صداقت کا ظن غالب ہو تو اس کا قول بھی معتبر ہوگا، چنانچہ خطیب بغدادی کہتے ہیں:

''لوعمل العلماوالحکام علی أن لا یقبلوا خبراً ولاشہادۃً إلامن مسلم بریٔ من کل ذنب قل أوکثر لم یمکن قبول شہادۃ أحد ولاخبرہٗ'' (الکفایۃ فی علم الروایۃ،۱۰۶) ۔

(اگرعلماورحکام اس پر عمل کرنے لگیں کہ وہ صرف مسلمان کی شہادت وخبر قبول کریں گے جو ہرقلیل وکثیر گناہ سے بری ہو، تو پھر کسی کی بھی شہادت وخبر کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوگا)۔

دوطرفہ خریدوفروخت کا جواز

جواب نمبر۵ : عقد بیع کے وقت ہی متعین طور پر ادھار یانقد قیمت پرآپس میں معاملہ طے ہوجائے تو یہ بالکل جائز اور درست ہے، دریافت کردہ مسئلہ میں زید کا جس شخص سے ادھار معاملہ طے ہوا ہے اسی شخص نے دوسرے خریدار سے زیادہ قیمت پر نقد معاملہ طے کرکے زید سے خرید کردہ سامان پر قبضہ کے بعد اسے دوسرے خریدار کے قبضہ میں دے دیا ہے اور ثمن حاصل کرلیا ہے تو وہ شخص مالک ہے ومختار ہے، اگر ثمن سے زید کا ادھار ثمن ادا کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، یہ دو الگ الگ معاملے ہیں اور دونوں میں بائع اور مشتری کو نقد یا ادھار، اور کم یا زیادہ قیمت پر معاملہ طے کرنے کا اختیار ہے اور بیع وشراء کا ایک مقصد حصول ربح (نفع حاصل کرنا ہے) ہے جسے بیع مرابحہ کہا جاتا ہے، اس کے جواز میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے، جس شخص نے دو طرفہ خرید وفروخت کامعاملہ کرکے نفع کمایا ہے یہ اس کا تجارتی حق ہے،جائز اور درست ہے۔

''قال فی التنویروشرحہ،وصح بثمنِ حال وہوالأصل أومؤجّل إلی معلوم لئلا یفضی إلی النزاع'' (ردالمختار۴،۲۵)۔

(نقد قیمت پر خرید وفروخت صحیح وجائز ہے اور اصل نقد قیمت ہی ہے اور مدتِ معلومہ پر ادھار عقد بھی درست ہے، تاکہ باہمی نزاع تک معاملہ نہ پہنچے)۔

قیمت دریافت کرنا عقدِبیع نہیں:

جواب نمبر۶:- کسی شخص کا بائع سے صرف متعینہ سامان کی قیمت دریافت کرنا، عقد بیع نہیں ہے جب تک بائع و مشتری آپس کی رضامندی کے ساتھ مجلسِ عقد میں شرعی قاعدہ بیع سے ایجاب و قبول کرکے عقد کو لازم نہ کرلیں وہ بیع نہیں ہوتی،یہاں ایسا ہی ہے، اب آگے وہ شخص دوسرے خریدارسے مبیع کے جملہ اوصاف بیان کرکے آج یا کل

وغیرہ کی مدت پر جس متعینہ سامان کو دیکھ کر اس نے قیمت دریافت کی تھی وہی سامان ہو یا دوسراآپس میں طے شدہ قیمت پر معاملہ کرے، خواہ وہ دریافت کردہ قیمت سے زیادہ ہو تو یہ ایک نیا الگ معاملہ ہے، یہ عقدِ سلم ہے، اس میں بائع کے ذمہ سامان کی فراہمی ہے، وہ مارکیٹ سے یا خود اسی بائع سے جس سے متعینہ سامان کی قیمت دریافت کی تھی ، بیان کردہ اوصاف و شرائط کے مطابق کم قیمت میں خرید کر سامان فراہم کرتا ہے، اور درمیان کا نفع حاصل کرلیتا ہے تو یہ جائز ہے، یہ اس کا ربحِ بیع ہے، کیونکہ عقدِ سلم میں مبیع کے مشخص و متعین اوصاف، کو الٹی، کوانٹٹی وغیرہ مطلوب ہوتے ہیں، خریدار کو سامان کی باہری قیمت کے کم و بیش ہونے سے کوئی واسطہ ،مطلب نہیں ہوتا، اصل قیمت وہی معتبر ہوتی ہے جو آپس میں طے ہوجاتی ہے:

''فالسلم عقد یثبت بہ الملک فی الثمن عاجلاً وفی المثمن آجلاً''(عالمگیریہ۳،۱۷۱)۔

''وأما بیان حکم السلم فہو ثبوت المک لرب السلم فی المسلم فیہ مؤجّلا، بمقابلۃ ثبوت الملک فی رأس المال المعین أو الموصوف معجلاً للمسلم إلیہ'' (الفتاویٰ العالمگیریہ۳،۱۷۳، درمختار۷،۴۵۵)۔

(عقدسلم کا حکم یہ ہے کہ اس میں ایک طرف خریدار (رب السلم) کی ملکیت مدتِ مقررہ والے سامان (مسلم فیہ) میں ثابت ہوجاتی ہے، دوسری طرف فروخت کنندہ (مسلم الیہ) کی ملکیت قیمتِ متعینہ یا موصوفہ میں فی الحال ثابت ہو جاتی ہے)۔

محور دوم:

پرچی کی خریداری جائز نہیں:

جواب نمبر۱:- سوال میں جس صورت کا ذکر کیا گیا ہے اس کو فقہاء کی اصطلاح میں تملیک الدین من غیر من علیہ الدین کہا جاتا ہے، موجودہ عربی میں ''کمبیالہ '' ،انگلش میں ''بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange)، اردو میں ہنڈی اس کا مترادف ہے، اس صورت میں کمیشن پر پرچی کی فروخت کم قیمت پر ہوتی ہے اور بعد میں زیادہ رقم وصول کی جاتی ہے تو اس کو عربی میں خصم الکمبیالہ اور انگلش میں بل آف ایکسچینج کو ڈِسکائونٹ کرنا (Discaunt Bill of Exchanging) اور اردو میں ہنڈی پر بٹّہ لگانا کہتے ہیں، اس صورت میں بائع سے پرچی خریدنے والا حامل کمبیالہ دائن اور بیچنے والا مدیون بن جاتا ہے، گویا یہ ایک قسم کا حوالہ ہے جس میں دین وصول کرنے کی ذمہ داری بائع کے بجائے خریدار کے حوالے ہو جاتی ہے۔

اس صورت میں ہوتا یہ ہے کہ حامل کمبیالہ جب کسی شخص سے جاکر یہ کہتا ہے (یا کوئی شخص خود جیسے یہاں دلال کہتا ہے) کہ تم مجھے پیسے ابھی دے دو اور تین مہینے (یا جو بھی مدت مقررہو) کے بعد میرے مشتری سے وصول کرلینا، وہ شخص کہتا

ہے کہ میں یہ کام اس وقت کرونگا جب تم مجھے کچھ کمیشن دو، لہٰذا عام طور پر کمبیالہ (پرچی) کی رقم سے کم دیتا ہے اور بعد میں زیادہ وصول کرتا ہے ۔

فرض کریں کہ ایک سوروپئے کا بل ہے وہ اس کو پچانوے روپئے دے دے گا اور بعد میں مدیون سے ایک سوروپیہ وصول کرے گا، یہ شرعاً جائز نہیں ہے ،کیونکہ یہ سود کی ایک قسم ہے کہ گویا آج پچانوے دے رہا ہے اور سو کا حوالہ لے رہا ہے تو جو پانچ روپئے زیادہ لے رہا ہے وہ سود ہے۔

حنفیہ اور جمہور کے نزدیک دین کی بیع جائز نہیں ہے، یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے، دین کو کسی ایسے شخص کے ہاتھوں بیچنا جس پر دین واجب نہیں تھا۔

امام مالک نے نو شرطوں کے ساتھ اجازت دی ہے (الشرح الکبیر۳،۳۲۵، باب فی شروط الحوالہ واحکامہا)۔

امام شافعی کے بھی دو قول ہیں، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ جائز نہیں،امام احمد بن حنبل کے یہاں بھی بالکل جائز نہیں (حضرت مفتی تقی عثمانی:اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴،۱۴۶-۱۴۴ فیصل دیوبند)۔

سودی قرض لے کر ثمن کی ادائیگی:

جواب نمبر۲:- حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''حرام کا ارتکاب اضطرارکی حالت میں معاف ہے، پس اگر جان کا قوی خطرہ ہے یا عزت کا قوی خطرہ ہے ،نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں ،مثلاً جائیداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے '' (فتاویٰ محمودیہ۱۶،۳۰۶ شیخ الاسلام دیوبند)۔

اس فتویٰ کا ماخذیہ ہے:

''الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃً أوخاصۃً'' (شرح المجلہ لسلیم رسلم بار،۳۳، مکتبہ حنفیہ کوئٹہ)۔

''ویجوزللمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر،۹۳، الفن الاول قدیمی)۔

''فَاِنْ اضُطّرغَیْرِ بَاغٍ وَلَاعَادٍ فاِنَّ اللہ غَفُوْر رحِیْم'' (سورۃ النحل: ۱۱۵)۔

''فإن لم یجد وسیلۃً إلاہذا فاقدم علیہ غیرباغٍ ولاعاد فإن اللہ غفور رحیم'' (الحرام والحلال فی الاسلام، علامہ یوسف القرضاوی، موکل الرباوکاتبہ ،۲۱۹، المکتب الاسلامی بیروت)۔

مذکورہ فتویٰ کی روشنی میں اس صورت حال میں مبتلاشخص کے لیے سودی قرض بدرجہ مجبوری لے کر عزت بچانے کی گنجائش ہے، لیکن دوسرے ساتھی کو سودی قرض میں مبتلا کرکے بعد میں خود سود ادا کرنا دو طرفہ گناہ کا سبب ہے، اس لیے جائز نہیں ہوگا، ''ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان''(قرآن کریم)۔

مال میں خرابی بتاکر قیمت کم کرانا

جواب نمبر۳:- سوال میں ذکرکردہ صورت سے واضح ہے کہ یہاں دو عقدبیع ہوا ہے، پہلی بیع مؤجل ہوئی ہے اور دوسری بیع معجل ہوئی ہے، دونوں بیع لازم ہو چکی ہے، پہلی بیع میں بائع اپناتصرف نافذکرکے مبیع کو سات سو روپئے فی کیرٹ کے حساب سے بیچ چکا ہے، اس کے بعد بائع ثمن اول کی ادائیگی کے وقت بیع میں یہ کہہ کر عیب لگاتا ہے کہ وہ پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا مال نہیں تھا، اس لئے بائع قیمت کم کرکے چارسوروپئے فی کیرٹ کے حساب سے ثمن وصول کرے، چنانچہ وہ حَطِّ ثمن پر بائع کو راضی بھی کرلیتا ہے، یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ بائع کو مبیع میں تصرف کے بعد رجوع بالنقصان کا حق حاصل نہیں رہا، ورنہ ظہور عیب کے بعد وہ کل ثمن کے ساتھ واپس کرسکتا تھا، مگر اب واپسی بھی ممکن نہیں رہی، اس لیے کہ وہ دوسرے کو سات سو روپئے فی کیرٹ کے حساب سے بیچ چکا ہے،اور مشتری سامان پرقابض ہوچکا ہے، عقد لازم ہو چکا ہے ،اس کو باطل نہیں کرسکتا، لہٰذا اس کے لیے قیمت کم کرانا جائز نہیں۔

''قال فی التنویرمن وجدبمشریہ ماینقص الثمن أخذہٗ بکل الثمن أوردہٗ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہٗ تعالیٰ:اِلَّا أن یرضیٰ بالضرر فیخیّر المشتری حینئذٍ بین الرد والإمساک من غیر رجوع بنقصان'' (ردالمختار۴،۸۰-۸۹)۔

(تنویر میں یہ قول ہے کہ جوشخص اپنی خریدی ہوئی چیز میں وہ عیب پائے جس سے قیمت کم ہو جاتی ہے تو وہ یا تو پوری طے شدہ قیمت پر لے لے یا اس کو واپس کردے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا: مگر اس صورت میں جب کہ مشتری عیب کے ساتھ ہی راضی ہو تواس کو دوباتوں میں سے ایک کا اختیار ہے: چاہے واپس کردے، چاہے سامان رکھ لے، لیکن وہ بائع سے قیمت کم (رجوع بالنقصان) نہیں کراسکتا)۔

عیب داربتا کر خریدنا اور شاندار بتا کر بیچنا:

جواب نمبر۴:- یہ باطل طریقہ ہے، ایسا عمل اسلام میں حرام ہے،اللہ تعالی فرماتا ہے:

''وَلَاتَاْکُلُوا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطل'' (البقرہ)۔

(اوراپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقے سے مت کھائو)۔

حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

''عن أبی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: المسلم أخوالمسلم لا یخونہٗ ولایکذبہ ولایخذلہ کل المسلم علی المسلم حرام عرضہٗ ومالہٗ ودمُہٗ، التقویٰ ہٰہنا، بحسب اِمرئ من الشر أن یحتقر أخاہٗ المسلم، ہذاحدیث حسن غریب''(جامع الترمذی ۲،۱۴، اشرفیہ دیوبند)۔

(حضرت ابوہریرہؓبیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺنے فرمایا:مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس کے ساتھ خیانت نہ کرے، اس کو نہ جھٹلائے، نہ رسوا کرے، ہر

مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبروریزی کرنا، اس کے مال کو ہڑپنا اور اس کا خون بہانا حرام ہے، تقوی یہیں ہے، آدمی کے شریر ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے)۔

مال میں ملاوٹ کو بتائے بغیر بیچنا:

جواب نمبر۵:- ملاوٹ والے مال کا یہ عیب بیان کئے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے، اطلاع عیب کے بعد اگر تاجر کہتا ہے کہ مجھے تو صرف سستا مال چاہئے ، ملاوٹ رہنے نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں تو یہ تاجر کافعل ہے، اس کے نفع نقصان کی ذمہ داری تاجر پر ہے، کاریگرپر یا مال بنوانے والے پر نہیں ہے، وہ اپنی واجبی لاگت کے حساب سے مناسب قیمت پر فروخت کرسکتا ہے، اب آگے تاجر اسی مال کو بیچے گا تو اس پر ملاوٹ کاعیب چھپا کر بیچنا حرام ہوگا۔

''عن أبی ہریرۃ أن رسول اللہﷺ مرّعلی صُبرۃٍ من طعام فأدخل یدہٗ فیہا فنالت أصابعہ بللا فقال یاصاحب الطعام ماہذا؟ قال:أصابتہٗ السماء یارسول اللہ، قال:أفلا جَعلتہٗ فوق الطعام حتی یراہُ الناس،ثم قال: من غشّ فلیس منا،ہذاحیث حسن صحیح'' (جامع الترمذی۱،۲۴۵فی کراہیۃ العش فی البیوع)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہﷺ کا گزر غلّہ کے ڈھیر سے ہوا، آپﷺ نے اِس کے اندر ہاتھ داخل کیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں میں نمی(تَری) آگئی، آپ ﷺنے غلہ کے ڈھیر والے سے کہا کہ یہ کیا دھوکہ بازی ہے، اس نے کہا یا رسول اللہ اس ڈھیر پر بارش کی بوندیں پڑ گئی تھیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر بھیگے ہوئے غلہ کو تم نے ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں کر دیا تاکہ اس کو لوگ بھی دیکھ لیتے، اس کے بعد آپ ﷺنے فرمایا کہ جو شخص ملاوٹ اور دھوکہ بازی کرے وہ ہمارے اسلامی طریقے پر نہیں ہے)۔

امام ترمذی فرماتے ہیں:

''والعمل علی ہذا عند أہل العلم کرہوا الغش وقالوا الغش حرام''۔

(اسی پر اہل علم کا عمل ہے، انہوں نے ملاوٹ کو مکروہ قراردے کر فرمایا کہ ملاوٹ ،کھوٹ، دھوکہ حرام ہے)۔

نفع لینے کی حد مقررنہیں:

جواب نمبر۶:- شریعت میں تجارتی سامان کے خریدوفروخت میں نفع لینے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، خاص طور پر زینت کے سامان جیسے جواہرات، سونے، چاندی وغیرہ ایک روپیہ قیمت کا ٹکڑا ایک ہزار میں خرید، بیچ سکتا ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے:

''نفع لینے کی کوئی حد متعین نہیں ہے، جتنا لینا چاہے لے سکتا ہے، بشرطیکہ گاہک کو دھوکہ نہ دے ''(فتاویٰ رشیدیہ ص۵۵۷ جدید میوبہ۵۴۰)۔

''الثمن المسمّٰی ہو الثمن الذی یسمیہ ویعینہ العاقدان وقت البیع بالتراضی سواء کان مطابقاً بقیمتہٖ الحقیقیۃ أو ناقصاً عنہا أو زائداً علیہا'' (شرح المجلہ رستم مکتبہ اتحاددیوبند۱،۷۳، رقم الماده: ۱۵۳، فتاویٰ قاسمیہ ۱۹،۵۲۴)۔

(مقررہ قیمت وہ ہے جسے متعاقدین آپس کی رضامندی سے بوقتِ عقد مقرر ومتعین کرتے ہیں، خواہ حقیقی قیمت کے مطابق ہویا اس سے کم یا زاید ہو)۔

لیکن بنیادی ضرورت کے سامان جیسے غلہ، نمک،تیل، کپڑا وغیرہ سامان میں عوام کی قوتِ خرید سے زیادہ نفع لینا جس سے ان کو ضررلاحق ہو ممنوع ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دعوا الناس حتی یرزق اللہ بعضہم من بعض''۔

(لوگوں کو چھوڑدو تاکہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا کرے)۔

محور سوم:

قیمت میں ڈسکائونٹ جائز ہے:

جواب نمبر ۱ :(الف، ب، ج) تینوں شکلوں میں اگر متعاقدین ڈسکائونٹ یعنی قیمت کم کردینے پر راضی ہوں تو شرعاً درست ہے۔

''یجوزللمشتری الحط من المبیع ویجوز للبائع الحطّ من الثمن إذا قبل الطرف الآخر فی مجلس الحط، ولیستوی أن یکون الحط بعد التقابض أو قبلہ، فلوحط المشتری أو البائع بعد القبض کان للآخرحق الاسترداد۔

ولا یشترط لجواز حط البائع من الثمن أن یکون المبیع قائما،لأن الحط إسقاط ولایلزم أن یکون فی مقابلتہٖ شئ'' (الموسوعۃ الفقہیۃ ۹،۵۵)۔

(مشتری کے لیے مبیع کم کردینا جائز ہے اور بائع کے لیے قیمت کم کردینا جائز ہے، جبکہ دوسرا فریق ڈسکائونٹ کی مجلس میں اسے قبول کرلے، اور اس میں ایک دوسرے کے قبضہ سے پہلے یا بعد میں ایک ہی حکم ہے، پھر جب مشتری یا بائع قبضہ کے بعد قیمت کم کردے تو ایک دوسرے کو واپسی کا حق حاصل ہوگا۔

اور بائع کے لیے قیمت کم کردینا ہرحال میں جائز ہے، مبیع موجود ہونا شرط نہیں ہے، اس لیے کہ ڈسکائونٹ اسقاط ہے جس کے مقابلے میں کوئی چیز موجود ہونالازم نہیں ہے)۔

مطلوبہ معیار میں کمی کے باوجود کاریگرکی اجرت کا مسئلہ:

جواب نمبر:۲- اگر مال تیار کروانے والے (مستصنع) نے اپنے میٹریل (جواہرات)

کاریگر (صانع) کے حوالہ کرکے سیمپل، ڈیزائن، سائز اور مطلوبہ اوصاف کے مطابق مال بنانے کا معاملہ طے کیا ہے اور کاریگر نے اس میں کمی کردی ہے تو اس کمی سے قیمت میں جتنا نقصان ہواہے، مال لے کر کاریگر کی اجرت سے اتنے نقصان کی تلافی مستصنع کرسکتا ہے، کاریگر کو یہ نقصان برداشت کرنا پڑے گا ،لیکن اس کی پوری مزدوری کو ضبط کرنا جائز نہیں ہے اور اگر پورا میٹریل بیکار ہوگیا ہے تو خراب مال کاریگر کو دے کر اپنے میٹریل کے ہم مثل میٹریل کاریگر سے وصول کرسکتا ہے، لیکن پورے مال کو ضبط کرکے مناسب اجرت ادا کئے بغیر فروخت کرنا مستصنع کے لیے ناجائز ہے، چاہے مارکیٹ میں یہ طریقہ معروف اور مروّج کیوں نہ ہو۔

مبسوط سرخسی کی درج ذیل عبارت سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے:

‘‘ولو سَلّم غزلاً إلی حائک لینسج سبعاًفی أربع فحاکہٗ أکثرمن ذالک أو أصغر فہو بالخیار إن شاء ضمّنہٗ مثل غزلہ وسلّم لہٗ الثوب، وإن شاء أخذ ثوبہٗ وأعطاہٗ الأجر إلا فی النقصان فإنہٗ یعطیہ الأجربحساب ذلک ولایجاوزبہ ما یسمیٰ’’(المسبوط للسرخسی ۱۰؍۸۶، فتاویٰ قاسمیہ ۱۹؍۶۴۸-۶۴۷)۔

(اگر کپڑابننے والے کو سوت دھاگا دے دے، تاکہ اس کے لئے چاربائی سات کے سائز میں کپڑا بنا کر دے، پس کپڑا بنانے والے نے اس سائز سے بڑا یا چھوٹا بنادیا تو آڈردینے والے کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو اپنے سوت دھاگے کے ہم مثل تاوان میں وصول کرلے اور بنا ہوا کپڑا، بننے والے کو دے دے، اور اگر چاہے تو اسی کپڑے کو لے کر اس کی اجرت ادا کردے، مگر قیمت کا نقصان ہو جانے کی صورت میں وہ اس نقصان کے بقدرتلافی کرکے اجرت دے دے، اور اس میں متعین قیمت سے تجاوز نہ کرے)۔

نمائشی قیمت کا کوئی اعتبار نہیں:

جواب نمبر۳ :- یہ بیع تلجئہ کے ہم شکل معاملہ ہے جس میں باہرسے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتا ہے،تین ہزار ۳۰۰۰کا ایک نقطہ اڑاکر ۳۰۰سو ظاہر کرنا محض نمائشی تعداد ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، درپردہ قیمت ہی معتبر ہے۔

‘‘بیع التلجئۃ۔ البیع الصوری أن یضطر لإظہار عقدٍ وإبطان غیرہ مع إرادۃ ذلک الباطن، کأن یظہر بیع دارہٖ لابنہٖ لئلا یستولی علیہا السلطان’’ (معجم لغۃ الفقہاء ۱۱۳کراچی، قواعد الفقہ۲۱۳، اشرفی دیوبند، معجم المصطلحات والالفاظ الفقہیہ۱؍۳۰۵، دارالفضیلہ، الموسوعۃ الفقہیہ ۹؍۶۲، فتاوی قاسمیہ ۱۹؍۵۳۳)۔

(بیع تلجئہ ایک نمائشی بیع ہے جس میں اوپر سے آدمی اظہار بیع کے لیے مجبور ہوتا ہے اور اندر جو کچھ چھپا ہوتا ہے ارادہ اسی کا ہوتا ہے،مثال کے طور پر کوئی شخص اپنے گھر کو اپنے بیٹے کے نام بیچنے کو ظاہر کرتا ہے اور اندر سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حاکم اس پر قبضہ نہ کرسکے)۔

یہی صورت حال مذکورہ مسئلہ میں بھی ہے اور اس سے یہ حکم بھی ظاہر ہو گیا کہ یہ عمل اگر ظلم سے بچنے کے لئے ہو تو گنجائش ہے، ورنہ درست نہیں۔

عادت وعرف کے اعتبار سے قیمت کی وصولیاں:

جواب نمبر۴:- اگر ایکسپورٹ ،اور امپورٹ کاروبار میں یہ طریقہ معروف ہو اور اس عرف وعادت کے مطابق ہی کاروبار ہوتا ہو، اور ایکسپورٹر اور امپورٹر دونوں پیمنٹ کے اس طریقہ پر راضی ہوں تو یہ جائز ہے،گورنمنٹ کی نظر سے بچناہوتو مناسب نہیں۔

''ولولم یکن الأجل مشروطاً فی العقدلکنہٗ منجم معتادکعادۃ بعض البلاد یشترون بنقد ویسلمون الثمن بعد شہر إماجملۃً أو منجما قیل لابد من بیانہٖ لأن المعروف کالمشروط'' (عنایۃ مع الفتح باب المرابحہ والتولیہ ۴۶۹،۶ زکریا دیوبند)۔

(اگر عقدمیں مدتِ ادائیگی کی شرط نہ ہو، قسطواراداٸیگی کارواج وعادت ہو جیسا کہ بعض شہروں کی عادت ہوتی ہے کہ نقد خریدتے ہیں اور ثمن ایک مہینے کے بعد اکٹھے یا تھوڑا تھوڑا ادا کرتے ہیں، تو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا بتادینا ضروری ہے، کیونکہ معروف چیز مشروط کے حکم میں ہوتی ہے)۔

زیور کی تیاری میں بچے ہوئے ٹکڑے صاحب مال کے ہیں:

جواب نمبر۵:- اگر یہ ذرّات اور ٹکڑے کسی بھی درجے میں قیمتی اور قابل فروخت ہیں تو یہ زیور بنوانے والے کا مال ہیں اور کاریگر کے لیے اس کا اپنے پاس رکھ لینا جائز نہیں ہے، اس کو مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگریہ اردو اصطلاح کے ہم معنی ''ناچیز ذرّئہ بے مقدار '' ہیں تو یہ کسی کے لئے کارآمد نہیں ہیں، کاریگر رکھناچاہے تو رکھ سکتا ہے۔

''من اکتسب مالا بغیر عقد کالسرقۃ، والغصب، والخیانۃ، والغلول ففی جمیع الأحوال، المال الحاصل لہ حرام علیہ ولکن إن أخذہ من غیر عقد لم یملک، ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ إن وجد المالک وإلا ففی جمیع الصور یجب علیہ أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء'' (بذل المجہود فی شرح ابی دائود ۳۷،۱مطبوعہ سہارنپورباب فرض الوضو،الموسوعۃ الفقہیہ۳۴، ۲۴۶ مطبوعہ کویت)۔

(جو شخص آپسی طے شدہ معاملہ کے بغیر مال حاصل کرے جیسے چوری،دوسرے سے چھینا ہوا، خیانۃ یا غنیمت سے چوری کا مال، ان تمام احوال میں اس کا حاصل کردہ مال اس پرحرام ہے، لیکن اگر بلا طے شدہ معاملہ کے لے لیا ہے تو وہ مالک نہیں ہوگا، اور اس پر واجب ہے کہ اگر مالک موجود ہے تو مالک کو مال واپس کردے، ورنہ (مالک موجود نہیں ہے تو) اِن تمام صورتوں میں اس پر واجب ہے کہ اسی مال کے مثل کو فقیروں پر صدقہ کردے)۔

قیمتی پتھروں میں استعمال ہونے والے دھاگے کا مسئلہ:

جواب نمبر۶:- اگر تاجروں کے عرف میں دس گرام دھاگے کا وزن طے شدہ ہوتو تاجرکاآٹھ گرام دھاگے والے زیور کو دس گرام مان کر خرید نادرست ہوگا۔

‘‘أما لوجری العرف بہ کبیع النعل مع شرطِ تشریکہ أو ورد الشرع بہٖ کخیار شرط، فلا فساد، کشرط أن یقطعہ البائع ویخیطہ قباء، مثال لما لا یقتضیہ العقد، وفیہ نفع للمشتری، أو یستخدمہ مثال لما فیہ نفع للبائع’’(الدرالمختار مع ردالمختار۵،۸۵سعید کمپنی)۔

(عقد مینتقاضا ئے عقد کے خلاف شر ط ہوتب بھی اگر اس کا عرف جاری ہوتو عقددرست ہوگا، جیسے جوتا فیتہ لگانے کی شرط پر بیچنا،یا تقاضائے عقد کے خلاف، شریعت وارد ہو جیسے خیار شرط تو اس میں فساد عقد نہیں ہے، جیسے کپڑا، کرتا سی دینے کی شرط پر خریدنا تقاضائے عقد کے خلاف ہے اور اس میں خریدار کا نفع ہے یا غلام کو خدمت لینے کی شرط پر فروخت کرنااس میں بائع کا نفع ہے)۔

اس مسئلہ کی ایک نظیر ‘‘فتاوی محمودیہ ’’ میں موجود ہے:

‘‘سوال: تاجر وں کی عادت ہے جب کسی سے مال خریدتے ہیں تو چونکہ عام طور پر غلّہ میں مٹی ہوتی ہے، اس لئے اس کے عوض میں ہر ایک من غلّہ کے اوپر مثلاً ایک کلوغلّہ لیتے ہیں، دوسرے کو فروخت کرتے ہیں تو مٹی کے عوض کچھ بھی نہیں دیتے، بلکہ مشتری اگرمانگتا ہے تو تاجر کہتا ہے کہ یہ تو تاجروں کی عادت ہے، اس لئے مٹی کے عوض کچھ بھی نہیں ملے گا، دریافت طلب یہ ہے کہ آیا تاجروں کا ایسا معاملہ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: یہ ناانصافی ہے، تاہم اگر طرفین اس پر رضامند ہوجائیں تو بیع درست ہوجائے گی لعدم المفسد’’ (فتاویٰ محمودیہ ۱۶،۵۲، باب البیع الصحیح شیخ الاسلام دیوبند)۔

مبیع میں سے کچھ حصہ ساقط کرکے فروختگی کی پرچی لکھنا:

جواب نمبر۷:- جس ایک قیراط پانچ سینٹ والے بائع کے لئے ایک قیراط مال کی پرچی لکھی گئی تھی خریدار تاجرنے اس کے مطابق پرچی لکھ دی اور بائع اورمشتری دونوں اس پرراضی ہوگئے، چونکہ بائع کو عندالعقدوقبلہ وبعدہٗ مبیع میں کمی بیشی کرنے کا اختیار ہے اور اسی طرح کا اختیار مشتری کو ثمن میں ہے، اور دونوں اس قیمت پر اپنی رضامندی سے عقد لازم کرلیتے ہیں تو یہ سمجھا جائے گا بائع مبیع میں پانچ سینٹ کم کرنے پر راضی ہوگیا، یہاں عقد تام ہوگیا، اب آگے خریدارتاجر ایک قیراط پانچ سینٹ میں یہ مال بیچتا ہے تو یہ ‘‘بیع مرابحہ ’’ ہے اور شرعاً جائز ہے، پرچی کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ وہ اصل ثمن نہیں بلکہ ثمن کی رسید ہے اور اصل ثمن وہ ہے جسے متعاقدین آپس میں طے کرتے ہیں، لہٰذا خریدار تاجر اب دوسرے خریدار تاجر سے ایک قیراط پانچ سینٹ میں بیچ دیتا ہے تو یہ اس کا تجارتی نفع ہے جو شرعاً درست ہے، کیونکہ زاید قیمت کے مقابلہ میں پانچ سینٹ مال موجود ہے یہ سود نہیں ہے۔

''الثمن المسمیٰ ہوالثمن الذی یسمیہ ویعینہ وقت البیع بالتراضی سواء کان مطابقاً لقیمتہ الحقیقیۃ أو ناقصاً عنہا أو زایداً علیہا'' (شرح الجملہ رستم باز ۷۳٫۱ مکتبہ اتحاددیوبند)۔

(مقررثمن وہ ہوتا ہے جسے خریدوفروخت کامعاملہ کرنے والے (متعاقدین) بوقت بیع آپس کی رضامندی سے مقرر ومتعین کرتے ہیں، خواہ یہ ثمن حقیقی قیمت کے مطابق ہو یا اس سے کم ہو یا اس قیمت سے زاید ہو)۔

مبیع کی ہلاکت ظاہر کرکے کچھ قیمت بائع کو دینا کچھ خود کھانا:

جواب نمبر۸:- جو شخص مال لے کرگیا ہے اگر اپنے قول میں جھوٹا ہے تو اُس کے لیے یہ پچیس فیصد قیمت دے کر باقی ماندہ مال حرام ہے ۔

''عن أبی حمید الساعدی أن رسول اللہ ﷺ قال:لایحل لامرئ أن یأخذ مال أخیہ بغیرحقہٖ، وذلک لما حرم اللہ مال المسلم علی السملم'' (مسند احمد بن حنبل۴۲۵٫۵، رقم: ۳۴۰۰۳، مجمع الزوائد۱۷۱٫۴ دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

(ابوحمیدالساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال ناحق لے لے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے مال کو دوسرے مسلمان کے لیے ناحق لینا حرام کردیا ہے)۔

اور اگر یہ شخص اپنی سچائی پر حلف اٹھا سکتا ہے تو یہ کل ثمن میں سے جتنی ادائے گی پر قادر ہو وہ ادا کرناواجب ہے اور جتنے حصۂ ثمن کی ادائے گی سے عاجز ہو اس کو اپنے بائع سے معاف کرا لینا ضروری ہے، اور ادھار مال دینے والے کے لئے بھی قیمت کم کردینا جائز ہے۔

''والحط منہ أی حط البائع بعض الثمن ولوبعد ہلاک المبیع''(مجمع الانہر۱۱۵٫۳ دارالکتب العلمیہ بیروت، درمختار۱۷۹٫۷ زکریا دیوبند)۔

(اور بائع کا کچھ ثمن کو کم کردینا جائز ہے اگرچہ مبیع ہلاک ہو جانے کے بعد ہو)۔

"الحنفیۃ قالواکل مایدعیہ أحد الشرکاء فی مقدار الربح والخسران وفقدالمال والدفع إلی شریکہ یصدق فی قولہٖ بعدأن یحلف الیمین''(الفقہ علی المذاہب الاربعہ۷۴٫۳ دیوبند)۔

(حنفیہ کہتے ہیں کہ بزنس پارٹنر میں سے ایک شخص نفع،نقصان کی مقدار اور مال کی گمشدگی، یااپنے پارٹنر کو دے دینے کے بارے میں دعویٰ کرے تو قسم کھانے کے بعد اس کی تصدیق کی جائے گی)۔

محورچہارم:

نقد یا ادھار قیمت متعین کرکے بیچنا جائز ہے:

جواب نمبر۱:- ڈائمنڈ کا مال ہو یا کوئی بھی مال ،تاجر کو نقداورادھار دونوں میں سے نقد کی فی الحال قیمت یا ادھار کی تعیین مدت کے ساتھ مقررہ قیمت پر بیچنا جائز

ہے،لیکن تردید کے ساتھ بلا تعین نقد اتنے پر اور ادھار اتنی قیمت پر بیچتاہونکہہ کر عقد ِبیع کرنا جائز نہیں ہے۔

''صح بثمنٍ حال وہو الأصل، ومؤجل إن أجل معلوم''(فتح القدیر۶؍۲۴۳ زکریا دیوبند، الموسوعۃ الفقہیہ ۲؍۳۸)۔

(فی الحال (نقد)قیمت پر بیچنا جائز اور صحیح ہے اور یہی اصل قیمت ہے اور ادھار بیچنا مدت کی تعیین کے ساتھ بھی صحیح ہے)۔

''رجل باع علی أنہ بالنقد بکذا وبالنسئیۃ بکذا وإلی شہر بکذا، وإلی شہرین بکذا لم یجز'' (عالگیریہ ۳؍۱۳۶ ، الباب العاشرفی الشروط التی تفسد البیع والتی لاتفسد)۔

(کسی شخص نے اس شرط پر مال بیچا کہ نقد اتنی قیمت پر اور ادھار اتنی قیمت پر اور ایک مہینہ کی مدت تک اتنی قیمت پر اور دو مہینے کی مدت پر اتنی قیمت پر، تو یہ بیع جائز نہیں ہے(کیونکہ اِس صورت میں قیمت کی تعیین مجہول ہے اور جہالت ِثمن کے ساتھ بیع شرعاً جائز نہیں))۔

متعاقدین (خریدوفروخت کرنے والے)کے درمیان جوقیمت طے ہوجائے وہی معتبر ہے، خواہ مارکیٹ میں کوئی اور قیمت ہو اس کا اعتبار نہیں، لہٰذا بائع کو اختیار ہے کہ مارکیٹ ریٹ پر مال فروخت کرے یا آپس مینطے کردہ ریٹ پر بیچے بہر صورت بیع جائز ہے۔

اب اگرکسی تاجر نے عامۃً مارکیٹ میں جاری دو مہینے کی ادھاری قیمت مثلاً دو سو روپئے پر مال فروخت نہیں کیا، بلکہ ایک سو تراسی روپئے نقد قیمت پر فروخت کیا تو یہ جائز ہے، اگرچہ رواجی سوچ کے اعتبار سے اس صورت میں ۶؍فیصدلیس نظر آتا ہے مگر یہ لیس ہے ہی نہیں، کیونکہ ۶؍فیصدلیس اس وقت کہلاتا جب دو سو روپئے میں دو مہینے کی مدت پر ادھار بیچ کر مدت کو کینسل کرکے نقد ایک سو تراسی روپئے میں فروخت کرتا، یہاں تو مستقل طور پر نقد قیمت ۱۸۳روپئے متعین کرکے بیچ رہا ہے تو یہ اصطلاح فقہاء میں بیع ثمنٍ حال ہے جو اصلِ ثمن ہے، اس میں تخفیف اور لیس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو ناجائز ہونے کاسوال کہاں سے پیدا ہوگا۔

بیع موجل میں مدت سے پہلے قیمت میں تخفیف کرنا:

جواب نمبر۲:- صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً عمروپر زید کاایک ہزار روپیہ دین تھا، اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو روپئے دین کے چھوڑدیتا ہوں، بشرطیکہ تم نوسو روپئے فی الحال ادا کردو، فقہ کی اصطلاح میں اس معاملے کو ''ضع وتعجل '' (کچھ ساقط کرو اور جلدی حاصل کرلو) کانام دیا جاتا ہے۔

اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعیؒ ،احناف میں سے امام زفر بن ہذیلؒ اور شوافع میں سے شیخ ابوثورؒ اس کے جوازکے قائل ہیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں

سے حضرت عبداللہ بن عمراور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین، حضرت حسن بصری، حضرت سعیدبن مسیب،حضرت حکم بن عتیبہ اور امام شعبی رحمہم اللہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے (موطا امام مالک ۶۰۶،۱، مصنف عبدالرزاق ۷۱،۸تا۷۴)۔

اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں، اور سند کے اعتبار سے دونوں ضعیف ہیں(السنن الکبری۲۸،۶ کتاب البیوع باب من عجل لہ ادنی من حقہٖ)۔

امام بیہقیؒنے اس کی تصریح کردی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے، اس لئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اس میں داخل ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل۳، ۱۰۸، فیصل دیوبند)۔

تعجیل کی صورت میں بلاشرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

دین موجل اگرجلد ادا کردیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ ‘‘چھوڑنا ’’ تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کردے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو ،تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاصؒنے ‘‘ضع و تعجل ’’ کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں ، ان کو اسی پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

‘‘ومن أجاز من السلف إذا قال:عجل لی أو ضع عنک، فجائز أن یکون أجازوہ إذا لم یجعلہ شرطا فیہ، وذلک بأن یضع عنہ بغیر شرط، ویجعل الآخر الباقی بغیر شرط’’ (احکام القرآن للجصاص۴۶۷،۱ ،آیت رباسلام اورجدید معاشی مسائل۳، ۱۱۸)۔

(جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قراردیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ ‘‘تم میرا دین جلد اداکردو، میں تمہیں کچھ دین معاف کردوں گا ’’ بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کردے، اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی اداکردے)۔

بڑھیا مال کے بدلے گھٹیا مال کامعاملہ:

جواب نمبر۳:- گھٹیا اوربڑھیا ڈائمنڈ کے درمیان قیمت مینجتنا فرق ہواتناہی قیمت میں سے کمی کروا سکتے ہیں۔ یعنی جتنی قیمت گھٹی ہے بائع سے اتنے روپئے واپس لے سکتے ہیں۔

‘‘فإن ظہرعیب قدیم عندالمشتری آخررجع بالنقصان،کثوب شراہ فقطعہٗ فاطلع علی عیب

ولیس لہٗ الرد إلا أن یرضی البائع بأخذہٖ وتحتہٗ‘‘مجمع الأنہر’’ لأن تعذر الرد بسبب العیب الحادث، وطریق معرفتہٖ أن یقوم وبہ ہذا العیب ثم یقوم وہوسالم، فإذا عرف التفاوت بین القیمتین یرجع علیہ بحصتہٖ من الثمن الخ’’ (الدرالملتقٰی مع مجمع الانہر۳،۶۶-۲۴ دارالکتب العلمیہ بیروت، النہرالفائق ۳،۳۹۸ زکریاد یوبند) ۔

(اگر دوسرے خریدار کے پاس سامان (مبیع) میں پرانا (پہلے سے موجود) عیب ظاہر ہو تو اس سے قیمت میں جتنا نقصان ہوا ہے اتنا واپس لے سکتے ہیں، مثال کے طور پر کسی نے کپڑا خریدا اور سلائی کے لئے اس کو کاٹا تو پتہ چلا کہ اس میں عیب ہے اور اب اسے بائع کوواپس نہیں کرسکتا، لیکن اگر وہ واپسی پر راضی ہو تو واپس کر سکتا ہے اور اسی جزئیہ کے تحت ‘‘مجمع الانہر ’’ میں ہے کہ نئے پیدا شدہ عیب کی حالت میں واپسی دشوار ہو تو عیب سے پیدا شدہ قیمت کے نقصان کو جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ عیب دار حالت میں اس کی قیمت لگائی جائے، پھر صحیح حالت کی قیمت لگائی جائے، پھر جب دونوں قیمتوں میں فرق واضح ہو جائے تو قیمت کے اتنے حصے کو بائع سے وصول کیا جائے)۔

اصلی مال کی جگہ خریدار کو نقلی مال دینے کا حکم:

جواب نمبر۴:- سوال کی وضاحت سے ظاہر ہے کہ ‘‘ریئل ڈائمنڈ ’’ قدرت کے خزانے میں پیدا ہونے والا اصلی مال ہے، اور سی۔وی۔ڈی (CVD)کیمیکل واپور (Chemical Vapor) ہے جو انسان کے کارخانے (فیکٹری) میں تیار شدہ نقلی مال ہے، جیسے ماربل،الگ مال ہے اور ٹائل علیحدہ چیز ہے، ماربل نیچورل ہے اور ٹائل آرٹیفیشیل ہے، لہٰذا جس جوہر ی نے الف خریدار کو ‘‘ریئل ڈائمنڈ ’’ (Real Diamond)کے بجائے CVDڈائمنڈ دیا ہے، جبکہ خریدار سے معاملہ ریئل ڈائمنڈ کا ہوا تھا تو اس نے دھوکہ دیا ہے ‘‘ ولا یجوز الخداع فی البیع’’۔

اس صورت میں حکم شرعی یہ ہے کہ پورا بیع C.V.Dڈائمنڈ بائع کو واپس کردیا جائے اور پوری قیمت اس سے واپس لے لی جائے۔

یہاں CVDڈائمنڈ کو روک کر اس کی ۲۵،فیصد کے مطابق قیمت کم کرکے باقی ۷۵،فیصد ریئل ڈائمنڈ کی قیمت وصول کرنے کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ خریدار کے قبضہ میں وہ مبیع نہیں ہے جس میں عیب ظاہر ہونے پر رجوع بالنقصان کر سکتا ہو۔

علامہ عبدالرحمن الجزیری حنفیہ کے موقف کی تفصیل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

‘‘ویتضح لک مما تقدم أن المشتری إذا وجد عیبا بالمبیع یرد بہ، فلیس لہ أن یمسکہٗ ویطالب بالعوض عن النقص الحاصل بسبب العیب، وإنما لہٗ أن یردکلہٗ ویأخذ الثمن کاملاً’’ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲،۱۵۳ ،سلمان عثمان اینڈ کمپنی دیوبند)۔

(اورگذشتہ تفصیل سے تمہارے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب مشتری مبیع میں ایسا عیب پائے جس سے مبیع کو واپس کرسکتا ہو، یہاں اس کو یہ حق نہیں ہے کہ مبیع

کو روک لے اور عیب کے سبب سے جو نقصان ہوا ہے اس کے عوض کا مطالبہ کرے، مشتری کے لئے صرف یہ حق ہے کہ وہ پورے مال کو واپس کردے اور پوری قیمت وصول کرلے)۔

ایک معاملہ میں دوسرے معاملہ کو داخل کرنے کاحکم:

جوا ب نمبر۵ :- یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ سائل نے یہاں ایک عقد بیع میں دوسرے عقد شرکت کو داخل کردیا، اور یہ شریعت میں جائز نہیں ہے۔

''لأن النبی ﷺ قال لایحل بیع وسلف ولاشرطان فی بیع'' قال الترمذی ہذا حدیث صحیح، ولأن النبی ﷺ نہی عن بیعتین فی بیع ۔حدیث صحیح ۔ وہذا منہ وکذلک کل ما فی معنی ذلک ..... وقال ابن مسعود رضی اللہ عنہ صفقتان فی صفقۃٍ ربا،وہذا قول أبی حنیفۃ والشافعی وجمہورالعلماء وجوزہ مالک وجعل العوض المذکور فی شرط فاسداً (الشرح الکبیرعلی المقنع لثمن الدین ابن قدامہ۴؍۵۳، ذکرالموفق لابن قدامہ فی المغنی۳؍۲۹۰)۔

(اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیع اور قرض کو جمع کرنا حلال نہیں ہے، امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ صحیح حدیث ہے، اور اس لئے کہ نبی ﷺ نے ایک بیع کے اندر دوسری بیع کرنے سے منع فرمایا ہے، یہ حدیث صحیح ہے، اور یہ مسئلہ بھی اسی میں ہے اور ہر وہ معاملہ جو اس معنی میں ہو وہ بھی ناجائز ہے۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک معاملہ کے اندر دوسرا معاملہ داخل کرنا سود ہے، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور جمہورعلماء کا بھی یہی قول ہے، امام مالکؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور شرط کے اندر جس بدل کا ذکر ہے اس کو فاسد قرار دیا ہے)۔

کم قیمت میں خرید کر زیادہ قیمت پر عقدشرکت کرنا:

جواب نمبر۶ :- مسئلہ وہی ہے جو سوال نمبر۵میں ہے، صرف شکل بدلی ہوئی ہے، اس بدلائو کی وجہ سے صورتِ مسئلہ میں بھی فرق پیدا ہوگیا ہے، یہاں الف نے ب کو بیچنے کے لئے جو ڈائمنڈ پیش کیا، ب نے مارکیٹ ریٹ معلوم کرکے الف کو نہیں بتایا، اور الف اور ب کے درمیان عقد بیع بھی نہیں ہوا، وہ ڈائمنڈ ب کے پاس بطور امانت محفوظ رہا، اسی بیچ ب نے یہ ڈائمنڈ ج کو دکھایا اور مارکیٹ ریٹ ڈھائی لاکھ کو چھپا کرج سے سوادولاکھ مینعقد شرکت ڈھائی لاکھ کے بجائے سوا دو لاکھ میں کرنا چاہا، پھر الف نے ب سے دو لاکھ میں یہ ڈائمنڈ خریدلیا تو الف اور ب کے درمیان عقد بیع تام ہوگیا، اور یہ معاملہ یہا ں ختم ہوگیا، اب مسئلہ صرف ب اور ج کے درمیان کا رہ گیا، ب ڈائمنڈ کا مالک ہے،اور ج سے سوادولاکھ میں شرکت چاہتا ہے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ ایک طرف ڈائمنڈ سامان ہے اور دوسری طرف نقد ہے او رشرکت عنان میں دونوں طرف نقد ضروری ہے۔

''قال العلامۃ ابن عابدین رحمہٗ اللہ تعالیٰ تحت قولہ (بغیر النقدین) ما لا تصحان

بالعرض ولا بالمكيل والموزون قبل الخلط بجنسہٖ، وأمابعدهٗ كذلک فی ظاہر الروایۃ فیکون المخلوط شرکۃ ملک وہوقول الشافعی رحمہٗ اللہ تعالیٰ وقال محمد رحمہٗ اللہ تعالیٰ شرکۃ عقد" (ردالمختار ۳،۳۵۰)۔

اور اگرب اور ج آپس میں جائز شرکت چاہتے ہیں تو اس کی شکل یہ ہے کہ ب اپنے شریک کو بتائیں کہ یہ ڈائمنڈ میں نے دو لاکھ میں خریدا ہے اور تم بھی دو لاکھ لگاکر شرکت کرو، اس طر ح دونوں جانب نقد کا تعین ہوجائے گا اور جانبین سے ڈائمنڈ کی خریداری میں نقد کے ساتھ شرکت ہوگی،ورنہ اصل خریداری چھپا کر شرکت کو ''غش ''مانا جائے گا اور غش حرام ہے (جامع ترمذی)۔

جواہرات کی خریدوفروخت کے بعض احکام

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری•

محور اول:

۱۔ جب بروکر اپنی دلالی کی فیس لے رہا ہے تو بائع اور مشتری کو بتائے بغیر، بیع کی قیمت میں سے کچھ اپنے پاس رکھ لینا، اور قیمت زیادہ لے کر بائع کو کم بتانا شرعاً بالکل جائز نہیں ہے، یہ بائع اور مشتری دونوں کو دھوکہ دینا ہے، ایسا بروکر صرف اپنی دلالی فیس کا حقدار ہے، دھوکہ اور فریب سے مزید کچھ اور رکھنے کا حقدار نہیں، دھوکہ اور فریب کی شرعاً کہاں گنجائش ہوسکتی ہے؟

۲۔ بائع جس قیمت پر تیار ہوا، اگر دلال خود اسی قیمت پر مال خرید لے، اور خریدار جس قیمت پر تیار ہو، اس قیمت پر خریدار کو بیچ دے، تو اس صورت میں دلال کی حیثیت دلال کی نہیں رہی، بلکہ مشتری اول اور بائع ثانی کی ہوگئی، اس صورت میں اسے بائع اول اور مشتری ثانی، کسی سےبھی دلالی کی فیس لینا جائز نہیں، جب وہ دلال نہیں رہا تو دلال کی فیس کیسی؟

دلال تو وہ ہوتا ہے جو خود عاقد نہیں ہوتا، بلکہ متعاقدین کے درمیان معاملہ طے کراتا ہے، جب وہ خود عاقد ہوگیا، جیسا کہ اس صورت میں تو وہ دلالی سے نکل گیا۔

شامی اور درمختار کی ان عبارات سے یہی پتہ چلتا ہے:

‘‘وأما الدلال فإن باع العين بنفسه بإذن ربها فأجرته على البائع وإن سعى بينهما وباع المالک بنفسه يعتبر العرف وتمامه فى شرح الوهبانية (درمختار) وفى شرحه رد المحتار (قوله فأجرته على البائع) وليس له أخذ شئى من المشترى لأنه هو العاقد حقيقة شرح الوهبانية وظاهره أنه لا يعتبر العرف هنا لأنه لا وجه له (قوله يعتبر العرف) فتجب الدلالة على البائع أو المشترى أو عليهما بحسب العرف جامع الفصولين ’’ (درمختارورد المحتار۴،۴۶)۔

(اگر دلال نے مالک کی اجازت سے خود بیچا ہے تو اس کی اجرت بائع (مالک) کے ذمہ ہے، اور اگر دونوں کے درمیان کوشش کرکے معاملہ کردیا ہے اور مالک نے خود بیچا ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا، اس کی پوری بحث شرح الوہبانیہ میں ہے (درمختار)، ماتن کا قول (تو اس کی اجرت مالک کے ذمہ ہے)سے ثابت ہوا کہ اس صورت میں دلال کو مشتری سے کچھ لینے کا حق نہیں، کیونکہ حقیقتاً دلال خود عاقد ہے، شرح الوہبانیہ، اس

• مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام ، نوادہ، مبارکپور۔

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عرف کا اعتبار نہ ہوگا، اس لئے کہ عرف کا اعتبار کرنے کی کوئی وجہ نہیں،ماتن کا قول (تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا) اس سے ثابت ہوا کہ دلال کی دلالی بائع یا مشتری یا دونوں پر، عرف کے اعتبار سے واجب ہوگی جامع الفصولین)۔

فرضی خریدار تیار کرنے کی صورت میں اگر فرضی خریدار اور بائع کے درمیان ایجاب وقبول ہوگیا، اور فرضی خریدار نے حقیقی مشتری کو سامان بیچا اور نفع لیا تو اس کے لئے جائز ہے، لیکن دلالی، خواہ چار فیصد ہو یا کم وزیادہ لینا جائز نہیں، کیونکہ وہ خود عاقد بن گیا، وہ دلال نہیں کہ دلال لے، اور دلال کا اس سامان کو بیچ کر نفع خود رکھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ اس سامان کا مالک نہیں، مالک فرضی خریدار ہے، دس روپے، یا کم وبیش جو بھی نفع ہو، وہ اسے ملے گا نہ کہ دلال کو، البتہ اس صورت میں دلال اپنی دلالی لے سکتا ہے، کیونکہ معاملہ اس کی دوڑ دھوپ سے طے پایا ہے۔

۳۔ جب اس مارکیٹ میں چوری کا مال بھی ملتا ہے اور درست مال بھی، اور متعین طور پر یہ بات معلوم نہ ہو کہ یہی مال چوری کا ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اکثر مال چوری کا فروخت ہوتا ہے، یا اکثر مال درست اور صحیح والا فروخت ہوتا ہے، اگر اکثر مال صحیح اور درست فروخت ہوتا تو اس مارکیٹ سے مال خریدنا جائز ہے، محض شک وشبہ کا اعتبار نہیں، لیکن اگر اکثر مال چوری کا فروخت ہوگا ہو تو وہاں سے مال خریدنا احتیاط کے سراسر خلاف ہے۔

حدیث نبوی ہے:

''دع ما یریبک إلی ما لا یریبک الخ'' (رواہ احمد والترمذی والنسائی، مشکوۃ المصابیح ۲۴۲،۱)۔

(جو شک پیدا کرے اسے چھوڑ دو اور جو شک نہ پیدا کرے اسے لے لو)۔

''ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام الخ'' (متفق علیہ؛ مشکوۃ المصابیح۲۴۱،۱)۔

(جو شبہات والی چیزوں میں پڑا وہ حرام میں پڑگیا)۔

جب معلوم ہوجائے کہ یہ چوری کا مال ہے تو ہرگز نہ خریدا جائے، اس کا حقدار اصل مالک ہے، یہ دوکاندار بھی مالک نہیں، کیونکہ اس نے اصل مالک سے نہیں خریدا، بلکہ ایسے شخص سے خریدا ہے جو مالک نہیں اور مالک کی اجازت بھی نہیں، کیونکہ چوری کا مال ہے، لہذا بیع ہی نہیں ہوئی، اور اس مال کا مالک وہی رہا جو پہلے سے تھا، اگر مالک کا پتہ چل جائے تو مالک کو لوٹایا جائے، ورنہ تفریغ ذمہ کے لئے صدقہ کردیا جائے، جیسا کہ مال حرام کا حکم ہے۔

۴۔ چوری کا شبہ پیدا ہونے کے بعد جب بیچنے والے سے دریافت کرلیا اور اس نے بتایا کہ یہ چوری کا مال نہیں ہے، درست مال ہے تو ایسا مال خریدا جاسکتا ہے، کیونکہ اتنا ہی اس کے بس میں تھا کہ بیچنے والے سے ہی پوچھ لے، مزید اس کے بس میں نہیں،

کیونکہ یہ قاضی یا محتسب نہیں، بہت چھان بین اس کے ذمہ لگا دی جائے تو بیع وشراء ہی مشکل ہوجائے گی۔

اعتماد وبھروسہ پر ہی سارا کام چلتا ہے، جب وہ کہہ رہا ہے کہ چوری کا مال نہیں تو حسن ظن رکھتے ہوئے کہ جھوٹ نہیں بول رہا ہوگا اس کا مال خریدا جاسکتا ہے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

''الیقین لا یزول بالشک'' (الاشباہ والنظائر،۲۷) (یقین شک کی وجہ سے زائل نہیں ہوگا)۔

اور اگر دل مطمئن نہ ہو تو نہ لے، حدیث نبوی ہے: ''دع ما یریبک إلی ما لا یریبک'' (مشکوۃ المصابیح۱،۲۴۲ بحوالہ ترمذی ومسند احمد)۔

۵۔ خریدے ہوئے سامان کو قبضہ میں لینے کے بعد، خواہ اس کی قیمت ادا کی ہو یا نہ کی ہو، کم یا زیادہ میں کسی اور شخص کو بیچ سکتا ہے، زیادہ کا بیچنے کی صورت میں زائد رقم بلا شک وشبہ اس کا نفع ہوا ، اور دوسرے سے حاصل شدہ قیمت سے وہ بائع اول کا پیسہ ادا کرے تو یہ بھی درست ہے۔

البتہ اگر وہ بائع اول کو ہی ثمن اول سے کم میں بیچ دے تو یہ ناجائز ہے۔

ہدایہ جلد ثالث ،۵۷ پر یہ مسئلہ موجود ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت بھی وہاں نقل کی گئی ہے۔

اس ایک شکل کے سوا جتنی شکلیں ہیں، سب جائز ہیں۔

۶۔ جب بائع اول سے خرید کر اور قبضہ کرکے دوسرے کو بیچتا ہے تو بیچنا جائز ہے اور اس کا نفع بھی صحیح ہے، نفع کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

محور دوم:

۱۔ یہ صورت جائز نہیں، یہ ثمن کی بیع ثمن سے ہے تفاضل کے ساتھ، جو کہ ربا ہے، لہذا جائز نہیں(ملاحظہ کریں : امداد الفتاوی۳،۱۶۵)۔

اسے پرچی کی بیع، ثمن سے نہیں کہہ سکتے، پرچی تو ثمن باقی رہنے کا ایک وثیقہ ہے۔

۲۔ اضطرار کی صورت میں سودی قرض حاصل کرکے ثمن ادا کرے، مگر خود سودی قرض لے، کیونکہ اضطرار اسی کو ہے، نہ کہ دوسرے ساتھی سے کہے، البتہ اگر اسے سودی قرض بھی حاصل کرنا مشکل، ناممکن کے درجہ میں ہو تو دوسرے ساتھی سے اس طرح کا قرض حاصل کرسکتا ہے۔

اشباہ میں ہے:

''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر) (محتاج کے لئے نفع پر قرض لینا جائز ہے)۔

۳۔ جب بائع اول سے پانچ سو روپے کیرٹ کے حساب سے مال خریدنے کی بات طے ہوچکی ہو اور ایجاب وقبول ہوچکا ہو، اور مبیع پر قبضہ کرکے، دوسرے کو فروخت کردیا اور اس سے ثمن بھی وصول کرلیا تو اب بائع اول سے جھوٹ بول کر اور دھوکہ دے کر مقررہ ثمن سے کم قبول کرنے پر مجبور کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اور کم کرائی ہوئی رقم مشتری اول کے لئے حلال نہ ہوگی۔

''قال النبیﷺ:ألا لا تظلموا ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفسہ'' (رواہ البیہقی والدارقطنی؛ مشکوۃ المصابیح۱،۲۵۵)۔

(رسول اللہﷺ نے فرمایا: خبردار! ظلم نہ کرو، خبردار، ایک آدمی کا مال دوسرے کے لئے بغیر اس کی خوش دلی کے، حلال نہیں)۔

۴۔ یہ بھی جائز نہیں، کما لا یخفی۔

۵۔ عیب پر مطلع کرکے بیچنا چاہئے، لیکن اگر خریدنے والا جانتا ہے کہ سستا مال اسی طرح ملاوٹ کرکے تیار ہوتا ہے تو بتانے کی ضرورت نہیں، المعروف کالمشروط کے قاعدے سے۔

۶۔ شرعاً کسی چیز کی قیمت مقرر کرنے کی تحدید نہیں، لیکن بہت زیادہ مہنگا بھی نہیں بیچنا چاہئے، زیادہ مہنگا بیچنا مکروہ ہے۔

محور ثالث:

۱۔ ثمن بائع کا حق ہے، وہ بغیر طے کئے ہوئے بھی طے شدہ ثمن میں کمی کرسکتاہے، اور جب طے ہو تو بدرجہ اولی کم کرنا اس پر لازم ہوجاتا ہے۔

ہدایہ میں ہے:

''ویجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع أن یزید من للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحط عن الثمن'' (ہدایہ۳،۷۵)۔

(جائز ہے مشتری کے لئے کہ بائع کے ثمن میں اضافہ کردے اور بائع کے لئے جائز ہے کہ مشتری کی مبیع میں اضافہ کردے اور ثمن میں سے کم کردے)۔

۲۔ اگر کاریگر نے مطلوبہ معیار کے مطابق مال تیار نہیں کیا تو اس کی اجرت کم کی جاسکتی ہے، لیکن اجرت ہی نہ دی جائے اور مال فروخت کردیا جائے، یہ شرعاً جائز نہیں، مارکیٹ میں اگرچہ یہ طریقہ معروف ومروج ہو تو بھی جائز نہیں، یہ رسول اللہﷺ کی اس معروف ومشہور حدیث کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مزدور کی مزدوری، مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدو۔

یہ عرف چونکہ نص کے خلاف ہے، اس لئے غیر معتبر ہے۔

۳۔ جب فریقین کو معلوم ہو تو جائز ہے اور اس تین سو کو تین ہزار ہی مانا جائے گا،

''العبرة لما فی الواقع لا بما کتب خلاف ذلک'' (شامی وغیرہ)۔

۴۔ جب فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے تو یہ بھی جائز ہے، لیکن اصل ثمن، اصل ثمن ہی رہے گا، نہ کہ دس فیصد والا، حوالہ جواب ۳ کے تحت گزر چکا۔

۵۔ جو گھسائی سے زیادہ ذرات بچے ہوئے ہیں وہ کاریگر کو رکھنا جائز نہیں، اور اگر رکھ لینے کی مالک کی طرف سے اجازت ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پتھر، دھاگے کے ریٹ میں فروخت ہونے میں شرعاً کوئی مانع نہیں ہے، محور دوم سوال ۶ کے تحت آپ خود ہی لکھ چکے ہیں کہ قیمتی پتھروں کی تجارت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز ایک روپے میں بھی فروخت کی جاسکتی ہے، اور ایک ہزار روپے میں بھی، اور اس کا جواب لکھا جا چکا ہے کہ شرعاً کسی چیز کی قیمت مقرر کرنے کی تحدید نہیں۔

اگر خریدار زبردستی کررہا ہے تو بیچنے والا اسے نہ بیچے، بیچنے والا کیوں ایسے خریدار کو بیچ رہا ہے جو پتھر کو دھاگے کے ریٹ میں خرید رہا ہے۔

۷۔ زبردستی کم کی پرچی بنانا جائز نہیں، اور مجبوراً راضی ہوجانا رضامندی نہیں، یہ بیع ہی نہیں ہوئی، کیونکہ تراضی طرفین نہیں، ''أما تعریفہ فمبادلۃ المال بالمال بالتراضی کذا فی الکافی'' (الفتاوی الہندیہ۳،۲)۔

لیکن اگر بیچنے والا اسی طرح سوچ لے کہ میرا مال بکاتو، خواہ کم کا سہی، تو یہ رضامندی ہوگئی، اور عام طور پر اس طرح کے معاملات میں یہی ہوتا ہے، خریدار اخلاقی دباؤ ڈالتا ہے، مارتا پیٹتا تھوڑی ہے، اور بیچنے والا بکنے پر خوش ہوجاتا ہے، خواہ دام کم ملنے کی وجہ سے کم خوش ہو، اب جب خریدنے والے نے خرید لیا تو اسے اختیار ہے جس قیمت پر چاہے، فروخت کرے۔

۸۔ دھوکہ مینآکر مجبوری میں بائع کے قبول کرلینے سے خریدار کے لئے باقی ماندہ رقم حلال نہ ہوگی۔

''ألا لا تظلموا ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفسہ'' (رواہ البیہقی والدارقطنی؛ مشکوۃ المصابیح۱،۲۵۵)۔

محور چہارم:

۱۔ بیچ سکتے ہیں، نقد کو سستا اور ادھار کو مہنگا فروخت کرنا جائز ہے۔

ہدایہ میں ہے:

''لأن للأجل شبہاً بالمبیع ألا یری أنہ یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ۳،۷۴)۔

۲۔ ادھارفروخت ہونے والے سامان کی قیمت نقد حاصل کرنے کی صورت میں، اگر بائع قیمت کم کرکے وصول کرے تو شرعاً کوئی حرج نہیں، سوال (۱) کے جواب میں ہدایہ

کی عبارت نقل کی جاچکی ہے۔

ثمن بائع کا حق ہے، وہ چاہے کم کرکے لے، یا چاہے تو بالکل ہی نہ لے۔

ہدایہ میں ہے:

‘‘ویجوز أن یحط عن الثمن’’ (کتاب مذکور،۷۵)۔

۳۔ اس صورت میں مشتری کو خیار عیب حاصل ہوگا، وہ طے شدہ قیمت کو کم نہیں کراسکتا، لیکن چاہے تو اس سامان کو واپس کرسکتا ہے، ہدایہ میں ہے:

‘‘وإذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فهو بالخیار إن شاء أخذه بجمیع الثمن وإن شاء رده’’ (کتاب مذکور،۴۰)۔

(اگر مشتری، مبیع میں کسی عیب پر مطلع ہوجائے تو اسے اختیار ہے کہ اگر چاہے تو پوری قیمت پر لے لے، یا اگر چاہے تو مبیع لوٹا دے)۔

۴۔ اس صورت میں بھی مشتری، بائع جوہری کو وہ ڈائمنڈ لوٹا جاسکتا ہے، یہ بھی خیار عیب کی صورت ہے، حوالہ جواب نمبر ۴ کے تحت گزر چکا ہے۔

۵۔ خرید لینے کے بعد یہ صورت جائز ہے، اور خریدنے سے پہلے صرف دام معلوم کرکے ایسا کرنا دھوکہ ہے، جائز نہیں، لا ضرر ولا ضرار۔

۶۔ اگر ‘ب ’ نے ‘الف ’ سے ڈائمنڈ کو خرید لیا، خواہ کسی بھی قیمت پر خریدا ہو، اس کے بعد مزید قیمت لگا کر کسی کو شریک کرکے فروخت کرنا چاہتا ہے تو شریک کرسکتا ہے، یہ بتانا ضروری نہیں کہ ‘ب ’ نے وہ ڈائمنڈ کتنے کا خریدا ہے۔

لیکن خریدنے سے پہلے اس ڈائمنڈ میں کسی اور کو شریک کرنا درست نہیں، کیونکہ ابھی وہ ڈائمنڈ ‘ب ’ کے ضمان میں ہی نہیں آیا تو وہ شریک کسی چیز میں کررہا ہے۔

جواہرات کی خریدوفروخت سے مربوط بعض مسائل

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی•

اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، سب انسانوں کے نفع رسانی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان سے نفع حاصل کرنے کےلئے اللہ نے انسانوں کو اخاذ ذہن بھی عنایت کیا جو گاہے گاہے کام میں لاکر نئی ایجادات وجدید مصنوعات کا تحفہ پیش کرتا رہتا ہے، ایک ہی چیز کو مختلف شکل دے کر جہاں خورونوش کی متنوع اقسام تیار ہوتی ہیں، لباس وپوشاک، نیز زیورات وزیبائش کی مختلف صورتیں بھی بنائی جاتی ہیں۔

جواہرات اللہ کی بہت سی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے جو دیکھنے میں پتھر ہیں مگر افادہ میں سونے سے کم نہیں، نیز لوگوں کی جانب سے ڈیمانڈ اس وقت قابل دید ہوتا ہے جب ان میں انسانی صنعت وفنی مہارت خوشنما بناکر پیش کرتی ہے، صیقل وصفائی کے ذریعہ رنگ برنگ کی اشیاء زیب وزینت تیار ہوتی ہیں، انسان عش عش کر اٹھتا ہے، چونکہ آج جواہرات کو بیش بہا اثاثہ سمجھا جانے لگا ہے تو لوگوں کی توجہ پہلے کے مقابلہ زیادہ ادھر ہوئی ہے، بہت سے مسلمانوں نے جواہرات کی خریدوفروخت کی تجارت شروع کی ہے اور کچھ زیادہ دل چسپی اس میں پیدا ہورہی ہے، مسلمانوں کے اس کاروبار میں لگنے کی وجہ سے فوراً سوال اٹھتا ہے کہ اس طرح کی بزنس اسلام کے موافق ہے یا نہیں، کہیں حصول دنیا کی آرزو، اور کثرت طلبی کی خواہش ان کو اسلام کے صحیح رخ سے موڑ کر منحرف تو نہیں کررہی ہے، اس لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ ہر نئی امنگ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے، اور بدلتے ہوئے حالات، چڑھتے اترتے ہوئے وقت کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ہر عمل کا اسلامی پیمانہ تیار کیا جائے، جن خامیوں کی وجہ سے شریعت سے دوری پیدا ہوسکتی ہے ان خامیوں کی نشان دہی کرکے راہ عمل صاف وشفاف اور آسان تیار کیا جائے، مندرجہ ذیل سطور میں جواہرات کی خریدوفروخت اور اس سے متعلق مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

محور اول:

(۱) بروکر ودلال اگر اجرت دلال کے علاوہ کچھ قیمت چھپالے:

صورت حال یوں ہوتی ہے کہ خریدار ۷۵ روپے میں خریدنا چاہتا ہے، بیچنے والا

• استاذ حدیث وفقہ جامعہ حسنیہ کایم کلم، کیرلا۔

اس کے لئے تیار نہیں توبروکر کے ذریعہ اس کی خریدوفروخت مکمل کی جاتی ہے، بروکر خریدار کو کہتا ہے کہ میں تم کو ۷۵ روپے میں دلوادونگا، چنانچہ بروکر بائع سے بات کرتا ہے اور اس کو ۶۵روپے میں بیچنے پر راضی کرلیتا ہے، اس طرح وہ خریدار کو لاتا ہے اور خریدار وبائع کے مابین معاملہ ہوجاتا ہے، دس روپے کا جو فرق آتا ہے وہ بروکر رکھ لیتا ہے، اس کو دلالی کی فیس الگ ملتی ہے۔

یہ معاملہ دلالی کا ہے، دلال اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے مابین واسطہ ہو، اصل معاملہ کرنے والا نہ ہو، مبسوط میں ہے:

''السمسار اسم لمن یعمل للغیر بالأجر بیعاً وشراء'' (المبسوط سرخسی۱۵،۱۱۵ باب السمسار) (دلال وہ ہے جو دوسرے کے لئے خرید وفروخت کام اجرت پر کرتا ہے)۔

دلال کی اجرت کا مدار عرف پر ہے، مگر معاملہ کا چھپانا یا جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے۔

''وإن سعی بینہما وباع المالک بنفسہ یعتبر العرف فتجب الدلالۃ علی البائع أو المشتری أو علیہا بحسب العرف'' (الدر مع الرد۴،۴۶ کتاب البیوع، مطلب: فساد المتضمن یوجب فساد الخ)۔

(اگر دو شخصوں کے مابین سعی کرے، لیکن بیع خود مالک کرے تو عرف کا اعتبار ہوگا اور بائع یا مشتری یا دونوں کے لئے عرف کے مطابق دلالی کا حکم ثابت ہوگا)۔

دلالی جائز ہے، باقی فریب اور جھوٹ تو کسی چیز میں بھی جائز نہیں، اور کسی عیب دار چیز کو یہ کہہ کر فروخت کرنا بھی جائز نہیں کہ اس میں کوئی عیب نہیں '' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶،۲۸۳)۔

فتاوی دار العلوم قدیم میں ہے: ''دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے، بشرطیکہ ظاہر کرکے رضا سے لیا جائے، اور جو خفیہ طرفین سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہے '' (فتاوی رحیمیہ ۹،۲۹۹ کتاب الاجار، دلال کی اجرت)۔

لہذا بروکر نے جو دس روپیہ بغیر بتائے اور طے کئے لیا ہے وہ اس کے لئے جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے پاس وہ مال خبیث ہے جس کو مالک یعنی خریدار تک پہنچانا ضروری ہے، اگر خریدار تک پہنچانا دشوار تر ہو تو پھر صدقہ کردے، کیوں کہ مال خبیث کا یہی حکم ہے۔

(۲) اگر بروکر خرید کر پھر خریدار سے زیادہ قیمت میں بیع کردے:

اگر صورت یہ ہو کہ بروکر نے جواہرات کے تاجر سے ایک قیمت میں خرید لیا، خواہ اپنے لئے خریدا ہو یا دوسرے کے لئے مثلاً تاجر سے ۶۵ روپے میں خریدا اور خریدار کو ۷۵ روپے میں بیع کردیا تو اب بروکر کی حیثیت خریدار کی ہوگئی، لہذا تاجر سے کمیشن وصول نہیں کرسکتا، لیکن اس کو حق ہے کہ نفع کے ساتھ کسی اور کو بیچ دے، اس کےلئے دس روپے کا نفع صحیح ہوجائے گا۔

''أما الدلال فإن باع العین بنفسہ بإذن ربہا فأجرتہ علی البائع ولیس لہ أخذ شئی من

المشتری لأنہ ہو العاقد حقیقۃ..... وظاہرہ أنہ لا یعتبر العرف ہنا؛ لأنہ لا وجہ لہ، وإن سعی بینہما وباع المالک بنفسہ یعتبرالعرف فتجب الدلالۃ علی البائع أو المشتری أو علیہما بحسب العرف" (الدر مع الرد۴/۴۶ کتاب البیوع، مطلب: فساد المتضمن یوجب فساد الخ) (بہرحال دلال نے اگر خود ہی سامان والے کی اجازت سے فروخت کیا تو اس کی اجرت بائع پر ہوگی مشتری سے کچھ نہیں لے سکتا، اس لئے کہ حقیقت میں عقد کرنے والا وہی ہے ..... ظاہر یہ ہے کہ یہاں عرف کا اعتبار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی کچھ وجہ نہیں ہے، اگر ان دونوں کے مابین بھاگ دوڑ کی اور فروخت بائع نے کی تو عرف کا اعتبار ہوگا اور عرف کے مطابق بائع یا مشتری یا دونوں سے اجرت دلالی وصول کرسکتا ہے)۔

چونکہ بیع وشراء میں عاقد حقیقت میں وہ ہوتا ہے جو ایجاب وقبول کرتا ہے، اس لئے اگر بروکر کسی فرضی خریدار کو لاتا ہے اور اسی کو خریدار ظاہر کرتا ہے، نیز فرضی خریدار ہی سودا کرتا ہے تو ''عاقد '' اسی فرضی شخص کو سمجھا جائے گا، بروکر کی حیثیت دلال وایجنٹ کی ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ اس صورت میں تاجر کو دھوکہ دیا جارہا ہے، اللہ کے رسول نے جن بیوع سے منع فرمایا ہے ان بیوع میں یا تو دھوکہ وغرر پایا جاتا ہے یا ضررو نقصان، یہ دونوں ہی امر قابل ترک ہیں، انہی بیوع ممنوعہ میں سے تلقی جلب، بیع الحاضرللبادی اور تناجش وغیرہ ہیں، اللہ کے نبی کا ارشاد ہے:

''لا یبتاع المرء علی بیع أخیہ ولا تناجشوا ولا یبیع حاضر لباد" (بخاری۱/۲۸۹ کتاب البیوع، باب لا یشتری حاضر لباد بالسمسرۃ)۔

(بیع پر بیع نہ کرے، نہ بڑھا چڑھا کر قیمت بتائے، اور نہ شہری دیہاتی کے لئے بیع کرے)۔

اس حدیث میں بیع حاضر کی مراد میں اختلاف ہے، ایک تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد ایسا شہری ہے جو ایجنٹ بن کر دوسرے کےلئے کام کرتا ہو، حضرت طاؤس فرماتے ہیں:

''سألت ابن عباس ما معنی قولہ: لا یبیعن حاضر لباد فقال: لا یکن لہ سمساراً" (بخاری۱/۲۸۹ کتاب البیوع، باب النہی عن تلقی الرکبان)۔

(میں نے حضرت ابن عباس سے ''لا یبیعن حاضر لباد" کا معنی دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اس کا ایجنٹ ودلال نہ ہو)۔

''وکرہ النجش إذا کانت السلعۃ بلغت قیمتہا، أما إذا لم تبلغ لا یکرہ لانتفاء الخداع .....و تلقی الجلب إذا کان یضر بأہل البلد أو یلبس السعر علی الواردین لعدم علمہم بہ فیکرہ للضرر والغرر، أما إذا انتفیا فلا یکرہ، وکرہ بیع الحاضر للبادی وہذا فی حالۃ قحط وعوز وإلا لا لانعدام الضرر" (درمختار۴/۱۴۸ کتاب البیوع، ما یکرہ البیع، ط: رشیدیہ، پاکستان)۔

(قیمت بڑھا کر (نجش، نہ لینے کے ارادے سے) بولنا مکروہ ہے جبکہ سامان کی

قیمت زیادہ ہوجائے، اگر زیادہ نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے دھوکہ کے نہ ہونے کی وجہ سے، تجارتی قافلہ سے آگے بڑھ کر سامان خریدنا مکروہ ہے، جبکہ اہل بلد کو ضرر ہو، یا قیمت آنے والے کو غلط بتائے، کیوں کہ آنے والے کو اس کا علم نہیں ہے، پس ضرر وغرر کی وجہ سے مکروہ ہے، اگر یہ دونوں (غرر وضرر) نہ ہوں تو مکروہ نہیں ہے، نیز حاضر کا دیہاتی کے لئے بیع کرنا (مکروہ ہے) جبکہ حالت قحط وفقر ہو، ورنہ نہیں ضرر کے نہ ہونے کی وجہ سے)۔

مذکورہ صورت میں بھی ایک فرضی گاہک کو لاکر تاجر کو دھوکہ دیا جارہا ہے، اس طرح یہ گناہ کا سبب تو ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے بائع ومشتری کی حیثیت میں فرق نہیں پڑے گا، اگر واقعتاً تاجر دھوکہ کھا ہی گیا تو بھی صحیح قول کے مطابق جمہور ائمہ کے نزدیک بیع صحیح ہوجاتی ہے۔

''وکرہ تحریماً مع الصحۃ عند الآذان الأول .....'' (درمختار۴،۱۴۷ کتاب البیوع)۔

(بیع صحیح ہونے کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے)۔

''ثم إن البیع وإن کا ن منہیاً عنہ ولکنہ نافذ مع الإثم عند الحنفیۃ والشافعیۃ والمالکیۃ فی قولہم المختار وبہ قال أحمد فی روایۃ'' (فقہ البیوع۲،۹۹۴، المبحث التاسع)۔

(بیع اگرچہ کہ ممنوع ہے مگر گناہ کے ساتھ نافذ ہے حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک قول مختار میں، یہی ایک روایت امام احمد کی ہے)۔

''أنہ قال: لا یبیع حاضر لباد دعوا الناس یرزق اللہ بعضہم من بعض ولو باع جاز البیع لأن النہی فی غیر البیع وہو الإضرار بأہل المصر فلا یوجب فساد البیع کالبیع وقت النداء'' (بدائع۴،۴۸۰، ط: زکریا)۔

(حاضر بادی کے لئے بیع نہ کرے، لوگوں کو چھوڑ دو اللہ بعض کو بعض کے ذریعہ رزق دیتا ہے، اگر بیع کردی تو جائز ہے، اس لئے کہ ممانعت اس وجہ سے ہے جو غیر بیع میں ہے اور وہ اہل بلد کو ضرر پہنچانا ہے، پس بیع کا سبب نہیں ہوگا جیسے اذان کے وقت بیع)۔

(۳) چوری کے مال کی خریداری:

کاریگر حضرات جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لیتے ہیں اور مالک کی اجازت کے بغیر بازار میں بیچ دیتے ہیں، چونکہ چور بازار میں سارا سامان چوری کا نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ امتیاز کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کہ کون سا مال چوری کا ہے اور کون سا چوری کا نہیں ہے، اگر وہ مال ممتاز ہوتا تو اس کی خریداری جائز نہ ہوتی۔

''الحرمۃ تتعدد مع العلم بہا إلا فی حق الوارث'' (درمختار۴،۱۴۶، کتاب البیوع، البیع الفاسد، مطلب: الحرمۃ تتعدد) (حرمت ۔اگر علم ہے ۔ تو تعدی کرجاتی ہے، مگر وارث کے حق میں)۔

‘‘فلو دخل بأمان وأخذ مال حربی بلا رضاہ وأخرجہ إلینا ملکہ صح بیعہ لکن لا یطیب لہ ولا للمشتری منہ’’ (درمختار۴،۱۴۵ کتاب البیوع، البیع الفاسد، مطلب: لا یطیب لہ الخ)۔

(اگر کوئی شخص امان لے کر دار الحرب گیا وہاں اس نے حربی کا مال بغیر اس کی رضا کے لئے لیا اور اپنے ملک میں آگیا تو اس کا مالک ہوجائے گا اور اس کی بیع صحیح ہوگی، لیکن یہ مال اس کے لئے طیب نہیں ہے اور نہ اس سے خریدنے والے کےلئے ہے)۔

یہاں ملکیت غلبہ واحراز کی وجہ سے آئی ہے، اگر ملکیت بائع کو نہیں ہوتی تو مشتری کے لئے خریدنا بھی جائز نہ ہوتا، فتاوی محمودیہ میں ہے:

‘‘اگر وہ مال کسی کے پاس خالص حرام طریقے سے آیا ہوا ہو اس کا خریدنا جائز نہیں، کیوں کہ اس کا اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے’’ (فتاوی محمودیہ بترتیب جدید ۱۸،۳۷۱)۔

لیکن چوری کا مال ممیز ومشخص نہ ہو تو اس مارکیٹ سے خریدنا بہتر نہیں ہے، لیکن خرید لینے پر بیع کے احکام جاری ہونگے۔

‘‘وإن کان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا یعلم أربابہ ولا شیئاً منہ بعینہ حل لہ حکماً والأحسن دیانۃ التنزہ عنہ’’ (رد المحتار۴،۱۴۶ کتاب البیوع، البیع الفاسد)۔

(اگر مال مخلوط اور حرام کے ساتھ جمع ہوکر اس کا مالک معلوم نہ ہو اور نہ متعین طور پر معلوم ہوتو قضاء حلال ہے، دیانتاً بہتر یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرے)۔

مگر کوئی ایسا چور مارکیٹ ہے جہاں زیادہ تر مال چوری کا بکتا ہے تو وہاں خریدنے کی صورت میں بہت قوی امکان ہوگا کہ اس نے چوری کا مال ہی خریدا ہے، اس لئے ایسے مارکیٹ سے بھی احتراز لازم ہے۔

(۴) خریدار نے بتایا کہ چوری کا نہیں ہے:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو شبہ ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ چوری کا مال ہو اس لئے تاجر سے پوچھ لیتا ہے، تاجر کہتا ہے: چوری کا نہیں ہے تو کیا اس کی بات پر اعتماد کرکے خریدنا جائز ہوگا، اگر تاجر چوری کی نفی کردیتا ہے تو اصولاً اس کے قول پر اعتماد کرکے خریدنے میں حرج معلوم نہیں ہوتا ہے۔

‘‘إذا کان غالب مال المہدی حلالاً فلا بأس بقبول ہدیتہ وأکل مالہ ما لم یتبین أنہ حرام، وإن کان غالب مالہ الحرام لا یقبلہا ولا یأکل إلا إذا قال: إنہ حلال ورثہ أو استقرضہ’’ (الاشباہ لابن نجیم۱،۳۰۹، الفن الاول، القاعدۃ الثانیہ: إذا اجتمع الحلال والحرام)۔

(ہدیہ کنندہ کا اکثر مال حلال ہو تو اس کے ہدیہ کو قبول کرنے میں حرج نہیں ہے اور نہ اس کو کھانے میں حرج ہے جب تک ظاہر نہ ہوجائے کہ یہ حرام ہے، اور اگر اکثر مال حرام ہو تو اس کو قبول نہ کرے اور نہ کھائے، الا یہ کہ ہدیہ دینے والا کہے: یہ حلال

ہے وراثت میں ملا ہے یا قرض لیا ہے)۔

(۵) سامان پر قبضہ کرنے کے بعد پیسے ادا کرنے سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا:

ایجاب وقبول سے ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور جب قبضہ ہوجاتا ہے تو ضمان ورسک بھی منتقل ہوجاتا ہے، اب اس میں خریدار جس قسم کا تصرف کرنا چاہتا ہے کرسکتا ہے، دوسرے سے بیچنا، ہدیہ دینا، صدقہ کرنا، آزاد کرنا یہ سب اس کے جائز تصرفات ہیں، لہذا قیمت ادا کئے بغیر بھی یہ سب تصرفات کا مالک ہوجاتا ہے، لہذا سامان پر قبضہ کرنے کے بعد قیمت کی ادائیگی سے قبل اس مبیع کو فروخت کردیتا ہے، پھر اسی پیسے سے قیمت ادا کردیتا ہے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، حدیث میں آیا ہے:

''من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یستوفیہ'' (بخاری۱/۲۸۶ کتاب البیوع، باب بیع الطعام قبل أن یقبض الخ)۔

(جو کوئی طعام خریدے وہ اس کو اس وقت تک نہ بیچے جب تک قبضہ نہ ہوجائے)۔

طعام کی تفسیر حنفیہ کے نزدیک منقول اشیاء سے کی جاتی ہے (فتح القدیر۶/۱۳۷ کتاب البیوع)، پس قبضہ کرنے کے بعد بیچنے میں حرج نہیں ہے۔

(۶) سامان پر قبضہ کرنے سے پہلے گاہک کی تلاش ومعاملۂ بیع:

خریدوفروخت میں شفافیت اس وقت آتی ہے جبکہ شریعت کے اصول کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے، جب تک اشیاء پر قبضہ نہیں ہوتا اس وقت تک مشتری کے ضمان میں مبیع داخل نہیں ہوتی ہے جو چیز ضمان میں نہ ہو اس سے نفع اٹھانا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ربح ما لم یضمن اور بیع ما لیس عندک سے متعدد حدیثوں میں منع فرمایا ہے، اس لئے جو چیز قبضے میں نہ ہوا ور وہ از قبیل منقولات ہو تو اس کی بیع کرنا جائز نہیں ہے، اگر قبل القبض بیع یعنی ایجاب وقبول کا تحقق ہوگیا تو وہ بیع فاسد کہلاتی ہے۔

''کل ما أورث خللاً فی رکن البیع ہو الإیجاب والقبول بأن کان من مجنون أو صبی لا یعقل؛ أو فی محلہ أعنی المبیع، فإن الخلل فیہ مبطل بأن کان المبیع میتۃ أو دماً أو حراً أو خمراً وما أورثہ فی غیرہ أی: غیر الرکن، وکذا فی غیر المحل ..... فیکون البیع بہذہ الصفۃ فاسداً لا باطلاً لسلامۃ رکنہ ومحلہ عن الخلل'' (الدر مع الرد۴/۱۱۲ باب البیع الفاسد، ط: رشیدیہ)۔

(جو رکن بیع یعنی ایجاب وقبول میں خلل پیدا کرے بایں طور پر مجنون یا غیر ممیز بچہ کی طرف سے ہو، یا محل بیع یعنی مبیع میں خلل پیدا کردے تو باطل کرنے والا ہے بایں طور پر مبیع مردار یا خون یا آزاد یا خمر ہو۔

اور جو اس کے علاوہ یعنی رکن ومحل کے علاوہ میں خلل پیدا کرے تو بیع فاسد ہوگی نہ کہ باطل، اس لئے کہ رکن بیع اور محل بیع خلل سے محفوظ ہے)۔

بیع قبل القبض میں فاسد کی تعریف صادق آتی ہے، کیونکہ ایجاب وقبول اہل سے

صادر ہورہے ہیں اور محل بیع یعنی مبیع مال ہے، لہذا باطل نہیں ہوگی، علامہ شامی نے اس کی تصریح بھی کی ہے:

''وفسد بیع المنقول قبل قبضہ ونفی الصحۃ الواقع فی المتن یحتملہا، أی یحتمل البطلان والفساد، والظاہر الثانی؛ لأن علۃ الفساد الغرر مع وجود رکنی البیع'' (الرد مع الدر۴،۱۸۲ کتاب البیوع، مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض)۔

(منقول کی بیع قبضہ کرنے سے پہلے فاسد ہے، متن میں جو صحت کی نفی ہے بطلان وفساد دونوں کا احتمال رکھتی ہے، ظاہر فساد ہے؛ اس لئے کہ علت فساد غرر ہے، بیع کے دونوں رکن تو موجود ہیں)۔

اگر پہلے شخص سے خریدوفروخت کا معاملہ مکمل ہوچکا تھا تو یہ بیع قبل القبض ہے جو کہ فاسد ہے اگر شخص اول سے ابھی معاملہ طے نہیں ہوا تھا تو بیع ما لیس عندک ہے جس کی ممانعت حدیث میں موجود ہے، اس مینغرر یعنی تملیک المال علی خطر بھی ہے جس کی ممانعت مستقل طور پر حدیث میں موجود ہے، اس لئے اس طرح کاروبار کی انجام دہی جائز نہیں ہے، ہاں دوسرے شخص سے صرف آرڈر لیا ہو باقاعدہ ایجاب وقبول کرکے معاملہ طے نہیں کیا ہو تو اس میں گنجائش ہوگی، کیوں کہ آرڈر ایک وعدہ ہوتا ہے، وعدۂ بیع کا وہ حکم نہیں ہوتا جو بیع کا ہوتا ہے۔

محوردوم:

(۱) بائع کی پرچی کا خریدنا:

بیع جب ادھار ہوتی ہے تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خریدار بائع کو ایک پرچی دے دیتا ہے جس پر واجب الاداء رقم درج ہوتی ہے، اس میں وہ مدت بھی لکھی ہوتی ہے جس میں رقم کی ادائیگی ہونی ہے، دلال ایسا بھی کرتا ہے کہ پرچی پر درج رقم سے کم دے کر اس پرچی کو خرید لیتا ہے اور جب ادائیگی کا وقت آتا ہے تو دلال خریدار سے پرچی دکھا کر پوری رقم لے لیتا ہے، اس میں بائع کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فوراً ایک مشت رقم مل جاتی ہے اور دلال کو کچھ رقم کا نفع ہاتھ آتا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ پرچی کی بیع نہیں؛ بلکہ رقم کی بیع ہے جو کہ تفاضل کے ساتھ ہورہی ہے، روپیے وپیسے بیع وشراء میں ثمن عرفی کا درجہ رکھتے ہیں، ان میں کمی بیشی کرنا عین ربا ہے، دلال کا اس طرح کرنا جائز نہیں ہوگا، دلال اپنی اجرت متعین کرکے بائع سے یا مشتری سے یا دونوں سے لے لے یہ الگ بات ہےمگر پرچی پر لکھی ہوئی مکمل رقم بائع کی ہے، اس میں خرد برد جائز نہیں ہے۔

(۲) ثمن کی ادائیگی کے لئے سودی قرض لینا:

ضرورت کے وقت سودی قرض لینے کی اجازت ہے:''یجوز للمحتاج الاستقراض

بالربح" (الاشباہ لابن نجیم ۲۶۷،۱، الفن الاول، الضرر یزال)۔

مگر مقروض ومدیون ضرورت مند ومحتاج کے زمرے میں ہوگا یا نہیں؟ یہ محل نظر ہے، دائن وصاحب حق کے لئے مطالبہ کرنے نیز سختی برتنے کا سلسلہ تو قدیم ہے، رسول اللہ ﷺ پر بھی ایک اونٹ واجب الاداء تھا، صاحب حق نے جو مطالبہ کیا تھا اس کو ان الفاظ میں راوی نے بیان کیا ہے:

"إن رجلاً تقاضی رسول اللہ ﷺ فأغلظ لہ فہمّ بہ أصحابہ، فقال: دعوہ فإن لصاحب الحق مقالاً واشتروا لہ بعیراً فأعطوہ إیاہ، قالوا: لا نجد إلا أفضل من سنہ، قال: اشتروہ فأعطوہ إیاہ فإن خیرکم أحسنکم قضاء" (بخاری۳۲۱،۱ کتاب فی الاستقراض واداء الدیون، باب: استقراض الابل)۔

(ایک شخص نے حضورؐ سے سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، صحابہ نے جھڑکنا چاہا تھا، اللہ کے رسول نے فرمایا: چھوڑ دو، اس لئے کہ صاحب حق کو گفتگو کرنے کا حق ہے، اس کے لئے ایک اونٹ خریدو اور دیدو، صحابہ نے کہا: اس عمر کا اونٹ نہیں مل رہا ہے، اس سے بڑی عمر کا مل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی کو خرید کردے دو، اس لئے کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو حسن قضاء کی صفت کے ساتھ متصف ہو)۔

اس لئے ناچیز سمجھتا ہے کہ مقروض کی اگر بے عزتی اس سے ہورہی ہے تو وہ اس درجہ کی نہیں ہے کہ سود جیسی لعنتی شئی کا ارتکاب کیا جائے، اور اس کو شرعی حاجت وضرورت قرار دے کر جائز کردیا جائے۔

(۳) ثمن طے کرنے کے بعد اس کی کچھ مقدار کم کروانا:

رائج صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ بیع ادھار ہوتی ہے، اس کی قیمت مثلاً پانچ سو روپے طے ہوئی ہے، وہ پانچ سو روپے میں کسی اور خریدار کو بیچ دیتا ہے، اس کے بعد خریدار اول بیچنے والے سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی قیمت وہ نہیں تھی، اس لئے چار سو روپے کے حساب سے لینے پر آمادہ کرتا ہے، اس معاملہ میں کذب بیانی پائی جاتی ہے، جب مال پانچ سو روپے میں بک گیا تو کم قیمت کا کیوں کر ہوا، ایسا کرکے اس سے سو روپے کم کروانا جائز نہیں، کسی بھی چیز کے حلال ہونے کے لئے جہاں اس شئی کا فی نفسہ حلال ہونا ضروری ہے، طریقۂ حصول بھی جائز ہونا لا بدی ہے، ورنہ وہ مال اس کے لئے خبیث بن جاتا ہے۔

اگر وہ کذب بیانی سے کام نہ لے اور ویسے ہی اصرار کرکے قیمت کم کروالے نیز بائع بطیب خاطر کم بھی کردے تو چوں کہ بائع کو حق ہے جتنی قیمت معاف کرنا چاہے کرسکتا ہے، اس لئے اس کی طرف سے یہ معانی متصور ہوگی اور وہ مال اس کے لئے جائز ہوجائے گا۔

''إن البائع والمشترى بالحط والزيادة غيرا العقد بتراضيهما من وصف مشروع إلى وصف مشروع، لأن البيع المشروع إما خاسر أو رابح أو عدل، والزيادة فى الثمن تجعل الخاسر عدلاً، والعدل رابحاً، والحط يجعل الرابح عدلاً والعدل خاسراً، وكذلک الزيادة فى المبيع'' (الموسوعة الفقهيہ۱۵،۴۲)۔

(بائع ومشترى نے کمی وزیادتی کرکے عقد کو اپنی رضا سے ایک وصف مشروع سے دوسرے وصف مشروع کی جانب پھیر دیا، اس لئے کہ بیع مشروع یا تو گھاٹے کے ساتھ ہوتی ہے یا نفع کے ساتھ یا برابر سرابر، ثمن کی زیادتی سے گھاٹے والی بیع مساوی، اور مساوی نفع والی بن جاتی ہے اور کمی سے نفع والی مساوی اور مساوی گھاٹے والی بن جاتی ہے، اسی طرح مبیع میں زیادتی کا معاملہ ہے)۔

(۴) خریدتے وقت عیب نکالنا اور بیچتے وقت خوب تعریف کرنا:

تاجروں کی ایک بری عادت یہ ہے کہ جب سامان خریدتے ہیں تو سامان کی اہمیت کو گھٹا دیتے ہیں، تاکہ اس کی قیمت کم دینا پڑے، لیکن جب اسی سامان کو بیچتے ہیں تو اس کی تعریف اتنی کرتے ہیں کہ خریدار متاثر ہوکر زیادہ پیسے دینے پر راضی ہوجاتا ہے، تاجروں کے یہ دونوں طرز عمل اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتے ہیں، حدیثوں میں ان دونوں عمل کی قباحت پر متنبہ کیا گیا ہے:

''عن عبد الله بن أبى أوفى أن رجلاً أقام سلعة وهو فى السوق فحلف بالله: لقد أعطى بها ما لم يعط ليوقع فيها رجلاً من المسلمين فنزلت: إن الذين يشترون بعهد الله وأيمانهم ثمناً قليلاً'' (بخارى۱،۲۸۰ كتاب البيوع، باب: ما يكره من الحلف فى البيع)۔

(ایک شخص مارکیٹ میں دکان لگاتا ہے، پس اللہ کی قسم کھا کرکہتا ہے: مجھ کو اس کی قیمت اتنی دی گئی حالانکہ اتنی قیمت نہیں دی گئی، تاکہ کسی مسلمان کو خریدنے پر مجبور کردے تو یہ آیت نازل ہوئی، ''إن الذين يشترون الخ'')۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الحلف منفقة للسلعة ممحقة للبركة'' (بخارى ۱،۲۸۰ كتاب البيوع، باب: يمحق الله الربا الخ)۔

(قسم کھانا سامانِ تجارت کو بیچوانے کا ذریعہ ہے، مگر برکت کو ختم کرنے کا سبب ہے)۔

کتمان عیب سے متعلق ارشاد نبوی ہے:

''فإن صدقا وبينا بورک لهما فى بيعهما وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما'' (بخارى۱،۲۷۹ كتاب البيوع، باب: يمحق الكذب والكتمان فى البيع)۔

(اگر دونوں سچ بولینگے اور عیوب بیان کردینگے تو دونوں کی بیع وشراء میں برکت ہوگی، اگر کتمان عیب کرینگے اور جھوٹ بولینگے تو برکت ختم ہوجائے گی)۔

ان حدیثوں سے ہمیں ہدایت ملتی ہے کہ فانی قلیل دنیا کو حاصل کرنے کے لئے

آخرت کی باقی وپائیدار کثیر نعمت کو گنوانا نہیں چاہئے، جو ہمارے تاجروں کا طرز عمل ہے وہ قابل ترک ہے، ورنہ مال کی کثرت ممکن ہے ہوجائے مگر برکت سے محرومی رہے گی۔

(۵) ملاوٹ والے مال کی خریدوفروخت:

بعض حضرات کو سستا مال مطلوب ہوتا ہے کوالیٹی سے بحث نہیں ہوتی ہے، جبکہ بعض حضرات اچھا مال چاہتے ہیں مہنگا ہو یا سستا، کبھی مال کی اچھائی وخرابی قیمت سے بھی عیاں ہوتی ہے، لہذا جو لوگ سستا مال چاہتےخواہ اس زیور کی بناوٹ میں جواہرات کے ساتھ شیشہ کی مقدار زیادہ شامل ہوجائے، اگر خریدار راضی ہے تو ہرچند کہ عیب ہے مگر درست ہے، لیکن ایک شخص صرف خریدتا ہے سستا وغیرہ کا کچھ تذکرہ نہیں کرتا ہے تو اب تاجر کو چاہئے کہ جس طرح ہوسکے اس کے اندر پائے جانے والے عیب سے مطلع کردے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''المسلم أخو المسلم، ولا یحل لمسلم إن باع من أخیہ بیعاً فیہ عیب أن لا یبینہ لہ'' (مستدرک حاکم علی شرط الشیخین۲،۱۰ کتاب البیوع)۔

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے اگر اس سے ایسی چیز بیع کرے جس میں عیب ہو اور اس کو بیان نہ کرے)۔

اس لئے بغیر عیب بیان کئے ہوئے اس کو فروخت کرنا اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

عیب کے بیان میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے، ناچیز کی رائے ہے کہ قیمتوں کا واقعی فرق بھی عیب کو بیان کرنے کے لئے کافی ہوگا، اگر دونوں قسم کے زیورات ہوں، دونوں کی قیمتوں کا فرق واضح کردیا جائے تو عیب کا بیان ہوسکتا ہے، مگر ایک ہی نوع کا زیور تیار کیاگیا ہو اور صرف اسی کی قیمت بیان کی جائے گی تو عیب کا بیان نہیں ہوپائے گا، پھر تو زبانی تصریح کی حاجت ہوگی۔

(۶) قیمتی پتھروں کی خریدوفروخت کے لئے نرخ کی تعیین:

اصل یہ ہے کہ حاکم وحکومت لوگوں کے معاملات میں دخیل نہ ہوں، بلکہ ان کو چھوڑ دیا جائے اپنے طور پر معاملات کو حل کریں، لیکن جب تجار حد سے تجاوز کرنے لگیں جس سے لوگوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوجائے تو حکومت قیمتیں فکس بھی کرسکتی ہیں:

''لا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس بقولہ علیہ السلام: لا تسعروا فإن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرزاق، فإن کانت أرباب الطعام یتحکمون ویتعدون عن القیمۃ تعدیاً فاحشاً وعجز القاضی عن صیانۃ حقوق المسلمین إلا بالتسعیر فحینئذ لا بأس بمشورۃ من أہل الرأی والبصیرۃ'' (ہدایہ مع تکملۃ فتح الملہم ۴،۸۹۲ کتاب الکراہیہ)۔

(حاکم کے لئے مناسب نہیں ہے کہ لوگوں پر قیمتوں کو متعین کرے، اللہ کے رسول نے فرمایا: تم لوگ قیمتیں مت متعین کرو، اللہ قیمت متعین کرنے والا ہے، کم کرنے والا اور زیادہ کرنے والا، رزق دینے والا، پس اگر ارباب طعام قیمت سے بہت زیادہ تعدی وتحکم کریں، نیز قاضی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بغیر قیمت متعین کئے ہوئے نہیں کرسکتا ہے تو اس وقت اہل رائے کے مشورہ سے قیمتیں فکس کر سکتا ہے)۔

''إن لولی الأمر أن یکرہ الناس علی بیع ما عندہم بقیمۃ المثل عند ضرورۃ الناس'' (الحسبۃ فی الاسلام،۱۷)۔

(حاکم کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو ان کے پاس جو مال موجود ہے اس کو قیمت مثل پر بیع کرنے پر مجبور کرے جب کہ لوگوں کو ضرورت ہو)۔

اس لئے جواہرات کے تجار اگر قیمتوں کی تعیین میں من مانی کرتے ہیں جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے یا ناسمجھ لوگ خریدنے کے لئے آتے ہیں اور وہ اپنی ناتجربہ کاری میں دھوکہ کھا جاتے ہیں تو حکومت قیمت فکس کرسکتی ہے، اس میں حرج نہیں ہے۔

محور سوم:

(۱) بائع کی طرف سے ڈسکاؤنٹ:

بائع کی طرف سے ڈسکاؤنٹ یعنی قیمت کو کم کرنے کا آفر ہوتا ہے، یہ خالص بائع کا حق ہے وہ چاہے تو کم کرسکتا ہے اور چاہے تو نہیں کرسکتا، حقیقت میں اس قسم کی بیع شرعاً درست نہیں ہونی چاہئے، کیوں کہ قیمت مجہول ہو جاتی ہےاور قیمت کی جہالت بھی بیع میں موثر ہوا کرتی ہے، لیکن بیع وشراء میں تعامل کا چوں کہ بہت دخل ہوتا ہے، بہت سے معاملات وشروط محض تعامل کی بنا پر جائز ہوجاتے ہیں، جیسا کہ فری سروس وغیرہ کی شرط، محض تعامل کی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، ورنہ تو یہ مقتضائے عقد کے خلاف ایسی شرط ہے جس میں مشتری کا فائدہ ہے، لہذا بیع فاسد ہونی چاہئے۔

اسی طرح ڈسکاؤنٹ کی بات اگر صلب عقد میں ہو تو حرج نہیں، اس لئے کہ بائع اپنے حق کو معاف کررہا ہے، اگر وقت مقرر پر قیمت ادا نہیں کی گئی تو بھی یہ حق ہوگا یا نہیں۔

(الف) اگر بائع نے بات واضح کردی تھی کہ وقت کے گزرنے پر ڈسکاؤنٹ نہیں ہوگا تو شرط کے مطابق ڈسکاؤنٹ کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(ب) اگر تعامل تھا اور بائع نے اس کی وضاحت نہیں کی تھی تو تعامل وعرف کو قاضی مان کر اس کے مطابق ڈسکاؤنٹ کا مطالبہ خریدار کرسکتا ہے۔

(ج) اگر عقد کے وقت کچھ بات نہیں ہوئی اور نہ تعامل ہی تھا تو اب ڈسکاؤنٹ کرنے کا قضیہ بھی پیش نہیں آئے گا۔

(٢) ریجکٹ مال لے لینا اور کاریگر کو قیمت نہ دینا:

کاریگر فقہی اصطلاح میں اجیر عام ہوا کرتا ہے، اجیر عام اگر مستاجر کی شرائط کے خلاف کرتا ہے تو ضامن ہوا کرتا ہے، خواہ یہ خلاف ورزی جنس میں ہو یا قدر میں یا وصف میں، اگر جنس میں خلاف کیا ہے مثلاً کپڑا دیا کہ اس کو فلاں رنگ میں رنگ دو، اس نے رنگ بدل دیا، اب رنگ بدلنے سے یا تو اس کی قیمت بڑھے گی یا گھٹے گی، دونوں ہی صورتوں میں مستاجر کو حق ہے کہ اجیر کو کپڑے کا ضامن بنا دے، نیز یہ بھی حق ہے کہ وہی کپڑا لے لے پھر اگر قیمت میں اضافہ ہوا ہے تو اضافہ کے بقدر دے دے، اگر نقصان ہوا ہے تو نقصان کے بقدر وصول کرلے۔

''فالخلاف إن كان فی الجنس بأن دفع ثوباً إلى صباغ ليصبغه لوناً فصبغه لوناً آخر فصاحب الثوب بالخيار إن شاء ضمنه قيمة ثوب أبيض وسلم الثوب للأجير؛ وإن شاء أخذ الثوب وأعطاه ما زاد الصبغ فيه إن كان الصبغ مما يزيد ..... وإن كان الصبغ مما لا يزيد ..... فاختار أخذ الثوب لا يعطيه شيئاً بل يضمنه نقصان الثوب فی قول أبی حنيفة'' (بدائع۸۱،۴ کتاب الاجارہ، باب استیجار الصناع)۔

(پس خلاف اگر جنس میں ہوا بایں طور کہ رنگریز کو ایک کپڑا دیا، تاکہ ایک رنگ میں رنگ دے، اس نے دوسرے رنگ میں رنگ دیا تو کپڑے والے کو اختیار ہوگا: اگر چاہے تو بلا رنگے کپڑے کا ضامن بنا دے اور کپڑا اجیر کو دے دے، اور اگر چاہے تو کپڑا لے لے اور رنگ کی وجہ سے اگر اضافہ ہوا ہے تو دے دے۔

اور اگر رنگ نے اضافہ نہیں کیا ہے ..... اور اس نے کپڑا لینے کو ترجیح دی ہے تو کچھ نہیں دے گا، بلکہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق کپڑے میں جو نقصان ہوا ہے اس کا ضامن بنائے گا)۔

اگر خلاف وصف میں ہے تو مستاجر یا تو سامان لے گا اور اجرت مثل دے گا، یا پھر اجیر کو اس شئی کا ضامن بنادے گا۔

''فإذا كان الخلاف فی الصفة نحو إن دفع إلى صباغ ثوباً يصبغه بصبغ مسمى فصبغه بصبغ آخر لكنه من جنس ذلك اللون فلصاحب الثوب أن يضمنه قيمة أبيض ويسلم إليه الثوب وإن شاء أخذ الثوب وأعطاه أجر مثله لا يجاوز به ما سمى'' (بدائع ۸۲،۴ کتاب الاجارہ، باب استیجار الصناع)۔

یہی حال اس وقت بھی ہے جب کہ عمدہ کرنے کے لئے کہا تھا مگر اس نے خراب کردیا۔

''ولو شرط عليه جيداً فأنعله بغير جيد فإن شاء ضمنه قيمة الخف، إن شاء أخذ الخف وأعطاه أجر مثل عمله وقيمة ما زاد فيه ولا يجاوز به ما سمى؛ لأن الردئ من جنس الجيد ويثبت الخيار بفوات الوصف المشروط'' (بدائع۸۲،۴ کتاب الاجارہ، باب استیجار الصناع)۔

(اگر شرط لگائی کہ اچھا نعل ڈالے، اس نے اچھا نہیں ڈالا اب چاہے تو خف کی قیمت

کا ضامن بنائے اگر خف لیتا ہے اور اس کو اس کے عمل کی اجرت مثل دے اور اس میں جتنا اضافہ ہوا ہے اس کو ادا کردے، مگر مقررہ مقدار سےمتجاوز نہیں ہوگا، اس لئے کہ ردی بھی جید کی جنس سے، اختیار تو اس لئے ثابت ہورہا ہے کہ وصف مشروط ہورہا ہے)۔

اگر مقدار میں خلاف کیا مثلاً سوت دیا کہ سات بائی چار کا کپڑا بن دے، اس نے اضافہ کردیا، اب سوت کے مالک کو اختیار ہے: سوت کا ضامن بنائے یا متعین کردہ مزدوری دے کر کپڑا لے لے، لیکن ناقص کردیا تو اصل کی روایت میں ضامن بھی بناسکتا ہےاور مزدوری دے کر لے بھی سکتا ہے، اور دوسری روایت میں اجرت مثل واجب ہوگی (بدائع۴،۸۲ کتاب الاجارہ، باب استیجار الصناع)۔

زیر بحث مسئلہ میں کاریگر کو جو جواہرات دیئے گئے ہیں اس نے ان جواہرات سے زیور تو بنایا ہے مگر مقررہ معیار کے مطابق نہیں ہوسکا یعنی اس میں کمی واقع ہوگئی یا بالفاظ دیگر وصف میں خلاف ہوا، لہذا تاجر کو یہ حق ہے کہ جو پتھر اس زیور میں لگے ہیں ان کا ضامن اس کاریگر کو بنادے، لیکن لینا چاہتا ہے تو اس کی اجرت مثل دے جو مقررہ اجرت سے زیادہ نہیں ہوگی۔

(۳) قانونی مصلحت کے لئے قیمت کم لکھنا:

خرید وفروخت کے صحیح ہونے کے لئےایجاب وقبول کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح اس کی صحت کے لئے مبیع وثمن نیز ادائیگی کی مدت کا شرعی طور پر صحیح ہونا ضروری ہے، ثمن وقیمت کے صحیح ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ معلوم ومتعین ہو اور نزاع کا باعث نہ ہو۔

''شرط لصحتہ معرفۃ قدر مبیع وثمن ووصف ثمن کمصری أو دمشقی غیر مشار إلیہ، لا یشترط ذلک فی مشار إلیہ لنفی الجہالۃ بالإشارۃ ما لم یکن ربویاً قوبل بجنسہ أو سلماً اتفاقاً أو رأس مال سلم لو مکیلاً أو موزوناً، وصح ثمن حال وہو الأصل ومؤجل إلی معلوم لئلا یفضی إلی النزاع'' (درمختار۴،۲۴۔۲۵ کتاب البیوع، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(بیع کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ مبیع وثمن کی مقدار معلوم ہو اور ثمن کا وصف جیسے مصری اور دمشقی ہونا معلوم ہو، جبکہ وہ ثمن مشار إلیہ نہ ہو، کیوں کہ مشار إلیہ میں یہ شرط نہیں ہے ، اشارہ کے ذریعہ جہالت کے منتفی ہونے کی وجہ سے جبکہ وہ ایسی ربوی شئی نہ ہو جس کا مقابلہ اسی جنس سے کیا گیا ہو، یا سلم ہو بالاتفاق یا سلم کا رأس المال ہو اگر وہ مکیلی یا موزونی ہو، نیز ثمن نقد ہو تو بھی اور یہی اصل ہے، صحیح ہے اور ثمن ادھار ہوتو بھی صحیح ہے جس کی مدت معلوم ہو تاکہ نزاع کا سبب نہ ہو)۔

نیز ثمن وہ ہوتا ہے جو عاقدین کے مابین معروف ومتعین ہو، ''والثمن ما تراضی علیہ المتعاقدان سواء زاد علی القیمۃ أو نقص'' (الموسوعۃ الفقہیہ۱۵،۲۵)۔

(ثمن وہ ہے جس پر عاقدین راضی ہوں خواہ قیمت سے زائد ہو یا کم ہو)۔

ابن قدامہ نے لکھا ہے:

‘‘فذہبوا إلی صحۃ البیع إذا عقد علی ثمن بوزن صبخۃ وملأ کیل مجہولین عرفاً وعرفہما المتعاقدان بالمشاہدۃ کبعتک ہذہ الدار بوزن ہذا الحجر فضۃ أو بملأ ہذا الوعاء أو الکیس دراہم’’ (المغنی لابن قدامہ۲۲۷،۴، الموسوعۃ الفقہیہ۳۴،۱۵)۔

(پس فقہاء بیع کی صحت کے قائل ہیں جب کہ ایک ثمن پر عقد ہو جو کسی بٹ کے وزن سے ہو یا کسی پیمانہ بھر کے، خواہ عرفاً دونوں مجہول ہوں، مگر عاقدین ان کو مشاہدہ سے جانتے ہوں، جیسے اس دار کو اس حجر کے برابر چاندی سے، یا اس برتن یا تھیلی بھر کر درہم سے بیع کی)۔

اس کی نظیر میں بیع بالرقم بھی پیش کی جاتی ہے: ‘‘علامۃ یعرف بہا مقدار ما وقع بہ البیع من الثمن فإذا لم یعلم المشتری ینظر إن علم فی مجلس البیع نفذ’’ (رد المحتار ۳۲،۴ کتاب البیوع، مطلب: البیع بالرقم)۔

(وہ ایسی علامت ہے جس سے بیع میں ثمن کی مقدار معلوم ہو، پس مشتری کو معلوم نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ مجلس عقد میں معلوم ہوتا ہے یا نہیں، اگر مجلس میں علم ہوجاتا ہے تو بیع نافذ ہوجائے گی)۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں:

‘‘قال أحمد:ولا بأس أن یبیع بالرقم ومعناہ أن یقول:بعتک ہذا الثوب برقمہ وہو الثمن المکتوب علیہ إذا کان معلوماً لہما حال العقد، وہذا قول عامۃ الفقہاء ..... فإن لم یکن معلوماً لہما أو لأحدہما لم یصح؛ لأن الثمن مجہول’’ (المغنی۲۶۴،۴)۔

(امام احمد نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے بیع بالرقم میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ: کہے اس کپڑے کو اس کے اوپر جو رقم ہے اس سے بیچا اور وہ ثمن ہے جو اس پر مرقوم ہے جبکہ دونوں کو اس کی مراد معلوم ہو عقد کے وقت ہی، یہی عام فقہاء کا قول ہے، پس اگر معلوم نہ ہو دونوں یا ایک کو تو صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ثمن مجہول ہے)۔

لہذا تاجر اگر ایک زیور کی قیمت تین سو روپے لکھتا ہے مگر وہ تین ہزار سمجھا جاتا ہے اور یہ تاجروں کے مابین معروف ومشہور بھی ہے تو اس طرح ثمن لکھنے میں اور تجارت کرنے میں حرج نہیں ہے، جبکہ حکومت سے اپنے آپ کو بچانا اور محفوظ رکھنا بھی مصلحت ہو، چونکہ حکومت مختلف اشیاء پر جو ٹیکس عائد کرتی ہے عام طور پر وہ ظالمانہ ہوتا ہے، حکومت کو عام حالات میں قیمتوں کو متعین کرنے کا حق بھی نہیں ہے اس لئے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ٹیکس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کوئی حیلہ اختیار کرتا ہے تو انشاء اللہ گناہ کے زمرے میں نہیں آئے گا، حضرت تھانوی کے مختلف فتاوی میں اس طرح کی تصریح موجود ہے (دیکھئے ایک فتوی: ٹیکس تشخیص کرنے والے سے اپنا مال چھپانا، امداد الفتاوی۱۵۲،۴ کتا ب الحظر والاباحہ)۔

(۴) ایکسپورٹ میں قیمتوں کو چھپانا:

ایکسپورٹ کرنے والے حضرات بھی ایسا کرتے ہیں کہ سامان پر پوری قیمت کا دس فی صد لکھتے ہیں، لیکن فریقین کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے، باقی نوے فیصد بھی بائع کو مل جاتے ہیں، مگر دوسرے طریقے سے، بینک کے ذریعہ توصرف دس فی صد کی وصول یابی ہوتی ہے، اس میں بھی حکومت کی نگاہ سے بچنا ہوتا ہے؛ کیوں کہ حکومت کی جانب سے بے جا ٹیکس لاگو کیا جاتا ہے، اگر اپنے آپ کو ایسے ٹیکسوں سے محفوظ رکھے تو حرج نہیں ہے، نیز جب بائع کو مکمل قیمت کسی دوسرے طریق سے ہی سہی مل جارہی ہے تو نہ اس میں دھوکہ ہوا نہ اضرار، اس لئے اس صورت میں حرج نہیں ہے۔

(۵) کاریگر نے بعض ذرات چھپا لیے:

کاریگر کے پاس جو جواہرات زیور وغیرہ بنانے کے بعد بچتے ہیں اگر وہ کارآمد ہیں جس کی انسان کو طلب ہوسکتی ہے تو ان ذرات کو کاریگر کے لئے اپنے پاس رکھنا ناجائز ہے، دوسرے کے مال سے بلا اس کی اجازت انتفاع ہے، نیز جھوٹ کی لعنت بھی شامل حال ہے، لہذا یہ جائز صورت نہیں ہوگی، اللہ کے رسول نے فرمایا: ''لا یحل مال امرأ مسلم إلا بطیب نفس منہ'' (مسند احمد۵،۷۲ مسند ابی حرہ) (کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

اللہ کا ارشاد ہے: ''لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (آپس میں مال باطل طریقے سے مت کھاؤ الا یہ کہ بطریق تجارت اور باہم راضی ہو)۔

''اور ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے خبث ہے، جیسے غصب وامانت، پس غاصب یا امین نے سامان یا رقم میں تصرف کیا تو نفع صدقہ کرے، عقد کے دوسرے کے مال سے متعلق ہونے کی وجہ سے، پس دونوں (عرض ونقد) میں کام کرے گا، جیسا کہ خسرو اور ابن الکمال نے تصریح کی ہے، ابن کمال نے کہا: اگر اس نے دین کا جھوٹا دعوی کیا تو بالکل مالک نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ بات یقینی ہے کہ اس کی ملکیت نہیں ہے '' (الرد مع الدر۴،۱۴۵ باب البیع الفاسد، مطلب: فیمن ورث مالاً حراماً، ط: رشیدیہ)۔

بذل المجہود میں ہے:''من اکتسب مالاً بغیر حق فإما أن یکون کسبہ لعقد فاسد أو بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول ففی جمیع الأحوال المال الحاصل لہ حرام علیہ'' (بذل المجہود۱،۳۷ کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضو)۔

(جس نے کوئی مال ناحق حاصل کیا، پس یا تو اس کا کسب عقد فاسد کے ذریعہ ہے یا بغیر عقد جیسے چوری، غصب، امانت، مال غنیمت میں خیانت تو ان تمام احوال میں حاصل ہونے والا مال اس کے لئے حرام ہے)۔

درزی کے چرائے ہوئے کپڑے کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فتاوی

محمودیہ میں ہے:

''درزی کو چاہئے کہ جب کپڑا ناپے تو جتنا خرچ ہوگا ناپ کر اتنا ہی بتائے، نہ اتنا کم بتائے کہ سل کر چھوٹا رہ جائے، نہ اتنا زیادہ بتائے کہ باقی بچے اور واپسی کی نوبت آئے، تاہم اگر باقی بچے گا تو اس کو خود نہ رکھے بلکہ واپس کردے، اس پر اگر گاہک ناراض ہوکر سخت الفاظ کہے تو جواب نہ دے خاموش رہے اور اس کو ذخیرہ آخرت تصور کرے '' (فتاوی محمودیہ بترتیب جدید ۴۰۰،۲۸ مال حرام کا حکم)۔

(۶) قیمتی پتھر میں لگنے والے دھاگے کی قیمت پتھر کی قیمت میں وصول کرنا:

قیمتی پتھروں کی آرائش کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں ان کا وزن دس گرام ہونا چاہئے، اگر بنانے والے کاریگر اس سے کم لگاتے ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے، خریدار جس قیمت میں لینا چاہتا ہے اگر کاریگر کو پسند ہے تو دے، اگر پسند نہیں ہے تو نہ دے، اس پر جبر تو ہے نہیں، یا وہ دھاگے ہی دس گرام لگادیں؛ تاکہ ان کا نقصان نہ ہو، اگر مبیع سامنے نہیں ہوتی ہے اور مبیع کی تعیین میں غلطی ہوجاتی ہے تو مشتری کو اختیار ملتا ہے:

''قال محمد إذا اشتری مسکاً وزناً فوجد فیہا رصاصاً فہو بالخیار إن شاء رد الرصاص وحط عن الثمن بقدر وزن الرصاص وإن شاء ترک'' (المحیط البرہانی ۴۴۲،۸ کتاب البیوع الشرط فی الاجل، الفصل الثامن)۔

(امام محمد نے فرمایا: جب مشک خریدا وزن کرکے اور اس میں رصاص پایا تو اس کو اختیار ہے: چاہے تو رصاص کو واپس کردے اور اس کے بقدر ثمن کم کردے، اور اگر چاہے تو چھوڑ دے)۔

لیکن مبیع سامنے ہو تو پھر خیار نہیں ہوتا ہے:

''وفی الظہیریۃ:اشتری سویقاً علی أن البائع لتہ بمن من السمن وتقابضا والمشتری ینظر إلیہ فظہر أنہ لتہ بنصف من جاز البیع ولا خیار للمشتری، وہو نظیر ما إذا اشتری صابوناً علی أنہ متخذ من کذا من الدہن ثم ظہر أنہ اتخذ بأقل من ذلک والمشتری ینظر إلی الصابون وقت الشراء جاز البیع من غیر خیار، وکذا لو اشتری قمیصاً علی أنہ متخذ من عشرۃ أذرع وہو ینظر إلیہ ثم ظہر أنہ من تسعۃ جاز البیع'' (المحیط البرہانی۴۴۳،۸ کتاب البیوع، الشرط فی الاجل، الفصل الثامن)۔

(ایسا ستو خریدا جس کے بارے میں بائع نے کہا تھا کہ ایک من گھی ملایا ہے، دونوں نے قبضہ کرلیا، مشتری اس ستو کو دیکھ رہا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ بائع نے آدھا من گھی ملایا ہے تو بیع جائز ہے، مشتری کو خیار نہیں، یہ نظیر اس مسئلہ کی ہے کہ جب صابون خریدا اس شرط کے ساتھ کہ اتنے دہن سے بنا ہے، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ اس سے کم سے بنایا گیا جبکہ مشتری صابون کو خریدتے وقت دیکھا تھا تو بیع جائز ہے اختیار

نہیں ہوگا، اسی طرح اگر قمیص خریدا اس شرط کے ساتھ کہ دس ذراع سے بنی ہے اور وہ اس کی نظر کے سامنے ہے، پھر ظاہر ہوا کہ نو ذراع ہے تو بیع جائز ہے)۔

دھاگے کی بابت بھی بعینہ یہی صورت ہے، اس لئے مشتری ابتداء سے ہی نہ خریدے اس کو اختیار ہے، لیکن خرید لیا تو بعد میں کوئی اختیار نہیں ہوگا، چونکہ دھاگہ وجواہرات کی بیع روپیے پیسے سے ہوتی ہے، لہذا کمی وبیشی سے بیع کے حکم میں فرق بھی واقع نہیں ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ مشتری کو معلوم ہے کہ اس زیور میں آٹھ گرام ہی دھاگے لگے ہیں تو اس کو آٹھ گرام ہی دھاگے کی قیمت لگانی چاہئے، کیوں کہ اسلام کا ایک قانون لا ضرر ولا ضرار بھی ہے، یعنی خود ضرر سے بچنا اور دوسروں کو بھی ضرر سے بچانا، چوں کہ اس قسم کے معاملات میں کاریگروں کی طرف سے بھی دھوکہ ہوا کرتا ہے، اس لئے دونوں ہی کو دھوکہ واضرار سے بچنا وبچانا چاہئے۔

(۷) ایک قیراط پانچ سینٹ کے برابر مال کو ایک قیراط کے بھاؤ میں بیچنا:

بیع وشراء کے صحیح ہونے کے لئے عاقدین کی رضا کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، قرآن کریم میں ہے:''إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم'' (الا یہ کہ تمہاری آپسی رضا کے ساتھ تجارت ہو)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''إنما البیع عن تراض'' (البیہقی۱۷،۶ کتاب البیوع، باب بیع المضطر) (بیع کا وجود رضا سے ہوگا)۔

''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ'' (مجمع الزوائد۱۷۲،۴ کتاب البیوع، باب الغصب وحرمۃ مال المسلم) (کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہے الا یہ کہ اس کی خوشی سے ہو)۔

فقہاء نے بھی بیع کی تعریف میں ''رضاء '' کو بنیاد کی حیثیت قرار دیا ہے، اکراہ، اضطرار، غرر، خطاء، اور ہزل وغیرہ سے رضا مفقود ہوجاتی ہے، ان تمام پر فقہاء کے یہاں تفصیلی کلام موجود ہے۔

لہذا ایک قیراط پانچ سینٹ کی مالیت کا پیپر اگر ایک قیراط کے نام سے بن جاتا ہے تو اس کی حقیقی مالیت میں فرق نہیں آتا ہے، اب اس کو ''ایک قیراط '' کے بھاؤ میں ہی خریدنا اور اس پر اصرار کرنا، نیز صاحب مال کا لکھے جانے کی وجہ سے مجبور ہونا رضا کو مفقود کرنے والا ہے، اس لئے ''پانچ سینٹ '' کی قیمت ادا کئے بغیر اس کو لینا جائز نہیں ہوگا، پانچ سینٹ کے بقدر مال اس کے پاس غیر کا مال ہوگا، اس کے لئے وہ مال خبیث ہے، لہذا اس پانچ سینٹ کی قیمت دوسرے گاہکوں سے وصول کرنا بھی جائز نہیں، واللہ اعلم۔

(۸) مجبوراً قبول کرنا بھی تراضی کے لئے مضر ہے:

مال لے کر باہر جانے والے تاجروں کا غلط بیانی کرکے دوسرے کے مال کو لے لینا اسلام کی نگاہ میں سنگین جرم ہے، کذب کا گناہ اپنی جگہ، دوسرے کے مال سے اپنے لئے سامان عیش وعشرت یا حاجت خورد ونوش مہیا کرنا، پھر انہی اموال کو اپنے ورثہ کے لئے

چھوڑ کر جانا ہمیشہ ہمیش کے لئے معصیت کا باعث ہوگا، اسی طرح کچھ فی صد ادا کردینے سے اور مجبوری میں مال والے کے قبول کرنے سے وہ مال حلال نہیں ہوتا ہے۔

''إن الله وضع عن أمتی الخطأ والنسیان وما استکرہوا علیہ'' (ابن ماجہ،۱۴۷ کتاب الطلاق، باب طلاق المکرہ والناسی) (اللہ نے میری امت سے خطا ونسیان اور اکراہ کو وضع کردیا ہے)۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا یرکب البحر إلا حاج أو معتمر أو غاز فی سبیل الله ولا یشتری من ذی ضغطۃ سلطان شیئاً'' (البیہقی۶،۱۸ باب بیع المضطر)۔

(سمندری سفر حاجی، معتمر یا مجاہد ہی کرے گا اور جن بادشاہ کا دباؤ ہو ان سے کوئی چیز نہ خریدی جائے)۔

دونوں حدیثوں پر اگرچہ تھوڑا کلام ہے مگر ''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ''، جو کہ حسن درجہ کی روایت ہے اس سے مؤید ہونے کی وجہ سے دونوں حدیثیں بھی قابل عمل ولائق استدلال ہیں۔

جو مال تاجر کے پاس تھا وہ بحکم امانت تھا، اس کی حفاظت اپنے مال کی طرح کرنا لازم تھا، اگر حفاظت میں کوتاہی ہوئی اور وہ ضائع ہوجاتا پھر بھی تاجر اس مال کا ذمہ دار ہوتا، مذکورہ بالا صورت میں تو تاجر نے کذب بیانی کی ہے، وہ مال اس کے پاس موجود بھی ہے، تو کیوں کر تاجر پر قابل ضمان وواپسی نہ ہوگا۔

''لا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا إذنہ ولا ولایتہ'' (درمختار۵،۱۴۰ کتاب الغصب) (دوسرے کے مال میں بغیر اس کی اجازت وولایت تصرف جائز نہیں ہے)۔

جواہرات کی خریدوفروخت

مفتی محمد ظفر عالم ندوی•

الحمد للہ رب العالمین ،والصلوۃ و السلام علیٰ سید المرسلین ۔

محور اول:

(۱) مفتی بہ قول یہ ہے کہ فیصد کے حساب سے دلالی کی اجرت لینا جائز ہے:''وعنہ قال :رأیت ابن شجاع یقاطع نساجا ینسج لہ ثیابا فی کل سنۃ'' (حاشیہ ابن عابدین ۶؍۶۳)، اب رہا مسئلہ دلال کا بائع اور مشتری کو بغیر اطلاع کئے ہوئے سامان فروخت کرکے فائدہ اٹھا نا تو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر بائع سے یہ معاملہ ہوا ہے کہ یہ سامان پینسٹھ روپئے میں بیچو اگر اور زیادہ میں بیچو گے تو فائدہ تمہارا ہوگا تو یہ صورت جائز ہوگی،بخاری شریف کی ایک روایت سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے''قال ابن عباس:لا بأس أن یقول:بع ہذا الثوب فما زاد علی کذا وکذا فہو لک'' (صحیح البخاری، کتاب الاجارۃ، باب اجرۃالسمسرۃ)، لیکن بغیر اطلاع کے ایساکرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ معاہدہ کے مطابق نہیں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: ''المسلمون عند شروطہم'' (صحیح البخاری،کتاب الاجارۃ،باب اجرۃ السمسرۃ)۔

(۲) اگر دلال نے بائع کی قیمت پر خود خرید لیا اور دوسرے خریدار سے اس کی قیمت پر فروخت کر دیا تو ایسا کرنا درست نہیں ،گویا کہ دلال اور بائع کے مابین بائع اور مشتری کا معاملہ ہوا ،اور دلال کے لئے مناسب نہیں کہ وہ چار فیصد اپنی فیس لے، تاہم اگر لے لے تو یہ صورت جائز ہے،ہدایہ میں ہے:''الإجارۃ عقد علی المنافع بعوض وفی الزاد یرید بالعوض عوضا ہو معلوما''(الفتاویٰ تاتار خانیہ۱۵؍۳)، رہا مسئلہ دلال کا کہ اس نے بائع کو دھوکہ دے کے فرضی خریدار لایا اور ساٹھ روپئے میں خرید کر اصل خریدار کو ستر روپئے میں فروخت کیا تو ایسا کرنا درست نہیں، حضورؐ نے فرمایا :''من غش فلیس منا'' (سنن الترمذی ،البیوع عن رسول اللہؐ،رقم الحدیث: ۱۳۱۵)، اگر دلال نے یہ کہا کہ ہم ساٹھ روپئے میں خرید کر تمہیں ستر روپے میں دیں گے تو یہ معاملہ مرابحہ کا ہے جو بلا تردد جائز ہے اور اگر درمیان میں باقاعدہ کمیشن طے ہے تو یہ معاملہ دلالی کا ہے،اس کی بھی شرعا اجازت ہے: ''عن محمد أن عثمان بن عفان کان یشتری العیر فیقول :من یربحنی عقلہا، من یضع فی یدی دینارا'' (السنن الکبریٰ للبیہقی ،باب المرابحۃ ۵؍ ۵۳۸،رقم الحدیث: ۱۰۷۹۳)۔

''المرابحۃ نقل ما ملکہ بالعقد الأول بالثمن الأول مع زیادۃ ربح'' (الہدایۃ ،باب المرابحۃ

• استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

والتولیۃ۳،۷) ۔

''فتجب الدلالۃ علی البائع والمشتری أو علیہما بحسب العرف''(رد المختار ،کتاب البیوع،مطلب فی حبس المبیع لقبض الثمن۷،۹۳)۔

(۳) کاریگر کا مالک کے علم کے بغیر چھوٹے چھوٹے جواہرات کے ٹکڑے کا بیچنا حرام ہے ،کیونکہ یہ ان کا مال نہیں، بلکہ چھپا کر رکھنا ،چوری کرنا ہے جس کی فروختگی ہرگز جائز نہیں، حدیث میں ہے: ''عن أبی حرۃ الرقاشیی عن عمروؓ قال :قال رسول اللہ ﷺ : لا یحل مال امرء مسلم إلا بطیب نفس منہ''(مشکوٰۃ المصابیح، باب غصب والعاریۃ،الفصل الثانی : ۲۵۵، مرقاۃ المفاتیح۳،۳۵۰)۔

''ومنہا أن یکون مملوکا بأن البیع تملیک فلا ینعقد فی مالیس بمملوک''(بدائع الصنائع ۴،۳۴۰)، اسی طرح جس چیز کا چوری کاہونا یقینی ہو اس کی خرید و فروخت ناجائز ہے:''قال علیہ الصلاۃ والسلام :من اشتریٰ سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ فقد شرک فی عارہا و إثمہا '' (فیض القدیر ۱۱،۵۶۵۴)، اور اگر متعین طور پر یہ بات معلوم نہ ہو رہی ہو کہ یہ مال چوری کا ہے تو مباح سمجھ کر اسے خرید لیا جائے گا، اس لئے کہ اشیاء میں اصل چیز مباح ہے ''الأصل فی الأشیاء الإباحۃ''۔

(۴) زید کو اگر یقین ہے کہ یہ سامان چوری کا ہے تو خریدنا درست نہیں ہے ،اور اگر بائع کہہ رہا ہے کہ یہ درست مال ہے تو خرید سکتے ہیں:'' المثبت المقدم علی النافی'' کے تحت اور ''الأصل فی الأشیاء الإباحۃ ''کی بنیاد پر (التمہید ۶،۳۴۴-۳۴۵، القواعد الفقہیۃ ۱۲۲)۔

(۵) صورت مسئلہ میں معاملہ بیع کا ہے، چنانچہ جب زید اور بایع کے درمیان بیع تام ہوچکی ہے اور قبضہ بھی کر لیا ہے تو اب زید کو اختیار ہے کہ وہ سامان کو چاہے جس قیمت پر بیچے سب نفع زید کا ہوگا،چونکہ یہ معاملہ مطلق ہوا ہے اگر چہ کہ قیمت بعد میں دی جارہی ہے، لیکن ادھار کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے اسے نقد پر محمول کیا جائے گا اور بائع جب چاہے زید سے متعینہ قیمت وصول کر سکتا ہے:''عن أبی بحر عن شیخ لہ قال :رأیت علی علیؓ إیزارا غلیضا قال :اشتریت بخمسۃ دراہم فمن اربحنی فیہ درہما بعتہ إیاہ''(السنن الکبریٰ لالبیہقی ،کتاب البیوع،باب المرابحۃ،رقم الحدیث: ۱۰۹۴۴)۔

''إذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع''(الہدایۃ ۳،۲۰) ۔

(۶) اشیاء منقولہ میں قبل القبض بیع و شرع جائز نہیں ہوگی ،لہٰذا جب تک قبضہ نہ ہو اس سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا درست نہیں ہے:''عن عبد اللہ بن عمرؓ أن رسول اللہ ﷺ قال:من اشتریٰ طعاما فلا یبعہ حتی یستوفیہ و یقبضہ''(صحیح المسلم،باب بطلان المبیع قبل القبض، رقم الحدیث: ۳۷۲۷)۔

''القبض فی بیع المشتریٰ المنقول فلا یصح بیعہ قبل القبض لما روی أن النبی ﷺنہا

عن بیع ما لم یقبض'' (بدائع الصنائع ۳۹۴،۴) ۔

محور دوم :

(۱)دلال کا نقد پیسہ دیکر مقررہ قیمت سے کم میں پرچی کا حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ '' بیع الدین من غیر من علیہ الدین'' میں داخل ہے، یعنی دائن اپنا دین مدیون کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو فروخت کردے تو یہ جائز نہیں ہے، چنانچہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ فرماتے ہیں:''لا ینبغی للرجل إذا کان لہ دین أن یبیعہ حتی یستوفیہ لأنہ غرر فلا یدری أیخرج أم لا یخرج''(المؤطا لامام محمد رحمہ اللہ باب الرجل یکون لہ العطایا او الدین علی الرجل فیبیعہ،۳۵۴)، اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو تو اس کے لئے دین کو اس وقت تک فروخت کرنا مناسب نہیں جب تک کہ اس دین کو وصول نہ کرلے، اس لئے کہ ایسے دین کو فروخت کرنا غرر ہے، کیونکہ وہ خود نہیں جانتا کہ وہ اس دین سے نکل سکے گا یا نہیں، یعنی دین وصول بھی ہوگا یا نہیں، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:''ولا ینعقد بیع الدین من غیر من علیہ الدین لأن الدین إما أن یکون عبارۃ عن مال حکمی فی الذمۃ وإما أن یکون عبارۃ عن فعل تملیک المال وتسلیمہ وکل ذلک غیر مقدور التسلیم فی حق البائع ولو شرط التسلیم علی المدیون لا یصح أیضاً لأنہ شرط التسلیم علی غیر البائع فیکون شرطاً فیفسد البیع'' (بدائع الصنائع ۱۴۸،۵)، مدیون کے علاوہ دوسرے کو دین فروخت کرنے کی صورت میں وہ بیع منعقد نہیں ہوگی، کیونکہ دین سے مراد یا تو مال حکمی جو مدیون کے ذمہ ہے یا دین سے مراد مال کا مالک بنانے اور اس کے سپرد کرنے کا فعل ہے اور یہ دونوں چیزیں بائع کے حق مینغیر مقدور التسلیم ہیں، اوراگر مال سپرد کرنے کی شرط مدیون پر لگا دی جائے تو یہ بھی درست نہیں، اس لئے کہ یہ بائع کے علاوہ دوسرے پر تسلیم کی شرط لگانا ہوجائے گا، لہذا یہ شرط فاسد ہوگی اور شرط فاسد ہونے کی وجہ سے بیع بھی فاسد ہوجائے گی ، مولانا تقی عثمانی صاحب مد ظلہ العالی نے اس موضوع پر اپنے مقالے میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور فقہا ء کی آراء اور دلائل کا جائزہ لیا ہے اور اخیر میں یہ نتیجہ پیش فرمایا ہے کہ یہ صورت جائز نہیں ہے (مستفاد فقہی مقالات۱،۹۹،۹۸)۔

(۲) عزت بچانے یا معاملہ کے مطابق وعدہ پورا کرنے کے لئے سودی قرض لینے کی شرعا اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ ربا سے متعلق قرآنی آیات میں اس کی حرمت جس شدت کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور حدیث نبوی میں اس کی جس طرح شناعت آئی ہے اس کے پیش نظر سود کی ہر شکل سے بچنا ضروری ہے ''قال اللہ تعالیٰ : یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافا مضاعفا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون'' (آل عمران ،۱۳۰)، وقال تعالیٰ:یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات'' (البقرۃ ،۲۷۶)، مذکورہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازیؒ نے التفسیر الکبیر میں لکھا ہے کہ ''أما ربا النسیئۃ فھو الأمر الذی کان مشھورا متعارفا بالجاہلیۃ

وذٰلک أنہم کانوا یدفعون المال علی أن یأخذ کل شہر قدرا معینا ویکون رأس المال باقیا ثم إذا حل الدین طالب المدیون برأس المال فإذا تعذر علیہ الأداء زادوا فی الحق والأجل فہذا ہو الربا الذی کانوا فی الجاہلیۃ یتعاملون بہ''(تفسیر کبیر۷،۹۱)، حدیث نبوی میں اس کی شناعت اس طرح بیان کی گئی ہے''عن أبی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: الربا سبعون جزاء أیسرہا أن ینکح الرجل أمہ''(مشکوۃ المصابیح،باب الربا،الفصل الثالث، ۲۴۶)، ''عن علی أمیر المؤمنینؓ مرفوعا ''کل قرض جر منفعتا فہو الربا، وکل قرض شرط فیہ الزیادۃ فہو حرام بلا خلاف''(اعلاء السنن،کتاب الحوالۃ۱۴،۴۹۹)۔ ''لعن الرسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال:ہم سواء''(صحیح مسلم ،۲،۷۲ ، رقم الحدیث ۱۵۹۸)، ان آیات و روایات کا تقاضہ یہ ہے کہ ربا کی تمام صورتوں سے بچا جائے۔

(۳) پانچ سو روپئے فی کیرٹ کے حساب سے مال خرید کر اگلے شخص کو سات سو روپیئے کے حساب سے فروخت کرنا درست ہے ،یہ بیع مرابحہ ہے اور نفع کمانا جائز ہے:''المرابحۃ بیع ما ملکہ بما قام وبفضل''(تنویر الابصارمع الدر المختار،باب المرابحۃ ۵،۱۳۳، کذا فی الہدایۃ ،باب المرابحۃ ۳،۷۳)۔

''المرابحۃ بیع ما شراہ بما شراہ وزیادۃ'' (ملتقی الابحر مع مجمع الانہر۳،۱۰۶)، لیکن سات سو فی کیرٹ بیچ کر بائع سے چھوٹ بولنا کہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں تھا، اس لئے اس کی قیمت کم کرو تو یہ جھوٹ ہے جو ناجائز ہے، حضور ﷺنے فرمایا: ''ثلاثۃ لا ینظر اللہ إلیہم یوم القیامۃولا یزکیہم ولہم عذاب ألیم ------المنفق سلعتہ بالکذب'' (سنن النسائی،کتاب البیوع،رقم الحدیث: ۶۶۵۹)۔

''عن حکیم بن حزامؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: ''البیعان بالخیار مالم یتفرقا، فإن صدقا و بینا بورک لہما فی بیعہما وإن کتما و کذبا مُحقت برکۃ بیعہما'' (صحیح البخاری،رقم الحدیث: ۲۰۷۹)، مذکورہ روایات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی سامان کم قیمت میں خرید کر نفع لے کر زیادہ قیمت مینفروخت کرنا جائز ہے، لیکن اس کے لئے جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے، اس لئے اس بیع میں جواز کے ساتھ کراہت بھی ہوگی ۔

(۴) مشتری کے لئے ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ خریدتے وقت سامان کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دے، اور جب اسی سامان کو دوسرے سے فروخت کرے تو خوب تعریف کرے، بلکہ درست یہ ہے کہ جو حقیقت ہو اس کو واضح کیا جائے، اسلام نے بھی اپنے مالی نظام میں اخلاقیات کی تعلیم دی ہے، یہی وجہ ہے کہ دھوکہ، ضرر، غرراور دیگر اخلاقی خرابیوں سے پاک معاملہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے،حکیم بن حزامؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''البیعان بالخیار مالم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما وإن کتما وکذبا موحقت برکۃ بیعہما'' (صحیح البخاری،رقم الحدیث: ۲۰۷۹)،

اور عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''المسلم أخ المسلم ولا یحل لمسلم إن باع من أخیہ بیعا فیہ عیب أن لا یبینہ لہ'' (السنن الکبریٰ للبیہقی، باب ما جاء فی التدریس وکتمان العیب ۵،۵۲۳، رقم الحدیث: ۱۰۷۳۴)، ان روایات کے علاوہ اور بھی احادیث نبوی اس باب میں کثرت سے ملتی ہیں ۔

(۵) تاجر کو اس عیب سے مطلع کرنا ضروری ہے، تاکہ معاملہ واضح ،صاف ستھرا ہو جائے اور اگر تاجر ملاوٹ کے ساتھ لینے پر راضی ہے تو یہ بیع درست ہوگی، ورنہ عیب چھپا کر فروخت کرنا جائز نہیں ہے،فقہاء نے اس کی صراحت کر دی ہے، در المختار میں ہے:''لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام'' (در مختار ۵،۴۷)، ''عن عقبۃ بن عامر الجہنیؓ قال :سمعت رسول اللہ ﷺ یقول:المسلم أخ المسلم ولا یحل لمسلم إن باع من أخیہ بیعا فیہ عیب أن لا یبینہ لہ''(السنن الکبریٰ للبیہقی ،باب ما جاء فی التدلیس وکتمان العیب ۵،۵۲۳)۔

(۶)قیمتی پتھروں کو جس قیمت پر چاہیں بیچ سکتے ہیں ،شریعت میں اس کی کوئی تحدید نہیں ہے، لیکن مناسب یہ ہے کہ مفاد عام کا لحاظ رکھا جائے اور عوام الناس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے اور گراں قدر قیمت سے احتراز کیا جائے، اسی طریقہ میں خیر وبرکت ہے، عہد نبوی میں آں حضرت ﷺ سے اشیاء کا بھاؤ متعین کرنے کی درخواست کی گئی تھی تو آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ،ہاں اگر اس سے عام لوگوں کو ضرر ہو تو فقہاء نے لکھا ہے کہ سلطان وقت کو اشیاء کی قیمت متعین کرنے کا حق ہے:''عن أنس بن مالکؓ :غلا السعر علی عہد رسول اللہ ﷺ فقالوا:یا رسول اللہ ﷺ:قد غلا السعر، سعر لنا،فقال :إن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرازق'' (سنن ابن ماجہ،باب من کرہ أن یسعر ،رقم الحدیث۲۲۰۰)۔

''من اشتریٰ شیئا وأغلا فی ثمنہ جاز''(الفتاوی الہندیہ ۳،۱۳۱)۔

''ولا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس لقولہ علیہ السلام:لا تسعروا،فإن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرازق ولأن الثمن حق العاقد فعلیہ تقدیرہ،فلا ینبغی للإمام أن یتعرض لحقہ،إلا إذا تعلق بہ دفع ضرر العامۃ'' (الہدایۃ ۴،۴۷۲)۔

محور سوم :

(۱) بائع ڈسکاؤنٹ کو ایک مدت مینقیمت ادا کرنے کی شرط کے ساتھ مربوط کردے تو یہ ڈسکاؤنٹ شرعا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ ''ضع وتعجل'' کے دائرہ میں آتا ہے، فقہاء احناف نے اسے عدم جواز کے زمرہ میں رکھا ہے، البتہ بیع مرابحہ میں اس کی گنجائش ہے، لیکن بیع مساومہ میں درست نہیں ہے ،مذکورہ سوال بیع مساومہ ہی سے متعلق ہے،علامہ سرخسیؒ نے بنونضیر کے واقعہ کو نقل کر نے کے بعد لکھا ہے کہ یہ معاملہ

اگرچہ مسلمان اور کافر کے درمیان درست ہو، لیکن مسلمانوں کا آپس میں ان شرطوں کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں:''ولما أجل النبی ﷺ بنی النضیر قالوا إن لنا دیونا علی الناس فقال ضعوا تعجلوا،ومعلوم أن مثل ہذہ المعاملۃ لیجوز بین المسلمین فإن من کان لہ علی غیرہ دین إلی أجل فوضع عنہ بعضہ بشرط أن یعجل بعضہ لم یجز،کرہ ذٰلک عمر و زید بن ثابت وابن عمر'' (شرح السیر الکبیر للسرخسی۱۴۱۲،۴)، دین مؤجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ چھوڑنا تعجیل کی شرط کے ساتھ نہ ہو، بلکہ تبرعا ہو،علامہ جصاص ؒ نے ضع و تعجل کے جواز سے متعلق تمام آثار وروایات کو اسی پر محمول کیا ہے، یعنی جب شرط نہ ہو تب جائز ہے ،فرماتے ہیں :''ومن أجاز من السلف إذا قال عجل لی أو ضع عنک،فجائز أن یکون أجازوہ إذا لم یجعلہ شرطا فیہ وذٰلک بأن یضع عنہ لغیر شرط،ویعجل الآخر الباقی بغیر شرط''(احکام القرآن للجصاص ۴۶۷،۱، مستفاد فقہی مقالات ۱۱۴،۱)۔

(۲) کاریگر نے مطلوبہ شئی تیار کر کے دیا اور بنوانے والے نے اس مال کو دیکھا اور رکھ لیا اور فروخت بھی کر دیا تو یہ بیع درست ہوجائے گی،حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی ؒ کا فتویٰ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۳۰۳،۱۴'' میں موجود ہو ہے، اور ان کی یہی رائے ہے،لہٰذا کاریگر کو اس کی اجرت دینا ضروری ہے اور اسے ٹال کہنا درست نہیں ہے،اس لئے کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو گیا ہے، اس کی وجہ سے کاریگر کو اجرت دینا ضروری ہے،اور مارکیٹ میں جو طریقہ رائج ہوگیا ہے وہ شرعا عرف فاسد ہے جس کا اعتبا ر نہیں ہوگا، اس بارے میں نبی کریم ؐ کی روایات بھی موجود ہیں،حضور ﷺ نے فرمایا :''ثلاثۃ أنا خصمہم یوم القیامۃ،ومن کنت خصمہ خصمتہ یوم القیامۃ،رجل أعطیٰ لی ثم غدر ورجل باع حرا فأکل ثمنہ ورجل استاجر أجیرا فاستوفیٰ منہ ولم یوفہ أجرہ '' (ابن ماجہ، کتاب الرہون، باب اجر الاجراء،رقم الحدیث: ۲۴۴۲)۔

دوسری حدیث ''أعطوا الأجیر أجرہ قبل أن یجف عرقہ''(ابن ماجہ، کتاب الرہون،باب اجر الاجراء : ۲۴۴۳)۔

(۳) جب فریقین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اصل قیمت تین ہزار ہے تو قیمت معلوم ہونے کی وجہ سے شرعا یہ بیع درست ہو جائے گی،لیکن ایسا کرنا حکومت کو دھوکہ دینا ہوا، تاکہ ٹیکس نہ دینا پڑے ،حالانکہ ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو حکومت کے قانون پر قائم رکھینگے، لہٰذا یہ عمل جائز نہیں ہے، حضور ؐ نے فرمایا :''من غش فلیس منا'' (سنن الترمذی،البیوع عن رسول اللہ ﷺ،رقم الحدیث: ۱۳۱۵)، دوسری بات یہ ہے کہ ملکی قانون کے خلاف کرنے کی وجہ سے عزت وجان بھی خطرہ میں رہتی ہے،مومن کو چاہئے کہ وہ اپنی عزت اور جان کی بھی حفاظت کرے ،حدیث میں ہے ''لا ینبغی للمؤمن أن

یذل نفسہ" (ترمذی ،رقم الحدیث: ۲۲۵۴)۔

(۴) اگر فریقین اس معاملہ پر راضی ہیں کہ ایکسپورٹ میں اصل قیمت کے بجائے دس فیصد قیمت لکھی جائے جو بینک سے حاصل ہو اور بقیہ رقم کسی اور طریقہ سے وصول کی جائے تو یہ معاملہ شرعا اگر چہ درست ہو جائے گا، لیکن انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے غلط بیانی کرنا یا اصل قیمت کو چھپانا درست نہیں ہے ،اس غلط بیانی کی وجہ سے اس قسم کا معاملہ اگر چہ درست ہوگا، لیکن کراہیت سے خالی نہیں ،''من غش فلیس منا" (مستفاد :کتاب الفتاوی ۳۸۸،۹) ۔

(۵)کاریگر کا زیور بنوانے والے کے علم کے بغیر بچے ہوئے ذرات کا رکھنا درست نہیں ہے:''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ''(مشکوۃ المصابیح،باب الغصب والعاریۃ،رقم الحدیث: ۲۵۵)۔

(۶) بیع کے صحیح ہونے کے لئے عاقدین کی رضا مندی شرط ہے،فرمان الٰہی ہے: ''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم''، بائع کو اختیار ہے کہ اپنے سامان کو جس قیمت پر چاہے فروخت کرے، بائع کو کم قیمت پر سامان فروخت کرنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے، لہٰذا مشتری کے لئے یہ درست نہیں کہ بائع کی رضا مندی کے بعداسے پتھر کو دھاگے کے ریٹ میں فروخت کرنے پر مجبور کرے، لیکن اگر بائع راضی ہو جاتا ہے تو بیع درست ہوگی:''لأن الثمن حق العاقد فإلیہ تقدیرہ فلا ینبغی للإمام أن یتعرض لحقہ إلا إذا تعلق بہ دفع ضرر العامۃ''(الہدایۃ ۴۷۱،۴)۔

(۷) مال کی قیمت ایک قیراط پانچ سینٹ ہے، مشتری نے بائع سے پانچ سینٹ زبر دستی کم کروایا ہے، لہٰذا یہ عمل درست نہیں ہے ،اس لئے کہ مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر زبردستی لینا یا کم کرانا حلال نہیں ہے، لہٰذا دام کم کرانے کے لئے زیادہ اصرار کرنا مومن کی شان نہیں، اللہ کا ارشاد ہے :''یا أیہا الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل''(سورۃ النساء: ۲۹) اور حضور ﷺ نے فرمایا :''لاضرر ولا ضرار فی الإسلام" (نہ خود نقصان اٹھاؤ ،نہ دوسروں کو نقصان پہنچاؤ) (المسند للامام احمد بن حنبل،کتاب البیوع، رقم الحدیث: ۲۳۴۱،التمہید۲۸۴،۴)۔

(۸)کسی کا مال غلط بیانی کر کے لینا شرعا جائز نہیں ہے، مال ضائع ہوگیا کہہ کر صرف پچیس فیصد قیمت دینا بھی جائز نہیں ہے، اس طرح فروخت کرنے والے کو کم دام پر فروخت کرنے کے لئے مجبور کرنا بھی درست نہیں: ''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ" (سنن الدار قطنی ۲۲،۳)۔

ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی•

اللہ تعالی نے جہاں انسان سے دنیا میں بہت سی ضرورتیں متعلق رکھی ہیں، وہیں اس میں ایک جذبہ زیبائش وآرائش کا بھی رکھا گیا ہے، اس جذبہ کی تسکین کے لئے انسان نت نئے ڈیزائن کے لباس تیار کرتا ہی ہے، بالوں کی تراش و خراش کرتا ہے، رنگ پیدا کرنے والے مواد سے بھی استفادہ کرتا ہے، لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ وہ قدرتی پتھروں، دھاتوں اور مصنوعی اشیاء کے زیورات کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو سنوارتا ہے، اسی جذبہ حسن آرائی نے ان پتھروں کو جن سے نہ انسان کا پیٹ بھرسکتا ہے اور نہ جسم کی ستر پوشی ہوسکتی ہے، لوگوں کے لئے مرغوب بنادیا ہے اور مہنگی قیمتوں میں ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔

جواہرات کی تراش وخراش ، زیورات کی بناوٹ اور ان کی خرید و فروخت میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کام کرتی ہے، اور معاشی اعتبار سے بھی یہ ان کے لئے ایک نفع بخش کاروبار ہے، اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ۲۸ویں فقہی سمینار کے لئے جن عنوانات کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں جواہرات کی خرید و فروخت بھی ہے؛ چنانچہ اس سے متعلق چند اہم سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

محور اول:

جواب۱۔ صورت مسؤلہ میں دلال کا اصل قیمت چھپاکر بائع اور مشتری کو بیع پر تیار کرلینا دھوکہ دینے کے مترادف ہے ، جب کہ دلال کی فیس طے شدہ ہے ، لہذا دلال کا مذکورہ طریقہ دھوکہ او رخیانت پر مشتمل ہے ، دلال عند اللہ گنہگار اور مجرم ہوگا، دلال کے لئے یہ صورت اپنانا صحیح نہیں ہے، البتہ بائع اور مشتری کی بیع صحیح ہے ۔

جواب ۲ (الف)۔ بیع میں معاملات صاف صاف ہونا چاہئے، کسی کو نقصان نہ پہنچایاجائے، مذکورہ صورت میں دلال کا خود مشتری اور بائع بننا اور اس کا علم سب کو ہو ، معاملہ کوئی مخفی انداز سے نہ ہوتو یہ صورت جائز ہوگی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''البیعان بالخیار مالم یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما وإن کتما وکذبا محقت البرکۃ من بیعہما''(ابوداؤد،۳۴۵۹،صححہ الالبانی)۔

• استاذ ومفتی جامعہ دار السلام عمرآباد۔

(بائع اور مشتری دونوں کو اختیار حاصل ہے جب تک کہ وہ دونوں جدا نہ ہوجائیں، اگر وہ دونوں سچائی کا ثبوت دیں،اوربیع کو صاف صاف بتادیں، تو ان کی تجارت میں برکت دی جائے گی، اور اگر دونوں کا معاملہ صفائی پر مبنی نہ ہوبلکہ جھوٹ پر مشتمل ہوتو ان کے بیع سے برکت چھین لی جائے گی)۔

جواب۲ (ب)۔ مذکورہ بیع میں دلال کا کسی کو فرضی خریدار بناکر فائدہ حاصل کرنا یقینا یہ بھی خیانت اور دھوکہ ہے ، لہذا یہ صورت درست نہ ہوگی ۔

جواب۳۔ ارشاد باری تعالی ہے:''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان'' (المائدہ) (نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو)، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''لا ضرر ولا ضرار'' (ابن ماجہ : ۳۴۰) (نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو نقصان پہنچاؤ)، ارشاد نبوی ہے: ''دع ما یریبک إلی مالا یریبک، فإن الصدق طمانینۃ وإن الکذب ریبۃ'' (سنن الترمذی: ۲۵۱۸،صححہ الالبانی) (شک وشبہ والی جگہوں سے دور رہو، یقینا سچائی میں سکون قلب ہے ، اور اور جھوٹ سراسرشک میں مبتلا کرنے والی چیز ہے)،نیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فمن اتقی الشبہات استبرا لدینہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام'' (مسلم : ۴۱۷۸) (جو شخص شبہ کی چیزوں سے بچے گاوہ اپنے دین میں بری الذمہ ہوجائے گا، اور جو شبہ کی چیزوں میں گرفتار ہوگا حرام میں واقع ہوگا)۔

صورت مسؤلہ میں مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں چوری کا مال خریدنا یا بیچنا تعاون علی الاثم ہے ، یعنی گناہ کے کاموں میں شریک ہونے کی علامت ہے، لہذا یہ مال خریدنا او ربیچنا جائز نہ ہوگا، البتہ پوری طرح تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوجائے کہ یہ مال چوری کا نہینہے تو ایسی صورت میں وہ مال خریدنا جائز ہوگا۔

جواب۴۔ خریدار کو جب تک اطمنان میسر نہ ہو، مشکوک او رمشتبہ لوگوں سے مال خریدنا جائز نہیں ہے،یہ بھی مسلم ہے کہ چوری کے مال عام مال کے بالمقابل سستے میں بیچے جاتے ہیں ، لہذا خریدنے والے میں دینداری اور دیانتداری مطلوب ہے، نیز وجہ شبہ پور ی طر ح ظاہر نہ ہوتو خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ وجہ پوری طرح عیاں نہ ہوتو نہ خریدنا ہی اچھا اور بہتر ہے ، مشتبہ چیزوں سے فرار تقوی کی علامت ہے۔

جواب۵۔ صورت مسؤلہ میں بیع مکمل ہوگئی اور قبضہ متحقق ہوگیا تو مبیع پر ہر طرح کا تصرف جائز ہے، جس طرح بیع مؤجل میں کوئی چیز خرید کرنقد میں بیچنا جائز ہے، بشرطیکہ معاملہ شروع سے ہی واضح اور طے شدہ ہے کہ بیع مؤجل ہے یا بیع معجل، اس صورت میں ادھار خرید کر نقد میں بیچنا اور فائدہ حاصل کرنا بھی صحیح ہے۔

جواب ۶۔ صورت مسؤلہ میں دلال کا اپنا طریقہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ دلال

سامان کا مالک نہیں ہے ، نہ ہی مبیع پر قبضہ ہے ،ایسی صورت میں بائع اول کے مبیع کو دوسرے شخص سے نفع کے ساتھ فروخت کرنا اور زائد قیمت کو اپنی دلالی کا معاوضہ تصور کرلینا شرعادرست نہیں ہے ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لا تبع مالیس عندک'' (سنن ابوداؤد : ۳۵۰۵) یعنی اپنے پاس جو مال موجود نہ ہو اس کی تجارت نہ کرو ، نیز دوسری ممانعت کی صورت یہ بھی ہے کہ اس بیع میں دھوکہ اور خیانت بھی شامل ہے جو کہ ناجائز ہے ۔

محور دوم:

جواب۱ ۔صورت مسؤلہ میں دلال کا خریدار اور بیچنے والے کے درمیان حائل ہونا او رخریدار کی پرچی کو حاصل کرکے بیچنے والے سے مقررہ قیمت سے کم قیمت میں معاملہ طے کرلیناشرعا صحیح نہیں ہے، اس کی دو صورتیں ہیں جوممنوع ہیں:(۱): بیع پر بیع شرعا ممنوع ہے ، نیز استغلال کی کیفیت جو نظرآرہی ہے، وہ بھی ممنوع ہے،(۲): بیع مؤجل کو بیع معجل میں تبدیل کرکے بائع سے کم قیمت پر معاملہ ختم کرلینا اور مشتری سے پوری قیمت حاصل کرنا گویا یہ صورت سود سے مشابہ ہے ، یعنی''کل قرض جر نفعا فہو ربا'' کے قبیل سے ہے، ہر وہ قرض جس سے نفع کمایاجاتا ہو سود کے حکم میں ہی داخل ہے (السنن الکبری للبیہقی ۳۵۰،۵) ۔

جواب ۲۔ صورت مسؤلہ میں از روئے شریعت سو د کی حرمت کتاب وسنت کی روشنی میں اظہر من الشمس ہے، لہذا سودی قرضہ خواہ خریدار خود حاصل کرے یا کسی اور کے ذریعہ یہ سودی قرضہ حاصل کرے ، دونوں صورتوں میں سودی قرضہ لینا اور دیناحرام ہوگا۔

جواب۳۔ صورت مسؤلہ میں شرعا دھوکہ دہی ، جھوٹ او رمکر وفریب کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، بلکہ یہ صورت تطفیف کی بھی نظر آتی ہے ، جو خاص کر عرب تجار کی عادت تھی، یعنی لینا ہوتو پوری طرح وصول کرتے تھے او ردینا ہو تو ناپ تول میں کمی کرتے تھے ،اس پر آیت یہ نازل ہوئی ، وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْن وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْن''(سورۃ تطفیف) (ڈنڈی مارنے والوں کے لئے ہلاکت ہے، ایسے لوگ جب خود ناپ کرلیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں، او رجب دوسروں کو ناپ کریا تول کر دیتے ہینتو گھٹاکردیتے ہیں)۔

نیز مال فروخت ہونے کے بعد یہ دعوی کرنا کہ اس میں عیب تھا کسی بھی صورت میں ناجائز ہے ، خیار عیب ، خیار رؤیت یا خیار مجلس کی ساری رعایتیں مشتری کو مال بیچنے سے پہلے حاصل ہونگی، لیکن مال بیچنے کے بعد یہ رعایتں حاصل نہ ہونگی۔

جواب۴۔ صورت مسؤلہ میں مذکورہ طریقہ جائز نہیں ہے ، کسی کی مجبور ی کا

غلط فائدہ اٹھانا ، کسی کو نقصان پہنچانا یا کسی کو احمق بناکر خود فائدہ اٹھانا استغلال کی صورتیں ہیں جو ناجائز ہیں ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''فإن صدقا وبينا بورک لہما فی بيعہما وإن كتما وكذبا محقت البركۃ من بيعہما''(ابوداؤد : ۳۴۵۹،صححہ الالبانی) (اگر وہ دونوں سچائی کا ثبوت دیں، اوربیع میں معاملہ کو صاف صاف رکھیں ،تو ان کی تجارت میں برکت دی جائے گی، اور اگر دونوں کا معاملہ صفائی پر مبنی نہ ہو،بلکہ جھوٹ پر مشتمل ہوتو ان کے بیع سے برکت چھین لی جائے گی)۔

جواب۵۔ مال کی تیاری میں ملاوٹ ، رنگ کے ذریعہ گاہک کو فریب دینا ، گھٹیا مال تیار کرکے خریدار سے خوب نفع کمانے کی کوشش کرنااو ربیع میں عیب سے آگاہ نہ کرنا یہ سب بیع وشراء کے منافی امور ہیں جو کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہیں۔

جواب۶۔ شریعت میں نفع کی تحدید پر کوئی اصول وضابطہ مقرر نہیں ہے ، البتہ استغلال سے منع کیا گیا ہے ، جیساکہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ سے قیمت بڑھنے کے وقت درخواست کی نرخ متعین فرمادینتو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:إن اللہ ہو القابض الباسط الرزاق المسعر''(سنن الترمذی: ۱۳۱۴، صححہ الالبانی) (بے شک اللہ روزی روکنے والا، روزی عام کرنے والا ،سب کو روزی دینے والا اور قیمتیں طے کرنے والاہے)، یعنی آپ نے نفع کی تحدید سے انکار فرمایا، البتہ آپ ﷺ کی زندگی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں نفع کی تحدید نظر نہیں آتی،جیساکہ حضرت عروۃ بارقیؓ کو نبی کریم ﷺ نے ایک دینار عنایت فرمایاتاکہ وہ آپ کے لئے قربانی کاایک بکرا خریدیں،تو انہوں نے ایک دینار میں دو بکرے خریدے، پھر ایک بکرا کو ایک دینار میں فروخت کردیا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بکرا اورایک دینار بھی لے آئے، تو نبی کریمﷺ نے ان کے حق میں برکت کی دعا فرمائی، اگر وہ مٹی بھی خریدتے تو فائدہ میں رہتے (رواہ الخمسۃ الا النسائی) ۔

محور سوم:

جواب۱۔ صورت مسؤلہ (ضع وتعجل، یعنی ادائیگی جلد کردو تو کچھ قرضہ معاف) کے جواز میں علماء کے مابین اختلاف ہے :

۱) جمہور علماء نے اس بیع کو حرام قرار دیا ہے ، حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے اس کی حرمت کا فتوی دیا ہے ، جب کہ حضرت زید بن ثابت ، ابن عمر ، مقداد ، سعید بن مسیب، سالم ، حسن بصری ، حماد، حکم ، سفیان ثوری ، ہیثم ، ابن علیہ اور اسحق بن راہویہ وغیرہم نے اس بیع کو مکروہ قرار دیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ یہ معاملہ سود سے مشابہ ہے ، اور سود کی حرمت متفق

علیہ ہے، اورسود کی نوعیت یہ ہے کہ قرض میں تاخیر کی بناء پر رقم بھی زیادہ دینی ہوگی، اور ادائیگی میں جلدی کی صورت میں قرض میں کمی کی جائے گی۔

امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط مینلکھا ہے کہ جب کسی شخص کے ذمہ کسی کا ایک وقت کے لئے قرض ہو اور وہ قرض کسی چیز کی فروخت کی قیمت تھی، لہذا وہ وقت سے قبل باقی قرض کی ادائیگی میں اس سے کچھ قرض معاف کرتا ہے تو اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں، اس لئے کہ وقت کے مقابلہ میں دراہم اور دراہم کے مقابلہ میں وقت سود ہے (المبسوط۱۳،۱۲۶)۔

ابن رشدؒ نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں تحریر فرمایا ہے کہ ضع وتعجل کو ناجائز قراردینے والوں کی دلیل یہ ہے کہ یہ وقت بڑھانے کی وجہ سے زیاد ہ کرنے کے مشابہ ہے جس کی حرمت پر سب کا اجماع ہے (بدایۃ المجتہد ۳،۱۶۲)۔

۲)جن علماء کرام نے جواز کافتوی دیا ہے ، ان میں صحابہ کرام کی ایک تعداد ہے مثلا حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور ز ید بن ثابتؓ بھی ہیں، ائمہ کرام میں امام احمدؒ ، اور امام شافعیؒ بھی شامل ہیں، یہی قول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن قیمؒ کا بھی ہے، فقہاء حنفیہ میں سے ابن عابدین بھی جواز کے قائلین میں شامل ہیں (الدر المختار ۵،۱۶۰)۔

جواز کے قائلین کے دلائل میں سے وہ حدیث مشہور ہے جسے عبد اللہ بن عباسؓ نے روایت کی ہے ، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جب بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کا حکم دیا تو بنو نضیر کے کچھ لوگ نبی کریم سے کہنے لگے، اے اللہ کے نبی ﷺ آپ نے ہمیں نکالنے کا حکم دے دیا ہے اور کچھ لوگوں پر ہمارے قرض بھی ہیں جن کی ادائیگی کا وقت ابھی تک نہیں آیا ہے ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ضع وتعجل یعنی قرض میں سے کچھ معاف کردو اور جلدی واپس لے لو(مجمع الزوائد میں مسلم بن خالد الزنجی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف ہے ، اور اسے ثقہ بھی کہا گیا ہے،جب کہ ابن قیمؒ نے فرمایا کہ خالد الزنجی کی حدیثیں حسن کے رتبے سے کم کی نہیں) (احکام اہل الذمہ لابن قیم۱،۳۹۶)۔

مذکورہ حدیث کی تایید میں بخاری شریف کی ایک روایت ہے جس میں کعب بن مالکؓ سے قرض کو آدھا حصہ معاف کرنے کا آپ نے حکم فرمایا: ‘‘یا کعب قا ل لبیک یارسول اللہ فأشار بیدہ أن ضع الشطر من دینک، قال کعب قد فعلت یارسول اللہ، قال رسول اللہ ﷺ قم فاقضہ’’ (البخاری: ۴۷۱)، یعنی ابن ابی حدردؓ نے حضرت کعبؓ سے قرض لیا تھا، جب حضرت کعبؓ نے قرض کا مطالبہ کیا، دونوں کی آوازیں مسجد میں بلند ہوئیں، یہاں تک نبی کریم ﷺ اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے، پھر حضرت کعب سے اشارہ سے فرمایا کہ آدھا قرض معاف کردو، تو حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ لبیک یارسول اللہ ، آپ

کا حکم سر آنکھوں پر ، پھر آپ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ اٹھو اور قرض ادا کردو)۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سود تو یہ ہے کہ مجھے زیادہ وقت دے اور میں تجھے زیادہ دیتا ہوں ،اور یہ سود نہیں ہے کہ مجھے جلد واپس کردو اور تمھیں معاف کرتا ہوں، یعنی اس میں طرفین کی مصلحتیں پوشیدہ ہیں، قرض دینے والا قرض کی جلد واپسی سے اور لینے والا کچھ قرض کی معافی سے مستفید ہوتا ہے،اس معاملہ میں سود کی مشابہت نظرنہیں آتی ، کیونکہ سود میں مدت کی زیادتی سے قرض میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں پر مدت کی کمی سے قرض میں کمی آتی ہے ، اس موضوع میں طرفین کا فائدہ ہے جب کہ سود میں مدت کی زیادتی سے سود خور کا ہی فائدہ ہوتا ہے ، اور قرض لینے والاکا نقصان ہی ہوتا ہے ، اس میں اس کی کوئی مصلحت نظر نہیں آتی ، غالبا ابن عباسؓ کے قول کا منشا یہی ہے۔

لجنۃ الدائمہ(مستقل فتوی کمیٹی) کا فتوی یہ ہے:''اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے ، صحیح قول یہی ہے کہ قرض جلد واپس کرنے کے لئے کچھ قرض معاف کرنا جائز ہے ، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے اور شیخین ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے ، اور ابن عباسؓ کی طرف سے بھی یہ قول منسوب ہے ''(فتاوی اللجنۃ الدائمۃ۱۳،۱۶۸)۔

''من قرارات المجمع الفقہی ۷۔۱۲ ذی القعدۃ ۱۴۱۲ھ الموافق ۹۔۱۴مایو ۱۹۹۲م بہذا القول أخذ المجمع الفقہ الإسلامی بشرط ألا یقع الاتفاق علی ذلک عند العقد ''۔

'' الحطیطۃ من الدین المؤجل، لأجل تعجیلہ، سواء أکانت بطلب الدائن أو المدین (ضع وتعجل) جائزۃ شرعا لاتدخل فی الربا المحرم ،انتہی'' (فتاوی یسألونک ۶،۴۴۰)۔

المجمع الفقہی کی فیصلوں میں سے یہ بھی ہے کہ مذکورہ اتفا ق عقد کے وقت طے شدہ نہ ہوتو مدت والے قرض میں سے واپس کرنے کی غرض سے کچھ قرض معاف کردینا شرعا جائز ہے ، چاہے قرض دینے والے یا لینے والے کے مطالبے سے معاف کیا جائے، یہ حرام سود میں شامل نہیں ہوتا،واللہ اعلم بالصواب(مزید تفصیلات کے لئے، الاسلام سؤال وجواب، فتوی نمبر : ۱۳۹۴۵)۔

راقم الحروف کی رائے بھی مذکورہ مجمع الفقہ الاسلامی کے موافق ہے، واللہ اعلم بالصواب

جواب۲۔ کار یگر مطلوبہ مال معیار سے کچھ کم تیار کردے او ریہ مال فروخت بھی ہوجائے تو اسے اجرت سے محروم کرنا شرعا جائز نہیں ،زیادہ سے زیادہ یہ صورت ممکن ہے کہ مطلوبہ معیار میں کمی کی وجہ سے اجرت میں کمی کی جائے، لیکن اجرت سے بالکل محرومی درست نہیں ہے ، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو نقصان پہنچاؤ: ''لا ضرر ولا ضرار'' (سنن ابن ماجہ : ۳۴۰)۔

جواب۳۔ قانونی مصلحت کی خاطر یا ٹیکس سے بچنے کی خاطر قیمت کم کرنا صحیح نہیں ہے ، بلکہ یہ عمل دھوکہ اور فریب پر مشتمل ہے، مومن کا ہرکام صاف اور واضح ہونا چائیے، موجودہ صحیح قیمت بتانا ضروری ہے۔

جواب۴۔ صورت مسؤلہ میں تجارت / مالی معاملات میں ہر بات صاف وشفاف ہونا ضروری ہے، ورنہ دھوکہ دہی تصور کیا جائے گا، اصل قیمت کو چھپانا گویا حکومت ِوقت کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے جو اصولا ناجائز ہے ۔

جواب۵۔ صورت مسؤلہ مینبچے ہوئے ذرات کا اصلی مالک زیور بنوانے والا ہی ہوگا، لہذا ذرات اور ٹکڑوں کو اصل مالک کی طرف لوٹانا ہی انصاف کی بات ہوگی، کاریگروں کا ان بچے ہوئے ذرات کو مالک کو لوٹانا ضروری ہے ورنہ کاریگر خائن تصور کیا جائے گا ۔

جواب۶۔ صورت مسؤلہ میں اگر بائع مشتری کو اصل حقیقت سے آگاہ کردے اور مطلوبہ چیز یا اس کی حقیقی قیمت دینے پر تیار ہوتو بائع کا یہ عمل اور طریقہ صحیح ہوگا، یا دوسری صورت میں جو بھی کمی بیشی کی صورت ہے اس سے بائع اور مشتری دونوں واقف ہوں اور ان کی رضامندی کے ساتھ یہ تجارت طے ہوتو مذکورہ تجارت صحیح اور جائز شمار ہوگی ۔

جواب۷۔ صورت مسؤلہ میں مذکورہ بیع سے بائع اور مشتری اپنے علم کے ساتھ ساتھ اس تجارت سے راضی بھی ہوں تو یہ تجارت شرعا جائز ہوگی۔

جواب۸۔صورت مسؤلہ میں خریدار کا بیچنے والے سے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا، یا بیچنے والے کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھانا کسی بھی صورت میں جائز نہ ہوگا، جھوٹ بولنے کی وجہ سے اس مال سے برکت چھین لی جائے گی، نیز یہ عمل کسی مسلمان کے لئے حلال نہ ہوگا۔ ہذا ما تبین لی واللہ أعلم بالصواب وصلی اللہ علی نبینا محمد وبارک وسلم والحمد للہ رب العالمین۔

* * *

ہیرے جواہرات کی خرید وفروخت کے اہم مسائل

مفتی جنید بن محمد پالنپوری•

محور اول:

۱۔ بروکر اور دلال کے لئے اس طرح کرنا جائز نہیں، بروکر کا کام یہ ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ کرادے گویا وہ درمیان میں صرف واسطہ ہوتا ہے، اسی کی اجرت پاتا ہے جسے عرف میں کمیشن کہا جاتا ہے۔

لہذا بائع اور مشتری کے درمیان جس قیمت میں مبیع کی خریدوفروخت طے ہوئی ہو اسی پر معاملہ کروانا ضروری ہے، دونوں کو دھوکہ میں رکھ کر درمیان میں اپنے لئے رقم نکالنا حرام اور ناجائز ہوگا، بروکر اور دلال کو ایک اعتبار سے وکیل بھی کہا جاتا ہے۔

''السمسار:من یعمل للغیر بالأجر بیعاً أو شراءً ویقال لہ فی العرف الدلال'' (دستور العلماء ۲،۱۳۲)۔

''الدلال:ہو السمسار أی الذی یدخل بین البائع والمشتری متوسطاً لإمضاء البیع'' (التعریفات الفقہیہ۱،۲۹۳)۔

دراصل اس اجرت دلال کو بھی ضرورت اور حاجۃ الناس کو مدنظر رکھ کر جائز کہا گیا ہے، بہ ہرحال صورت مسئولہ میں بروکر کے لئے ۴؍فیصد کمیشن لینا ہی درست ہوگا، درمیان میں اپنے لئے رقم نکالنا جائز نہ ہوگا۔

''وفی الحاوی سئل محمد بن سلمۃ عن أجرۃ السمسار، فقال أرجو أنہ لا بأس بہ وإن کان فی الأصل فاسد الکثرۃ التعامل وکثیر من ہذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس إلیہ کدخول الحمام'' (رد المحتار۶،۶۳، باب الاجارۃ الفاسدہ، مطلب فی أجرۃ الدلال)۔

۲۔ پہلی صورت درست ہے، البتہ اصل مشتری کے سامنے کسی بھی طرح یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ وہ براہ راست دلال سے مبیع خرید رہا ہے اور دلال یہ مبیع بائع سے خرید کر مجھے بیچ رہا ہے، چونکہ عام طور پر دلال واسطہ ہوتا ہے اور اس صورت میں مبیع کی قیمت مناسب رہتی ہے، عموماً معاملہ کرنے والے یہی سمجھتے ہیں ، اگر انھیں معلوم ہوجائے کہ دلال ہمیں یہ چیز بیچ رہا ہے، وہ یہاں واسطہ نہیں ہے تو مشتری دلال سے خریدنے پر جلدی راضی نہ ہونگے، چونکہ اس صورت میں مبیع کی قیمت زیادہ ہوجاتی ہے۔

• دار الافتاء والارشاد، مجلس البرکۃ، ممبئی۔

نیز اس صورت میں اب دلال کے لئے ۴٪فیصد کمیشن لینا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اب خود مشتری اور پھر بائع کی شکل اختیار کرچکا ہے، اور بیک وقت ایک ہی شخص بائع اور دلال یا مشتری اور دلال نہیں ہوسکتا، یعنی اپنی چیز بیچنے پر مشتری سے اور خریدتے وقت بائع سے کمیشن نہیں لے سکتا، کمیشن تو محنت کا عوض ہوتا ہے اور یہاں تو خود خرید رہا ہے اور پھر بیچ رہا ہے تو اب یہ دلال نہیں رہا، بلکہ بائع اور مشتری بن گیا۔

دوسری صورت بھی ہو بہ ہو اسی طرح ہے، بس فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں دلال خود خریدوفروخت کا عمل کررہا ہے اور دوسری صورت میں فرضی یعنی ڈمی شخص کو کھڑا کرکے مبیع خرید رہا ہے اور پھر بیچ رہا ہے، عامی اور بازاری زبان میں تو اسے فرضی اور ڈمی شخص کھڑا کرنا کہا جائے گا، مگر بہ نظر غائر فقہی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ فرضی بائع اور مشتری اسی دلال کا وکیل بالبیع والشراء ہے، اسی وکالت کا نتیجہ ہے کہ اس خریدوفروخت میں ہونے والا منافعہ دلال جو دراصل مؤکل ہے لیتا ہے۔

''(باب الوکالۃ بالبیع والشراء) (إن عممت) أی الوکالۃ جزاء الشرط قولہ الآتی صحت قال فی الہدایۃ من وکل بشراء شئ فلا بد من تسمیۃ جنسہ وصفتہ أو جنسہ ومبلغ ثمنہ لیصیر الفعل المؤکل بہ معلوماً لیمکنہ الإئتمار إلا أن یکون وکالۃ عامۃ الخ'' (درر الحکام شرح غرر الاحکام)۔

اس صورت میں بھی مشتری کے سامنے اس بات کی وضاحت ضروری ہوگی کہ دلال کا وکیل یعنی خود دلال اس سے معاملہ کررہا ہے، (وجہ اوپر بیان کی گئی)۔

نیز عقود میں حقوق عاقد یعنی وکیل کی طرف لوٹتے ہیں، لہذا اسے ۴٪فیصد کمیشن لینا بھی درست نہ ہوگا، اور اصل معاملہ دلال (مؤکل) کے لئے ہے، لہذا اس کے لئے بھی کمیشن لینا درست نہ ہوگا۔

''لا یشترط إضافۃ العقد إلی المؤکل فی البیع والشراء والإجارۃ والصلح عن إقرار، فإن لم یضفہ إلی مؤکلہ واکتفی بإضافتہ إلی نفسہ صح أیضاً وعلی کلتا الصورتین لا تثبت الملکیۃ إلا لمؤکلہ ولکن إن لم یضف العقد إلی المؤکل تعود حقوق العقد إلی العاقد یعنی الوکیل وإن أضیف إلی المؤکل ویکون الوکیل بہذہ الصورۃ کالرسول الخ'' (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۳٪۵۵۰)۔

۳۔ جن دوکانوں اور مارکیٹ کے بارے میں یقین سے معلوم ہے کہ چوری کا مال ہے یا ظن غالب یہی ہے کہ چوری کا مال یہاں بکتا ہے تو وہاں سے مذکورہ سامان خریدنا خریدار کے لئے جائز نہیں ہے، اگر خریدے گا تو چوری کے گناہ میں خریدار بھی شامل ہوجائے گا۔

فقہاء کے یہاں ظن غالب ملحق بالیقین ہے۔

الاشباہ والنظائر میں علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

''وغالب الظن عندہم ملحق بالیقین وہو الذی یبتنی علیہ الأحکام یعرف ذلک من تصفح کلامہم فی الأبواب'' (ص: ۶۳)۔

''وقال علیہ الصلاۃ والسلام: من اشتری سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ فقد شرک فی عارہا

وإثمہا" (شعب الایمان، مصنف لابن ابی شیبہ)۔

''والحاصل أنہ إن علم أرباب الأموال وجب ردہ علیہم وإلا فإن علم عین الحرام لا یحل لہ الخ" (شامی: کتاب البیوع، مطلب فیمن وزن مالاً حراماً ۳۰۱،۷)۔

''لو ظہر غیر حلال أی مسروقاً أو مغصوباً یرجع علیہ المشتری، الخ" (شامی۴۵،۵)۔

''ولو باع السارق المسروق من إنسان أو ملک منہ بوجہ من الوجوہ فإن کان قائماً فلصاحبہ أن یأخذہ لأنہ عین ملکہ وللمأخوذ منہ أن یرجع علی السارق" (بدائع الصنائع ۸۵،۷؛ فصل فی السرقہ)۔

۴۔ اگر بائع کی بات پر یقین یا ظن غالب ہو کہ وہ سچ بول رہا ہے تو خریدنے میں حرج نہیں، البتہ جس مارکیٹ میں یا دوکان میں چوری کا مال بیچا جانے کا اندیشہ ہو تو تمام تاجروں کو چاہئے کہ اس مارکیٹ یا دوکان سے مال خریدنا ہی چھوڑ دیں، وہ مارکیٹ والے یا دوکان دار وضاحت بھی کریں کہ آپ کو جو مال دے رہا ہونچوری کا نہیں ہے، تب بھی تنبیہاً اس سے مال نہ خریدا جائے، اگر تما م خریدار اس کا اہتمام کرنے لگیں تو لازمی طور پر مارکیٹ والوں اور دوکان دار کو احساس ہوگا، اس سے درست کاروبار کرنے والوں کو حوصلہ ملے گا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (القرآن الکریم)۔

۵۔ عاقدین کے ایجاب وقبول سے بیع تام ہوجاتی ہے، اس کے لئے ثمن پر قبضہ ضروری نہیں، نیز اشیاء منقولہ میں بعد القبض اسے بیچنا درست ہے، لہذا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:''البیع یلزم بإیجاب وقبول أی حکم البیع یلزم بہما" (البحر الرائق۲۶۲،۵)۔

''البیع مبادلۃ مال بمال وینعقد بإیجاب وقبول ..... وإذا وجدالإیجاب والقبول لزم البیع" (مجمع الانہر)۔

''فلا یصح بیع منقول قبل قبضہ" (شامی ۳۶۹،۷)۔

''من حکم البیع إذا کان منقولاً أن لا یجوز بیعہ قبل قبضہ" (ہندیہ۱۲،۳)۔

۶۔ بیع کے جائز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مبیع بائع کی ملکیت ہو، اگر وہ خود بیع کررہا ہو، یا اس کے مؤکل کی ملکیت میں ہو، نیز یہ بھی شرط ہے کہ بائع مبیع کی حوالگی وتسلیم پر فوری طور پر قادر ہو۔

صورت مسئولہ میں غیر مملوک کی بیع ہورہی ہے، لہذا بیع باطل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:''لا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندک" (سبل السلام۸۰۹،۳)۔

''وبیع ما لیس فی ملکہ لبطلان بیع المعدوم ومالہ خطر العدم (قولہ لبطلان بیع .....

إن من شرط المعقود علیہ أن یکون موجوداً مالاً متقوماً مملوکاً فی نفسہ ..... یکون مقدور التسلیم'' (درمختار مع الشامی۷،۲۸۶)۔

البتہ بعض مرتبہ آدمی کے پاس کاروبار کے لئے رقم نہیں ہوتی، نیز مارکیٹ میں کریڈٹ نہیں ہوتی کہ کوئی مال پر قبضہ بغیر ثمن اور ادھاری پر دیدیں، اور سامنے والا خریدنے والا تیار ہوتا ہے، مگر یہاں غیر مملوک کی بیع کی وجہ سے معاملہ درست نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں اس معاملہ کو جواز کے دائرہ میں داخل کرنے کے لئے بیع سلم سے تبدیل کیا جاسکتا ہے، کہ لوگوں کے لئے راحت ہو۔

اس صورت میں بیع سلم کی شرائط پایا جانا ضروری ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جنس کا معلوم ہونا، کہ کس چیز میں بیع ہورہی ہے۔

(۲) نوع کا معلوم ہونا، کہ کس قسم کی چیز ہوگی۔

(۳) صفت کا معلوم ہونا، کہ چیز عمدہ واعلی قسم کی ہے یا ادنی قسم کی۔

(۴) اجل (مدت) کا معلوم ہونا، کہ مال کتنے عرصہ کے بعد مشتری کے حوالہ کیا جائے گا۔

(۵) مؤجلا ہونا، یعنی سلم میں ضروری ہے کہ مبیع، مال ایک مدت کے بعد حوالہ کیا جائے، اگر مبیع ادھار نہ ہو تو یہ معاملہ عقد سلم نہ ہوگا اور مدت کم ا زکم ایک ماہ ہونی چاہئے۔

(۶) مجلس عقد میں ثمن (قیمت) پر قبضہ کرنا، کہ مشتری اسی مجلس میں طے شدہ قیمت بائع کے حوالہ کردے۔

(۷) مال کا وقت عقد سے لے کر مدت پوری ہونے تک بازار مینموجود ہونا۔

(۸) راس المال معلوم ہو۔

علامہ حصکفی فرماتے ہیں:''وشرطہ أی شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ:بیان جنس ونوع وصفۃ وقدر وأجل وأقلہ فی السلم شہر وبیان مکان الإیفاء للمسلم فیہ'' (الدر المختار)۔

صورت مسئولہ کو بیع سلم میں تبدیل کرنے کے لئے تمام شرائط پر عمل آسان ہے، البتہ پانچویں شرط پر عمل مشکل ہوگا کہ مشتری مبیع پر قبضہ کرنے کے لئے ایک مہینہ کی مدت پر راضی نہ ہوگاجو عند الاحناف شرط ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک اجل شرط نہیں، لہذا سلم میں داخل ہوسکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ابتلاء عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے قول پر عمل کی گنجائش دی ہے۔

''ولا یجوز السلم إلا مؤجلاً وقال الشافعی: یجوز حالاً لإطلاق الحدیث ورخص فی السلم'' (ہدایہ، باب السلم۳،۹۴)۔

لہذا صورت مسئولہ میں بیع سلم کی پانچویں شرط کو چھوڑ کر بقیہ پر عمل کرکے

معاملہ کو تبدیل کرنے کی گنجائش ہوگی، اس سے تمام کے تمام کام بن جائینگے، کہ مشتری سے سلم کا معاملہ کرے اور پھر تاجر سے خرید کر مشتری کو پہنچا دے۔

محور دوم:

۱۔ پرچی میں لکھی ہوئی رقم سے کم میں اسے فروخت کرنا میعادی چیک کی بیع اور بیع الجامکیہ کے مرادف ہوکر ناجائز اور حرام ہوگا، قبل ازوقت کم قیمت میں پرچی اور بل فروخت کرنے میں سود اور ربا پایا جاتا ہے، لہذا اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے (مستفاد ایضاح النوادر ۱،۳۶)۔

''إن بيع الصک والبراءة والجامكية إنما لا يجوز'' (اعلاء السنن)۔

''وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية'' (درمختار مع الشامی)۔

البتہ گناہ سے بچنے کے لئے یہ حیلہ کیا جاسکتا ہے کہ بائع دلال سے پرچی میں لکھی رقم سے کم بنام قرض لے لے اور کہہ دے کہ فلاں تاریخ کو فلاں شخص (مشتری) سے اس پرچی کے ذریعہ رقم وصول کرکے لے آنا، اور اس رقم میں سے اپنا قرض کاٹ لینا اور بقیہ رقم آپ کے کام کی مزدوری ہے، مثلاً پرچی میں ۳۰۰،روپے لکھے ہوئے ہیں تو دلال سے ۲۵۰،روپے قرض لے اور جب دلال مشتری سے رقم وصول کرلے تو ۲۵۰،روپے تو بہ طور قرض اس سے وصول کرلے گا اور بقیہ پچاس روپے بہ طور مزدوری لے گا (مستفاد: امداد الفتاوی۳،۱۶۹، فتاوی قاسمیہ)۔

۲۔ خود ہی سودی قرض لے یا کسی اور سے لینے کے لئے کہے، بات تو ایک ہی ہے کہ سودی قرض لیا جارہا ہے جو ناجائز اور حرام ہے، یہاں کوئی اضطراری صورت بھی نہیں کہ گنجائش دی جائے۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:''أحل الله البيع وحرم الربا'' (سورة البقرہ)۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے: ''لعن رسول اللہﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال هم سواء'' (مسلم)۔

اس صورت میں سودی قرض لینے سے بچنے اور بائع کو راضی کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بائع اور مشتری اس بیع کو فسخ کردے اور پھر نئے سرے سے نئی قیمت پر خریدوفروخت کا معاملہ کرے، اس نئے معاملہ میں عاقدین قیمت بڑھا کر بھی طے کرسکتے ہیں، تاکہ بائع کا نقصان نہ ہو اور مشتری سودی قرض سے بچ جائے۔

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مشتری سے استیفاء ثمن متعذر ہوجائے تو بائع کی رضامندی فوت ہوگئی، لہذا معاملہ خود بہ خود فسخ ہوجائے گا، اب اس صورت میں پہلے معاملہ کو فسخ کئے بغیر بھی نیا معاملہ کرسکتے ہیں۔

''لأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشترى، فات رضا البائع، فيسبب بفسخه''

(ہدایہ۳،۱۴۷، البحر الرائق۷،۶۱)۔

۳۔ اولاً اصولی بات یہ ہے کہ دونوں طرف وعدۂ بیع ہے اور پھر بائع سے پانچ سو روپے کیرٹ کے حساب سے خرید کر کسی دوسرے کو سات سو روپے کے حساب سے بیچ دیتا ہے اور پھر بائع سے قیمت کم کراکر چار سو روپے کے حساب سے دیتا ہے تو چونکہ حط ثمن بتراضی ہے، لہذا بیع متحقق ہوجانے کے بعد بھی جائز ہے، اور اس پہلے معاملہ میں حط ثمن کی وجہ سے دوسرے معاملہ میں حط ثمن ضروری نہیں، کیوں کہ خریدار کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنا مال جس قیمت میں چاہے بیچے، البتہ مشتری ثانی کے ساتھ مبیع کی صفات وغیرہ بیان کرنے میں دھوکہ سے کام نہ لیا جائے۔

''ویجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک فالزیادة والحط یلتحقان بأصل العقد عندنا'' (ہدایہ)۔

''ومن اشتری شیئاً وأغلی فی ثمنہ جاز'' (ہندیہ۳،۱۶۱)۔

۴۔ شرعی اصطلاح میں عیب مبیع کے اس نقصان کا نام ہے جس کی وجہ سے ارباب تجارت کے یہاں مبیع کی قیمت کم ہوجاتی ہو۔

''العیب:ہو ما ینقص ثمن المبیع عند التجار وأرباب الخبرة'' (المجلہ: مادہ: ۳۳۸)۔

صورت مسئولہ میں بائع سے مبیع خریدتے ہوئے ایسے ہی عیوب بیان کرکے قیمت کم کرائی ہے تو اسے فروخت کرتے ہوئے ان عیوب پر مشتری کو مطلع کرنا یا تمام عیوب سے براء ت ظاہر کرنا ضروری ہے، ورنہ مشتری کو ان عیوب پر مطلع ہونے پر خیار عیب حاصل ہوگا۔

''إذا ذکر البائع أن فی المبیع العیب کذا وکذا وقبل المشتری مع علمہ بالعیب فلا یکون لہ الخیار بسبب ذلک العیب، إذا باع مالاً علی أنہ برئ من کل عیب ظہر فیہ فلا یبقی للمشتری خیار عیب'' (المجلہ: المادہ: ۳۴۱۔۳۴۲)۔

''ولو برئ من کل عیب صح وإن لم یسم الکل فلا یرد بعیب'' (کنز الدقائق)۔

عیوب سے براء ت کا مطلب یہ ہے کہ آج کے دور میں بائع نے اس طرح کہہ دیا کہ ''اچھی طرح دیکھ لیں بعد میں کوئی عیب نظر آیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں، تو یہ تمام عیوب سے براءت ہوجائے گی۔

''ہل یجوز للبائع أن یشترط البراءة من العیب، قد اختلف فیہ الفقہاء، فأما الحنفیۃ فقالوا: إذا شرط البائع البراءة من العیب، یعتبر ہذا الشرط فلا یثبت للمشتری الرد بالعیب ..... والمعروف فی زماننا أن البائع یقول:بعتک ہذا الشئی علی أساس أنہ یباع، کما ہو'' (asis) وہو فی عرف التجار یعتبر براءة من کل عیب، فیعتبر'' (فقہ البیوع۲،۸۴۵،۸۴۴)۔

بعض مرتبہ خریدارمبیع کے عیوب پر بتلائے بغیر مطلع نہیں ہوسکتا، اور بائع

عیوب سے باخبر ہوتا ہے، نیز مشتری ان عیوب پر مطلع ہوجائے تو اس بیع پر راضی ہی نہ ہوگا یا قیمت ضرور کم کروائے گا، لہذا ان جیسی صورتوں میں انسانی رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ عیوب سے براءت ظاہر کرنے کی بجائے مشتری کو مکمل عیوب سے باخبر کیا جائے۔

بعض حضرات فقہاء نے صراحت کی ہے کہ عیب سے مطلع کرنا واجب ہے، عقبہ بن عامرؓ کی حدیث ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے نبی پاکﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''المسلم أخو المسلم ولا یحل لمسلم باع من أخیہ بیعاً وفیہ عیب إلا بینہ لہ'' (ابن ماجہ)۔

حضرت واثلہ بن الاسقعؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''لا یحل لأحد یبیع شیئاً إلا یبین ما فیہ ولا یحل لمن یعلم ذلک إلا بینہ'' (مسند احمد)۔

امام شافعیؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدبن حنبلؒ کا مسلک (تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ) بھی یہی ہے کہ بائع عیب سے باخبر ہے تو مشتری کے سامنے ان عیوب کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۵۔ مشتری مال کی ملاوٹ سے واقف ہے تب تو کوئی حرج نہیں، البتہ اگر وہ واقف نہیں تو تاجر کے لئے ضروری ہے کہ مبیع میں ملاوٹ سے اسے مطلع کرے ورنہ سخت گنہ گار ہوگا، حدیث شریف میں ہے: ''المسلم أخ المسلم ولا یحل لمسلم باع من أخیہ بیعاً وفیہ عیب إلا بینہ لہ'' (ابن ماجہ)، ایک حدیث میں ہے: ''لا یحل لأحد یبیع شیئاً إلا یبین ما فیہ ولا یحل لمن یعلم ذلک إلا بینہ'' (مسند احمد)۔

اگر عیب پر مطلع کئے بغیر فروخت کردیا تو مشتری کو خیار عیب حاصل ہوگا، اس بنیاد پر مشتری کو مبیع لوٹانے کا حق ہوگا۔

''خیار العیب:حق یثبت للمشتری لرد المبیع بسبب عیب کان فی المبیع وقت الشراء ولم یطلع علیہ وأصلہ دلالۃ قولہ تعالی: ''یاأیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (نساء) فدلت الآیۃ علی أن عدم الرضا یمنع صحۃ البیع فإن فقد الرضا من أصلہ لا یتحقق البیع شرعاً وإن اختل رضا المشتری بسبب العیب فإنہ یوجب الخیار فیہ اتباعاً للحکم علی قدر الدلیل وقد وردت السنۃ بہذا الخیار أیضاً، فأخرج أبوداؤد عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: أن رجلاً ابتاع غلاماً فأقام عندہ ما شاء اللہ أن یقیم، ثم وجد بہ عیباً فخاصمہ إلی النبیﷺ، فردہ علیہ، فقال الرجل:یا رسول اللہ ﷺ! قد استغل غلامی، فقال رسول اللہﷺ:''الخراج بالضمان'' (سنن ابی داؤد، فقہ البیوع۲/۸۲۶)۔

''إذا ذکر البائع أن فی المبیع عیب کذا وکذا وقبل المشتری مع علمہ بالعیب فلا یکون لہ الخیار بسبب ذلک العیب'' (المجلہ/۶۷)۔

۶۔ خریدوفروخت میں زیادہ سے زیادہ نفع لینے کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں،

فریقین کی باہمی رضامندی سے تھوڑا یا زیادہ لینے کی گنجائش ہے، البتہ اتنا زیادہ نفع لینا جو عام مارکیٹ کے تاجروں کی نظر میں زیادہ بنتا ہو، غبن فاحش (زبردست دغابازی) کہلاتا ہے، بے مروتی ہے اور مشتری کو بتلائے بغیر مکروہ ہے۔

''عن أنس بن مالکؓ قال: غلا السعر علی عہد رسول اللہ، فقالوا:یا رسول اللہ! قد غلا السعر، فسعر لنا، فقال:''إن اللہ ہو المسعر القابض الباسط الرزاق، إنی لأرجو أن ألقی ربی ولیس أحد یطلبنی بمظلمۃ فی دم ولا مال'' (سنن ابن ماجہ)۔

''ومن اشتری شیئاً وأغلی فی ثمنہ فباعہ مرابحۃ علی ذلک جاز وقال أبویوسف رحمہ اللہ إذا زاد زیادۃ لا یتغابن الناس فیہا فإنی لا أحب أن یبیعہ مرابحۃ حتی یبین'' (ہندیہ۳،۱۶۱)۔

محور سوم:

۱۔ دین مؤجل میں قبل از وقت ادا کرنے میں دین میں کمی کی جائے تو یہ جائز نہیں۔

الف: معاملہ ہی اسی طرح طے پایا ہے، لہذا قطعاً جائز نہیں۔

ب: عقد میں تو طے نہیں پایا مگر مارکیٹ میں چلن عام ہونے سے ''المعروف کالمشروط '' کے قاعدہ سے جائز نہ ہوگا۔

''ومما یتعامل بہ بعض التجار فی الدیون المؤجلۃ أنہم یسقطون حصۃ من الدین بشرط أن یعجل المدیون باقیۃ قبل حلول الأجل، مثل أن یکون لزید علی عمرو الف، فیقول زید:''عجل لی تسع مائۃ وأنا أضع عنک مائۃ''، وإن ہذہ المعاملۃ معروفۃ فی الفقہ باسم ''ضع وتعجل'' وہذا التعجیل إن کان مشروطاً بالوضع من الدین: فإن المذاہب الأربعۃ متفقۃ علی عدم جوازہ'' (فقہ البیوع۱،۵۴۵۔۵۴۶)۔

ج: البتہ اگر عقد میں شرط نہیں لگائی اور نہ ہی اس کا عرف ہے تو بہ تراضی عاقدین ثمن میں کمی کرنا جائز ہے۔

''ویجوز أن یحط عن الثمن ..... فالزیادۃ والحط یلتحقان بأصل العقد عندنا'' (ہدایہ)۔

''فإن کان البائع قد قبض الثمن ثم حط البعض أو قال: حططت بعض الثمن عنک صح ووجب علی البائع رد مثل ذلک علی المشتری'' (ہندیہ۳،۱۶۷)۔

۲۔ اگر کاریگر مطلوبہ شئی کے معیار میں کمی رکھتا ہے تو بنوانے والے کو اختیار ہوگاکہ کاریگر کو جو مال اور میٹریل دیا تھا اس کا ضامن بنائیں اور یہ تیار شدہ مال کاریگر کا ہوجائے گا، اور وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا، نیز اس بات کا بھی اختیار ہوگا کہ بنوانے والا تیار شدہ مال لے لیں اور کاریگر کو اجرت مثل ملے گی جو اجرت مسمی سے زیادہ نہ ہوگی۔

صورت مسئولہ میں رجیکٹ (Reject) مال کہہ کر کاریگر کو اجرت مثل دیئے بغیر لے لینا قطعاً جائز نہیں، یہ ایک قسم کا ظلم ہے۔

‘‘صورة الاستصناع أن يدفع الرجل إلى رجل حديداً أو نحاساً ليصوغ له إناءاً أو نحو ذلک فإن وافق شرطه فليس للصانع أن يمتنع من الدفع ولا للمستصنع أن يمتنع عن القبول وإن خالفه كان للمستصنع الخيار إن شاء ضمنه حديداً مثل حديده والإناء للصانع ولا أجر له وإن شاء أخذ الإناء وأعطى الصانع أجر مثل عمله لا يجاوز به المسمى’’ (ہندیہ)۔

۳۔ تجار میں یہ عرف رائج ہے، نیز آئندہ چل کر کسی طرح کے نزاع کا خطرہ نہیں ہوتا، لہذا تحریر میں ایک صفر کم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۴۔ انکم ٹیکس اور قانونی کارروائی سے بچنے کی خاطر یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے، اس میں بائع کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے کہ اسے تو مکمل ثمن پہنچ رہا ہے، لہذا یہ عمل جائز ہے۔

۵۔ زیورات وغیرہ بناتے ہوئے جو ذرات اور ٹکڑے نکلتے ہیں، یہ بھی بہت قیمتی ہوتے ہیں، کاریگر کے ذمہ ضروری ہے کہ زیور بنانے والے کو سپرد کردے، ورنہ غاصب کہلائے گا، اور عند اللہ سخت پکڑ ہوگی۔

‘‘من اكتسب مالاً بغير حق فأما أن يكون كسبه بعقد فاسد أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه ولكن أن أخذه من غيره عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه’’ (بذل المجهود، ہندیہ، شامی)۔

البتہ بعض ذرات وہ ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے جو کاریگر کے بدن سے چپک جاتے ہیں، اسی لئے عام طور پر جہاں اس طرح کا کام ہوتا ہے، اسی جگہ کاریگروں کے لئے غسل خانہ بنایا جاتا ہے، کام سے فارغ ہوکر جب وہ غسل کرتے ہیں تو ان کے غسل کا پانی محفوظ کیا جاتا ہے، اور پھر بیچا جاتا ہے، اس پانی کا خریدار اس پانی کو مشینوں سے چھان کر سونے کے ذرات نکالتے ہیں۔

اسی طرح جس چٹائی پر بیٹھ کر زیورات بنانے کا کام ہوتا ہے، اس پر سے بھی مشینوں کے ذریعہ ذرات لئے جاتے ہیں، اس طرح کے ذرات کا ضمان کاریگر پر نہیں آنا چاہئے، کیوں کہ یہ اس کے قبضہ سے باہر کی چیز ہے اسے غصب بھی نہیں کہا جائے گا۔

۶۔ خریدار تاجر بائع کی بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو بائع کو چاہئے کہ اس سے معاملہ ہی نہ کرے، کہ اس کا نقصان نہ ہو، البتہ اس کے بعد بھی فروخت پر راضی ہوتا ہے تو خریدار گنہ گار نہ ہوگا، کیوں کہ یہاں کوئی جبر ہے نہ دھوکہ، عاقدین کی رضامندی سے معاملہ ہورہا ہے۔

‘‘البيع هو مبادلة المال بالمال بالتراضي’’ (النہر الفائق)۔

‘‘الأصل في العقود المالية بنائها على التراضي’’ (الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی)۔

۷۔ پرچی میں صرف ایک قیراط کی خریداری درج ہونے کی بنیاد پر پانچ سینٹ کی قیمت ادا نہ کرنا حرام اور ناجائز ہے، اس کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، یہ بائع کی رضامندی

کے بغیر حط ثمن ہے جو ناجائز اور غصب کے حکم میں ہوگا، خریدار تاجر کے ذمہ ضروری ہے کہ پانچ سینٹ کی قیمت بھی ادا کرے ورنہ وہ سخت گنہ گار ہوگا، ''قال النبیﷺ: ''من غش فلیس منا'' ۔

''من اکتسب مالاً بغیر حق فأما أن یکون کسبہ بعقد فاسد أو بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول ففی جمیع الأحوال المال الحاصل لہ حرام علیہ ولکن أن أخذہ من غیر عقد لم یملکہ ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ'' (بذل المجہود)۔

البتہ جب یہ خریدار تاجر آگے کسی اور کو یہی مال ایک قیراط اور پانچ سینٹ کہہ کر بیچتا ہے تو یہاں خریدار کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہورہا ہے، لہذا یہ بیع ثانی درست ہے۔

۸۔ پرچی میں لکھی کم قیمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غلط بیانی سے کام لے کر قیمت کم کرانا قطعاً جائز نہ ہوگا، اس صورت میں بائع مجبوری میں معاف بھی کردے، تب بھی معاف نہ ہوگا، خریدار کے ذمہ ضروری ہوگا کہ کل رقم ادا کرے۔

تفسیر مظہری میں ہے: ''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم یعنی لا یأکل أحد منکم مال غیرہ من المسلمین ومن تبعہم من أہل الذمۃ .....بالباطل أی بوجہ ممنوع شرعاً کالغصب والسرقۃ والخیانۃ والقمار والربو والعقود الفاسدۃ'' (۸۷،۲)۔

''عن أبی حرۃ الرقاشی عن عمہ أن رسول اللہﷺ قال: ألا لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ'' (شعب الایمان للبیہقی۳۸۷،۴)۔

''لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی'' (شامی)۔

محور چہارم:

۱۔ مجلس عقد ہی میں نقد معاملہ طے ہوتا ہے اور نقد کی بنیاد پر ثمن میں کمی کی جاتی ہے تو یہ معاملہ بالکل جائز ہے۔

''ألا تری أنہ یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ)۔

۲۔ دیون مؤجلہ میں مدیون سے وقت مقررہ سے قبل دین ادا کرنے پر دین کا ایک حصہ ساقط کرنے کی شرط لگانا درست نہیں، گویا دین کو وقت سے قبل ادا کرنے کے عوض دین معاف کیا گیا جو قطعاً ناجائز ہے۔

''ومما یتعامل بہ بعض التجار فی الدیون المؤجلۃ أنہم یسقطون حصۃ من الدین بشرط أن یعجل المدیون باقیۃ قبل حلول الأجل، مثل أن یکون لزید علی عمرو ألف، فیقول زید ''عجل لی تسع مائۃ وأنا أضع عنک مائۃ، وإن ہذہ المعاملۃ معروفۃ فی الفقہ باسم ''ضع وتعجل'' وہذا التعجیل إن کان مشروطاً بالوضع من الدین، فإن المذاہب الأربعۃ متفقۃ علی عدم جوازہ'' (ہدایہ مع فتح القدیر، فقہ البیوع۵۴۵،۱، ۵۴۶)۔

۳۔ خریدار کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ مبیع (ڈائمنڈ) بائع کو واپس کردے اور مکمل

ثمن کا مطالبہ کرے، البتہ دونوں کو ایسی صلح کرنے کا بھی اختیار ہے کہ مشتری مبیع اپنے پاس رہنے دے اور دونوں آپسی رضامندی سے قیمت کا کچھ حصہ کم کردے، بہ شرطیکہ یہ معاملہ شریعت کی طرف سے طے کردہ صلح کی شرائط کے مطابق ہو۔

مقتضی خیار العیب:ثم مقتضی خیار الرد أن المشتری لہ أن یرد المبیع إلی البائع ویطالبہ برد الثمن، وہل یجوز لہ أن یمسک المبیع ویطالبہ ببعض الثمن ضماناً للنقصان (الأرش)؟، اختلف فیہ الفقہاء فمذہب الحنفیۃ والشافعیۃ أنہ لا یحق لہ أن یجبر البائع علی ذلک وإنما حقہ فی فسخ المبیع واشتراء المبیع أو إمساکہ بدون مطالبۃ الأرش وکذلک لا یجوز للبائع أن یجبر المشتری علی إمساک المبیع مع قبول ضمان النقصان وعللہ صاحب الہدایۃ بقولہ ''لأن الأوصاف لا یقابلہا شئ من الثمن فی مجرد العقد ولأنہ لم یرض بزوالہ عن ملکہ بأقل من المسمی فیتضرر بہ ودفع الضرر عن المشتری ممکن بالرد بدون تضررہ''۔

''أما إذا رضی المتبایعان علی الأرش بطریق الصلح، جرت علیہ الأحکام الصلح عند الحنفیۃ، قال ابن ہمامؒ: ولو وجد بہ عیباً فاصطلحا علی أن یدفع أو یحط دیناراً جاز''(فقہ البیوع)۔

''صاحب خیار العیب لہ قبول المبیع بثمنہ المسمی کلہ ولیس لہ إمساکہ ونقص الثمن بما یقابل العیب إلا إذا رضی البائع'' (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام۱؍۳۳۵)۔

۴۔ اس طرح کرنا سراسر دھوکہ ہے، مشتری کو خیار عیب حاصل ہوگا اور وہ اس کی بنیاد پر مال واپس دے کر مکمل رقم واپس لے گا۔

''مقتضی خیار الرد أن المشتری لہ أن یرد المبیع إلی البائع ویطالبہ برد الثمن'' (ایضا)۔

۵۔ یہ شرکت کا معاملہ ہے، اس صورت میں زید کو ڈائمنڈ میں جو شریک کیا جاتا ہے، یہ بہ طور بیع تولیہ کے ہوتا ہے، یعنی جتنی قیمت میں آپ نے خریدا ہے مثلاً دو لاکھ روپیہ میں تو کسی کو شریک کرنے کے لئے اسی قیمت میں شریک کرنا ضروری ہے۔

صورت مسئولہ میں زید کو جب شریک کیا جارہا ہے تو دولاکھ روپے کے حساب سے کرنا ضروری ہے۔

''التولیۃ:بیع یتفق فیہ الطرفان علی أن البائع یبیع المبیع بتکلفتہ بدون أی ربح ومن أقسامہ الإشراک وہو أن یکون أحد الطرفین اشتری شیئاً لنفسہ، ثم أشرک الآخر فی حصۃ منہ بنسبتہ من الثمن مثل أن یشتری أرضاً بمائۃ ألف، ثم یشرک غیرہ فی نصفہا بخمسین ألفاً وجاء فی المحیط ما ملخصہ:

''إذا اشتری الرجل شیئاً وقال لہ الآخر:أشرکنی فیہ، فأشرکہ، فہذا بمنزلۃ البیع فإن لم یعرف الثمن، فقیل: البیع فاسد، وقیل صحیح لأن الثمن معلوم فی نفسہ وإن لم یعرف المشتری فہو کشراء ما لم یرہ'' (المحیط البرہانی ۶؍۱۴)۔

''والإشراک تولیۃ:لکنہ تولیۃ لبعض المبیع ببعض الثمن والعلم بالثمن کلہ شرط صحۃ البیع'' (بدائع الصنائع۴؍۴۶۱، فقہ البیوع۲؍۴۳۳)، البتہ اگر شرکت کے الفاظ استعمال نہ

کرے، بلکہ خریدوفروخت یعنی زید سے سیدھے اس ڈائمنڈ کے آدھے حصہ کو بیچنے کی بات کرے تو اس صورت میں بطور مرابحہ یا مساومہ منافعہ لینے کا جواز ہوگا اور لفظ شرکت میں بیع تولیہ یعنی نہ نفع نہ خسارہ (No Loss No Profit)کی بنیاد پر شریک کرنا ہوگا، کما مر آنفاً۔

۶۔ ‘ب ’ کے لئے ‘ج ’ کو ڈائمنڈ میں شریک کرنا ہی درست نہیں، چونکہ مبیع کا بائع کی مملوک ہونا ضروری ہے اور یہاں ڈائمنڈ کا مالک ‘ب ’ نہیں، بلکہ ‘الف ’ ہے، لہذا انعقاد بیع کی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے یہ شرکت جو دراصل بیع ہے درست نہیں۔

‘‘شرط انعقاد البیع أن یکون المبیع مملوکاً للبائع عند البیع، فإن لم یکن لا ینعقد ..... وہذا بیع ما لیس عندہ ونہی رسول اللہ ﷺ عن بیع ما لیس عند الإنسان’’ (بدائع)۔

‘‘والثانی: أن یکون المبیع ملک البائع فیما یبیعہ لنفسہ فلا ینعقد بیع ما لیس مملوکاً’’ (الموسوعہ)۔

البتہ اگر ‘ج ’ سے وعدۂ شرکت کرے اور پھر ‘الف ’ سے خرید کر شریک کرلے تو جائز ہے، البتہ اس صورت میں یہ بیع تولیہ ہے، ثمن اول پر شریک کرنا ضروری ہوگا، اور اگر وعدہ بیع کرے تو یہ بطور مرابحہ مزید بھی لے سکتا ہے، فقط واللہ تعالی اعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

جواہرات کی خریدوفروخت کے جوابات

مفتی محمد عثمان بستوی•

اللہ تعالی کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس وقت اہل اسلام کے اندر ایک شعور پیدا ہورہا ہے کہ وہ اپنے معاملات کو بھی اپنی عبادات کی طرح سے شریعت کے مطابق انجام دینا چاہتے ہیں، کیونکہ حلال کمائی کا انسانی زندگی کے احوال میں بڑا دخل ہوتا ہے، اس کی طرف اللہ تعالی نے خود اشارہ فرمایا: ‘‘یا أیہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً’’ پاکیزہ کمائی پر اعمال صالحہ کا ترتب ہوتا ہے، اسی لئے فقہاء اسلام نے عبادات کی طرح سے معاملات کے مسائل پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں اور جائز وناجائز کے اصول وضوابط اور تفصیلی جزئیات قلمبند فرمائی ہیں، حضرت امام محمدؒ سےلوگوں نے سوال کیا کہ آپ نے تصوف میں کوئی کتاب تصنیف نہیں فرمائی تو آپ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ ‘‘حسبکم کتاب البیوع ’’ اور زمانہ قدیم کا دستور تھا کہ تجار اپنے سفر میں فقیہ ماہر کو ساتھ رکھتے اور شریعت وتجارت کے مسائل ان سے پوچھتے رہتے، ائمہ خوارزم نے فرمایا کہ تاجر کے لئے ایک فقیہ اپنے ساتھ رکھنا ضروری ہے، تاکہ اس کے معاملات شریعت کے مطابق انجام پاتے رہیں (البحر الرائق۵،۲۶۱)۔

مذکورہ بالا آیات وروایات اور فقہی عبارات سے بخوبی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اپنے معاملات کو شریعت کے مطابق انجام دینا ہر مسلمان کے لئے ایک دینی ضرورت ہے، اس مختصر سی تمہید کے بعد سوالات کے جوابات عرض کئے جاتے ہیں، واللہ ھو الموفق المیسر۔

محور اول:

جواب: ۱۔ اگر دلال بائع کے متعین کردہ ثمن سے زائد میں فروخت کردے تو وہ زیادتی بائع کا حق ہے، دلال کے لئے خود رکھ لینا شرعاً ناجائز وحرام ہے، کیوں کہ یہ اضافہ بیع کا عوض ہے، دلال کی حیثیت ایک اجیر کی ہے، وہ اپنی متعینہ اجرت کا حقدار ہے، خداع اور دھوکہ، کذب وغیرہ کے ذریعہ اپنی اجرت سے زائد لینا ہرگز جائز نہیں، البتہ اگر وہ بائع کو باخبر کردے اور بائع اس کے اس فعل پر بغیر کسی جبر ودباؤ کے راضی ہوجائے تو گنجائش ہوگی، ورنہ نہیں،

‘‘إذا وکلہ ببیع عبد فباعہ بألفین جاز لأن الزیادۃ ہناک بدل ملک الموکل فیکون لہ’’ (ہدایہ)۔

• مفتی واستاذ ریاض العلوم گورینی، جونپور، یوپی۔

‘‘وفی نتائج الأفکار:ولا یجوز أن یستحقہ الوکیل لا بإذن الموکل ولا بغیر إذنہ ولہذا لو قال بع ثوبی ہذا علی أن ثمنہ لک لا یصح’’ (نتائج الافکار۸؍۴۴)۔

اگر وکیل سے زیادتی خود رکھ لینے کی معاملہ میں شرط لگا دی جائے تو شرط فاسد ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہوگی اور زیادتی کا حقدار موکل ہوگا، لیکن اگر وکیل متعینہ ثمن سے زائد میں فروخت کرے اور کوئی شرط نہ لگی ہو اور موکل وہ زیادتی وکیل کو اپنی رضا اور خوشی سے دے دے تو پھر ممانعت کی کوئی وجہ نہیں، حاصل یہ کہ وکیل، دلال اگر بیع کو متعینہ ثمن سے زائد میں فروخت کردے تو وہ زیادتی موکل کا حق ہے، جیسا کہ ہدایہ، نتائج الافکار وغیرہ سے نقل کیا گیا، اور حضرت اقدس تھانویؒ نے بھی اسی طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا: ‘‘یہ مال چھ روپے من کو فروخت ہوا ہے، یہ سب روپیہ مالکوں کا حق ہے، کیونکہ ان کے مال کا بدل ہے، اس میں سے بیوپاری مذکور کو فی من ایک روپیہ رکھنا جائز نہیں، ہاں اگر مالکوں کو خبر ہوجاوے اور وہ اس کو معاف کردیں تو بعد معاف کردینے کے اس کو حلال ہوجائے گا، اگر مالکوں کو خبر نہ ہوئی یا وہ معاف نہ کرے تو وہ روپیہ حرام رہتا، قال اللہ تعالی: ‘‘ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم’’ (امداد الفتاوی۳؍۴۰۷)۔

جواب: ۲ ۔ (الف) تخریج جواب میں سہولت کے لئے اولاً چند مسائل نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ باب بیع میں چونکہ حقوق وکیل سے متعلق ہوتے ہیں، اس لئے وکیل بالبیع اپنے لئے خریدنے کا حق نہیں رکھتا ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں بائع اور مشتری دونوں کے حقوق ایک ہی شخص سے متعلق ہوجائینگے اور شخص واحد مطالِب اور مطالَب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے، لہذا جس چیز کے فروخت کرنے کا وکیل ہو اس کو اپنے لئے نہیں خرید سکتا ہے:

‘‘الوکیل بالبیع لا یملک شراءہ لنفسہ لأن الواحد لا یکون مشتریاوبائعاً’’ (البحر الرائق ۷؍۱۶۷)۔

‘‘إذا اشتری الوکیل بالبیع مال موکلہ لنفسہ لا یصح لأنہ لا یجوز لأحد أن یکون بائعاً ومشتریاً فی عقد واحد بسبب إن ذلک یؤدی إلی تضاد الأحکام ولأنہ یوجب أن یکون المشتری والمستقضی والقابض والمسلم والمخاصم فی العیب والمخاصم واحداً’’ (شرح المجلہ۱۰۔۱۱؍۶۲۸، تکملۃ رد المحتار۱۱؍۴۴۶)۔

البتہ اگر موکل اس کی بیع کو نافذ وصحیح قرار دے تو امام صاحب کی ایک روایت کے مطابق اجازت کے بعد بیع بنفسہ صحیح ہوجائے گی، ‘‘وکان فی المسألۃ قولین:والوجہ ما فی النہایۃ إلا إذا أجاز الموکل بعد البیع فلایرد ما ذکرہ’’ (منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق ۷؍۱۶۶)، ‘‘وفی البزازیۃ:وإن أمرہ الموکل أن یبیعہ لنفسہ أو أولادہ الصغار أو ممن لا تقبل شہادتہ لہ فباع منہم جاز’’ (تکملۃرد المحتار۱۱؍۴۴۶)۔

٢۔ وکیل بالشراء اگر کسی متعین چیز کے خریدنے کا وکیل ہو تو موکل کی عدم موجودگی میں بغیر اس کو اطلاع کئے وکیل کا وہ چیز اپنے لئے خریدنا شرعاً جائز نہیں، کیوں کہ اپنے لئے خریدنے کی صورت میں وکالت سے عزل ہے اور وکیل کے لئے اپنے کو بغیر اطلاع کے معزول کرنا صحیح ودرست نہیں، لہذا عدم موجودگی میں اگر بغیر اطلاع کے وکیل اپنے لئے خرید لے تو یہ شرعاً جائز نہیں اور وہ خریداری موکل ہی کے لئے ہوگی۔

''ولو وکلہ بشراء شئ بعینہ فلیس لہ أن یشتریہ لنفسہ لأنہ یؤدی إلی تغریر الآمر حیث اعتمد علیہ ولأن فیہ عزل نفسہ ولا یملکہ علی ما قیل إلا بمحضر من الموکل'' (ہدایہ)۔

''وفی نتائج الأفکار:وإذا اشتری یقع الشراء للموکل لأن شراءہ لنفسہ عزل لنفسہ عن الوکالۃ وہو لا یملک ذلک إلا بمحضر من الموکل'' (نتائج الأفکار۴۵٫۸، ہکذا فی البحر۱۵۸٫۷، وفی شرح المجلہ، رقم المادہ: ۱۵۲۴، ۱۰۔۱۱٫۶۶۱)۔

٣۔ اگر غیر متعین چیز خریدنے کا وکیل ہو تو ایسی صورت میں اگر وکیل اپنے مال سے اپنے لئے خریداری کرے تو یہ صحیح اور درست ہے اور خریدی ہوئی چیز وکیل کی ملکیت ہوگی، نہ کہ موکل کی، البتہ اگر موکل کی نیت سے یا موکل کے مال سے خریداری کرے گا تو وہ چیز موکل کی ہوجائے گی۔

''وإن کان بغیر عینہ فالشراء للوکیل إلا أن ینوی للموکل أو یشتریہ بمالہ'' (البحر الرائق۱۶۰٫۷، ہدایہ مع نتائج الافکار۴۸٫۸)۔

۴۔ قاصد اور رسول کے احکام وکیل سے مختلف ہیں، لہذا اگر دو شخصوں کے درمیان پیغام رسانی اور معاملہ کی انجام دہی کے لئے کوئی واسطہ بنے اور کسی کا وکیل نہ ہو تو ایسی صورت میں واسطہ کا اپنے لئے خرید لینا جائز ہے، ''الرسول إذا لم یضف عقد الشراء إلی المرسل لم یقع الشراء للمرسل بل یقع للرسول لأن الشراء متی وجد نفاذاً لم یتوقف فإذا أضاف المشتری العقد إلی نفسہ وقع الشراء لہ ولزمہ الثمن ولا یقبل منہ قولہ کنت رسولاً لأن إضافۃ العقد إلی نفسہ تنافی الرسالۃ'' (شرح المجلہ لرستم باز ، رقم المادہ: ۱۴۶۲، ص٫۷۸۴)۔

درج ذیل صورتوں میں دلال کا اپنے لئے خریدنا جائز ہے:

١۔ دلال بائع اور مشتری میں سے کسی کا وکیل نہ ہو؛ بلکہ وہ دونوں کے درمیان رابطہ کنندہ ہو تو اس صورت میں دلال کا اپنے لئے خریدنا جائز ہے۔

٢۔ دلال مشتری کا وکیل ہو، لیکن اسی سامان کے خریدنے پر مامور نہ ہو، بلکہ دلال کو اس سامان اور اسی نوع کے دوسرے سامان کو خریدنے کا اختیار ہو تو اس صورت میں بھی دلال کا اپنے مال سے اپنے لئے خریدنا جائز ہے۔

٣۔ دلال اگر مشتری کی طرف سے وہی متعینہ سامان خریدنے پر مامور ہو اور مشتری کو اطلاع دینے کے بعد خریداری کرے یا بائع کا وکیل ہو اور اپنے لئے خریداری پر بائع کی

رضا واجازت موجود ہو تو بھی دلال کے لئے اپنی خاطر خریدنے کی گنجائش ہے۔

عدم جواز کی صورت:

دلال اگر بائع کاوکیل ہو یا مشتری کا وکیل اسی متعینہ سامان کو خریدنے کے لئے ہو تو اس صورت میں دلال کے لئے خریدنا جائز نہیں ہے، جب تک کہ بائع اجازت نہ دے اور مشتری کو اطلاع نہ کرے۔

نوٹ: جن صورتوں میں دلال کا اپنے لئے خریدنا جائز ہے ان صورتوں میں اپنے لئے خریداری کرنے پر دلال کو اپنی فیس اور کمیشن نہیں ملے گی، کیوں کہ وہ کمیشن اجرت ہے جس کا بغیر عمل کے استحقاق نہ ہوگا۔

جواب: ۲۔ (ب): دھوکہ دینا شریعت میں ناجائز وحرام ہے، اسی وجہ سے حدیث میں خریدنے کے ارادہ کے بغیر صرف قیمت بڑھانے کے لئے قیمت لگانے سے منع کیاگیا ہے:

''النجش أن یزید الرجل فی ثمن السلعۃ لا لرغبۃ نفسہ فی شراءہا بل لیخدع غیرہ لیرغب فیہا ویشتریہ بثمن زائد وہو ممنوع بنص الحدیث'' (فقہ البیوع۱؍۱۴۰)۔

''عن أبی ہریرۃؓ قال: نہی رسول اللہﷺ أن یبیع حاضر لباد ولا تناجشوا ولا یبیع الرجل علی بیع أخیہ ولا یخطب علی خطبۃ أخیہ ولا تسأل المرأۃ طلاق أختہا لتکفأ ما فی إناءہا'' (بخاری؛ رقم الحدیث: ۲۱۴۰)۔

''عن ابن عمرؓ قال: نہی النبیﷺ عن النجش'' (البخاری؛ رقم الحدیث: ۲۱۴۲)۔

''وقال ابن أبی أوفی: الناجش أکل ربا خائن وہو خداع باطل لا یحل، قال النبیﷺ الخدیعۃ فی النار'' (بخاری؛ باب النجش؍۶۰)۔

ان روایات کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ فرضی خریدار کے ذریعہ مشتری سے زائد قیمت وصول کرنا خداع اور فریب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں اور عدم جواز کی علت مال مسلم کو طیب خاطر کے بغیر دھوکہ کے ذریعہ حاصل کرنا ہے، لہذا یہی علت اور وجہ اس صورت میں بھی پائی جاتی ہے جب بائع کو فرضی خریدار کے ذریعہ مارکیٹ سے کم قیمت پر راضی کرلیا جائے تو اس میں بھی خداع، فریب اور طیب نفس کے بغیر مال کو حاصل کرنا پایا جاتا ہے، تو اس صورت کا بھی حکم نجش کاحکم ہوگا، البتہ اگر فرضی خریدار کے ذریعہ بائع کو اس کی مارکیٹ قیمت پر راضی کیا جائے تو اس میں علت نہی کے مفقود ہونے کی وجہ سے جواز کے دائرہ میں آئے گا، جیسے کہ فرضی خریدار کے ذریعہ مشتری کو مارکیٹ قیمت کی ادائیگی پر راضی کرنا جائز ہے (شامی۷؍۳۰، فتح ۶؍۱۰۶)۔

''النجش أما معناہ فی الاصطلاح الفقہی فہو أن یزید الرجل فی ثمن السلعۃ لا لرغبۃ نفسہ فی شراءہا بل لیخدع غیرہ لیرغب فیہا ویشتریہ بثمن زائد وقد ورد النہی فی الحدیث

الصحیح، ولذلک أجمع الفقہاء علی حرمتہ فإن کان الناجش فعل ذلک من عند نفسہ ولم یعلم بہ البائع أو لم یأمرہ فالإثم علی الناجش وحدہ، وإن وقع ذلک بمواطاۃ من قبل البائع فالإثم علیہما'' (فقہ البیوع،۹۸۸)۔

سوال میں درج شکل نجش کے دائرہ میں آتی ہے اور نجش والی تمام علتیں اس میں بھی موجود ہیں، اس لئے مذکورہ طریقہ سے خریدنا شرعاً جائز نہیں اور اگر کوئی خرید لے بشرطیکہ وہ بائع ومشتری میں سے کسی کا وکیل نہ ہو تو اس کی خریداری کراہت تحریمی کے ساتھ صحیح ہوجائے گی۔

مذکورہ طریقہ پر خرید وفروخت کا حکم:

جمہور فقہاء کے نزدیک اگر اس طرح سے خرید وفروخت کی جائے تو بیع منعقد ہوجائے گی، لیکن جس نے اس طرح کیا ہے اور اس خریداری کے ذریعہ جو نفع کمایا ہے وہ خبیث ہے، لہذا اس کا تصدق یا رد علی المالک واجب ہے یا بیع کو فسخ کرکے از سر نو بغیر خداع اور دھوکہ کے بیع کرنا لازم ہے، بعض فقہاء بیع کو فاسد اور اس کی آمدنی کو حرام کہتے ہیں، لیکن جمہور کے نزدیک بیع منعقد ہے اور اس پر ملکیت کے تمام احکام نافذ ہونگی۔

''أما حکم البیع الذی عقد بطریق النجش فالبیع صحیح مع الإثم عند الحنفیۃ والشافعیۃ وفی الراجح من مذہب الحنابلۃ وقال أہل الظاہر البیع باطل رأساً وبہ قال مالک وأحمد فی روایۃ وإن کان فی البیع غبن فاحش فللمشتری خیار الفسخ عند المالکیۃ والحنابلۃ ، أما عند الحنفیۃ فلا خیار للمشتری مطلقاً الخ'' (فقہ البیوع،۹۸۹)۔

فرضی خریدار کو ملنے والی اجرت کا حکم:

بائع یا مشتری کو دھوکہ دینا شرعاً ناجائز وحرام ہے اور اس کے ذریعہ سے جو اجرت حاصل کی جائے گی وہ بھی ناجائز وحرام ہوگی، کیوں کہ جائز کام کی اجرت جائز اور ناجائز کام کی اجرت ناجائز ہوا کرتی ہے، لہذا جو فرضی خریدار بائع کو دھوکہ دے کر قیمت کم کرائے یا مشتری کو دھوکہ دے کر زیادہ قیمت وصول کرائے، اس کا یہ عمل اور اجرت دونوں ناجائز ہونگے۔

''فإن کان الناجش فعل ذلک من عند نفسہ ولم یعلم بہ البائع أو لم یأمرہ فالإثم علی الناجش وحدہ وإن وقع ذلک بموطأۃ من قبل البائع فالإثم علیہما'' (فقہ البیوع،۹۸۸)۔

''ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاہی لأنہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد'' (ہدایہ۳،۳۰۶)۔

''کل إجارۃ وقعت لمظلمۃ لأنہ استئجار لفعل المعصیۃ فلا یکون المعقود علیہ مقدور الاستیفاء شرعاً'' (بدائع الصنائع۴،۲۷۸، طبع دار الفکر بیروت)۔

جواب: ۳۔ ہر ایسی مارکیٹ جس میں چوری ، غصب اور ملکیت والے سامان مخلوط

طور پر فروخت ہوں اور ان کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہو کہ کون ملکیت والے سامان ہیں اور کون چوری اور غصب والے تو اس میں اعتبار غلبہ کا ہوگا، اگر زیادہ تر مال چوری اور غصب کے ہوتے ہوں تو اس مارکیٹ سے خریداری جائز نہیں، لیکن اگر اکثریت صحیح، درست اور جائز مال کی ہو تو اس مارکیٹ سے خریداری جائز ہے، بشرطیکہ خریدے جانے والے مال کے بارے میں چوری، غصب، مال حرام وغیرہ ہونے کا علم نہ ہو، شریعت مطہرہ نے مدار غلبہ پر رکھا ہے، اس لئے کہ مارکیٹ کا بالکلیہ مال حرام سے خالی ہونا تقریباً ناممکن ہے، لہذا اگر مدار غلبہ پر نہ ہو تو ایسی صورت میں حرج عظیم پایا جائے گا جو شرعاً معفو عنہ ہے، صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت سے نقل کردیا ہے۔

''ولنا أن الغلبة تنزل منزلة الضرورة فی إفادة الإباحة، ألا تری أن أسواق المسلمین لا تخلو عن المحرم المسروق والمغصوب ومع ذلک یباح التناول اعتماداً علی الغالب وہذا لأن القلیل لا یمکن الاحتراز عنہ ولا یستطیع الامتناع منہ فسقط اعتبارہ دفعاً للحرج کقلیل النجاسة وقلیل الانکشاف'' (ہدایہ مع نتائج الافکار ۵۱۸،۱۰)۔

''إن المال مرکب من الحلال والحرام ولا یعرف أن الحلال ممیز من الحرام أو مخلوط غیر ممیز، والأولی فی ہذہ الصورة التنزہ ولکن یجوز للآخذ أن یأخذ منہ مالہ ہبة أو شراء لأن الأصل الإباحة ..... قال الإمام محمدؒ تعالی فی کتاب الآثار: ''أخبرنا أبوحنیفة قال حدثنا محمد بن قیس أن أبا العوجاء العشار کان صدیقاً لمسروق فکان یدعوہ فیأکل من طعامہ ویشرب من شرابہ ولا یسألہ، قال محمد: وبہ نأخذ ولا بأس بذلک ما لم یعرف خبیثاً بعینہ، وہو قول أبی حنیفة رحمہ اللہ تعالی'' (فقہ البیوع۱۰۳۸،۲)۔

جواب: ۴۔ فروخت کرنے والا جب یہ کہے کہ یہ مال چوری وغیرہ کا نہیں ہے تو اگر وہ خود ثقہ اور پابند شریعت ہے تو اس کی خبر معتبر ہوگی اور اس سے مال خریدنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ ثقہ اور پابند شریعت نہیں ہے تو ایسی صورت میں اگر اس کی بات اور خبر پر اطمینان ہو تو اس سے مال خریدنا جائز ہے اور اگر اطمینان نہ ہو تو مال خریدنا جائز نہیں، کیوں کہ باب معاملات میں فاسق، کافر، مستور الحال وغیرہ سب کی خبر پر اعتبار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان پر اطمینان ہو اور اگر اطمینان نہ ہوتو خبر کے مقبول اور معتبر ہونے کے لئے عدد یا عدالت شرط ہوگی، حاصل یہ کہ اگر قرائن سے فروخت کرنے والے کی بات اور خبر کا سچ ہونا معلوم ہو تو اس کی خبر پر اعتبار کرکے خریدوفروخت کرنا جائز ہے، غیر مسلم کی طرف سے مستقلا حلت وحرمت کی خبر تو معتبر نہیں، لیکن اگر حلت وحرمت کی خبر ضمنی طور پر ہو تو غیر مسلم کی طرف سے بھی مقبول ہے، جیسا کہ تمام کتب فقہیہ میں اس کی صراحت موجود ہے، لہذا بازار میں فروخت ہونے والے مال سے متعلق مسلم وغیر مسلم دونو نکی خبر اطمینان قلب کی شرط کے ساتھ معتبر ہوگی۔

‘‘ویقبل قول کافر ولو مجوسیا، قال اشتریت اللحم من کتابی فیحل أو قال اشتریتہ من مجوسی فیحرم ولا یردہ بقول الواحد وأصلہ إن خبر الکافر مقبول بالإجماع فی المعاملات لا فی الدیانات ویقبل قول المملوک ولو أنثی والصبی فی الہدیۃ سواء أخبر بإہداء المولی غیرہ أو نفسہ والإذن سواء کان بالتجارۃ أو بدخول الدار، ویقبل قول الفاسق والکافر والعبد فی المعاملات لکثرۃ وقوعہا کما إذا أخبر أنہ وکیل فلان فی بیع کذا فیجوز الشراء منہ إن غلب علی الرأی صدقہ’’ (الدر مع الرد۹؍۴۹۷)۔

جب کسی مال کے بارے میں شک وشبہ ہونے لگے تو ایسی صورت میں قرائن پر عمل کرنے کا حکم ہے، اور فروخت کنندہ کی خبر کسی قرینہ سے کم نہیں، لہذا اگر اطمینان ہو تو اس پر اعتبار کرنا جائز ہے۔

‘‘إن المدار علی غلبۃ الظن فلینظر المبتلی فی القرائن’’ (شامی۹؍۴۹۸ زکریا)۔

جواب: ۵۔ سامان کی خریداری کے وقت اس کی قیمت اور ثمن کا اپنی ملکیت اور قبضہ میں ہونا لازم وضروری نہیں، البتہ فروخت کئے جانے والے سامان کا قبضہ میں ہونا لازم ہے، لہذا اگر کوئی شخص کوئی سامان ادھار خرید کر قبضہ کرلے اور پھر اس کو کسی دوسرے سے فروخت کرکے بقایہ ادا کردے اور اگر نفع ہو تو اپنے استعمال میں لائے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، یہ صورت بلا کراہت جائز ہے، کیونکہ خریدنے اور قبضہ کرلینے کے بعد مبیع پر مشتری کی ملکیت کاملہ متحقق ہوجاتی ہے، اور مبیع سے بائع کا حق بالکلیہ ختم ہوجاتا ہے، اگرچہ ثمن کی ادائیگی نہ پائی گئی ہو، یہی وجہ ہے اگر مشتری ثمن کی ادائیگی سے عاجز اور قاصر ہوجائے تو بائع کو اپنی مبیع واپس لینے کا حق نہیں رہے گا، بلکہ مبیع کو فروخت کرکے بائع کا ثمن ادا کرنے کے بعد جو بچے وہ مشتری کو ملے گا۔

‘‘قال السرخسیؒ: وإذا اشتری الرجل فلوساً بدراہم ونقد الثمن ولم تکن الفلوس عند البائع فالبیع جائز لأن الفلوس الرائجۃ ثمن کالنقود وقد بینا أن حکم العقد فی الثمن وجوبہا ووجودہا معاً ولا یشترط قیامہا فی ملک بائعہا لصحۃ العقد کما لا یشترط ذلک فی الدراہم والدنانیر’’ (مبسوط۱۴؍۲۴)۔

‘‘غاب المشتری قبل القبض ونقد الثمن غیبۃ معروفۃ فأقام بائعہ بینۃ أنہ باعہ منہ لم یبع فی دینہ لامکان ذہابہ إلیہ وإن جہل مکانہ بیع المبیع أی باعہ القاضی أو بأمورہ نظراً للغائب وأدی الثمن ومافضل یمسکہ للغائب وإن نقص تبعہ البائع إذا ظفر بہ’’ (الدر مع الرد۷؍۴۸۳)۔

امام بخاری نے تو اس پر باب قائم فرمایا ہے:‘‘باب من اشتری بالدین ولیس عندہ ثمن الخ’’، یعنی مبیع فروخت کرنے کے وقت بائع کی مملوک ہونا تو ضروری ہے، لیکن مشتری کے لئے خریدتے وقت ثمن کا مملوک ہونا ضروری نہیں (انعام الباری۷؍۶۶۹، ۷؍۶۸۰)۔

جواب: ۶۔ کسی سامان کو خریدنے سے پہلے صرف قیمت وغیرہ معلوم کرکے

خریدار سے زیادہ قیمت میں فروخت کرنے کا معاملہ ومعاہدہ کرنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ اگر وہ سامان مصنوعات کی قبیل سے ہو تو یہ شکل استصناع میں داخل ہوکر جائز ہوگی، لیکن اگر وہ سامان مصنوعات کی قبیل سے نہ ہو مثلاً غلہ جات پھر فروٹ جانور وغیرہ تو اس کا جواز Contract یعنی سپلائی کے ٹھیکہ یا سلم کے طور پر ہوگا، تو صورت مذکورہ کا جواز یا تو استصناع میں داخل ہونے کی وجہ سے ہے، کیوں کہ استصناع کے لئے خود تیار کرنا اور بنانا شرط نہیں، بلکہ دوسرے کی مصنوعات کو حوالہ کردینا بھی جائز ہے یا سلم ومعاہدہ میں داخل ہونے کی وجہ سے، لہذا اگر وہ مصنوعات کی قبیل سے نہ ہو تو بھی یہ شکل جائز ہے، کیوں کہ مستقبل میں کسی چیز کے فروخت کرنے کا وعدہ اور معاہدہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، حضرات فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے، البتہ سلم میں دخول اسی وقت ہوگا جبکہ اس کی شرائط موجود ہوں، خصوصاً مجلس عقد میں ثمن پر قبضہ کا پایا جانا وغیرہ، اور اگر شرائط سلم واستصناع موجود نہ ہوں تو شکل معاہدہ میں داخل ہوکر جائز ہوگی، خلاصہ یہ کہ سوال نمبر ۶ میں درج شکل جواز کی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

''المبیع فی الاستصناع ہو العین لا عمل الصانع وعلی ذلک فلو أتی الصانع للمستصنع بخف من صنعہ أو من صنع غیرہ قبل الاستصناع وقبلہ کان صحیحاً'' (درر الحکام۳،۱،۳۵۹)۔

''حکم ہذہ الاتفاقیات أنہ إن کان محل التورید شئ یحتاج إلی صنعہ فیمکن تقعیدہا علی أساس الاستصناع ..... وإن کان المستورد یعجل الثمن بکاملہ عند العقد فہذا عقد یأخذ حکم السلم، أما إذا کان محل التورید شئ لا یحتاج إلی صنعۃ ولا یمکن تخریجہ علی أساس السلم فلا یجوز أن تعتبر الاتفاقیۃ عقداً باتاً للبیع أو الشراء لأنہ عقد مضاف إلی المستقبل ..... فالصحیح أن اتفاقیۃ التورید لا تعدو من الناحیۃ الشرعیۃ من أن تکون تفاہما ومواعدۃ من الطرفین، أما البیع الفعلی فلا ینعقد إلا عند تسلیم المبیعات'' (فقہ البیوع۱،۹۵)۔

محور دوم:

جواب : ۱۔ جواب سے قبل چند مسائل لکھے جاتے ہیں:

۱۔ بیع الدین من غیر من ہو علیہ الدین شریعت میں ناجائز ہے:

''بیع الدین من غیر من ہو علیہ لا یصح، قال مولانا فی فوائدہ: وبیع الدین لا یجوز ولو باعہ من المدیون أو وہبہ'' (رد المحتار۷،۳۳)۔

اور اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی ائمہ کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''دین کو کسی ایسے شخص کے ہاتھوں بیچنا جس پر دین واجب نہیں تھا یہ حنفیہ اور اکثر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں، امام مالکؒ نے نوشرطوں کے ساتھ اجازت دی ہے، امام شافعیؒ کے بھی دو قول ہیں، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ جائز

نہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بھی بالکل جائز نہیں (انعام الباری۱؍۴۸۱)۔

مالکیہ کی شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) مدیون شہر میں موجود ہو، (۲) دین کا اقرار بھی کررہا ہو، (۳) دین ان چیزوں کی قبیل سے ہو جن کی بیع قبل القبض مالکیہ کے نزدیک جائز ہے، لہذا دین غلہ کی بیع جائز نہیں، (۴) دین اپنی غیر جنس سے فروخت کیا جائے، (۵)دین سونا یا چاندی کی بیع سونے یا چاندی میں سے کسی کے عوض نہ ہو، (۶) مشتری اور مدیون کے درمیان عداوت نہ ہو، (۷) ثمن نقد ہو، ادھار نہ ہو، نیز مضمون فی الذمہ نہ ہو، (۸) قاضی کے فیصلہ کو مدیون تسلیم کرتا ہو۔

''أما المالکیۃ فأجازوا بشروط لخصہا الزرقانیؒ:الأول:أن یکون المدین حاضرا فی البلد، الثانی أن یکون المدین مقراً بالدین، الثالث:أن یکون الدین شیئاً یجوز بیعہ قبل قبضہ عند المالکیۃ، الرابع: أن یباع الدین بغیر جنسہ، الخامس أن یباع دین الذہب بالفضۃ أو بالعکس، السادس: أن لا یکون بین المدین ومشتری الدین عداوۃ، السابع: أن یکون الثمن نقداً، الثامن: أن یکون المدیون من تأخذہ الأحکام'' ۔

۲۔ بیع میں اگر وکیل ہو تو حقوق بیع وکیل سے متعلق ہوتے ہیں، اسی وجہ سے وکیل بالبیع کے ذمہ مبیع کی تسلیم اور وکیل بالشراء کے ذمہ ثمن کی ادائیگی لازم ہوتی ہے اور وکیل بالبیع اگر اجرت لے تو اس کے ذمہ ثمن وصول کرنا بھی لازم ہوتا ہے، لیکن اس کے اوپر ثمن کی ادائیگی لازم نہیں، اگر یہ ثمن ادا کرے گا بلا مشتری کے حکم کے تو یہ اس کا تبرع ہوگا اور اگر مشتری کے حکم سے ادائیگی کرتا ہے تو ان کا نائب ہوگا۔

''وإن أضیف إلی الموکل تعود حقوق العقد إلی الموکل ویکون الوکیل کالرسول، ولو باع الوکیل بالبیع مال الموکل بإضافۃ العقد إلی نفسہ کان تسلیم المبیع إلی المشتری واجباً علیہ ولہ أن یطلب ویقبض الثمن من المشتری، ویجبر الوکیل بالشراء علی أدا ثمنہ للبائع من مالہ وإن لم یقبضہ من مؤکلہ'' (شرح المجلہ المادہ: ۱۴۶۱ ملخصاً)۔

۳۔ وکیل بالشراء کو اگر بائع کل ثمن اور کل قیمت ہبہ کردے تو وکیل اپنے موکل سے پورے ثمن کا مطالبہ کرے گا، لیکن اگر بائع ثمن کو معاف کردے یا ساقط کردے تو وکیل اور موکل دونوں سے ساقط ہو جائے گا، وکیل کےلئے مطالبہ کا حق باقی نہ رہے گا (شرح المجلہ ، المادہ: ۱۴۹۰، شامی ۸؍۲۵۰، البحرالرائق۷؍۱۵۵)۔

۴۔ اگر قرض خواہ اپنے قرض وصول کرنے کا کسی کو وکیل بنا دے اور قرض کے کچھ حصہ وکیل کو ہبہ کردے تو یہ تملیک اور ہبہ صحیح ہے اور وکیل جب وصول کرے گا تو اولاً وکیل ہوگا، بعدہ ہبہ کئے ہوئے حصہ کے بقدر قبضہ کرنے میں اصیل ہوگا، البتہ اگر مجلس میں قبضہ نہ پایا جائے تو بعد میں قبضہ کے لئے صراحۃً اجازت کی ضرورت ہوگی۔

''من وہب دینہ الذی ہو فی ذمۃ واحد لآخر وأذنہ صراحۃ بالقبض بقولہ اذہب فخذہ فذہب

الموہوب لہ وقبضہ تتم الہبۃ'' (شرح المجلہ، المادہ: ۸۴۸)۔

''جاز التصرف فی الثمن ببیع أو ہبۃ ممن علیہ الدین، ولا یجوز من غیرہ إلا إذا سلطہ علی قبضہ فیکون وکیلاً قابضاً للموکل ثم لنفسہ'' (رد المحتار۷٫۳۷۶)۔

(۵) کسی معاملہ میں صحت وفساد دونوں کا احتمال ہو تو معاملہ کو صحت پر محمول کرنا اصل ہے، اس لئے صحت پر محمول کیا جائے گا اور فساد خلاف اصل ہے، لہذا جب تک ممکن ہو فساد کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

''إذا اختلف المتبایعان فی الصحۃ والفساد فالقول لمدعی الصحۃ لأنہما لما اتفقا علی العقد کان الظاہر من إقدامہما علیہ صحتہ'' (رد المحتار۷٫۳۴۷)۔

صورت مسئولہ کا حکم:

محور دوم کے تحت مذکور پہلی صورت بظاہر بیع الدین من غیر من ہو علیہ الدین کی معلوم ہوتی ہے جو شریعت میں ناجائز وحرام ہے، جیسا کہ نمبر ایک کے تحت تفصیل سے ذکر کردیا گیا، لیکن جب اس صورت میں دوسری جہات سے بھی نظر غائر ڈالی جائے تو گنجائش اور جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیوں کہ پرچی خریدنے والا دلال یا تو بائع کا وکیل ہوگا یا مشتری کا یا دونوں کا (انعام الباری ۶٫۴۵۳)، اگر یہ بائع کا وکیل ہے تو جب تک ثمن وصول نہ ہوجائے وکالت باقی ہے اور جب پرچی لے کرکے متعینہ مقدار ادا کردے تو یہ مشتری کی طرف سے بعض دین کی ادائیگی ہوگی اور بائع نے جتنا حصہ کم کیا ہے وہ دلال کے لئے ہبہ اور تملیک ہے، لہذا دلال کو وکالت کی بنا پر مشتری سے پورا ثمن وصول کرنے کا حق ہوگا اور بائع کی کم کردہ مقدار کو ہبہ ہونے کی وجہ سے اپنی ملکیت میں رکھنے کا حق ہے اور بائع کو جتنی مقدار ادا کردیا ہے اتنی مقدار اس کے بدلہ میں لینے کا حق ہے اور شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ دوسرے اور چوتھے نمبر میں واضح کردیا گیا اور اگر پرچی خریدنے والا مشتری کا وکیل ہے تو بائع کو ادا کردہ رقم میں یہ خود اصیل اور ذمہ دار ہے اور بائع نے جتنا ہبہ کردیا اتنے کا یہ مالک اور مشتری سے پورا ثمن وصول کرنے کا حقدار ہے جیسا کہ نمبر تین کے تحت عرض کیا جاچکا ہے، حاصل یہ کہ مذکورہ صورت کو جواز پر محمول کرنا ممکن ہے، اس لئے اس شکل کو جواز کے دائرہ میں رکھا جائے گا، کیوں کہ جواز عدم جواز پر مقدم ہے۔

''تملیک الدین ممن لیس علیہ الدین باطل إلا فی ثلاث:حوالۃ ووصیۃ وإذا سلطہ أی سلط المملک غیر المدیون علی قبضہ أی الدین فیصح حینئذ'' (فقہ البیوع۱٫۳۶۳)۔

''لا یجوز تملیک الدین من غیر من علیہ الدین إلا إذا سلطہ علیہ واستثنی فی الأشباہ من ذلک ثلاث صور، الأولی إذا سلطہ علی قبضہ، فیکون وکیلاً قابضاً للموکل ثم لنفسہ، الثانیۃ الحوالۃ والثالثۃ الوصیۃ'' (رد المحتار۷٫۳۷۶)۔

خلاصہ:

دلال کے پرچی خریدنے والی صورت صرف ظاہر کے اعتبار سے بیع معلوم ہوتی ہے ورنہ درحقیقت یہ صورت بیع کی نہیں، بلکہ اگر دلال مشتری کا وکیل ہو تو اس کی یہ شکل ہوگی کہ اس نے اپنے ذمہ لازم ثمن کو ادا کردیا ہے اور بائع نے ثمن کا کچھ حصہ دلال کو ہبہ کردیا ہے اور دلال نے بائع کا حق مشتری سے ختم کردیا ہے، البتہ خود دلال مشتری سے پورے ثمن کے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔

''لو أمر رجلاً أن یشتری لہ جاریۃ بألف فاشتراہا ثم أن البائع وہب الألف من الوکیل فالوکیل أن یرجع علی الآمر'' (البحر الرائق۷؍۱۵۵)۔

اور اگر دلال بائع کا وکیل ہو تو پرچی لے کر بائع کا ثمن ادا کرنا اور مشتری سے وصول کرنا اصل کے اعتبار سے تملیک الدین من غیر من علیہ الدین میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، لیکن وکالت کی بنا پر وکیل مشتری سے اولاً دین پر قبضہ موکل (بائع) کے لئے کرے گا، ثانیاً اپنے لئے اور وکیل اس وصول کردہ دین کی وہ مقدار جتنی اس نے اپنی طرف سے ادا کردیا ہے اس کے بدلہ میں رکھ لے گا اور جو زائد ہے اس کو ہبہ کی بنیاد پر رکھے گا، لیکن ظاہر ہے کہ جس وقت ہبہ پایا گیا اسی وقت قبضہ نہیں پایا جارہا ہے، اس لئے قبضہ کے وقت بائع کی اجازت صریحہ ضروری ہے، تاکہ ہبہ تام ومکمل ہوجائے، نیز وکیل کو اجیر کے درجہ میں بھی رکھا جاسکتا ہے، جتنا حصہ بائع کو ادا کرے وہ قرض کی ادائیگی بنے گی اور جو زائد ہے وہ وکیل کی اجرت ہوگی، چنانچہ مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ بل ڈسکاؤنٹنگ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو شخص بینک سے بل ڈسکاؤنٹ کرانا چاہتا ہے وہ دو معاملہ الگ الگ کرے، (۱) امپورٹر سے پیسہ وصول کرنے کا، (۲) اس وصولی پر سروس چارج متعین کرے (جدید معاشی مسائل ملخصا۳؍۲۱۰)۔

ایک اشکال:

جو تاویلات کی گئی ہیں ان تاویلات پر اشکال اس طرح ہوتا ہے کہ اگر دلال کو مشتری کا وکیل مانا جائے تو ایسی صورت میں بائع کی طرف سے بعض ثمن کا جو ہبہ پایا گیا ہے اس کو فقہاء نے ہبہ نہیں مانا ہے، بلکہ اسقاط اور حط میں داخل کیا ہے، اس لئے ثمن کا اتنا حصہ مشتری سے بھی ساقط ہوجائے گا، لہذا دلال کے لئے صرف ہبہ کے علاوہ مقدار وصول کرنے کا اختیار ہوگا (شامی ۸؍۲۵۰، البحر الرائق۷؍۱۵۵)، اور اگر اس کو بائع کا وکیل ماناجائے تو اس پر تملیک الدین من غیر من ہو علیہ الدین کا اشکال ہوتا ہے (شرح المجلہ رستم باز ۱؍۴۱۷)۔

جواب:

پہلے اشکال کا جواب یہ ہوگا کہ وکیل بالشراء نے گویا کہ بائع کو پورا ثمن ادا کردیا

ہے اور بائع کی طرف سے وکیل کو کچھ حصہ مستقلاً ہبہ کیا گیا، لہذا وکیل پورا ثمن ادا کرنے کی وجہ سے پورا ثمن وصول کرنے کا حقدار ہوگا اور دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ بائع کا پرچی دینا یہ ثمن پر قبضہ کرنے کی توکیل ہے اور وکیل نے بائع کو جو ادا کیا ہے وہ اولاً قرض ہے، اب جب وکیل وصول کرے گا تو جتنا ادا کیا ہے اتنا قرض سے مقاصہ ہوجائے گا اور مابقیہ بائع کی طرف سے ہبہ یا اجرت بن جائے گا، واللہ اعلم۔

جواب: ۲۔ سودی قرض لینا ضرورت کے وقت جائز ہے اور ضرورت میں آبرو کی حفاظت بھی داخل ہے، لہذا اگر بائع کو اپنی عزت بچانے کے لئے غیر سودی قرض حاصل نہ ہو تو وہ خودسودی قرض حاصل کرسکتا ہے، شرعاً اس کی اجازت ہے، اسی طرح اگر وہ خود کسی وجہ سے سودی قرض حاصل نہ کرسکتا ہو تو دوسرے کے ذریعہ سے سودی قرض لینا اور سود سمیت اس کا قرض ادا کردینا شرعاً جائز ہے، کیوں کہ جب کسی دوسرے کے ذریعہ سے قرض لیا جائے تو وہ دوسرا وکیل نہیں بلکہ قاصد اور رسول کے درجہ میں ہوتا ہے، البتہ قرض کے قبضہ کرنے میں وہ وکیل بن سکتا ہے تو وہ استقراض میں قاصد ہے اور قبضہ میں وکیل ہے، لیکن اگر وہ قرض اپنے نام سے لے تو ایسی صورت میں قرض لینے میں وہ اصیل ہے، بہرحال مجبور اور ضرورت مند کا تعاون کرنا جائز ہے؛ گرچہ اس کے لئے سودی قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے، جواز ایک تو اس کی ضرورت کو پیش نظر رکھنے سے ثابت ہوتا ہے، دوسرے سودی قرض کو رشوت پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ رشوت میں بھی ناحق مال دینا پڑتا ہے، اسی طرح سودی قرض میں سود ناحق دیا جاتا ہے، لہذا دونوں کا حکم بھی ایک ہوگا اور رشوت کے بارے میں حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ رشوت ضرورت کے وقت دینا جائز ہے، نیز جلب منفعت کے لئے بھی دینے کی اجازت ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ جب بائع اپنی عزت بچانے کے لئے سودی قرض لینے پر مجبور ہو تو براہ راست خود یا کسی دوسرے کے واسطہ سے سودی قرض لینا جائز ہے۔

''ثم الرشوة على أربعة أقسام:منها ما هو حرام على الآخذ والمعطى وهو الرشوة على تقليد القضاء والإمارة..... الثالث:أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعاً للضرر أو جلباً للنفع وهو حرام على الآخذ فقط'' (شامی ۳۵،۸)۔

''والأمور الضرورية ترجع إلى حفظ خمسة أشياء:الدين والنفس والعقل والعرض والمال فحفظ كل منها ضروری للناس'' (اصول الفقہ للخلاف،۲۲۱)۔

اس مسئلہ کی تائید میں اکابر کے چند فتاوی نقل کئے جاتے ہیں، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: اگر گزارہ کی کوئی صورت نہ ہو تو محتاج کے لئے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے (فتاوی محمودیہ۱۵،۳۰۱)۔

ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: پس اگر جان کا قوی خطرہ ہے یا عزت

کا قوی خطرہ ہے، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں مثلاً جائیداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے اور اگر ایسی ضرورت نہیں، بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لئے ضرورت ہے یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے یا جائیداد فروخت ہوسکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لئے ضرورت ہے یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے یا جائیداد فروخت ہوسکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، گناہ کبیر ہے (فتاوی محمودیہ۱۶،۳۰۶)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں: مثلاً اپنے جائز روپیہ سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہو کر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمار ہوکر ضبطی وغیرہ ہورہا ہو تو قانونی رو سے اپنے حلال روپے کو بچانے کے بقدر مجبوری میں بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے (منتخبات نظام الفتاوی۱،۱۸۹)۔

جواب: ۳۔ بیع کے تام ہوجانے کے بعد بائع کا حق متعینہ ثمن سے متعلق ہوگا اور بائع کو پورا ثمن وصول کرنے کا شرعاً حق ہے، لیکن اگر بائع اپنی رضا وخوشی سے ثمن کا کچھ حصہ کم کردے تو یہ صحیح اور درست ہے، کم کرنے کے بعد بائع کا حق ما بقیہ سے متعلق ہوگا، یہ کمی کرنا درست ہے، اس کے لئےمبیع کا مشتری کی ملکیت میں قائم اور موجود ہونا ضروری نہیں، مبیع کے فروخت کردینے اور ضائع ہوجانے کے بعد بھی صحیح اور درست ہے، لیکن بائع کو مجبور کرنا اور بغیر رضا جبراً ثمن کے کم کرنے پر آمادہ کرنا جائز نہیں، جواز کے لئے طیب خاطر بہرحال شرط ہے، اگر بغیر طیب خاطر کے ثمن کے کم کرنے پر مجبور کیا گیا اور کسی دباؤ کے نتیجہ میں اس نے کم کرد یا تو یہ جائز نہیں اور کم کی ہوئی مقدار مشتری کے لئے حلال نہیں۔

لقولہ تعالی:''یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم''، ولقولہ علیہ السلام:''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ''، حط البائع مقداراً من الثمن المسمی بعد العقد صحیح ومعتبر مثلاً لو بیع مال بمائۃ قرش ثم قال البائع بعد العقد حططت من الثمن عشرین قرشا کان للبائع أن یأخذ مقابل ذلک ثمانین قرشاً فقط، إن ہبۃ البائع مقدارا من الثمن المسمی للمشتری أو حطہ مقداراً منہ عنہ أو إبراءہ من بعضہ بعد العقد صحیح ومعتبر سواء أکان المبیع قائماً أم ہالکاً حقیقۃً أم حکماً وسواء کان البائع قد قبض الثمن أم لم یقبضہ ولا یشترط فی ہذا الحط قبول المشتری لأن الحط إبراء والإبراء لا یتوقف علی القبول حسب المادۃ: ۱۵۶۸ إلا أنہ یصح مردوداً بالرد" (شرح المجلہ لعلی حیدر۱،۲۰۶)، لیکن اگر مشتری کے کہنے پر بائع اپنی رضا وخوشی سے کم کردے تو شرعاً کوئی حرج نہیں، یہ جائز ہے۔

جواب: ۴۔ دھوکہ دینا شریعت میں ناجائز وحرام ہے، دھوکہ دینے پر بہت سخت

وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اسی بنا پر خرید وفروخت کے وقت عیب چھپانے کو حرام کہا گیا ہے اور عیب چھپانے والے پر بہت سخت وعید آئی ہے، آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو عیب کو چھپائے وہ اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے یا آپﷺ نے فرمایا کہ فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں، ایک روایت میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں اور ایک روایت میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے بغیر عیب بیان کئے ہوئے فروخت کردے اور ایک دوسری روایت میں آپﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر بائع ومشتری صدق بیانی اور عیوب کے اظہار سے کام لیتے ہیں تو ان کی خریدوفروخت میں برکت ہوتی ہے اور اگر کذب بیانی سے کام لیتے ہیں یا عیب کو چھپاتے ہیں تو خریدوفروخت میں سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔

''من باع عیباً لم ینبہ علیہ لم یزل فی مقت اللہ أو قال:لم تزل الملائکۃ تلعنہ'' (ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۲۴۷)۔

''أفلا جعلتہ فوق الطعام کی یراہ الناس! من غش فلیس منا'' (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۹۶)۔

''المسلم أخو المسلم ولا یحل لمسلم إن باع من أخیہ بیعاً فیہ عیب أن لا یبینہ لہ'' (المستدرک للحاکم۲،۱۰)۔

''البیعان بالخیار ما لم یتفرقا أو قال حتی یتفرقا، فإن صدقا وبینا بورک لہما فی بیعہما وإن کتما وکذبا محقت برکۃ بیعہما'' (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۰۷۹)۔

اسی وجہ سے حضرات علماء نے کتمان عیب کو ناجائز وحرام کہا ہے اور بعض علماء نے ایسے شخص کو فاسق ومردود الشہادۃ قرار دیا ہے، اور اس کو گناہ کبیرہ کے زمرہ میں رکھا گیا ہے۔

''لا یحل کتمان العیب فی مبیع وثمن لأن الغش حرام وفی البزازیۃ: إذا باع سلعۃ معیبۃ علیہ البیان وإن لم یبین قال مشائخنا یفسق ترد شہادتہ، لأن الغش من أکل الناس بالباطل'' (الدر المختار مع الرد المحتار۷،۲۳۰)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ دھوکہ دے کر مال حاصل کرنا اکل بالباطل میں داخل ہے، لہذا سامان فروخت کرنے کے وقت جو خوبیاں اس میں موجود نہ ہوں ان کو شمار کرانا بھی کذب بیانی، خداع وفریب میں داخل ہے، جس طرح سے موجود عیب کو چھپانا خداع وفریب میں داخل ہے، حاصل یہ کہ غیر موجود خوبیوں کو بیان کرنا اور موجود عیوب کو چھپانا دونوں کی علت کذب، خداع، اکل بالباطل وغیرہ ہیں، لہذا یہ دونوں عمل ناجائز ہیں اور جس طرح سے عیوب کو چھپا کر قیمت زیادہ وصول کرنا ناجائز ہے اسی طرح غیر موجود خوبیوں کو بتا کر زیادہ قیمت حاصل کرنا بھی ناجائز ہوگا، لیکن اگر

کسی چیز میں واقعتاً خوبیاں موجود ہوں اور عیوب بھی ہوں تو اگر عیوب کو پیش نظر رکھ کر بائع سے قیمت کم کرائی جائے اور خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر مشتری کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کیا جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ کسی عیب کو چھپانا اور کسی غیر موجود خوبی کو بیان کرنا نہ پایا جائے اور حدیث شریف میں نجش کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کی ایک تفسیر بے ارادۂ خرید ثمن بڑھانے کے لئے بھاؤ لگانا سے کی گئی ہے تو دوسری تفسیر غیر موجود خصوصیات بیان کرنے سے کی گئی ہے، تاکہ قیمت زیادہ وصول کی جائے۔

''وکرہ النجش بفتحتین ویسکن: أن یزید ولا یرید الشراء أو یمدحہ بما لیس فیہ لیروجہ ویجری فی النکاح وغیرہ ثم النہی محمول علی ما إذا کانت السلعۃ بلغت قیمتہا أما إذا لم تبلغ لایکرہ لانتفاع الخداع'' (الدر مع الرد۷،۳۰۵)۔

عیب دار مبیع کو فروخت کرنے پر ثمن کم کرانے کا حکم:

اگر مبیع عیب دار ہو اور عیب کا علم ہونے کے باوجود دوسرے سے فروخت کردینے کی صورت میں عیب کے بقدر ثمن کم کرنے پر بائع کو مجبور کیا جاسکتا ہے یا نہیں، یہ مسئلہ حضرات فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے، حضرات حنابلہ کے نزدیک فروخت کرنے کے باوجود ثمن کم کرنے پر مجبور کرنا جائز ہے اور مالکیہ کے نزدیک اگر خریدی ہوئی قیمت سے کم میں فروخت ہو تو کم کرانے کا حق ہے، برابر یا زیادہ میں فروخت کرے یا ہبہ اور صدقہ کردے تو کم کرانے کا حق نہیں اور شافعیہ کے نزدیک فروخت کرنے کے بعد ثمن کم کرانے کاحق نہیں خواہ عیب کی جانکاری ہو یا نہ ہو، البتہ اگر مشتری کی ملکیت سے مبیع بغیر عوض کے نکل جائے، مثلاً ہبہ، صدقہ، وقف وغیرہ، تو ایسی صورت میں عیب کے بقدر ثمن کم کرانے کا حق ہے اور حضرات احناف کے نزدیک عیب کی جانکاری کے باوجود اس کے آگے فروخت کردیا گیا تو ثمن کم کرانے کا اختیار احناف، شوافع اور مالکیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، البتہ حنابلہ کے مذہب کے مطابق ثمن کم کرانے کا اختیار ہوگا۔

''مذہب الحنفیۃ إن أخرج المبیع عالماً بالعیب فلا حق لہ فی الأرش الخ ومذہب الشافعیۃ فی الراجح أن المشتری لا حق لہ فی الأرش بعد البیع سواءکان عالماً بعیب أو غیر عالماً بہ ومذہب المالکیۃ إن باعہ بنفس الثمن الذی اشتراہ بہ أو بالأکثر فلا رجوع لہ بالأرش وفی صورۃ الہبۃ والتصدق یستحق الأرش ومذہب الحنابلۃ أنہ یستحق الأرش وإن أخرجہ عن ملکہ عالماً بالعیب لأن الأرش عوض الجزء الفائت بالعیب'' (فقہ البیوع ملخصا،۸۶۸ ، ۸۷۰،۲)۔

جواب: ۵۔ایسے سامان کی تیاری جس میں ملاوٹ کا دستور ہو بقدر عرف ملاوٹ کرنا جائز ہے اور مشتری کو اس ملاوٹ سے باخبر کرنا بھی ضروری نہیں، البتہ اگر ملاوٹ عرف سے زائد کی جائے تو اس کو بتلانا لازم وضروری ہے اور اس ملاوٹ شدہ

سامان کی جو مارکیٹ قیمت ہو اس کو وصول کرنا اور اس کے عوض فروخت کرنا بغیر ملاوٹ کے بیان کے بھی جائز ہے، لیکن اگر کسی سامان میں ملاوٹ کا دستور نہ ہو اور اس میں ملاوٹ کی جائے یا دستور اور عرف سے زائد مقدار کی ملاوٹ کی جائے تو اس کو بتلانا واجب ہے اور اس کو چھپانا کتمان عیب اور دھوکہ میں داخل ہے جو جائز نہیں، البتہ اگر ملاوٹ ظاہر اور کھلی ہوئی ہو، دیکھنے سے پورا علم ہوجاتا ہو تو ایسی ملاوٹ کے بیان کئے بغیر بھی فروخت کرنا جائز ہے، ایسی ملاوٹ کو بیان کرنا لازم وضروری نہیں، حاصل یہ کہ اگر مشتری کو ملاوٹ کا علم بائع کی اطلاع سے یا عرف سے یا ظاہر سے ہوجاتا ہے تو پھر بائع کے ذمہ ملاوٹ کو بیان کرنا لازم نہیں، لیکن اگر مشتری کو ملاوٹ کا علم نہ ہو اور ملاوٹ کی جائے تو اطلاع کرنا لازم ہے، چھپانا، دھوکہ دینا ناجائز وحرام ہے، البتہ اگر بائع مشتری سے یہ کہہ دے کہ ہر چیز کو خود ہی سمجھ بوجھ لو، پرکھ لو، میں کسی چیز کا ذمہ دار نہیں تو یہ بھی جائز ہے، تمام عیوب سے باخبر کرنا ایسی صورت میں لازم نہیں، اسی طرح اگر مشتری خود تمام عیوب کے ساتھ لینے پر راضی ہو تو بھی موجود عیوب سے باخبر کرنا لازم وضروری نہیں، کیونکہ عیوب پر مشتری کی عدم رضا کی وجہ سے اطلاع واجب ہوتی ہے، اور جب وہ عیوب پر راضی ہے تو اطلاع واجب نہیں ہوگی، یہ مسائل کتب فقہیہ میں مذکور ہیں:

''إذا باع مالاً علی أنہ برئ من کل عیب ظہر فیہ لا یبقی للمشتری خیار عیب'' (شرح المجلہ، رقم المادہ: ۳۴۲)۔

''من اشتری مالاً وقبلہ بجمیع العیوب لا تسمع منہ دعوی العیب بعد ذلک مثلاً لو اشتری حیواناً بجمیع العیوب وقال قبلتہ مکسراً محطماً أعوج معیباً فلا صلاحیۃ لہ بعد ذلک أن یدعی بعیب قدیم'' (شرح المجلہ، رقم المادہ: ۳۴۳)۔

''ولا بأس ببیع المغشوش إذا بین غشہ أو کان ظاہراً یری وکذا قال أبوحنیفۃؒ فی حنطۃ خلط فیہا الشعیر والشعیر یری، لا بأس بہ وقال الثانی:فی رجل معہ فضۃ نحاس لا یبیعہا حتی یبین'' (رد المحتار۷٫۴۹۴، ہندیہ۳٫۲۵۲)۔

''المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً، الثابت بالعرف کالثابت بالنص، الثابت بالعرف کالثابت بدلیل شرعی (مثلاً) لو اشتری شخص بقرۃ فتبین لہ بعد شرائہا أنہا غیر حلوب وأراد ردہا ینظر إن کان ہذا الشخص معروفاً أنہ ممن یشتری للذبح لا یجوز الرد وإن کان للانتفاع یجوز'' (شرح المجلہ لعلی حیدر۱٫۴۶)۔

صورت مسئولہ کا حکم:

مال سستا ہونے کی صورت میں مال کے اندر آمیزش اور ملاوٹ تاجروں کے عرف میں معلوم ومشہور ہے، لہذا اگر بقدر عرف ملاوٹ کی جائے تو خریدار کو بتلانا واجب ولازم نہیں، کیونکہ جس چیز کا علم عرف سے ہوجاتا ہے تو وہ ایسی ہی ہے جیسے بیان

اور صراحت سے علم ہو نیز جب تاجر کھوٹ اور ملاوٹ کے ساتھ لینے پر آمادہ ہے اور خود ہی کہہ رہا ہے کہ ملاوٹ ہو یا نہ ہو اس سے نہیں مطلب تو یہ ملاوٹ پر رضا کی صریح دلیل بھی ہے اور جب تاجر عیوب پر اپنی رضا کو ظاہر کردے تو اس کا خیار عیب ساقط ہوجاتا ہے اور تاجر کو واپس لوٹانے کا حق باقی نہیں رہتا اور جب تاجر نے اپنے حق کو ساقط کردیا تو اب اس کو باخبر کرنا بھی ضروری ہوگا کہ اس میں یہ عیب ہے یا اس قدر ملاوٹ ہے، حاصل یہ کہ مذکورہ شکل میں ملاوٹ سے باخبر کرنا ضروری نہیں۔

جواب: ۶۔ شریعت مقدسہ نے بیع وشراء کے معاملہ میں فریقین کو آزاد رکھا ہے اور بازار کی جو قوتیں (رسد وطلب) ہیں ان کو برسرکار لاکر یہ فرمایا ہے کہ آپس میں باہمی رضامندی سے قیمتیں طے کرلیں، البتہ شریعت نے اس پر ضرور پابندی لگائی ہے کہ کسی کا مال دھوکہ دے کر لیا جائے یا بازار میں مال کو قیمت بڑھانے کے لئے روک لیا جائے، اس پر شریعت نے پابندی لگائی ہے، لیکن قیمت کی تعیین میں بائع ومشتری کو آزاد رکھا ہے، اس کی کوئی تحدید وتعیین نہیں کی ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص کسی کو دھوکہ دیئے بغیر اپنا ایک روپے کا سامان ایک ہزارمیں فروخت کردے تو بیع صحیح ہے، نفس بیع میں کوئی خرابی نہیں، البتہ ثمن فاحش کے ساتھ فروخت کرنا امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک مکروہ بھی نہیں، تو کسی چیز کی قیمت بہت زیادہ لگا دینا جب کہ دھوکہ دہی وغیرہ کا معاملہ نہیں ہو فی نفسہ جائز تو ہے لیکن خلاف اولی ہے۔

''إذا وجد غبن فاحش فی البیع ولم یوجد تغریر فلیس للمغبون أن یفسخ البیع، لو باع شخص مالہ الذی بقیمۃ قرش واحد بألف قرش فالبیع صحیح أی لا یوجد فی البیع حد ذاتہ خلل ولا یقال بأن البیع غیر صحیح بسبب بیعہ بثمن فاحش جدا إلا أن البیع المذکور عند الإمام الثالث مکروہ، أما عند الإمام الثانی فہو غیر مکروہ، مثلاً لو باع شخص دارہ للآخر بلا تغریر لہ بخمسین ألف قرش أی بدون أن یقول المشتری إن داری تساوی خمسین ألف قرش فلیس للمشتری أن یفسخ البیع بداع أنہ تغرر کما أنہ لو باع ذلک الشخص تلک الدار للآخر وتغرر بمقدار أی خسر بہا فلیس لہ أن یطالب البائع بضمان ذلک المبلغ الذی خسرہ والبائع أن یبیع بضاعتہ بما شاء من ثمن ولا یجب علیہ أن یبیع بسعر السوق دائماً'' (قضایا فقہیہ۸، شرح المجلہ۱،۳۱۳، حاشیہ فتاوی عثمانی۱۶۰)۔

محور سوم:

جواب: ۱۔ جواب سے قبل چند تمہیدی مسائل لکھے جاتے ہیں تاکہ تخریج جواب اور فہم جواب میں آسانی اور سہولت ہو:

(۱) درج ذیل چھ قسموں کی شرائط کو حضرات فقہاء نے مقتضائے عقد کے موافق

مان کر عقد کو صحیح اور شرط کو معتبر مانا ہے، وہ شرائط یہ ہیں:

(١) ثمن پر قبضہ کرنے تک مبیع کو روک لینے کی شرط، (٢) مبیع کو مشتری کے حوالہ اور ثمن کو بائع کے حوالہ کرنے کی شرط، (٣) مبیع پر مشتری کی ملکیت کی شرط، (٤) مبیع کے برتن کے بقدر وزن کو کم کردینے کی شرط، (٥) مشتری کے ذمہ پھل توڑنے کی شرط، (٦) مبیع کے ثمن سے کچھ مقدار کم کردینے کی شرط

''البیع بشرط یوجبہ العقد صحیح ومعتبر، الشروط التی ہی مقتضیات العقد ہی التی یوجبہا العقد ولو لم تذکر فی أثنائہ وہذہ الشروط لا تفید شیئاً زائداً عن العقد بل ہی موکدۃ لما یوجبہ ولذلک لا تقع المنازعۃ بین المتعاقدین بأمثال ہذہ الشروط وہی ستۃ:(١) حبس البائع المبیع حتی یقبض الثمن، (٢) تسلیم المبیع للمشتری وتسلیم الثمن للبائع، (٣) امتلاک المشتری المبیع، (٤) طرح زنۃ الإناء من مجموع زنتہ وزنۃ المبیع إذا کان من المائعات، (٥) قطف الثمر من الشجر کونہ علی المشتری فی بیع الثمر، (٦) حط شئی من ثمن المبیع'' (شرح المجلہ لعلی حیدر ١٣٦،١)۔

(٢) شروط مفسدہ کا اگر عرف ہوجائے تو عرف کے بعد فساد کا سبب نہیں بنینگی، بلکہ عرف کے مطابق وہ معاملہ صحیح اور شرط معتبر ہوگی۔

''البیع بشرط متعارف یعنی المرعی فی عرف البلد صحیح والشرط معتبر'' الخ (شرح المجلہ لعلی حیدر، رقم المادہ: ١٨٨)۔

(٣) شروط مفسدہ اگر عقد میں داخل نہ ہوں بلکہ بطور وعدہ ان کا ذکر ہو تو ایسی صورت میں بھی معاملہ صحیح اور شرط واجب الایفاء ہوگی۔

''والشرط الفاسد الذی یشترط بعد العقد علی سبیل الوعد لا یفسد العقد ویجب الوفاء بہ من حیث أن الوفاء بالوعد واجب لحاجۃ الناس إلیہ'' (شرح المجلہ لعلی حیدر ١٣٨،١)۔

(٤) عرف سے ثابت ہونے والی شرائط منصوص شرائط کے درجہ میں ہیں، یعنی اگر کوئی شرط عرف میں معروف ہو تو بغیر ذکر کے بھی ان کا لحاظ کیا جائے گا، ''المعروف بین التجار کالمشروط بینہم'' (شرح المجلہ، المادہ: ٤٤)۔

(٥) اگر ثمن کی ادائیگی کے لئے کوئی مدت متعین نہ ہو اور عقد میں اجل کی شرط نہ لگی ہو تو ایسی صورت میں اگر بائع ثمن کا کچھ حصہ معاف کرنے کے لئےکوئی وقت مقرر کردے تو وقت مقررپر ادائیگی کی صورت میں بائع کی شرط کے مطابق ثمن مشتری کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا اور اگر بائع کی شرط کے مطابق ادائیگی نہ پائی جائے تو ثمن کامل کی ادائیگی لازم ہوگی۔

''والأصل أن الإحسان إن وجد من الدائن فإسقاط وإن منہما فمعاوضۃ (قال) لغریمہ (أدّ إليّ خمسمائۃ غدا من ألف لی علیک علی أنک برئ من) النصف (الباقی فقبل) وأدی فیہ (برئ وإن لم یؤد ذلک فی الغد عاد دینہ) کما کان لفوات التقیید بالشرط .... (کذا لو صالحہ من دینہ

على نصفه يدفعه إليه غداً وهو برئ مما فضل على أنه إن لم يدفعه غدا فالكل عليه كان الأمر) كالوجه الأول" (الدر مع الرد ٤٢٢،٨ طبع دار الكتب العلميه)۔

نوٹ: دین کے کچھ یا کل کو ساقط دینے کانام ابراء ہے اور ابراء کو معلق کرنا صحیح نہیں ہے، ابراء کی تعلیق باطل ہے، البتہ تقیید درست ہے اور جب شرط متعارف ہو تو اس کی تقیید ہی پر محمول کیا جائے گا، اس مسئلہ سے متعلق پوری تفصیل شامی ۵۰۲،۷ تا۵۰۴ اور شامی ۴۲۱،۸-۴۲۲ اور احسن الفتاوی ۱۸۰،۷-۱۸۴ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

صورت مسئولہ کا حکم:

(الف) اگر معاملہ کرتے وقت ثمن کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس وقت خریدار سے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر فلاں وقت تک ثمن ادا کردیا گیا تو اتنے فیصد ڈسکاؤنٹ کردیا جائے گا تو یہ معاملہ جائز ہے، کیوں کہ حط ثمن اجل کے عوض نہیں ہے، بلکہ یہ بائع کا تبرع اور احسان ہے اور یہ شرط مقتضائے عقد کے موافق بھی ہے، لہذا معاملہ صحیح ہوگا اور شرط کے مطابق ادائیگی کی صورت میں ثمن کم ہوجائے گا، البتہ اگر ثمن کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت متعین ہو اور پھر اس وقت سے پہلے یہ کہا جائے کہ فلاں وقت تک ادا کردو تو اتنے فیصد کم کردیا جائے گا تو یہ شکل جائز نہیں، کیوں کہ یہ کمی اجل کا عوض ہے اور اجل کا عوض مستقلاً جائز نہیں، بہرحال سوال میں درج شکل جواز کی ہے جیسا کہ تمہیدی مسائل میں نمبر ایک اور نمبر پانچ کے تحت اس کا ذکر کردیا گیا، تائید میں احسن الفتاوی سے ایک فتوی نقل کیا جاتا ہے، مفتی رشید احمد صاحب احسن الفتاوی میں قیمت میں رعایت بذریعہ قرعہ کے تحت فرماتے ہیں کہ یہ قیمت میں کمپنی کی طرف سے رعایت ہے اور کس خریدار کورعایت دی جائے اس کا انتخاب وہ بذریعہ قرعہ اندازی کرتی ہے، اس میں کسی کا نقصان نہیں، لہذا یہ خریدوفروخت جائز ہے (احسن الفتاوی۵۱۸،۶)۔

اس فتوے سے بھی مذکورہ صورت کے جواز کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ قیمت متعینہ پر ادا کرنے کی صورت میں ثمن کم کیا گیا ہے جس میں کسی کا نقصان نہیں، لہذا اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

(ب) اور اگر یہ شرط نہ لگائی گئی ہو، لیکن مارکیٹ کا یہی چلن اور دستور ہو تو بھی یہ شرط ملحوظ ہوگی اور عرف کے مطابق ثمن کم کیا جائے گا اور اس کے لینے دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، کیوں کہ اس میں بھی بائع کا تبرع اور احسان ہے، لہذا شرط معروفہ کے مطابق اسقاط ثمن خریدار کا حق ہوگا، جیسا کہ نمبر ۴ اور نمبر ۳ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

(ج) اور اگر معاملہ کے وقت نہ یہ شرط ہو اور نہ اس قسم کا عرف ہو تو اسقاط ثمن مشتری کا حق نہیں، لیکن اگر بائع برضا وخوشی ثمن کم کردیتا ہے تو یہ اس کا تبرع

محض ہے جس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ تینوں شکلیں جائز ہیں۔

جواب : ۲۔ کسی عمل پر اجرت کا استحقاق یا تو شرط سے ہوتا ہے یا تو عرف سے، اسی وجہ سے اگر کسی کی طرف سے کوئی عمل پایا جائے جس پر اجرت کا نہ تو عرف ہو اور نہ ہی اجرت کی شرط تو اس عمل کی اجرت لازم نہیں ہوتی ہے، حضرات فقہاء کا مشہور ضابطہ ہے:

''المنافع لا تضمن إلا بالعقد أو بالعرف وقال فی الموسوعۃ الفقہیۃ إن المنافع لا تضمن لا بالغصب ولا بالإتلاف وإنما تضمن بالعقد أو شبہۃ العقد'' (الموسوعۃ الفقہیہ۳۹،۱۰۳)۔

لہذا جب کاریگر نے مطلوبہ ومشروطہ معیار پر مال تیار نہیں کیاتو کاریگر کا یہ عمل عقد سے خالی ہے، یعنی اس عمل پر اجارہ کا انعقاد نہیں ہوا ہے اور عرف سے بھی اجرت کا استحقاق ثابت نہیں ہورہا ہے، تو ایسی صورت میں فقہاء کے ضابطہ کے مطابق اجرت کا استحقاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ عمل اجارہ کے تحت داخل نہیں۔

''الأجیر المشترک یضمن الضرر والخسارۃ التی تولدت عن فعلہ ووصفہ إن کان بتعدیۃ وتقصیرہ أو لم یکن یعنی أن الأجیر المشترک ضامن للخسارۃ التی تتولد عن فعلہ سواء أکان متعدیاً أو لم یکن أو سواء تجاوز المعتاد أو لم یتجاوز لأن ما یدخل تحت عقد الإجارۃ ہو العمل السلیم وأما العمل الفاسد فلا یدخل تحت الإجارۃ وبناء علیہ یکون الأجیر المشترک بہذہ الصورۃ فعل شیئاً غیر داخل تحت الإجارۃ ولیس مأذوناً یعملہ بحکم الإجارۃ'' (شرح المجلہ،۶۰۶)۔

اگر کاریگر کو تاجر نے اپنا میٹریل دیا ہو اور وہ شرائط کے مطابق اس نے مال نہ تیار کیا ہو تو ایسی صورت میں اگر تاجر کاریگر سے کوئی ضمان نہیں لیتا ہے تو اس کے ذمہ کوئی اجرت بھی واجب نہیں ہوگی، کیونکہ منفعت معقودہ حاصل نہیں ہوئی، لہذا کاریگر اجرت کا حقدار نہیں جیسا کہ تفصیل سے نقل کردیا گیا، لہذا جو دستور تجار کا ہے اگر تجار کاریگری کے لئے میٹریل اپنا دیتے ہیں تو یہ شریعت کے مطابق ہے۔

جواب: ۳۔ قانونی مصلحت کے تحت طرفین کی رضا سے کاغذات میں اگر ایک زیرو کم لکھا جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مستقبل میں نزاع کا اندیشہ نہ ہو، جب فریقین عرف کی بنا پر اس طرز سے متفق ہوں اور کسی کے حق کے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو تو پھر شرعاً اس طرز میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اعتبار حقیقت کا ہوتا ہے نہ کہ کتابت کا، تحریر یادداشت اور نزاع سے حفاظت کے لئے ہوتی ہے، بذات خود تحریر مقصود نہیں، لہذا جب عرف وغیرہ کی بنا پر تحریر کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوجائے تو پھر تحریر لازم نہیں، تحریر کا حکم عام حالات میں استحبابی ہے وجوبی نہیں۔

''العبرۃ لما فی الواقع لا بما کتب خلاف ذلک'' (فتاوی مہدویہ۲،۴۹۵، تکملہ رد المحتار۲،۴۵۹)۔

‘‘یاأیہا الذین آمنوا إدا تداینتم بدین ..... فاکتبوہ أی اکتبوا الذی تداینتم بہ لأنہ أوثق وأدفع للنزاع والجمہور علی أنہ أمر استجاب فإن ترکت فلا بأس بہ’’ (تفسیر مظہری۱،۴۵۶)۔

‘‘وفیہ: فائدۃ الکتابۃ أن لا ینسی العاقدان قدر الثمن أو قدر رأس المال أو المسلم فیہ أو الأجل أو نحو ذلک، لا أن یکون حجۃ فإن الحجۃ إنما ہو الشہود’’ (تفسیر مظہری۱،۴۵۷)۔

لیکن اگر کسی کے ذمہ کسی کا کوئی حق باقی ہوتو اس کی ادائیگی کا انتظام کرنا شرعاً اس کے ذمہ واجب ہے۔

اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا جب کسی کے ذمہ حقوق اللہ یا حقوق العباد باقی ہوں تو اس کی ادائیگی کی وصیت کردینا شرعاً واجب ہے، تاکہ کسی صاحب حق کا حق ضائع نہ ہو، لہذا ایک زیرو کم کرنے کا جو دستور تجارکے درمیان رائج ہے اگر اس سے صاحب حق کا حق ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو مدیون کے ذمہ اس کو لکھ لینا اور دوسرے قابل اطمینان لوگوں کو باخبر کردینا واجب ہے اور اگر فریقین کو اطمینان ہو تو اس کو لکھ لینا واجب نہیں، لیکن استحباب سے بہرحال خالی نہیں۔

‘‘الوصیۃ أربعۃ أقسام: واجبۃ کالوصیۃ برد الودائع والدیون المجہولۃ..... قالہ فی البدائع ..... الوصیۃ بما علیہ من الفرائض والواجبات کالحج والزکاۃ والکفارات واجبۃ وفی المواہب: تجب علی مدیون بما علیہ للہ تعالی أو للعباد’’ (رد المحتار۱۰،۳۳۶)۔

عبارات مذکورہ میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حقوق ودیون کی حفاظت انسان کے ذمہ واجب ہے، ایک روایت میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان پر ایک دو رات بھی اس حال میں نہیں گزرنا چاہئے کہ اس پر کسی کا حق ہو اور وہ لکھا ہوا نہ ہو۔

‘‘عن ابن عمر قال قال رسول اللہﷺ: ما حق امرئ مسلم لہ شئ یوصی فیہ یبیت لیلتین إلا وصیتہ مکتوبۃ عندہ’’ (مشکوۃ۱،۲۶۵)۔

حضرات فقہاء عام حالات میں دیون وحقوق وغیرہ کی کتابت کو صرف مستحب قرار دیتے ہیں واجب نہیں، اس لئے کہ بہت سی روایتوں میں دیون کے لین دین کا تو ذکر موجود ہے، لیکن اس کی کتابت وغیرہ نہیں کی گئی، اس لئےحضرات فقہاء فاکتبوہ، فاشہدوا وغیرہ والے اوامر کو استحباب پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے نقل کردیا گیا، جب صاحق حق کے حق کی ادائیگی اور حفاظت لکھنے ہی پر موقوف ہو تو چوں کہ حقوق کی ادائیگی واجب ہے، اس لئے لکھنا بھی واجب ہوگا، البتہ دائن کے ذمہ واجب نہیں۔

صورت مسئولہ کا حکم:

قانونی مصلحت کے تحت ایک زیرو کم کرکے لکھے جانے کا جو دستور تجار کے درمیان ہے اگر فریقین کو اس پر اطمینان ہے اور کسی کے حق مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو یہ جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا گیا،

رہا ٹیکس وغیرہ سے بچنے کا مسئلہ تو ظالمانہ ٹیکس سے جو موجودہ وقت میں عموماً ظالمانہ ہی ہوتے ہیں جائز ہے۔

''أما فی زماننا فأکثر النوائب توخذ ظلماً ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فہو خیر لہ'' (رد المحتار۷،۶۲۲)۔

جواب: ۴۔ جواب نمبر ۳ کے تحت درج ذیل چند باتوں کی وضاحت کی گئی ہے :

(۱) اعتبار حقیقت کا ہوتا ہے نہ کہ حقیقت کے خلاف لکھی ہوئی چیز کا (تکملۃ رد المحتار بحوالہ امداد المفتین)۔

(۲) اگر کمی بیشی کے ساتھ لکھنے میں کسی کا کوئی حق ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اس لئے کہ لکھنا فی نفسہ واجب وضروری نہیں، بلکہ نزاع وضیاع سے حفاظت کے لئے لکھنے کا حکم ہے لہذا اگر ان امور سے اطمینان ہو تو لکھنا مستحب ہے واجب نہیں (تفسیر مظہری)۔

(۳) اگر نہ لکھنے کی صورت میں حق کے ضائع ہوجانے کا ظن غالب ہو تو مدیون پر لکھ لینا اور دوسرے قابل اطمینان لوگوں کو باخبر کردینا واجب ہے، اسی لئے حدیث شریف میں دیون وغیرہ سے متعلق وصیت نامہ کو تحریر کرنے کی انتہائی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے اوپر دوسرے کا حق ہو اس کے اوپر ایک دوراتیں بھی ایسی نہیں گزرنی چاہئیں کہ اس کے پاس وصیت نامہ لکھا ہوا نہ ہو (مشکوۃ شریف، رد المحتار)۔

(۴) قانونی مصلحت کی بنیاد پر اصل قیمت کے بجائے کچھ کم لکھنا یا نہ لکھنے وغیرہ کی شرعاً اجازت ہے (رد المحتار)۔

صورت مسئولہ کا حکم:

مذکورہ بالا امور اربعہ کے مجموعہ سے یہ واضح ہوگیا کہ ایکسپورٹ میں قیمت کم لکھنے کا جو دستور ورواج ہے شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جس کے ذمہ ادائیگی ہے، اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرلینا جس سے صاحب حق کا حق نہ مارا جائے استحباب سے خالی نہیں، البتہ اگر صاحب حق کے حق ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو اس کی حفاظت کی تدابیر کرلینا بہرحال واجب ہے، جواب نمبر ۳ و۴ کا حاصل ایک ہی ہے ۔

جواب: ۵۔ زیورات کی ڈھلائی کے وقت جو ذرات اور ٹکڑے نکلتے ہیں یہ دو اعتبار سے قابل غور ہیں: (۱) یہ ملکیت زیورات بنوانے والے کی ہوتے ہیں تو کاریگر کے لئے اس کا رکھنا کیوں کر جائز ہوگا، (۲) یہ ٹکڑے کاریگر کے عمل کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں تو یہ قفیز طحان کی قبیل سے معلوم ہوتا ہے تو پھر اس کا جواز کیوں کر ہوگا۔

جواب از اشکال اول:

اگر عرف اور عادت سے یہ اندازہ ہو کہ زیورات سازی کے وقت نکلنے والے

ذرات کو ان کے مالکین نے کاریگر کے لئے مباح کردیا ہے تو پھر اس کا استعمال کرلینا شرعاً جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں اور جب زیورات سازی کرنے والوں سے نکلنے والے ذرات کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے اور یہی عرف ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مالکین کی طرف سے اس کو مباح کردیا گیا ہے اور اباحت کے لئے جس طرح سے اجازت صریحہ سے علم ہوتا ہے، اسی طرح عرف وعادت اور دلالت حال سے بھی علم ہوجاتا ہے، مباح ہونے کے لئے اجازت صریحہ ضروری نہیں، بلکہ دلالت حال، عرف وغیرہ بھی کافی ہے۔

''والمعتمد أنہ لا بأس بہ إذا لم یعلم النہی صریحاً أو دلالۃ أو عادۃ'' (شامی۶،۴۴۵)۔

''من ینثر السکر والدراہم فی العرس وغیرہ فمن أخذ شیئاً ملکہ لأن الحال دلیل علی الإذن وعلی ہذا لو وضع الماء والجمد علی بابہ یباح الشرب منہ لمن مربہ من غنی أو فقیر وکذا إدا غرش شجرۃ فی موضع لا ملک فیہ لأحد وأباح للناس ثمارہا وکل ذلک مأخوذ من الحدیث'' (شامی۶،۴۳۶)۔

لہذا اگر کاریگر کے پاس نکلنے والے ذرات چھوڑ دینے کا عرف ہو تو اس کو اباحت پر محمول کرکے کاریگر کے لئے جائز مانا جاسکتا ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب:

اگر نکلنے والے ذرات کو کاریگر کی اجرت میں داخل مانا جائے تو قفیز طحان والا اشکال صرف صورۃً ہے حقیقۃً نہیں، کیوں کہ اگر زیورات کو اجرت قرار دیا جاتا تو قفیز طحان کی شکل ہوگی، لیکن اگر ذرات کو اجرت میں داخل مانا جائے تو یہ قفیز طحان میں داخل نہیں ہوگا، کیوں کہ ذرات جو میٹریل کا جز ہیں ان کا عمل صناعی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ افراز ہے اور یہ شکل شرعاً جائز ہے، کیوں کہ اگر اجرت کو ملا کردیا جائے اور کاریگر کو افراز کی اجازت ہو تو یہ جائز ہے، چنانچہ جواز کا یہی حیلہ مذکورہ ہے، حاصل یہ کہ اس کے کچھ حصہ کو اجرت قرار دینا قفیر طحان میں داخل نہیں، البتہ مصنوع کے حصہ سے اجرت کو لینا قفیز طحان میں داخل ہے۔

''ولو دفع غزلاً لآخر لینسجہ لہ بنصفہ أو بنصف الغزل (المنسوج) أو استاجر بغلاً لیحمل طعامہ ببعضہ أو ثوراً لیطحن برہ ببعض دقیقہ فسدت فی الکل لأنہ استاجرہ بجزء من عملہ والأصل فی ذلک نہیہ ﷺ عن قفیز الطحان، والحیلۃ أن یفرز الأجر أولا أو یسمی قفیزاً بلا تعین ثم یعطیہ قفیزاً منہ فیجوز'' (الدر مع الرد۹،۷۸-۷۹)۔

نیز اگر قفیز طحان میں داخل مانا جائے تو عرف وعادت کی وجہ سے مشائخ بلخ کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے اور حضرت امام احمد کے نزدیک بھی جائز ہے (انعام الباری۶،۵۶۳)۔

اس لئے اس کی گنجائش ہے، رہا جہالت کا مسئلہ تو یہ جہالت یسیرہ ہے جو مفسد

نہیں:''لأن الجہالۃ الیسیرۃ تصح أن غیر مفسدۃ'' (شامی۷،۴۹)۔

''ومشائخ بلخ والنسفی یجیزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل أہل بلادہم بذلک'' (شامی۹،۸۰)۔

تفصیلات مذکورہ کی روشنی میں زیورات سے نکلنے والے ذرات کو اگر چھوڑ دیئے جانے کا عرف ہو تو جائز ہے۔

جواب: ۶۔ خرید وفروخت کے جواز اور اس کی آمدنی کے حلال ہونے کی اصل روح طرفین کی رضا ہے، لہٰذا اگر طرفین میں سے کوئی ایک معاملہ پر کسی قسم کے جبر اور دباؤ کی بنا پر راضی ہو تو اس رضا کا شرعاً اعتبار نہیں اور زور وزبردستی کے ساتھ کیا ہوا معاملہ شرعاً جائز نہیں اور اس کی آمدنی حلال نہیں، چنانچہ اللہ تعالی نے مال کے حلال ہونے کے لئے رضا کی شرط لگائی ہے۔

''یاأیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم''۔

لہٰذا اگر آٹھ گرام کے دھاگے کو دس گرام کے برابر رکھنا جانبین کی رضا سے ہو تو یہ جائز ہے، کیوں کہ جانبین کی رضا سے اگر ظرف کا کوئی وزن فرض کرلیا جائے اور اس کے بقدر مبیع کے وزن سے کم کرکے مبیع کی قیمت لگائی جائے تو یہ مبیع کی اٹکل سے قیمت لگانا ہوگا اور اٹکل سے خریدوفروخت شرعاً جائز ہے، کیوں کہ جس مبیع کا یا اس کے ظرف کا کوئی وزن متعین طور پر معلوم نہ ہو اور ایک وزن فرض کرکے قیمت لگائی جائے تو یہ تقویم اٹکل ہی بنے گی، وزن کے اعتبار سے تقویم تبھی ہوسکتی ہے جب وزن معلوم ہو اور جب وزن معلوم نہ ہو تو یہ اندازہ سے تقویم اٹکل اور جزاف میں داخل ہے، البتہ خریدوفروخت میں تعبیر اس طرح اختیار کرنی چاہئے کہ اس دھاگے میں جو پتھر ہیں ان کو اتنی قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے، یہ نہ کہا جائے کہ ان پتھروں کا اتنا وزن ہے۔

''والحیلۃ فی جوازہ أن لا یعقد العقد إلا بعد وزنہ تحریاً للصحۃ فیقول بعد الوزن بعتک ما فی ہذا الظرف بکذا ویقول الآخر قبلت فیکون ہذا من بیع الجزاف وہو صحیح'' (رد المحتار۷،۲۷۱)۔

البتہ اگر معاملہ میں بہرصورت پتھروں کا وزن متعین کیا جائے اور اس میں لگنے والے دھاگے کا وزن بھی متعین طور پر فکس کیا جائے تو ایسی صورت میں حضرات فقہاء بیع کو فاسد مانتے ہیں، کیوں کہ دھاگے کا ایک متعین وزن ہر صورت میں مقرر کرنا مقتضائے عقد کے خلاف ہے، جس میں متعاقدین میں سے کسی ایک کا نفع ہے، اس لئے یہ معاملہ فاسد ہوگا، چنانچہ تمام کتب فقہیہ میں اس کی صراحت ہے اور صاحب فتح القدیر نے اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا:

''(قولہ من اشتری زیتا فی ظرف) صورتہا فی الجامع: محمد عن یعقوب عن أبی حنیفۃ فی رجل اشتری من رجل ہذا الزیت وہو ألف رطل علی أنہ یزنہ بظروفہ فیطرح عنہ مکان کل

ظرف خمسين رطلا قال هذا فاسدوإن كان قال على أن تطرح عنى وزن الظرف فهو جائز" (فتح القدير ۶،۴۳۸)۔

اور موجودہ زمانہ میں عموماً برتن میں پیک جو چیزیں فروخت ہوتی ہیں یا بوریوں میں بند یا دھاگوں میں پروئی ہوئی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں ان سب میں عموماً برتن، بوریاں، دھاگہ وغیرہ کا وزن یکساں ہوتا ہے، اسی لئے متعاقدین برتن وغیرہ کا ایک وزن فرض کرکے قیمت کم کردیتے ہیں اور برتن اور بوریوں میں جو چیزیں پیک ہیں ان کو الگ سے نہیں تولا جاتا ہے، اگر اس کو بیع مجازفہ پر محمول نہ کیا جائے تو عموماً اس طرح کے معاملات فاسد ہوجائینگے، لہذا ابتلائے عام کی وجہ سے اس کی صحت کے لئے تاویل ضروری ہے اور یہ تاویل مجازفت والی صحیح اور منطبق ہے، لہذا اس تاویل سے معاملہ کو جائز کہا جائے گا اور یہی سمجھا جائے گا کہ فروخت کرنے والا مال کے وزن سے قطع نظر جو مال اس میں موجود ہے اسی کو فروخت کرتا ہے اور خریدنے والا بھی وزن سے قطع نظر اس میں موجود سامان خریدتا ہے اور اگر اس کو مجازفت پر محمول نہ کیا جائے تو حرج وتنگی پیدا ہوگی، مثلاً تصرف کے لئے اعادۂ کیل ووزن وغیرہ بھی لازم ہوگا۔

دوسری تاویل: دھاگہ سمیت پورے مال کی قیمت مانی جائے، بعدہ دھاگہ کے وزن کا اندازہ کرکے اس کے بقدر ثمن ساقط کردی جائے، توحط ثمن کی تاویل ہوگی۔

جواب: ۷۔ تھوک خریدار کا مال جو کسور ہوتے ہیں ان کو حذف کرکے قیمت لگانے کا دستور ورواج ہے اور پھٹکر خریدوفروخت میں کسور کی بھی قیمت لگانے کا عرف ورواج ہے، اس لئے اگر تھوک خریدار کسر کی قیمت نہ لگائے اور ان کو اصل کے تابع مان لے تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ ''المعروف عرفاً کالمعروف شرطاً''، اور ''المعروف بين التجار كالمشروط بينهم'' (شرح المجلہ، الماده: ۴۴)، اسی طرح اگر وہ پھٹکر فروخت کرتے وقت اس کسر کی قیمت لگا کر فروخت کرے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں، تھوک خریدوفروخت کی صورت میں جو زائد کسور ہیں ان کو وصف کے درجہ میں رکھا جائے گا اور جو زائد نکلے گا اس کی قیمت لازم نہ ہوگی، یہ مشتری کا فائدہ سمجھا جائے اور پھٹکر کی صورت میں وصف کے مقابلہ میں قیمت کی تعیین کرکے اصل کے درجہ میں رکھینگے، لہذا جو زائد کسر ہے اس کی بھی قیمت وصول کی جائے گی، مثلاً کپڑے کا تھان پورا فروخت کیا جائے اور اس کے ذراع کا بیان وصف کے طور پر ہو، ہر ذراع کی الگ الگ قیمت متعین نہ کی جائے تو پورے تھان کی جو قیمت متعین ہوگی وہ بہرصورت لازم ہوگی، خواہ بیان کردہ ذراع سے کم ہو یا زیادہ اور اگر ایک ایک ذراع کی الگ الگ قیمت متعین ہوگی تو جتنے ذراع کپڑا ہو اتنا ثمن لازم ہوگا، اگر کم ہے تو کم اور زیادہ ہو تو زیادہ، اور اسی طرح زیورات کے پتھر وموتی وغیرہ میں وزن وصف کے درجہ میں ہوتا ہے، لہذا اس میں جو کسر ہوگا اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی، لیکن اگر

معاملہ میں اس وصف کے مقابل میں قیمت متعین کی جائے تو وصف اصل کا درجہ اختیار کرے گا۔

''وإن باع المذروع مثلہ أخذ الأقل بکل الثمن أو ترک وأخذ الأکثر بلا خیار للبائع وإن قال کل ذراع بدرہم أخذ الأقل بحصتہ أو ترک'' (الدر مع الرد۷۰،۷)۔

''لو باع لؤلؤۃ علی أنہا تزن مثقالاً فوجدہا أکثر سلمت للمشتری لأن الوزن فیما یضرہ التبعیض وصف بمنزلۃ الذرعان'' (شامی۶۸،۷)۔

جواب: ۸۔ خلاف حقیقت لکھنے سے حقیقت نہیں بدلتی ہے، حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے، لہذا اگر کسی کے ذمہ کسی کا حق باقی ہو اور وہ شخص شہود وبینہ کے فقدان کی بنا پر مال دینے سے انکار کردے تو اس سے وہ مال اس کے لئے حلال نہیں ہوجائے گا، یہاں تک کہ اگر شہادت کے مفقود ہونے اور دلائل ظاہرہ کی بنا پر قاضی، حاکم یہاں تک کہ نبی بھی اگر کوئی فیصلہ کردے جو نفس الامر کے موافق نہ ہوتو فیصلہ سے نفس الامر نہیں بدلے گا اور فیصلہ کی وجہ سے مال حلال نہیں ہوگا، وہ حرام ہی رہے گا، چنانچہ آپﷺ نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی کا کوئی حق گرچہ پیلوکی ایک مسواک ہی کیوں نہ ہو قسم کی مدد سے حاصل کرلیا تو اس کے اوپر جنت حرام اور جہنم واجب ہوجاتی ہے (مشکوۃ)۔

ایک دوسری روایت میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعہ سے کسی مسلمان کا مال حاصل کرلے تو اللہ سے اس کی ملاقات ناراضگی کی حالت میں ہوگی (مشکوۃ)۔

ایک دوسری روایت میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی ایک انسان ہی ہوں، تم اپنے مقدمات میرے پاس لاتے ہو، ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی فریق زیادہ فصیح وبلیغ ہو تو میں اس کی بات سن کر دوسرے کا حق کا فیصلہ اس کے لئے کردوں تو وہ شخص اس کو ہرگز نہ لے، اس لئے کہ جس کا فیصلہ اس کے لئے ہوا ہے وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے (مشکوۃ)۔

''عن أبی أمامۃؓ قال قال رسول اللہﷺ: من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینہ فقد أوجب اللہ لہ النار وحرم علیہ الجنۃ فقال لہ رجل وإن کان شیئاً یسیراً یا رسول اللہ قال وإن کان قضیباً من أراک''۔

''عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہﷺ: من حلف علی یمین صبر وہو فیہا فاجر یقتطع بہا مال امرئ مسلم لقی اللہ یوم القیامۃ وہو علیہ غضبان فأنزل اللہ تصدیق ذلک:'' إن الذین یشترون بعہد اللہ وأیمانہم ثمناً قلیلاً'' ۔

محور چہارم:

جواب: ۱۔ ائمہ اربعہ، جمہور فقہاء ومحدثین کے نزدیک ادھار خریدوفروخت میں

قیمت زیادہ رکھنا اور نقد خرید وفروخت میں قیمت کم رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ عقد کے وقت ہی بیع کے نقد یا ادھار ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کرکے ثمن متعین کردیا جائے، لیکن اگر معاملہ کے وقت کسی ایک جہت پر اتفاق اور کسی ایک ثمن کی تعیین نہیں پائی گئی تو اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں، یعنی دونوں قیمتوں میں تردید کے ساتھ خریدوفروخت میں ثمن کے مجہول ہونے کی وجہ سے معاملہ فاسد ہوجائے گا۔

''العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا أو قال إلى شهر بكذا أو إلى شهرين بكذا فهو فاسد لأنه لم يعاطه على ثمن معلوم ونهى النبیﷺ عن شرطين فى بيع وهذا هو تفسير الشرطين فى بيع ومطلق النهى يوجب الفساد فى العقود الشرعية وهذا إذا افترقا على هذا، فإن كان يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وأتما العقد عليه فهو جائز لأنهما ما افترقا إلا بعد تمام شرط صحة العقد'' (المبسوط۸،۱۳)۔

''هل يجوز أن يكون الثمن المؤجل زائداً على الثمن الحال؟ فالأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين قد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعر النقد بشرط أن يبت العاقدان على أنه بيع مؤجل بأجل معلوم، فأما إذا قال البائع أبيعك نقداً بكذا ونسيئة بكذا وافترقا على ذلك دون أن يتفقا على تحديد واحد من الشقين، وأخرج ابن أبى شيبة عن ابن عباسؓ قال: لا بأس أن يقول للسلعة هى بنقد بكذا ونسيئة بكذا ولكن لا يفترقان إلا عن رضا''۔ وأخرج مثله عن طاؤس وعطاء وحماد وإبراهيم كما أخرج عبد الرزاق مثله عن سعيد بن المسيب وطاؤس والزهرى وقتادة، وقد اتفقت المذاهب الأربعة على ذلك'' (فقہ البیوع۱،۵۴۲)۔

جواب: ۲۔ اگر قیمت کی ادائیگی کے لئے معاملہ کے وقت ہی کوئی وقت متعین کردیا گیا تھا، یعنی خریدوفروخت ادھار کی شرط کے ساتھ ہوئی تھی جس کی مدت بھی متعین کردی گئی تھی، اس صورت میں اگر وقت مقررہ سے پہلے بائع کو پیسے کی ضرورت پیش آجائے اور وہ (ضع وتعجل) یعنی ثمن کم کرکے فی الفور ادا کردو تو اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، ائمہ اربعہ نیز حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، محمد ابن سیرینؒ، حسن بصریؒ، سعید بن مسیبؒ، حکم بن عتیبہؒ، امام شعبیؒ ضع وتعجل کے طریقہ سے ثمن وصول کرنے کو ناجائز کہتے ہیں، اس کے برعکس حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، امام زفرؒ، شیخ ابوثورؒ، اس طریقہ کے مطابق ثمن کی ادائیگی کو جائز کہتے ہیں اور اختلاف کی بنیاد احادیث کا تعارض ہے، ایک روایت سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اور دوسری روایت سے عدم جواز، دونوں روایتیں درج ذیل ہیں:

(۱) ''لما أمر النبیﷺ بإخراج بنى النضير من المدينة جاءه ناس منهم فقالوا يا رسول الله! إنک أمرت بإخراجهم ولهم على الناس ديون لم تحل فقال النبیﷺ:ضعوا وتعجلوا'' (السنن الکبری للبیہقی۶،۲۸)۔

اس روایت سے ''ضع وتعجل کا جواز معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ آپﷺ نے بنو نضیر کے یہودیوں سے اس اصول پر عمل کرنے کی اجازت دی تھی۔

(۲) ''أسلفت رجلاً مائۃ دینار ثم خرج سہمی فی بعث بعثہ رسول اللہﷺ فقلت لہ: عجل لی تسعین دیناراً وأحط عشرۃ دنانیر، فقال:نعم فذکر ذلک لرسول اللہﷺ:فقال:أکلت ربا یا مقداد وأطعمتہ'' (السنن الکبری للبیہقی۶،۲۸)۔

اس روایت سے ضع وتعجل کا ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ سودینار کے بدلے نوّے ادا کرکے دس بچا لینے کو آپﷺ نے اکل ربا فرمایا: ''أکلت ربا یا مقداد وأطعمتہ''، اس روایت سے جمہور استدلال کرتے ہوئے ضع وتعجل کو ناجائز فرماتے ہیں اور پہلی روایت کے بارے میں مختلف تاویلات کی گئی ہیں مثلاً:(۱)سند کا ضعیف ہونا، (۲) منسوخ ہونا، کیوں کہ یہ واقعہ ۲ھ کا ہے، (۳) مال حربی کا ہونا، (۴) یہود سود خور تھے، یہودیوں کا جو سود راس المال سے زائد ہوگیا تھا اس سود کو آپﷺ نے ساقط کرنے کا حکم دیا، چنانچہ علامہ واقدی نے اپنی مغازی میں درج کیا ہے، مختصر سا جملہ نقل کیا جاتا ہے:

''فصالحہ علی أخذ رأس مالہ ثمانین دیناراً وأبطل ما فضل'' (مغازی الواقدی۱،۳۷۴)۔

چونکہ روایت اولی مؤول ومحتمل ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں، اس لئے جمہور نے روایت ثانیہ سے استدلال کرتے ہوئے ضع وتعجل کو ناجائز فرمایا ہے، عدم جواز کی وجہ ظاہر ہے کہ اجل کے مقابل میں اصالۃً عوض مقرر کیا جارہا ہے جو سود ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے، سود میں بھی اجل ہی کا وصول کیا جاتا ہے، اس لئے ضع وتعجل کا وصول شریعت کے ضابطہ کے مطابق ناجائز وحرام ہے، ''لأن المعجل خیر من المؤجل وہو غیر مستحق بالعقد فیکون بإزاء ما حطہ وذلک اعتیاض عن الأجل وہو حرام'' (ہدایہ۳،۲۵۱)۔

دیون غیر مؤجلہ میں ضع وتعجل:

اگر کسی کے ذمہ دیون لازم ہوں خواہ وہ مبیع کا ثمن ہو یا قرض ہو اور اس میں ضع وتعجل کے اصول پرعمل کیا جائے تو یہ جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، لہذا اگر معاملہ کرتے وقت ثمن کے ادھارہونے کے لئے کسی متعین وقت کی شرط نہ لگائی گئی ہو، بلکہ از راہ تبرع بائع نے مشتری کو ثمن کے ادائیگی کی مہلت دے دیا ہو تو ضع وتعجل کے اصول پر عمل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ عقد کے بعد جو مہلت دی جاتی ہے وہ بائع کا تبرع ہوتا ہے اور یہ قرض میں داخل ہوجائے گا اور قرض میں تاجیل لازم نہیں ہوتی ہے، اسی بنیاد پر بائع کو قرض میں جب چاہے مطالبہ کا حق رہتا ہے، اسی طرح سے اگر ثمن کے ادھار ہونے کی عقد میں شرط نہ لگائی گئی ہو اور بعد میں مہلت دی جائے تو

یہ قرض میں داخل ہوجائے گا اور جس طرح سے قرض میں ضع وتعجل کے اصول پر عمل کرنا جائز ہے، اسی طرح ثمن میں عقد کے بعد دی گئی مہلت میں بھی ضع وتعجل کے اصول پر عمل کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ یہاں ثمن کے کچھ حصہ کا اسقاط اجل کےمقابل میں نہیں کہ ربا یا شبہ ربا میں داخل ہو، بلکہ یہ بائع کا تبرع مستقلہ ہے جس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

''وفی الخانیۃ: رجل باع شیئاً بیعاً جائزا وأخر الثمن إلی الحصاد والدیاس قال یفسد البیع عند أبی حنیفۃ وعن محمد أنہ لا یفسد البیع ویصح التاخیر لأن التأخیر بعد البیع تبرع فیقبل التأجیل إلی الوقت المجہول'' (شامی۷؍۵۴)۔

عقد کے بعد دی جانے والی مہلت کو اگر قرض کے درجہ میں رکھا جائے تو یہ اشکال ہوتا ہے کہ مہلت لازم نہیں ہونا چاہئے، اور اگر مہلت کو لازم مانا جائے تو بیع کو صحیح نہیں ہونا چاہئے، حالانکہ مہلت کے لزوم اور بیع کی صحت صراحتاً منقول ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقد کے بعد دی جانے والی مہلت کا لزوم شرط بعدیہ کے اصل عقد میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ عقد فاسد ہوجائے گا، بلکہ شرط بعدیہ کا لزوم وعدہ میں شامل ہونے کی وجہ سے ہوگا (کما فی الشامیۃ۷؍۲۸۱)۔

جواب: ۳۔ اگر بائع کی طرف سے اعلی کہہ کر فروخت کیا جائے اور مشتری اسی کے اعتماد پر اعلی سمجھ کر خرید لے، پھر تحقیق وتفتیش کے بعد اس کاگھٹیا ہونا واضح ہوتو وصف مرغوب فیہ فوت ہونے کی وجہ سے مشتری کے لئے واپس کرنے کا حق ہے، اس لئے کہ جب وصف مرغوب فیہ کی عقد میں شرط لگادی جائے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ مبیع کو پورے ثمن کے ساتھ لے لے یا اس کو واپس کردے، مبیع کو خلاف شرط پانے کی صورت میں ثمن کو کم کروانے کا حق نہیں، البتہ اگر رد سے مانع کوئی چیز پیش آجائے مثلاً کوئی عیب پیدا ہوجائے یا مشتری کی طرف سے اس میں مانع رد کوئی تصرف پالیا جائے تو بقدر نقصان رجوع کا حق اور اختیار ہوگا اور اگر مانع رد کوئی چیز پیش نہ آئے تو ثمن کم کرانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ عقد اول کو فسخ کرکے از سر نو معاملہ کیا جائے، لیکن عقد اول کو باقی رکھتے ہوئے بغیر مانع رد کے ثمن کم کرانے کا حق نہیں۔

''وکذلک الجودۃ والرداءۃ فی أسواق السلع تنضبط بدرجات معلومات، فشراء سلعۃ علی أنہا من الدرجۃ الأولی أو الثانیۃ شرط جائز یثبت بہ خیار فوات الوصف فإن ہذہ الدرجات معروفۃ الیوم فی عرف التجار بأوصاف معلومۃ، إذا رضی المشتری بالمبیع وأراد أن یمسکہ بدون الوصف المشروط فإنہ یمکسہ بجمیع الثمن لأن الأوصاف لا یقابلہا شئ من الثمن وہذا لا خلاف فیہ، قال ابن قدامۃؒ فمتی بان خلاف ما اشترطہ، فلہ الخیار فی الفسخ والرجوع بالثمن أو الرضا بہ ولا شئ لہ لا نعلم بینہم فی ہذا خلافاً'' (فقہ البیوع؍۸۷۸۔۸۷۹)۔

جواب: ۴۔ اگر جوہری سے اصلی ہیرا طلب کیاگیا اور اس نے دھوکہ دیتے ہوئے کیمیکل والا ہیرا دے یا تو پرکھنے کے بعد جب کیمیکل والا ہونا ظاہر ہوگیا تو یہ بیع باطل ہوگئی، کیوں کہ جنس مبیع میں تغریر بیع کے بطلان کا سبب ہے، چنانچہ فقہ البیوع میں فقیہ عصر تحریر فرماتے ہیں:

''التغریر فی بیان جنس المبیع وذلک مثل أن یقول بائع الحلیۃ أنہا حلیۃ ذہب فیتبین أنہا من فضۃ مطلیۃ بالذہب فالبیع فی مثل ہذا باطل، قال ابن الہمامؒ إذا اشتری ہذہ الجاریۃ فظہرت غلاماً فالبیع باطل لعدم المبیع'' (فقہ البیوع مع حاشیہ۱،۲۰۸)۔

''لو باع داراً علی أن بناءہا آجر فإذا ہو لبن فالبیع باطل، الأغراض والمقاصد تتفاوت تفاوتاً فاحشاً فیلتحق بالجنس المختلف فیتعلق العقد بالمسمی والمسمی معدوم'' (المحیط البرہانی،۳۷۲)۔

اگر نقلی زیورات موجود ہوں تو ان کو واپس کرکے اصلی لیا جائے اور اگر لاعلمی میں اس کو فروخت کردیا ہے یا کسی جگہ استعمال ہوگئے ہیں تو اسی طرح کے نقلی زیوارات واپس کئے جائیں اور اصلی حاصل کئے جائیں اور اگر نقلی کا مثل نہ حاصل ہوسکے یا بائع لینے پر آمادہ نہ ہو تو نقلی کی جو مارکیٹ قیمت بنتی ہے اس کو ثمن سے کم کرکے بقیہ ثمن واپس لیا جائے اور اگر ثمن ادا نہیں کیا ہے تو صرف نقلی کی قیمت ادا کردی جائے۔

''ولو قبض زیفاً بدل جید جاہلاً بہ فلو علم وانفقہ کان قضاء اتفاقاً ونفق أو أنفق فلو قائماً ردہ اتفاقاً، فہو قضاء وقال أبویوسف إذا لم یعلم یرد مثل زیفہ ویرجع بجیدہ استحسانا کما لو کانت ستوقۃ أو نبہرجۃ، واختارہ للفتوی ابن کمال، قلت رجحہ فی البحر والنہر والشرنبلالیۃ وبہ یفتی'' (الدر مع الرد۷،۴۸۷۔۴۸۸)۔

جواب: ۵۔ شرکت کی یہ صورت شرعاً صحیح اور درست ہے، کیوں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ خریدار نے اپنے خریدے ہوئے ڈائمنڈ کے نصف حصہ کو دوسرے سے مقررہ قیمت میں فروخت کردیا ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ہر مالک کو اپنی مملوک میں ایک مقررہ قیمت لے کر شریک کرنے کااختیار ہوتا ہے اور یہ شرکت نصف سہام کے بیع کے ذریعہ سے متحقق ہوتی ہے، مالک کے لئے اپنی خریدی ہوئی قیمت کے حساب سے فروخت کرنا لازم نہیں، بلکہ اس کو اختیار ہے کہ اپنے مبیع اور مملوک کے حصہ کو جس قیمت میں چاہے فروخت کرکے شریک کرلے، شریعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں، البتہ اگر مطلق شرکت کا معاملہ ہو اور شرکت کے لئے کوئی قیمت متعین نہ کی جائے تو ایسی صورت میں جس قیمت پر خریداری ہوئی ہو اس کا لحاظ کیا جائے گا، لیکن اگر شریک سے حصہ کی قیمت متعین کردی جائے تو متعینہ قیمت ہی لازم ہوگی۔

''ومن اشتری عبداً مثلاً فقال لہ آخر اشرکنی فیہ فقال فعلت إن قبل القبض لم یصح وإن

بعده صح ولزمہ نصف الثمن بناء علی أن مطلق الشرکۃ یقتضی التسویۃ، قال اللہ تعالی: ‘‘فہم شرکاء فی الثلث’’، إلا أن یبین خلافہ’’ (شامی۶؍۵۰۷)۔

‘‘والحیلۃ فی جوازہ أن یبیع نصف البقرۃ منہ بثمن’’ (عالمگیریہ۴؍۴۴۵۔۴۴۶)۔

‘‘لا یفسد بیع عشرۃ أسہم من مائۃ سہم لشیوع السہم لأن السہم اسم للجزء الشائع فکان المبیع عشرۃ أجزاء شائعۃ من مائۃ سہم کما فی الفتح’’ (شامی۷؍۷۱)۔

‘‘بیع الشائع جائز اتفاقا کما فی بیع عشرۃ أسہم من مائۃ سہم’’ (فتح القدیر۶؍۲۷۵)۔

ان سب عبارتوں سے یہ معلوم ہوا کہ اپنی مملوک کا کچھ حصہ جس ثمن پر چاہے فروخت کرکے دوسرے کو شریک کرسکتا ہے۔

جواب: ۶۔ اگر ‘الف ’ ‘ب ’ سے اپنا ڈائمنڈ بیچنا چاہتا ہے اور ‘ب ’ اس کو خریدنے پر آمادہ بھی ہے، لیکن اس کی مارکیٹ قیمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ‘ب ’ نے معاملہ کو معلق رکھا ہے، پھر ‘ ب ’ نے ‘ ج ’ سے بھاؤ تاؤ کیا تو ڈھائی لاکھ روپیہ ‘ ج ’ ادا کرنے پر تیار ہوا تو ‘ ب ’ ‘ج ’ سے اس کے نصف حصہ کو سوالا کھ میں خریدنے کے بارے میں پوچھا تو اگر ‘ ب ’ ‘الف ’ سے اپنا معاملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی ‘ ج ’ سے سوا لاکھ میں نصف حصہ فروخت کرے تو ظاہر ہے کہ یہ بیع قبل الشراء ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، لیکن اگر ‘ج ’ کے قیمت بتلانے کے بعد ‘الف ’ سے وہ اپنا معاملہ دولاکھ یا ڈھائی لاکھ میں مکمل کرلے پھر اس کے بعد ‘ ج ’ سے جس قیمت میں چاہے نصف حصہ کو فروخت کرکے شریک کرسکتا ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، حاصل یہ کہ کوئی شخص اپنی چیز خرینے کے بعد کل یا اس کا نصف یا چوتھائی حصہ جس قیمت میں چاہے فروخت کرسکتا ہے، شریعت کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں، نیزجب بیع مساومہ ہو تو خریدار کو اپنی خریدی ہوئی قیمت بتلانا لازم نہیں، البتہ مرابحہ اور تولیہ کا معاملہ چوں کہ امانت ودیانت پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے اگر مرابحہ یا تولیہ کی شکل اختیار کی جائے تو اصل خریدی ہوئی قیمت بتلانا واجب ہوگا۔

‘‘ومن اشتری عبداً مثلاً فقال لہ آخر أشرکنی فیہ فقال فعلت إن قبل القبض لم یصح لأنہ بیع مالم یقبض ولو أشرکہ بعد القبض ولم یسلمہ إلیہ حتی ہلک لم یلزمہ ثمن ویعلم أنہ لا بد من قبول الذی أشرکہ لأن لفظ أشرکتک صار إیجاباً للبیع فہذا بیع النصف بنصف الثمن الذی اشتراہ بہ، ولزمہ نصف الثمن إلا أن یبین خلافہ’’ (شامی ۶؍۵۰۷)۔

دلالی اور جواہرات کی خریدوفروخت سے متعلق چند اہم مسائل

قاضی محمد حسن ندوی•

یہ بھی حقیقت پر مبنی ہےکہ اللہ نے انسان کو مختلف کمالات وصفات سے متصف فرمایا ہے، کوئی انسان کی تعلیم وتربیت کا علم اور تجربہ رکھتا ہے، تو کوئی تجارت وزراعت کا فن جانتا ہے ، کوئی مکان کی تعمیر کا ماہر اور معمار ہے، تو کوئی مال ومتاع کی خریدو فرخت میں دلال وسمسار ہے ، الغرض دنیا میں ہر ایک انسان دوسرے کی معاونت و تعاون کا محتاج ہے، چنانچہ حاجت انسانی کی بنا پر قیاس کے خلاف اجارہ کی طرح اسلام نے دلالی کی اجازت دی ہے ، محوراول کے دوسوالات دلالی سے متعلق ہے، اس لئے پہلے اس کی تعریف ، شکلیں اور شرطوں سے متعلق روشنی ڈالی جارہی ہے :

دلالی کی تعریف اور صورت :

اردومیں کمیشن اور عربی میں دلالی اور سمسرۃ دونوں کہتے ہیں ، سمسرۃ کا معنی دلالی ہے، دلالی کو سمسار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بائع اور مشتری کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے، یعنی بائع کے سامنے فروخت کرانے اور مشتری کو سامان دلانے میں مدد کرتا ہےاور اس کے عوض میں دونوں سے طے شدہ کے مطابق اجرت لیتا ہے، امام سرخسی لکھتے ہیں :

''وَالسِّمْسَارُ اسْمٌ لِمَنْ يَعْمَلُ لِلْغَيْرِ بِالْأَجْرِ بَيْعًا وَشِرَاءً'' (المبسوط ۱۵،۱۱۵)۔

تھوڑے فرق کے ساتھ صاحب موسوعہ الاقتصاد الاسلامی نے اس کی تعریف کی ہے:

''بينما العملة (Commission) نسبة من قيمة سلع مبيعة فى عملية يكون العامل فيها وسيطا (Broker) كالسمسارالذي يشرى ويبيع الأوراق المالية لحساب الغير مقابلة نسبة معينة'' (موسوعة الاقتصادالاسلامي۱،۱۸۷- ۱۸۸)۔

(کمیشن مبیع کی قیمت کے اعتبار سے عامل کے عمل کے عوض ہوتی ہے، عامل اس میں دلال (بروکر) کی طرح سامان کی خرید وفروخت میں تعاون کرتا ہے اس کے بدلہ میں متعین اجرت لیتا ہے)۔

اسی طرح امام محمدؒ نے تعریف کی ہے :

''خریدنے والے اور بیچنے والے کے درمیان ربط وتعلق کا کام انجام دے، اشیاء تجارت کی خرید وفرخت میں معاون ثابت ہونے والے فرد کو فقہ کی اصطلاح میں سمسار ،

• استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

کمیشن ایجنٹ کہتے ہیں " (فتاوی عالمگیری ۴، ۴۴۱)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اس کی نوعیت لکھتے ہوئے ذکر کرتے ہیں :

''سمسرۃ کی عام صورت یہ ہے کہ آپ میرے لئے مشتری تلاش کریں، اگر مشتری تلاش کر کے لائیں گے تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے دونگا، اس میں عام طور پر مدت مقرر نہیں ہوتی ہے، بلکہ عمل کی تکمیل پر اجارہ ہوتا ہے" (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴،۱۲۰)۔

بہرحال اس توجیہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ سمسرۃ کے معنی دلالی اور دلال کو سمسار کہتے ہیں، اور اس سے وہ شخص مراد ہے جو کسی کے لئے کوئی چیز خرید نے میں مدد دے ، نیز بائع اور مشتری کے درمیان رابطہ قائم کرے اور کسی سے سودا کرائے۔

سمسار بعض اوقات بائع کی دلالی کرتا ہے کبھی مشتری کا وکیل ہوتا ہے اور کبھی دونوں کا وکیل ہوتا ہے ، جیسا کہ امام سرخسی نےصاحبین کے قول کو ذکر کیا ہے:

''وَقَالَ: أَبُو يُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللَّهُ: إنْ شَاءَ أَمَرَهُ بِالْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ وَلَمْ يَشْتَرِطْ لَهُ أَجْرًا فَيَكُونُ وَكِيلًا مُعَيَّنًا لَهُ، ثُمَّ يُعَوِّضُهُ بَعْدَ الْفَرَاغِ مِنْ الْعَمَلِ مِثْلَ الْأَجْرِ''(المبسوط۱۵ ،۱۱۵)۔

اسی طرح جب کسی بازار وشہر میں دونوں طرف سے دلال بنانے کا عرف ورواج ہو تو فقہاء نے حاجت اور عرف کی بنا پر گنجائش دی ہے ۔

''وفي الحاوی:سئل محمد بن سلمۃ عن أجرۃ السمسار فقال أرجو أنہ لا بأس بہ وإن کان في الأصل فاسد لکثرۃ التعامل وکثیر من ھذا غیرجائز فجوز لحاجۃ الناس إلیہ'' (رد المحتار ۶،۶۳ مطلب في اجرۃ الدلال)۔

سمسرۃ کا جواز :

اس کا ثبوت قرآن وحدیث اور اجماع سے ہے۔

سمسرۃ (دلالی) اجارہ کی طرح ہے ، اجارہ میں منفعت کے بدلے اجرت ہوتی ہے، اسی طرح دلالی میں ایک عمل کے بدلہ میں اجرت ہوتی ہے جو بائع دلالی کے درمیان طے ہوتی ہے یا کبھی دلال اور مشتری کے درمیان طے ہوتی ہے، اور کبھی دونوں کا سمسار وکیل ہوتا ہے اور بعد میں اجرت مثلی دونوں سے وصول کرتا ہے، اس طرح دلالی اجیر کے اجارہ کی طرح ہے، اور اس کی اجازت قرآن مجید کی کئی آیات سے ہے :

''فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْہُنَّ اُجُوْرَہُنَّ" (طلاق : ۶) (پھراگر وہ عورتیں تمہارے لئے دوھ پلادیں تو ان کو اجرت دو) ۔

''فَانْكِحُوْھُنَّ بِـاِذْنِ اَھْلِہِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ" (نساء: ۲۵) (سو ان سے نکاح کیا کروان کے مالکونکی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر قاعدہ کے موافق دے دیا کرو)۔

سمسرہ جعالہ کی ایک شکل ہے، گرچہ دونوں میں فرق ہے، یعنی سمسرۃ میں معقود علیہ ، عمل متعین ہوتا ہے ، لیکن پورے جعالہ میں نہ تو کوئی مدت مقرر ہوتی ہے اور نہ کوئی عمل ، بلکہ عمل کے نتیجے پر اجرت دی جاتی ہے ، مثلاکسی شخص کا کوئی سامان

غائب ہے ،پتہ نہیں ہے کہاں ہے ؟ صاحب سامان کسی شخص سے کہتاہے: اگر تم میرے سامان میرے پاس لئے آؤگے تو تمہیں اتنی اجرت دوں گا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔

''قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ'' (یوسف : ۷۶) (بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن)۔

اس آیت میں بادشاہ وقت نے پیالہ کی دستیابی پر ایک اونٹ کے برابرراشن دینے کا وعدہ کیا، مگر اس کے لئے نہ کوئی مدت مقرر کی ،اور نہ عمل کی مقدار، بلکہ عمل کے نتیجے میں اجرت دینے کا وعدہ کیا۔

بہرحال جعالہ کی صحت میں فقہاء کا اختلاف ہے، چنانچہ جعالہ ائمہ ثلاثہ کے یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ صواع کی بناپر درست ہے:''وتجوزالجعالۃ شرعا عندالمالکیۃ والشافیعۃ والحنابلۃ بدلیل قولہ تعالی قصۃ یوسف مع إخوتہ''(یوسف : ۷۲) (الفقہ الاسلامی وأدلتہ)۔

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے کے تعلق سےڈاکٹر وھبہ زحیلی نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ کے یہاں جعالہ درست نہیں ہے، مگر اس سلسلہ میں امام صاحب سے کوئی صریح عدم صحت کی دلیل مروی نہیں ہے (حوالہ سابق)

البتہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں امام ابوحنیفہ سے بھی جواز نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ''الجعالۃ في رد الضالۃ والآبق وغیرھما جائزۃ وھذا قول أبي حنیفۃ ومالك والشافعي ولا نعلم مخالفا''، تو صحیح بات یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی سمسرہ درست ہے (اعلاء السنن ۱۳،۴۰، البدائع ۶،۸)، نیز سورہ یوسف کی آیت ''وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيرٍ'' سےجعالہ کا جواز ثابت ہوتاہے۔

چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب کا بھی یہی رجحان ہے، وہ لکھتے ہیں :

میرا غالب گمان یہ ہے کہ اس بارے میں امام ابو حنیفہ سے کوئی نفی کی بات ثابت نہیں ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴، ۱۲۲)۔

بہرحال جب جعالہ ثابت ہے تو سمسرۃ بھی قرآن سے ثابت ہے، کیوں کہ وہ اجارہ کے قبیل سے ہے۔

اسی طرح کئی احادیث اور آثار صحابہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے :

''قَالَ: كُنَّا نَبْتَاعُ الْأَوْسَاقَ بِالْمَدِينَةِ وَنُسَمِّي أَنْفُسَنَا السَّمَاسِرَةَ فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمَّاهَا بِاسْمٍ هُوَ أَحْسَنُ مِنْ اسْمِنَا قَالَ: صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلِفُ فَشُوبُوهُ بالصدقۃ '' (بحوالہ المبسوط ۱۵ ،۱۱۴)۔

دوسری حدیث میں ہے:

''المُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطهم'' (بخاري شريف ،بَابُ الشُّرُوطِ فِي المَهْرِ ۲۷۲۱)۔
(مسلمان اپنے شروط پر قائم رہتے ہیں)۔

اور امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ ابن سیرینؒ اور عطاءؒ اور ابراھیمؒ اور حسنؒ جیسے بلند پایہ علماء ایجنٹ کے کمیشن کو جائز قرار دیتے تھے ۔

اور ابن عباس کہتے ہیں :

''وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ:''لاَ بَأْسَ أَنْ يَقُولَ:بِعْ هَذَا الثَّوْبَ، فَمَا زَادَ عَلَى كَذَا وَكَذَا، فَهُوَ لكَ'' (صحيح البخاري مع فتح الباری ۵ ،۳۵۷- ۳۵۸) (ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں : یہ کپڑا فروخت کرو ، تو اتنی رقم سے زیادہ آپ کی)۔

اور ابن سیرین کہتے ہیں :

''جب کوئی کہے کہ اسے اتنے میں فروخت کریں اور جو نفع ہو آپ کا یا نفع میرے اور تیرے درمیان تو اس میں کوئی حرج نہیں ''۔

اور فقہانے لکھا ہے کہ امت کی ضرورت وحاجت کی بنا پر سمسرۃ کے جواز پر اجماع ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں :

''لَكِنَّا اسْتَحْسَنَّا الْجَوَازَ بِالْكِتَابِ الْعَزِيزِ، وَالسُّنَّةِ، وَالْإِجْمَاعِ''(بدائع ۴ ،۱۴)۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے بھی سمسرۃ کی اجات دی ہے :

''السمسرة:هي الوساطة بين البائع والمشتري لإجراء البيع، والسمسرة جائزة، والأجر الذي يأخذه السمسار حلال؛ لأنه أجر على عمل وجهد'' (الفقه الاسلامي وأدلتہ۴،۱۲۹)۔

سمسرۃ کے جواز کی شرطیں :

اوپر کی بحث سے جب یہ بات ثابت ہوئی کہ سمسرۃ (بروکری) باعتبار اجارہ ہے، تو باعتبار جعالہ بھی ، لہذا دونوں کی صحت کے لئے فقہاء نے جن شرطوں کا لحاظ ضروری قرار دیا ہے ان کا اعتبار دلالی کی درستگی میں بیحد ضروری ہوگا ، بہر حال یہاں گرچہ اجارہ اور اجرت کے تعلق سے چند شرطیں ذکر کی جارہی ہیں ، اس میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے ۔

امام شافعی کے یہاں شرائط ارکان کے درجہ مینہیں اور وہ کل چار ہیں :عاقدین ، صیغہ اجارہ ، منفعت اور اجرت کا ہونا۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی قلمبند کرتے ہیں :

''يشترط في أركان الإجارة الأربعة:وهي العاقدان والصيغة والمنفعة والأجرة ما يأتي من الشروط'' (الفقه الاسلامي وأدلتہ۴،۵۵۱)۔

لیکن دوسرے ائمہ کرام کے یہاں اجارہ کے لئے صیغہ کا ادا کرنا ، منفعت کا معلوم ہونا اور اجرت کا ہونا شرط ہے، اور منفعت کا زمانہ کے ساتھ خاص ہونا یا کسی عمل کے

ساتھ ہونا ضروری ہے ، جیسے کپڑے کی سلائی اور رنگائی وغیرہ ۔

''وأن تكون المنفعة معلومة عيناً وقدراً وصفة ، وتقديرها بالزمن كإجارة الدور للسكنى مدة سنة، أو بالعمل كالاستئجار لخياطة ثوب'' (حوالہ سابق ۵۵۲،۴)۔

اسی طرح اجرت کے سلسلہ میں بھی علماء نے وضاحت کی ہے:

معاملات کے ثمن میں جو شرطیں ہیں وہی اجرت میں ہیں ، یعنی اجرت کا پاک اور مال متقوم ہونا، منتفع کے لائق ہونا، اسے حوالہ کرنے پر قادر ہونا اور عاقدین کے علم میں ہونا۔

جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے لکھا ہے :

''الأجرة:يشترط فيها ما يشترط في الثمن في عقد البيع، بأن تكون طاهرة....وأن تكون منتفعاً بها.... وأن تكون مقدوراً على تسليمها....وأن تكون معلومة للعاقدين''(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۵۲،۴)۔

علامہ ابن ھمام نے لکھا ہے :

انسان تین صورتوں میں نفع کا مالک ہوتا ہے :کبھی مال کے عوض میں، تو کبھی عمل کے عوض میں اور کبھی ضمان کے طور پر۔

''والربح إنما يستحق بالمال أو العمل أو الضمان'' (فتح القدير ۶۳،۲)۔

''موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیۃ میں ہے:''جائزشرعاً لأنہ یعتبر أجر'' (۳۶۶،۴)۔

اسی طرح تھوڑے فرق کے ساتھ درالحکام شرح مجلۃ الاحکام میں ہے :

''يكون الاستحقاق للربح أحيانا بالمال أو بالعمل وأحيانا أيضا بالضمان'' (۳ ،۳۸۲) ۔

اور ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے لکھا ہے :

''بأن الربح يكون بالمال، أو بالعمل حسب الاتفاق، أو بضمان العمل كما في شركة الأعمال'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۹۲،۷)۔

مذکورہ بالا اجارہ کی شرطوں اور فقہاکی توجیہات سے یہ بات واضح ہوئی کہ دلال اجیر مشترک کی طرح ہے، اس لئے اس کا عمل درست ہوگا اور اجرت مسمی یا اجرت مثلی کی صورت میں اجرت کا مستحق ہوگا ، جیسے رنگریز ، لوہا ر وغیرہ اپنے عمل کی بنیاد پر اجرت کا مستحق ہوتا ہے (حوالہ سابق ۵۶۱،۴)۔

''والأجير المشترك:هو الذي يعمل لعامة الناس كالصباغ والحداد....وحكمه: أنه يجوز له العمل لكافة الناس''(حوالہ سابق)۔

محور اول :

جواب (۱):

اس لئے محور اول کے سوال نمبر: ۱ کی درجہ ذیل شقیں ہوتی ہیں :

(۱) پہلی شق یہ ہے کہ جب بائع اور مشتری دونوں نے دلالی کی فیس ۴؍فیصد متعین

کرکے سامان کی بیع وشراء کے لئے بروکر کو ذمہ دار بنا دیاہے اور اس پر دلال نے رضا مندگی ظاہری کی، لیکن اس کے بعد بروکر نے بائع کو سو روپئے کے بجائے ۶۵ روپئے میں فروخت کرنے پر تیار کرلیا، اور مشتری کو ۷۵ رپئے ہی میں خرید نے پر اور دس روپئے (۴؍فیصد اجرت کے علاوہ) اپنی جیب میں رکھ لیئے، لیکن نہ بائع کو اس کی اطلاع دی اور نہ مشتری کو ، اس بناپریہ اجارہ کی شرط کے خلاف ہے، کیوں کہ عاقدین کے علم میں اس بات کا ہونا ضروری ہے کہ بروکر کی اجرت ۴ ؍فیصد کے علاوہ دس روپئے بھی ہیں، مگر بروکر نے عاقدین کے علم سے مخفی رکھا ، اور یہ عاقدین کے حق میں ضرر ہے اور ناجائز طریقہ پر یہ حاصل کرنا ہوگا، قرآن وحدیث میں اس سےمنع کیا گیا۔

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' (نساء ۲۹)۔

حدیث میں ہے :''لا یحل مال إمری مسلم إلا بطیب نفسہ'' (کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لئے اس کی اجازت کے بغیر درست نہیں)۔

(۲)دوسری وجہ یہ ہے کہ سمسرۃ کی اجازت کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ بروکر امین وصادق ہو، لیکن مذکورہ صورت میں اس کا خائن ہونا ظاہر ہورہاہے، کیوں کہ بائع کو سمسار بتادیا ہوتا کہ مشتری نے یہ سامان ۷۵ روپئے میں خریدا ہے تو اس کا دس روپئے کا فائدہ ہوجاتا ، لیکن دلال نے بائع کو نہیں بتایا، یہ در اصل دلال کا عمل غرر اور خداع کے مستلزم ہے اور یہی مفضی الی النزاع کا سبب ہے، اس لئے اس صورت میں بھی دلالی کا عمل درست نہیں ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ کہ بروکر بائع کے مال کو فروخت کرنے کے لئے مشتری کو تلاش کرتا ہے، یا سامان کی خرید کے لئے بائع سے بات کرتا ہے، دونوں کے حق میں اس کی حیثیت معاون کی ہے اور وہ دونوں کے لئے محسن ، احسان کا بدلہ احسان ہے ''ھَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ'' (قرآن مجید)۔

اس صورت میں بائع بروکری کی اجرت متعین کرکے دینگے یا اجرت مثلی ہوگی، دونوں صورتوں میں عاقدین کے علم میں ہونا ضروری ہے جیساکہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے لکھا ہے :

''وأن تکون الأجرۃ معلومۃ للعاقدین'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴؍۵۵۱)۔

لیکن یہاں دلال نے عاقدین کو نہیں بتایا ہے، اس لئے یہ صورت بھی جائز نہیں ہوگی۔

(۴) اجارہ جس طرح اس کے تقاضہ کے خلاف شرطوں سے فاسد ہوجاتا ہے، اسی طرح دلال کا دلالی کرنا بھی فاسد ہوجائےگا، لہذا مذکورہ صورت میں اجرت مسمی کے علاوہ عاقدین سے کچھ لینا درست نہیں ہوگا ،تاہم اس صورت میں اجرت مثلی کا حقدار ہوگا اور شرط فاسد کی صورت میں اجارہ کی طرح دلالی کا عقد فاسد ہوجائے گا، تاہم دلال

اجرت مثلی کا مستحق ہوگا، جیسا کہ صاحب ھدایہ نے لکھا ہے:

''الإجارة تفسدها الشروط كما تفسد البيع؛ لأنه بمنزلته، ....والواجب في الإجارة الفاسدة أجر المثل لا يجاوز به المسمى'' (ھدایہ ۳۰۱،۳)۔

اجارہ بیع کی طرح ہے جن شرطوں سے بیع فاسد ہوتی ہے ان شرطوں سے اجارہ بھی ، اور اجارہ فاسد میناجر مثل اجر مسمی کے برابر واجب ہوتاہے، اس لئے اس صورت میں دلال اجرت مثلی کا حقدار ہوگا۔

(۵) اگر بائع نے سمسارسے معاملہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ سامان (کپڑا وغیرہ) فروخت کردو ، اگر ۶۵ روپئے میں سے زیادہ میں فروخت کروگے تو جتنا زیادہ ہوگا، وہ تمہارا ہوگا تو اس صورت میں اگر بروکر نے مشتری سے ۶۵ روپئے کے بجائے ۷۵ روپئے میں فروخت کیا تو اس صورت میں دس روپئے جو زائد ہیں اسے سمساراستعمال کرسکتا ہے،کیوں کہ بائع نے اس کی اجازت دی ہے، یعنی بائع اور دلال دونوں راضی بہ رضا ہیں۔

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'' (نساء ۲۹)۔

اس صورت میں جواز کی دلیل حضرت عبداللہ بن عباس کی حدیث بھی ہے:

''وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ:'' لاَ بَأْسَ أَنْ يَقُولَ:بِعْ هَذَا الثَّوْبَ، فَمَا زَادَ عَلَى كَذَا وَكَذَا، فَهُوَ لَكَ''(صحيح البخاري ۳۵۷،۵) (حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا اس کپڑے کو فروخت کرو جو زائد ہو وہ تمہارا ہے)۔

جواب (۲):

امام سرخسی نے صاحبین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سمسار جہاں بائع اور مشتری کا معاون ہوتا ہے اسی طرح وہ دونوں کا وکیل بھی ہوتا ہے، بشرطیکہ اجرت کی شرط نہ ہو۔

''وَلَمْ يَشْتَرِطْ لَهُ أَجْرًا فَيَكُونُ وَكِيلًا مُعَيَّنًا لَهُ، ثُمَّ يُعَوِّضُهُ بَعْدَ الْفَرَاغِ مِنْ الْعَمَلِ مِثْلَ الْأَجْرِ'' (المبسوط؛ مکہ مکرمہ ۱۱۵،۸)۔

اوریہ بات مسلم ہے کہ وکیل کی دوحیثیت ہیں:کبھی وہ سفیر ہوتا ہے تو کبھی اصیل، چنانچہ علامہ کا سانی نے اس کی توجیہ کی ہے:

''وَأَمَّا الْبَيْعُ فَالْوَاحِدُ فِيهِ إذَا كَانَ وَلِيًّا يَقُومُ بِطَرَفَيْ الْعَقْدِ، كَالْأَبِ يَشْتَرِي مَالَ الصَّغِيرِ لِنَفْسِهِ، أَوْ يَبِيعُ مَالَ نَفْسِهِ مِنْ الصَّغِيرِ، أَوْ يَبِيعُ مَالَ ابْنِهِ الصَّغِيرِ مِنْ ابْنِهِ الصَّغِيرِ، أَوْ يَشْتَرِي، إلَّا أَنَّهُ إذَا كَانَ وَكِيلًا لَا يَقُومُ بِهِمَا؛ لِأَنَّ حُقُوقَ الْعَقْدِ مُقْتَصِرَةٌ عَلَى الْعَاقِدِ، فَلَا يَصِيرُ كَلَامُ الْعَاقِدِ كَلَامَ الشَّخْصَيْنِ'' (بدائع الصنائع ،زکریا بکڈپو:۴۸۹،۲)۔

الغرض بروکری کے باب میں دلال کی مختلف حیثیت ہوتی ہے، کبھی وہ دلال ہوتا ہے توکبھی وکیل، اگر پہلے اس کی اجرت بائع ومشتری کی طرف سے متعین ہے تو اس صورت میں بائع ومشتری کے مابین کا معاملہ دلال کی حیثیت سے ہوتا ہے ، لیکن جب بائع

اور مشتری کی طرف سے کوئی اجرت متعین نہ ہو تو اس صورت میں دلال وکیل کے قائم مقام ہوتا ہے، کیوں کہ وکالت میں مؤکل کی طرف سے پہلے سے اجرت متعین نہیں رہتی ہے، بلکہ وکالت کے بعد مؤکل اجرت عمل دیتا ہے ، جیسا کہ اوپر امام سرخسی کی توجیہات سے بات واضح کی جاچکی ہے ۔

بہرحال صورت مسئولہ میں دلال کا کردار وکیل کی حیثیت سے ہے ،یہ اس وقت درست ہے جبکہ پہلے سے اجرت طے نہ ہو، لیکن تحقیق طلب امر یہ کہ بائع نے اپنا سامان جس قیمت پر فروخت کرنے لئے دوسرے کو دلال بنایا ہے ، اس قیمت میں دلال وہ مال خود خرید لے اور مشتری کو تیار کرکے طے شد ہ اجرت پر اس سامان کو فروخت کر دے، توسوال یہ ہے کہ دلال کا مشتری کی حیثیت سے بائع کے ساتھ معاملہ کرنا شرعًا درست ہوگا؟

اس کا حکم ایک اصول پر مبنی ہے کہ عقد میں ایک آدمی دو طرف سے عاقد ہوسکتا ہے، بایں طور پر وہ ایک کی طرف سے وکیل ہوتا ہے اور دوسرے کی طرف سے اصیل، تو ایسی صورت میں وکیل کا اپنے لئے مؤکل سے معاملہ کرنا درست ہوگا، جیسے نکاح کے باب میں درست ہے، لہذا ‘‘زوجنی ’’ کے جواب میں وکیل کا ‘‘زوجتك نفسی ’’کہنا دونوں کی طرف سے ایجاب وقبول کے قائم مقام ہوجائےگا ‘‘یعنی زوجتك ’’‘‘ قبلت’’ کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور وکیل کا مؤکلہ سے نکاح کرنا درست ہوگا، کیوں کہ اس باب میں نکاح کے حقوق وکیل کی طرف سے نہینلوٹتے، بلکہ عاقدین کی طرف لوٹتے ہیں ، اس لئے حق زوجیت کی سپردگی میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوگی اور نہ مفضی الی النزاع کا سبب ہوگا.

علامہ شامی نے لکھا ہے :

‘‘كزوجتك نفسی ’’ أشار إلى عدم الفرق بين أن الموجب أصيلاً أو وليا أو وكيلا’’ (شامی ۲۶۳،۲)۔

اور علامہ کاسانی فقہاء احناف کے مذہب کو اس طرح لکھتے ہیں :

‘‘قَالَ أَصْحَابُنَا:يَنْعَقِدُ بِعَاقِدٍ وَاحِدٍ إذَا كَانَتْ لَهُ وِلَايَةٌ مِنْ الْجَانِبَيْنِ، سَوَاءٌ كَانَتْ وِلَايَتُهُ أَصْلِيَّةً، كَالْوِلَايَةِ الثَّابِتَةِ بِالْمِلْكِ وَالْقَرَابَةِ، أَوْ دَخِيلَةً كَالْوِلَايَةِ الثَّابِتَةِ بِالْوَكَالَةِ؛ بِأَنْ كَانَ الْعَاقِدُ مَالِكًا مِنْ الْجَانِبَيْنِ كَالْمَوْلَى’’ (بدائع الصنائع ۴۸۸،۲)۔

رہا مسئلہ کہ بیع کے باب میں ایک شخص عاقد الطرفین ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

اس کاجواب درجہ ذیل شکلوں میں دیا گیا ہے :

(۱) پہلی شکل یہ ہے کہ اگربروکر(دلال) بائع سے دلالی کا معاملہ طے کرنے کے بعد مشتری کی حیثیت سے بائع کا سامان اپنے لئے خریدتا ہے (جبکہ اس کی حیثیت وکیل کی ہے) تو اس تناظر میں وکیل (یعنی دلال) کا عاقد الطرفین ہونا لازم آئے گا، نیز وہی مطالب اور وہی مطلوب ، وہی مسلم اور وہی مسلم ہوگا ، اور یہ ممتنع ہے جیساکہ اوپر

علامہ کا سانی کی توجیہ سے بات واضح ہوچکی ہے۔

البتہ نکاح کے باب مینیہ درست ہے کہ ایک شخص من جانب وکیل ہواور من جانب آخر اصیل بھی، لہذا ایک طرف سے ''زوجت نفسی''،'' قبلت'' کے قائم مقام ہوجائے گا ، کیوں کہ نکاح کے باب میں حقوق عاقدین کی طرف لوٹتے ہیں اس لئے وکیل کا مؤکل سے نکاح کرنا درست ہے ، لیکن وکیل فی البیع میں بیع کے حقوق وکیل کی طرف منتقل ہوتے ہیں ، اس لئے موکل (یعنی دلال) کا اپنے لئے فروخت کرنا درست نہیں ، جیسا کہ علامہ شامی رقمطراز :

''الوكيل بالبيع لا يملك شراؤه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشتريا وبائعافيبيعه من يشتريه منه وإن أمره المؤكل أن يبيعه من نفسه وولده الصغير أو ممن لا تقبل شهادته فباع منهم جاز'' (شامی ،باب الوکالۃ بالبیع والشراء،۸ ۲۵۷)۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جس مجلس میں بائع نے کسی کو دلال بنانے کے لئے ایجاب کیا،اس ایجاب کا دلال نے کوئی جواب نہیں دیا ،یاقبول کرنے کے بعد اسی مجلس میں دلالی کی ذمہ داری سے بری ہونے کا اظہار کیا ، تو اس صورت میں وہ دلال بائع سابق کا دلال نہینہوگا ، اور جب اس کی حیثیت دلال کی نہیں رہی، تو عام مشتری کی طرح وہ دلال بائع سے اپنے لئے سامان خرید سکتاہے۔

وجہ یہ ہے کہ جس طرح وکالت کے لئے مؤکل وکیل کے مابین ایجاب وقبول ضروری ہے، اسی طرح بائع اور دوسرے شخص کے درمیان بروکر کا معاملہ طے ہونے کے لئے ایجاب وقبول ضروری ہے، لیکن جب بائع کی طرح سے ایجاب ہوا اور سمسار کی طرف سے قبول نہیں ہوا تو وہ شخص اس بائع کا بروکر نہیں ہوگا ، اور جب سمسار نہیں ہوگا تو اس بائع کا سامان اپنے لئے فروخت کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی رقمطراز ہیں:

''ركن الوكالة عند الحنفية:هو الإيجاب والقبول، فإذا لم يوجد الإيجاب والقبول لا يتم العقد'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴،۴۴۳ - ۴۴۴)۔

(۳) تیسری شکل : اللہ تعالی نے انبیاء رسول اور عام انسان کو حلال اور پاک مال استعمال کرنے کا حکم دیاہے ، کیوں کہ اسی پر عمل کے صالح ہونے اور دعا کی قبولیت کا دار ومدار ہے ۔

''يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا'' (القرآن)۔

حدیث شریف میں ہے:

''التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ، وَالصِّدِّيقِينَ، وَالشُّهَدَاءِ''(سنن ترمذي ،حدیث: ۲۵۲)۔

(جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا)۔

‘‘إِنَّ التُّجَّارَ يُحْشَرُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقَى وَبَرَّ وَصَدَقَ’’ (المعجم الكبير للطبراني ۲۵۲۰)۔

(تجار فاجر وفاسق بناکر اٹھائے جائیں گے ، مگر جو لوگ تقوی وسچائی اور اچھی طرح معاملہ کرے گا وہ اس میں شامل نہیں ہوگا)۔

نیز اللہ کے رسول ﷺ نے تجارت میں صداقت وامانت ، کذب بیانی اور کتمان حقیقت کے اثرات کو اس طرح بیان کیا ہے:

‘‘فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا’’ (بخاری ۱۹۳۷)۔

(اگر عاقدین بیع وشراء میں صداقت اور حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں تو دونوں کے معاملہ میں برکت ہوتی ہے ورنہ برکت اٹھا دی جاتی ہے)۔

ان آیات واحادیث کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ دلال بنانے کی غرض ومقصد پر نگاہ رکھنابھی ضروری ہے، کیوں کہ عقود میں ‘‘العبرةفي العقود للمعاني’’ معانی کا اعتبار ہوتا ہے، صاحب مال کسی کو دلال اس لئے بناتا ہے کہ اس سے بیع وشراء کا علم نہیں ہوتا ہے یا علم تو ہوتا ہے، لیکن اس کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے ، اسی طرح مشتری بھی کوئی سامان خریدنے کے لئے اپنا دلال بناتا ہے ، دونوں صورتوں میں دلال کی حیثیت اجیر مشترک اور عامل کی ہوتی ہے، اور عامل کامل وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے وظیفہ کو اکمل صورت میں ادا کرے، اگر اس میں وہ کمی کرتا تو ان کا شمار مطففین میں ہوتا ہے ، تطفیف کی صورت کیل ووزن ہی میں نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کا تعلق تمام حقوق سے ہے۔

اسی طرح بائع جب کسی کو اپنا دلال بناتا ہے تو دلال اس باب میں امین ہے کہ بائع کا مال فروخت کرانے میں امانت وصداقت کا مظاہرہ کرے ،اور بائع کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے، تاکہ بائع اور مشتری کا جو اعتماد ہے اس میں فرق نہ آئے ، اس لئے سوال نمبر۲ کی دوسری صورت میں دلال کا کردار اس اعتبار سے امانت وصداقت کے خلاف ہے ، کیوں کہ دلال نے اصل مشتری سے ملاقات کرانے کے بجائے فرضی مشتری سے بات کرایا، جس نے صرف ۶۰ روپئے میں خرید نے کی بات کی اور بائع اسے اصل مشتری سمجھکر ۶۰ روپئے میں اپنا سامان دینے کے لئے آمادگی ظاہر کردی ،پھر دلال نے وہ سامان اصل مشتری کے معرفت ۶۰ روپئے کے بجائے ۷۰ روپئے میں فروخت کیا ، اس صورت میں دس روپئے مزید بروکری کی فیس کے علاوہ بائع کی اجازت کے بغیر اپنی جیب میں رکھا ہے ،اس صورت میں گویا کہ مذکورہ آیت کی بنیاد پر دلال نے بائع کا دس روپئے کا نقصان کیا ،جس کی شرعاً اجازت نہیں، اسی لئے اللہ تعالی نے دوسری جگہ پر اس سے منع فرمایا ہے :

‘‘وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ’’ (شعراء : ۱۸۳) (اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو)۔

اسی بنا پرصاحب موسوعہ نے لکھا ہے کہ بائع ومشتری یا بائع اور دلال کے درمیان جو معاملہ ہوتا ہےاس کی دراصل بنیاد وہ اعتماد ووثوق ہے جو تجارت کی منڈی میں تجارت پر ہوتا ہے ، یہ اعتماد اس وقت تک بحال رہتا ہے جب تک ان میں امانت وصداقت کی صفت باقی رہتی ہے ،لیکن جب یہ صفت مفقود ہوجاتی ہے تو وہ اعتماد بھی جاتارہتا ہے ، مذکورہ صورت میں بائع کا اعتماد دلال پر قائم تھا دلال نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا ہے، جو ایک اعتبار سے دلال کا یہ عمل غبن، غدر، وخداع کے قبیل سے ہے اور یہ درست نہیں ، اسی لئے خائن اور غبن کرنے والے کا صدقہ بھی قبول نہیں ہوتا ، حدیث میں ہے :''لا یقبل اللہ صدقۃ من غلول'' (ابوداؤد شریف۹،۱)، اس کے تحت صاحب بذل نے لکھاہے کہ ''وأصل الغلول الخيانة في الغنيمة ، والمراد هنا المال الذي حصل بسبب حرام'' (بذل المجهود ۳۵۸،۱) (غلول وہ مال غنیمت میں خیانت کرتا ہے یعنی وہ مال جو حرام طریقہ پر حاصل ہوا ہو)۔

اسی طرح مذکورہ صورت میں دلال عاقدین کو دھوکہ دے کر مال حاصل کرتا ہے ، اس لئے وہ زائد مال درست نہیں ہوگا۔

''لأن المعاملات تعتمد على الثقة المتبادلة بين الأمة إنما تحصل بشيوع الأمانة'' (موسوعة الاقتصاد الاسلامي ۲۶۲،۱)۔

(معاملات اصلاً تجار کے مابین قائم شدہ اعتماد پر موقوف ہے ، یہ اعتماد امانت کی بقا سے بحال رہتا ہے)۔

اور رسول اللہ ﷺ نے معاملات کے باب میں کذب بیانی اور حقیقت حال سے چشم پوشی کو بے برکتی کا سبب قرار دیا ہے۔

''البَيِّعَانِ بِالخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، أَوْ قَالَ: حَتَّى يَتَفَرَّقَا - فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَذَبَا وَكَتَمَا فَعَسَى أَنْ يَرْبَحَا رِبْحًا، وَيُمْحَقَا بَرَكَةَ بَيْعِهِمَا'' (بحوالہ موسوعہ ۲۵۳،۱ ، بخاري شريف ۵ ،۵)۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس صورت میں دلال کا یہ عمل اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ دلال کا مقصد ہی دس روپئے کا فائدہ اٹھانا ہے، جو اجرت دلالی کے علاوہ ہے، اس کا وہی حکم ہوگا جو حکم شہری کا دیہاتی کے مال خرید نے میں ہے اور اس کی نظیر ''بیع حاضر لباد '' والی حدیث ہے :

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: «نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُتَلَقَّى الرُّكْبَانُ، وَلاَ يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ ، يَا ابْنَ عَبَّاسٍ: مَا قَوْلُ لاَ يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ؟ قَالَ: لاَ يَكُونُ لَهُ سِمْسَارًا'' (بخاري كتاب الاجارة :رقم الحديث : ۲۲۷۴)۔

اس حدیث کے تحت منع کی وجہ کے سلسلہ میں ملا علی قاری لکھتے ہیں :

''إِذَا جَاءَ الْبَدَوِيُّ بِطَعَامٍ إِلَى بَلَدٍ لِيَبِيعَهُ بِسِعْرِ يَوْمِهِ وَيَرْجِعَ فَيَتَوَكَّلُ الْبَلَدِيُّ عَنْهُ لِيَبِيعَهُ بِالسِّعْرِ الْغَالِي عَلَى التَّدْرِيجِ وَهُوَ حَرَامٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ وَمَكْرُوهٌ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ - رَحِمَهُ اللَّهُ - وَإِنَّمَا

نَهَى عَنْهُ لِأَنَّ فِيهِ سَدَّ بَابِ الْمَرَافِقِ عَلَى ذَوِي الْبِيَاعَاتِ''(مرقاۃ المفاتیح۶ ۶۸،)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ :

اس حدیث سے امام بخاری نے اس طور پر استدلال کیا ہے کہ ''لا یکون لہ سمسار '' یہ خاص ہے اس صورت سے جبکہ کوئی شہری دیہاتی کا دلالی نہ بنے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲۰۴،۲)۔

اس لئے اس صورت میں دیہاتی بائع کے نقصان کے ساتھ ساتھ شہر کے غریب لوگوں کا نقصان ہوتا ہے اور فائدہ صرف دلال کا ہوتا ہے، اس لئے حضرت ابن عباس نے کہا ''لا یکون لہ سمسار''یعنی شہری آدمی دیہاتی کے لئے سمسار نہ بنے۔

اسی طرح مذکورہ صورت میں دلال اپنا ذاتی فائدہ کے لئے فرضی مشتری کو تیار کرتاہے، تاکہ بائع قیمت کم کرنے پر راضی ہوجائے اور پھر زیادہ قیمت میں اصل مشتری کے معرفت فروخت کردیتا ہے ، یہ صورت بھی بیع حاضر لباد کی قبیل سے ہے۔

چنانچہ ابواسحٰق الشیرازی لکھتے ہیں :

''ویقول الشیرازی :ویحرم تلقی الرکبان، وھو أن یتلقی القافلة ویخبرھم بکساد ما معھم من المتاع لیغبنھم، ولأن ھذا تدلیس وغرر فلم یحل'' (المھذب ۲۹۳،۱ بحوالہ موسوعہ الاقتصاد الاسلامی ۲۵۴،۱ ، دارالسلام)۔

(ابواسحٰق شیرازی لکھتے ہیں : تلقی الرکبان اس لئے منع ہے کہ مشتری دیہاتی لوگوں کے سامان کو کم بھاؤں میں خرید تے ہیں (پھر بازار میں زیادہ بھاؤ میں فروخت کرتے ہیں)، یہ ان کے ساتھ غبن کرتا ہے اور یہ دراصل تدلیس وغرر ہے، لہذا یہ درست نہیں ہوگا)۔

مذکورہ بالاوجوہ واسباب کی بناپر مذکورہ صورت میں دلالی فیس کے علاوہ دس روپئے کا فائدہ اٹھانا (جبکہ اس کا علم عاقدین کو نہ دیا ہو)شرعا درست نہیں ہوگا ، کیوں کہ اس صورت میں بائع سے دس روپئے دلالی کا لینا دھوکہ اور فریب کا معاوضہ ہے اور یہ ناجائز ہے ، اسی طرح اس صورت میں بھی دلال کا بائع یا مشتری سے اجرت مثلی سے زیادہ روپئے لینا ناجائز ہوگا جبکہ دو فرضی خریدار نے بائع کو پانچ سوروپئے کے بجائے ۴۰۰ روپئے پر راضی کرلیا، پھر اصل مشتری کے ساتھ سامان پانچ سو روپئے میں فروخت کردیا تو دلال کا سوروپئے رکھنا شرعاً درست نہیں ہوگا ۔

اسی قسم کے معاملہ کو آپ ﷺ نے ''نجش '' یا تناجش ''سے تعبیر کیا،یعنی خریدنے کا ارادہ تو نہ ہو ، لیکن دوسرے گاہکوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے ایک شخص یا دو اشخاص قیمت بڑھا کر بولے کہ یہ خریداروں کے ساتھ دھوکہ دہی ہے جیسا کہ ترمذی میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَقَالَ قُتَيْبَةُ: يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيَّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَنَاجَشُواوقال الترمذي وَالعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَهْلِ العِلْمِ كَرِهُوا النَّجْشَ: " وَالنَّجْشُ: أَنْ يَأْتِيَ الرَّجُلُ الَّذِي يَبصر السِّلْعَةَ إِلَى صَاحِبِ السِّلْعَةِ فَيَسْتَامُ بِأَكْثَرَ مِمَّا تَسْوَى، وَذَلِكَ عِنْدَمَا يَحْضُرُهُ المُشْتَرِي يُرِيدُ أَنْ يَغْتَرَّ المُشْتَرِي بِهِ، وَلَيْسَ مِنْ رَأْيِهِ الشِّرَاءُ إِنَّمَا يُرِيدُ أَنْ يَخْدَعَ المُشْتَرِيَ بِمَا يَسْتَامُ، وَهَذَا ضَرْبٌ مِنَ الخَدِيعَةِ''(جامع الترمذي ۱ ،۲۴۴ ، ابواب البيوع ، بَابُ كَرَاهِيَةِ النَّجْشِ)۔

نجش سے مراد :

ایک شخص کوئی سامان لینا نہیں چاہتا ، لیکن قیمت بڑھ کر بولتا ہے، تاکہ دوسرا گاہک اس کو زیادہ قیمت میں خرید لے اور دھوکہ کھا جائے ، اس صور ت میں اس کے حرام اور گناہ ہونے پر اتفاق ہے، لیکن یہ امام مالک کے یہاں بیع باطل ہوگی، لیکن ائمہ ثلاثہ کے یہاں درست ہے، البتہ دھوکہ دہی کی وجہ سے گنہگار ہوگا (قاموس الفقہ ۲ ،۳۶۲)۔

جواب (۳):

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں ، اور یہ بھی مسلم ہے کہ دنیا امتحان وابتلا ء کی جگہ ہے، اس لئے ہر شعبہ میں نفس کے گمراہی کے بہت ایسے سامان رکھدئے گئے ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں ، لیکن اللہ نے انسان کو ارادہ واختیار کی ایک خاص صلاحیت بھی ودیعت کی ہےکہ اگر وہ خیر اور بھلائی کی راہ اختیار کرنے کا ارادہ کرکے انتخاب کرےگا تو اللہ تعالی اس کے لئے وہ راستہ ہموار کردیتے ہیں۔

''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا '' (قرآن مجید)۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ شارع نے ماکولات و مشروبات کو چند وجوہ واثرات کی بناپر حرام قرار دیاہے ، نجاست ، درندگی، ملک غیر اور کرامت ، چوں کہ ہر غذا کی تاثیر ہوتی ہے ، حرام سے جو گوشت پوست اور خون تیار ہوتا ہے، اس میں ساری برائیاں پیوست ہوتی ہیں، جو کھانے والوں کو نیکی کے کام پر آمادہ نہیں ہونے دیتی ، اور ایسے ہی ملک وملت میں فتنہ وفساد کو جنم دیتے ہیں، ان ہی وجہ سے ملک میں قتل وخونریزی ، چوری عام ہوتی ہے اور ملک میں رہنے والوں کا چین وسکون مفقود ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مال حرام استعمال کرنے والوں کے لئے بڑی وعید سنائی ہے:

''عَنْ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّيَ بالحرَام'' (مشکوٰۃ شریف ،۲۴۳)۔

(حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہوتی ہے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ انسان رزق حلال کی تلاش کرے اور ایسے لوگوں سے خرید وفروخت نہ کرے جو حلال وحرام کی تمیز نہیں رکھتے ، کیوں کہ اللہ تعالی نے مشتبہات سے احتراز کو حفاظت دین اور صیانت پاکدامنی کا زینہ قرار دیا ہے ۔

''الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشبهات استبرَأَ لدِينهِ وعِرْضِهِ'' (مشکوٰۃ شریف ۲۴۱)۔

ملا علی قاری ؒ اس حدیث کے بابت رقمطراز ہیں:

''وَهَذَا الْحَدِيثُ وَسَبَبُ عِظَمِ مَوْقِعِهِ أَنَّهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - نَبَّهَ فِيهِ عَلَى صَلَاحِ الْمَطْعَمِ وَالْمَشْرَبِ وَالْمَلْبَسِ وَغَيْرِهَا بِأَنْ يَكُونَ حَلَالًا، وَأَرْشَدَ إِلَى مَعْرِفَةِ الْحَلَالِ'' (مرقاۃ المفاتیح ۹،۶)۔

اس کی اہمیت پر رسول اللہ ﷺ نے امت کو کھانا ، پانی اور لباس حلال وپاک طریقہ پر حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے اور حلال کی پہچان کی رہنمائی بھی کی ہے ۔

اس لئے اگر کسی کی ملکیت میں دونوں سامان ہوں ، حلال وحرام میں تمیز مشکل ہو، نیز یہ بھی پتہ لگانا دشوار ہو کہ مال چوری کا ہے ، تو ایسی صورت میں اس کی ملکیت سے مال خریدنا درست ہوگا ۔

اس سلسلہ میں فقہاء نے حلال وحرام کے دلائل وبراھین رکھتے ہوئے دوشکلوں میں جواب دیا ہے ، تاکہ امت کو ضروریات کی بجاآوری میں ضیق وتنگی نہ ہو ،اس سلسلہ میں سب سے پہلے حدیث کو پیش نظر رکھے :

''ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام'' (حوالہ سابق) ۔

جیسا کہ اس وقت خرید وفروخت میں عام رواج ہوگیا ہے ، بہت پہلے رسول اللہ ﷺ نے پیشن گوئی فرمائی ہے:

''يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ أَمِنَ الْحَلَالِ أم من الْحَرَام'' (مشکوٰۃ ۲۴۱)۔

(لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی اس کی قطعاپرواہ نہیں کرے گا کہ وہ حلال کھارہا رہا ہے یا حرام)۔

اسی بنا پر فقہاء نے معقود علیہ کے سلسلہ میں کچھ قیود وشرائط مقر رکئے ہیں، ان میں سے ایک شر ط مبیع کا مال متقوم ہونا ہے، مال متقوم کی تعریف کئی شکلوں میں کی ہے۔

مال متقوم کی تعریف :

وہ مال جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور حاجت کے وقت ذخیرہ اندوزی ممکن ہو جیسا کہ ڈاکٹر زحیلی نے لکھا ہے:

''والمال عند الحنفية ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ ،۱۲۵)۔

دوسری تعریف : ''ہو کل ما يمكن أن يملكه الإنسان وينتفع به على وجه معتاد''

(حوالہ سابق)۔

(وہ چیز جس کی تملیک انسان کے لئے ممکن ہو اور معتاد طریقہ پر اس سے انتفاع بھی ہو)۔

تیسری تعریف :یہ ہے کہ مال متقوم وہ مال ہے جس کی ذخیرہ اندوزی شرعاً درست ہے۔

''والمتقوم ما یمکن ادخارہ مع إباحتہ شرعاً'' (حوالہ سابق)۔

اسی طرح صاحب موسوعہ نے ذکر کیا ہے کہ مبیع کی شرطوں میں سے ہے کہ مبیع مال متقوم ہو اور اس کی متعدد تعبیرات میں تعریف کی ہے، ایک تعریف ملاحظہ کیجیے : ''أن یکون البیع مالا متقوما ...والمتقوم ما یمکن ادخارہ مع إباحتہ شرعاً'' (موسوعہ فتاوی الاسلامیہ ۱،۲۶-۲۵)۔

چوں کہ اس صورت میں یہ واضح نہیں ہو پارہاہے کہ مال حلال ہے یا حرام اور اس کا مالک کون ہے؟ تو یہ ما ل مشتبہ ہے ، اس کے بارے میں احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے ، یہی ورع وتقوی کا کردار ہے، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایاہے:

''وَقَالَ:اسْتَفْتِ نَفْسَكَ اسْتَفْتِ قَلْبَكَ ثَلَاثًا،الْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ'' (مشکوٰۃ شریف، حدیث: ۲۷۷۴)۔

(اللہ کے رسول ﷺنے فرمایا: اپنے نفس سے استفتاء کر، خیر وبھلائی اس میں ہے جس میں قلب کو اطمنان ہو)۔

ملاعلی قاری ''قول رسول ''والإثم ما حاك في النفس ...وإن أفتاك الناس'' کے تحت لکھتے ہیں:

''وَإِنْ قَالُوا لَكَ إِنَّهُ حَقٌّ فَلَا تَأْخُذْ بِقَوْلِهِمْ فَإِنَّهُ قَدْ يُوقِعُ فِي الْغَلَطِ وَأَكْلِ الشُّبْهَةِ، كَأَنْ تَرَى مَنْ لَهُ مَالٌ حَلَالٌ وَحَرَامٌ، فَلَا تَأْخُذُ مِنْهُ شَيْئًا، وَإِنْ أَفْتَاكَ الْمُفْتِي مَخَافَةَ أَنْ تَأْكُلَ الْحَرَامَ، لِأَنَّ الْفَتْوَى غَيْرُ التَّقْوَى'' (مرقاۃ المفاتیح ۲،۶)۔

یعنی مفتی گرچہ جواز کا فتوی دے، لیکن حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے مال مشتبہ استعمال نہ کرے ، کیوں کہ فتوی تقوی کے خلاف ہے۔

اسی بنا پرعلامہ ابن نجیم نے حرام کے پہلو کو حلال پر ترجیح دیتے ہوئے قاعدہ مرتب کیا ہے :

''إِذَا اجْتَمَعَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ غَلَبَ الْحَرَامُ'' (الاشباہ والنظائر:۱ ،۳۷۳ ،مکتبہ فقیہ الامت)۔

(جب حلال وحرام جمع ہوجائے تو حرام کو ترجیح ہوگی)۔

الغرض مذکورہ احادیث اور محدثین فقہاء کی توجیہات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس صورت کی دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ تقوی وورع اور احتیاط کا تقاضایہ ہے کہ جب مال کا

متقوم ہونا معلوم نہیں ہے، نہ اس کے مالک کا پتہ ہے، تو مال مشتبہ ہونے کی وجہ سے ایسی مارکیٹ سے مال نہ خریدے، بلکہ دوسری ایسی مارکیٹ سے خریدے جہاں متقوم ہو۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ یہی مال چوری کا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کی آیت ''خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا'' اور علامہ ابن نجیم کے قاعدے ''الأصل في الأشياء الإباحة'' کی بنیاد پر امام شافعی کا رجحان یہ ہے کہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے، بلکہ احناف میں سے امام کرخی ؒ کا بھی یہی رجحان ہے۔

''هَلْ الْأَصْلُ فِي الْأَشْيَاءِ الْإِبَاحَةُ حَتَّى يَدُلَّ الدَّلِيلُ عَلَى عَدَمِ الْإِبَاحَةِ؟ وَهُوَ مَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللَّهُ ....وَفِي شَرْحِ الْمَنَارِ لِلْمُصَنِّفِ:الْأَشْيَاءُ فِي الْأَصْلِ عَلَى الْإِبَاحَةِ عِنْدَ بَعْضِ الْحَنَفِيَّةِ، وَمِنْهُمْ الْكَرْخِيُّ(الاشباہ والنظائر،۲۵۳)۔

علامہ ابن قیم کے نزیدک عقود میں اصل صحیح ہونا ہے، الایہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل آجائے (اعلام الموقعین ۱،۱۱۲-۳)۔

اسی کی طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا بھی میلان ہے ۔

''والأصل في هذا أنه لا يحرم على الناس من المعاملات التى يحتاجون إليها إلا مادل الكتاب والسنة على تحريمه''(فتاوی شیخ الاسلام ۲۸،۳۸۶)۔

(معاملات میں اصل اس کا مباح ہونا ہے، الا یہ قرآن وحدیث اس کی حرمت پر دلالت کرے)۔

اور اس سے بھی واضح بات علامہ ابن نجیم نے فرمائی ہے جو صورت مسئلہ کے موافق ہے:

''وَأَمَّا مَسْأَلَةُ مَا إذَا اخْتَلَطَ الْحَلَالُ بِالْحَرَامِ فِي الْبَلَدِ، فَإِنَّهُ يَجُوزُ الشِّرَاءُ، وَالْأَخْذُ إلَّا أَنْ تَقُومَ دَلَالَةٌ عَلَى أَنَّهُ مِنْ الْحَرَام''(الاشباہ والنظائر ۱،۳۸۵)۔

(اگر کسی شہر میں حلال حرام کے ساتھ جمع ہو جائے تو جب تک کوئی واضح قرینہ نہ ہو کہ یہ مال حرام ہے اس وقت اس شہر میں خرید وفروخت درست ہے)۔

لہذا مذکورہ صورت میں اس مارکیٹ سے مال خریدنا درست ہوگا، بشرطیکہ اس مال کے حرام ہونے پر کوئی دلیل واضح ہوجائے، اور اس کے علاوہ کوئی نعم البدل مارکیٹ نہ ہو، اور یہ فتوی ہے، تقوی یہ ہے کہ وہاں سے خرید وفروخت میں احتراز کیا جائے۔

جواب (۴):

سوال نمبر:۳ کے جواب کے تحت آیات واحادیث اور فقہاکے قواعد کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جب صاحب مال نے کہا یہ درست وحلال مال ہے تو اس مال کو فروخت کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

وجہ یہ ہے کہ یہ امور دینیہ میں سے ہے،اس لئے اس میں صرف مسلمان عاقدین کی شہادت معتبر ہے، چنانچہ فقہاء نے اس سلسلہ میں ذکر کیا ہے کہ وہ امور جن کا تعلق

معاملات سے ہے جس میں کسی پر کوئی چیز لازم نہ ہو اور نہ اس میں نزاع کی صورت ہو ، جیسے کسی کو تجارت کی اجازت دینا وغیرہ ، ان امور میں مسلمان ، کافر ، فاسق اور نابالغ، کی خبریں معتبر ہوتی ہیں (البحر الرائق ۸،۱۸۶)۔

البتہ وہ امور جن کاتعلق دیانات سے ہے یعنی خدا اور بندوں کے درمیان حقوق سے متعلق جو احکام ہیں ایسے امور میں خبر دہندہ کا مسلمان اور عادل ہونا ضروری ہے ، مثلا پاک ہے یا نہیں، اسی طرح مال کا حلال ہونا وغیرہ ، اس میں مسلمان ہی کی خبر مقبول ہوگی (بحوالہ قاموس الفقہ ۲،۳۳۶)۔

جیسا کہ مفتی سید محمد عمیم صاحب نے قواعد الفقہ مینذکر کیا ہے کہ مسلمان کے امور صواب ودرستگی پر محمول ہوتے ہیں۔

''قاعده: أمور المسلمين على السداد حتى يظهر غيره'' (قواعد الفقہ، دار الکتاب دیوبند،۶۳)۔

اس مسئلہ کی تائید علامہ ابن نجیم کے اس جزیہ سے بھی ہوتی ہے :

''وَإِنْ كَانَ غَالِبُ مَالِهِ الْحَرَامَ لَا يَقْبَلُهَا، وَلَا يَأْكُلُ إلَّا إذَا قَالَ: إنَّهُ حَلَالٌ وَرِثَهُ أَوْ اسْتَقْرَضَهُ'' (الاشباہ والنظائر ۱،۳۸۳)۔

(اگر اس کا اکثر مال حرام ہوتا ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں اور نہ اس کا استعمال کرنا درست، ہاں اگر اس نے کہا کہ مال حلال ہے، وراثت میں ملا ہے یا کسی سے قرض کے طور پر لیا ہے (تو ایسی صورت میں قبول کرنا اور اسے استعمال کرنا درست ہوگا)۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات عام طور پر حلال صورت پر مبنی ہوتے ہیں ، یہ یقینی والا پہلو ہے اورعارض یقینی سے ہی زائل ہوتا ہے اور یہاں کوئی عارض یقینی والا پہلو نہیں ہے، البتہ مشتری کو بائع کے مال میں کسی وجہ سے شبہ پیدا ہوا تو استفسار پر بائع نے جب مال حلال کی تصدیق اور خبر دی، تو اب اس کے ما ل میں شبہ کرنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ حموی نے ذکر کیا ہے:

''إن الشئ الثابت بشئ لا يرتفع إلا بمثله والنص وخبر الواحد سواء في وجوب العمل وهو كاف في الأحكام'' (حاشیہ حموی اشباہ۱،۲۲۱)۔

(بیشک چیزوں کا ثبوت اسی کے مثل چیزوں سے، نص اور خبرواحد سے زائل ہوجاتا ہےاور خبر واحد احکام میں کافی ہےاور وجوب عمل میں یکساں ہیں)۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمان کے پاس مال اصل کے اعتبار سے مال حلال ہوتا ہے تو اسی صفت کے ساتھ باقی رہے گا، الا یہ کہ اس کے خلاف حرام ہونے کی صورت یقینی صورت میں پیدا ہوجائے۔

''الْأَصْلُ بَقَاءُ مَا كَانَ عَلَى مَا كَانَ''(الاشباہ والنظائر ۲۹۱)۔

بیع میں کبھی دونوں طرف مال ہوتا ہے ، اس صورت میں مجلس عقد میں عاقدین کا قادر التسلیم ضروری ہے، نیزاگر دونوں کا جنس بھی ایک ہو ،تو بائع ومشتری دونوں کے ملک میں ہونا ضروری ہے اور یدابید بھی ، دونوں کا ادھار ہونا یا ان میں سے ایک کا ادھار ہونا درست نہیں ،لیکن اگر بیع کی صورت یہ ہے کہ مبیع کا تبادلہ ثمن کے عوض ہے تو اس صورت میں بیع کے نفاذ کے لئے مبیع کا بائع کے ملک میں ہونا ضروری ہے، مگر ثمن میں یہ شرط نہیں ہے ، جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی مبیع اور ثمن میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) ‘‘یشترط لانعقاد البیع أن یکون المبیع مالاً متقوماً ولا یشترط ذلك في الثمن’’

(۲) ‘‘یشترط لنفاذ البیع أن یکون المبیع موجوداً في ملك البائع ولایشترط ذلك في الثمن’’ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۶۹،۴)۔

جواب (۵):

دو اعتبار سے تحقیق طلب ہے :

(۱) بیع کی وہ قسم ہے جس میں مبیع نقد ہو اور ثمن ادھار، کیا یہ درست ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث اور فقہاء کی تصریحات اس بات پر دال ہیں کہ یہ صورت درست ہے، بشرطیکہ ثمن متعین ہو اور ادائیگی کی مدت بھی متعین ہو، کیوں کہ بیع کے نفاذ کے لئے مبیع کی موجودگی ضروری ہے، لیکن ثمن کی موجودگی ضروری نہیں، لہذا اگر مشتری نے مبیع منقولہ میں قبضہ کرنے کے بعد تصرف کیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، وہ مال جو منقولہ کی قبیل سے ہے اس میں قبضہ کے بعد تصرف درست ہے ، چاہے مشتری مبیع کو اقالہ کی صور ت میں فروخت کرے یا مرابحہ کی صورت میں۔

‘‘لا یجوز التصرف في المبیع المنقول قبل القبض بلا خلاف’’ (حوالہ سابق ۱۷۳،۴)۔

یہ صورت بیع نسیئۃ کی ہے ، اس بیع میں مبیع نقد اور ثمن ادھار ہوتا ہے، لیکن أجل کا پہلے سے متعین کرنا ضروری ہے ، مثلاً کسی نے کتب خانہ سے ایک کتاب خریدی ، اور تاجر سے یہ کہا میں اس کی قیمت ایک ماہ کے بعد دونگا ، بائع نے کہا ٹھیک ہے تو یہ بیع نسیئۃ اور بیع مؤجل ہے ، اب تاجر (بائع) کا اس مدت سے پہلے مشتری سے تقاضہ کرنا درست نہیں ہوگا ، جیسا کہ اس حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

‘‘عن عائشۃ أن النبي اشتری طعاما من الیھودی إلیٰ أجل ورھنہ درعاً’’(الحدیث)۔

(حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ کھانا ایک وقت متعین تک قیمت اداکرنے کی شرط پر خریدا اور اس کے پاس درع رھن کے طور پر رکھی)۔

بہرحال جب بیع کی صحت کی تمام شرطیں پائی جارہی ہیں ، بائع اور مشتری میں ولایت عقد ہے ، مبیع وثمن معلوم ومتعین ہیں، گرچہ ثمن ادھار ہو، لیکن اس کی ادائیگی کا

وقت متعین ہے تو یہ صورت درست ہے،جیسا کہ شیخ وھبہ زحیلی نے لکھا ہے:

''أن يكون المعقود عليه موجودا حين التعاقد ....أن يكون المبيع معلوما والثمن معلوما" (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴،۱۵۱)۔

اسی طرح شرح المجلہ میں ہے:

''الثمن لا يتحقق إلا في عقد فهو مايتراضى عليہ المتبايعان سواء كان أكثر من القيمة أم أقل أم مساويا والثمن هو ما تراضى عليہ المتبايعان مقابلا للمبيع، البيع مع تاجيل الثمن وتقسيطہ صحيح يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل ... (شرح المجلہ لسليم رستم باز،۱۲۴ - ۱۲۵)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے بیع نسیئۃ کی درستگی کی چند شرطیں ذکر کی ہیں: بیع نسیئۃ ہونے کے لئے شرط یہ کہ اجل کا متعین ہونا ضروری ہے، اگر بیع بالنسیئۃ میں اجل متعین نہیں ہوگی تو بیع فاسد ہوجائے گی، لیکن یہ اس وقت ہے جب مبیع بالنسیئۃ ہو (اسلام اور جدید معاشی مسائل :۲،۴۲)۔

یہ صورت وہ ہے جس میں عین کا تبادلہ دین (ثمن) کے عوض ہوا ہے، اس میں احناف کے یہاں تھوڑی تفصیل ہے اور اس کا لحاظ ضروری ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب بائع نے مشتری سے ثمن (دین) کی حوالگی کا مطالبہ کیا ہے تو مشتری پر واجب ہے کہ اس عین کا بدل دین (ثمن) بائع کے حوالے کردے ۔

رسول اللہ ﷺ کے قول ''الدين مقضى'' کے بنا پر ضروری ہے، کیوں کہ اگر مشتری نے مبیع کے مقابلہ میں ثمن مشتری کے حوالہ نہیں کیا ،اور اس میں تاخیر کی تو وہ دین ادا نہیں ہوا۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جب مبیع کی سپردگی کے لئے مشتری نے بائع سے مطالبہ کیا تو بائع پر ضروری ہے کے مبیع اس کے حوالے کردے، تاکہ دونوں میں مساوات قائم ہو جائے۔

البتہ اس تفصیل سے دوصورتیں مستثنی ہیں :

(۱) ایک مسلم فیہ ہے، اس میں دین مؤجل ہوتا ہے۔

''واستثنوا من ذلك أمرين أولهما المسلم فيہ لأنہ دين مؤجل''(الفقہ الاسلامی وادلتہ ،۴،۱۷۷)۔

(۲) دوسری صورت وہ ہے جس میں ثمن مؤجل (ادھار ہوتا ہے) تو اس صورت میں بائع پر مبیع فوراً مشتری کے حوالہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

''والثاني:الثمن المؤجل فلو كان الثمن مؤجلاً، يجب تسليم المبيع للحال، لأن البائع أسقط حق نفسه في التأجيل" (حوالہ سابق)۔

(۳) أن يكون الثمن حالاًّ، فإن كان مؤجلاً، فلا يثبت حق الحبس، لأنه سقط بالتأجيل" (حوالہ سابق ۴،۱۷۸)۔

چوں کہ یہ صورت بیع نسیئۃ کی ہے، اس لئے یہاں سب سے پہلے بیع نسیئۃ اور بیع حلال میں فرق ظاہر کیا جارہا ہے۔

بیع نسیئۃ اور بیع حال میں فرق :

دونوں میں فرق یہ ہے کہ جب بیع بالنسئیۃ ہوتی ہے تو اس میں جو اجل مقرر ہوتی ہے اس اجل سے پہلے بائع کو ثمن کے مطالبہ کا بالکل حق نہیں ہوتا ، مثلا کسی نے تاجر سے ایک کتاب خریدی ، اور تاجر سے یہ کہا اس کی قیمت ایک مہینہ کے بعد ادا کروں گا اور اس نے کہاں ٹھیک ہے، ایک مہینہ کے بعد ادا کردینا، یہ بیع مؤجل ہوگئی یا بیع بالسئیۃ ہوگئی، اب ایک مہینہ سے پہلے مطالبہ کا جواز نہیں ہوگا ۔

لیکن اس کے برعکس بیع حال میں ہوتی ہے جس میں بائع کو بیع کے بعد فوراًمطالبہ کا حق ہوتا ہے، الغرض بیع مؤجل اور حال میں استحقاق کی وجہ سے فرق ہوتا ہے کہ بائع کا استحقاق بیع بالنسئیۃ میں اجل سے پہلے قائم ہی نہیں ہوتا، اور بیع حال میں فوراً عقد کے متصل قائم ہوجاتا ہے۔

جواب (۶):

اس کی اصل شکل یہ ہے کہ ایک شخص کے قبضہ میں مبیع موجود ہے، اس سے کوئی دوسرا شخص بھاؤ اور قیمت پوچھتا ہے ، لیکن خرید وفروخت کا معاملہ کسی وجہ سے طے نہیں ہوتا ہے ، بلکہ حقیقت میں بیع ہی نہیں ہوئی ، لیکن بھاؤ کرنے والا اس سامان کی بیع اور فروخت کی بات دوسرے مشتری سے لیتا ہے، اس شئی کے بارے میں جو اس کے قبضہ میں نہیں ہے،بلکہ بائع اول سے جتنے میں خریدنے کی بات کیا تھا اس سے زیادہ میں فروخت کی بات کرلیتا ہے ، بہر حال یہاں سوال یہ ہے کہ مبیع پر قبضہ سے پہلے دوسرے سے فروخت کی بات کرنا کیا درست ہے؟

اس سلسلہ میں احادیث نبویہ اور اقوال فقہاء پر نظر ڈالنا ضروی ہے ، اس لئے یہاں سب سے پہلے روایات پیش کی جارہی ہیں :

’’عَن عبداللہ ابْنِ عُمَرَ قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:’’مَنِ اشْتَرَى طَعَامًا بِكَيْلٍ أَوْ وَزْنٍ، فَلَا يَبِيعُهُ حَتَّى يَقْبِضَهُ ’’(مسند أحمد ، ۱۱۱)۔

(جوکیل یاوزن سے کھانا خریدے وہ قبضہ میں لئے بغیر اس کو فروخت نہ کرے)۔

’’مَنِ اشْتَرَى طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتَّى يَكْتَالَهُ’’ (مسلم ۵،۲)۔

(جو کھاناخریدے وہ پیمانہ سے ناپےبغیر فروخت نہ کرے)۔

’’عن جَابِرَ بْن عَبْدِ اللهِ :كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا ابْتَعْتَ طَعَامًا، فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَسْتَوْفِيَهُ’’ (مسلم شریف۶،۲)۔

(رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جب کھانا خریدو تو وصول کرنے سے پہلے فروخت نہ کرو)۔

''عَنْ حَكِيمَ بْنَ حِزَامٍ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، إِنِّي أَشْتَرِي بُيُوعًا فَمَا يَحِلُّ لِي مِنْهَا، وَمَا يُحَرَّمُ عَلَيَّ قَالَ: " فَإِذَا اشْتَرَيْتَ بَيْعًا، فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَقْبِضَهُ'' (مسند أحمد ،۳،۳- ۴).

(حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں خرید وفروخت کے بعض معاملات کرتاہوں ، تو میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ؟ فرمایا جب خرید وفروخت کرو تو قبضہ کئے بغیر فروخت نہ کرو)۔

فقہاء کی آراء:

ان احادیث کی روشنی میںفقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی چیز پر قبضہ سے پہلے اس کوفروخت کرنا درست نہیں، البتہ اس میں عطاء کا اختلاف ہے کہ وہ بیع قبل القبض کے جواز کے قائل ہیں ، اسی طرح جزوی طور پر فقہاء کی رائے مختلف ہیں ۔

شوافع :

ائمہ شوافع کے یہاں کوئی بھی شئی قبضہ سے پہلے اس کوفروخت کرنا درست نہیں، چاہے وہ مال منقولہ ہو یا غیرمنقولہ۔

''لا يجوز البيع المبيع قبل قبضه عقارا كان أو منقولا لا يأذن البائع ولا بغيرإذنه لا قبل أداء الثمن ولا بعده''(شرح المهذب ۹،۲۶۴)۔

(نہ فروخت کنندہ کی اجازت سے اور نہ بلا اجازت ، نہ قیمت کی ادائیگی سے پہلے نہ اس کے بعد)۔

امام محمد کی رائے شوافع کے نقطہ نظر کے مطابق ہے (مختصر الطحاوی ،۸۴)۔

حنابلہ :

البتہ حنابلہ کے یہاں تفصیل ہے، غیر خوردنی اشیاء میں قبضہ سے پہلے فروختگی جائز ہے ، لیکن خوردنی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہیں (المغنی ۴،۸۸)۔

مالکیہ:

اسی طرح ان کے یہاں اور زیادہ تفصیل ہے جو درجہ ذیل ہیں:

(۱الف) غیر خوردنی اشیاء قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں۔

(ب) خوردنی اشیاء اگر پیمانہ سے خرید نہ کی گئی ہوں بلا تعین مقدار خریدکیاگیا ہو تو ان کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کیا جاسکتاہے۔

(ج) جو خوردنی اشیاء ناپ،تول کر، یعنی اس لائق نہ ہوں کہ اس کا ذخیرہ کیا جاسکے ، قبضہ سے پہلے ان کی بیع کے بارے میں امام مالک کے دونوں طرح کے قول ہیں، لیکن قول مشہور یہ ہے کہ ان کوبھی قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں۔

(د) جو خوردنی اشیاء اموال ربویہ کے قبیل سے ہوں ، قبضہ سے پہلے ان کو فروخت کرنا درست نہیں ۔

حنفیہ :

رہا مسئلہ احناف کے نقطۂ نظر کا تو ان کے یہاں بھی تفصیل ہے :

غیر منقول اشیاء جیسے زمین ومکان وغیرہ قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں ، لیکن منقول اشیاء قبضہ سے پہلے فروخت نہیں کی جاسکتیں ، امام یوسف کا رجحان ابتداً اسی رائے کی طرف تھا جو امام شافعی کی ہے ، مگر پھر انہوں نے امام صاحب کی رائے کی طرف رجوع کر لیا۔

الغرض حنفیہ نے احادیث کے الفاظ کے بجائے مقصد پر نگاہ رکھی ہے کہ اصل مقصد غرر سے بچاناہے، اس لئے اموال میں ضائع اور ہلاک ہونے کے اندیشہ سے بیع قبل القبض درست نہیں ہوگی ، لیکن اموال غیر منقولہ میں بیع قبل القبض درست ہوگی ، بشرطیکہ ضیاع کا خطرہ نہ ہو، اسی وجہ سے جو زمین ومکان دریا کے کنارے واقع ہوں اور دونوں کے ضیاع کا اندیشہ ہوں تو ایسی صورت میں زمین ومکان پر قبضہ کے بعد ہی فروخت کرنا جائز ہوگا (البحر الرائق)۔

''ولا غرر في العقار، إذ لا يتوهم هلاك العقار''(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴؍ ۲۴۴)۔

ممانعت کی علت :

فقہاء کی آراء کو سامنے رکھنے سے یہ بات عیاں ہے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت دراصل علت پر مبنی ہے، حنفیہ کے نزدیک اس کی علت غرر اور ربوا ہے، ''العلۃ عند الحنفیۃ فی عدم جواز بیع الشئ قبل القبض ھی الغرر'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴؍ ۲۴۲)۔

چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ''والحدیث معلول بہ'' (ہدایہ مع الفتح۶ ؍۵۱۴)۔

اور داماد آفندی کا بیان ہے:

''الغرر المنھی عنہ غرر انفساخ العقد والحدیث معلول بہ'' (مجمع الانہر ۲؍۴۹)۔

اور فقہاء شوافع کے یہاں بھی ممانعت کی اصل علت غرر ہی ہے، علامہ ابواسحٰق شیرازی بیع قبل القبض کی ممانعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ولأن ملكہ عليہ غير مستحق لأنہ ربما هلك فانفسح العقد وذلك غرر من غير حاجۃ فلم يجز'' (شرح المھذب، ۹؍۲۶۴)۔

احادیث اور فقہاء کی آراء کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچاہوں کہ سوال نمبر ۶ کی صورت کئی وجہوں سے درست نہیں :

(۱) بیع کی صحت کے لئے مبیع کا بائع کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے، یہاں بائع کے قبضہ میں نہیں ہے، اس سے پہلے بیع کرنا بیع الطیور فی الہواء، بیع السمک فی الماء، اور بیع الحبلۃ کے مثل ہے اور ان چیزوں کی بیع درست نہیں، لہذا یہ صورت بھی درست نہیں ہوگی ۔

''لايحل سلف وبيع ...ولايحل بيع ماليس عندك''(ابوداؤد)۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ یہ صورت غرر کے قبیل سے ہے ، رسول اللہ ﷺ نے اس بیع سے منع فرمایا ہے جس میں غرر ہو ، ظاہر ہے بائع ثانی نے دوسرے سے فروخت کی بات کرلی ، پھر اصل بائع وہ سامان خرید ے گا، یہاں امکان ہے کہ مبیع ہلاک ہوگئی ہو یا بائع سابقہ قیمت پر دینے کے لئے راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں مشتری ثانی کو دھوکہ دینا لازم آئےگا، بلکہ دونوں میں نزاع بھی ہوسکتا ہے ، اس صورت میں مفضی الی النزاع بھی ہے۔

(۳) قول رسول ﷺہے ''الخراج بالضمان'' (ابن ماجہ۲،۲۲)، یعنی نفع ضمان کے اعتبار سے ہوتا ہے، لیکن یہاں بائع کے قبضہ میں نہ مبیع ہے اور نہ اس کے ہلاک ہونے کا ضمان عائد ہے، اس کے بغیر نفع کے ساتھ معدوم شئی کی بیع کی جارہی ہے، اس لئے یہ صورت درست نہیں، بلکہ اس طرح کی بیع فقہاء نے بیع باطل میں شمار کیا ہے ، موسوعہ الاقتصاد الاسلامی میں ہے :

''لا یجوز أن یأخذ ربح سلعۃ لم یضمنھا مثل أن یشتری متاعاً ویبیعہ إلی آخر قبل قبضہ من البائع فھذا بیع باطل وربحہ لا یجوز'' (۱،۲۶۹)۔

جس سامان کے ہلاک کا جو ضامن نہیں ہوتا وہ اس کے نفع کا مالک نہیں ہوگا ، مثلاً ایک شخص نے ایک سامان بکر سے خریدا ، بائع سے قبضہ کرنے سے پہلے دوسرے کے معرفت مشتری اول نے فروخت کردیا ، یہ باطل ہے اور اس کا نفع ناجائز ہوگا۔

''إِذَا ابْتَعْتَ طَعَامًا، فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَسْتَوْفِيَهُ''(رواہ مسلم شریف۵،۸)۔

البتہ ایک صور ت میں یہ بیع درست ہوگی جبکہ بکر عمر سے سامان دوسو روپئے میں خریدنے کے بعد اپنے قبضہ میں لےلے ، پھر خالد کے معرفت وہی سامان ڈھائی سوروپئے میں فروخت کرے ،تو اس صورت کے جواز میں کوئی قباحت نہیں ہوگی ، اور نفع کا استعمال بکر کے لئے درست ہوگا جبکہ وہ نفع عرف کے مطابق ہو۔

محور دوم :

جواب (۱):

بائع اور مشتری کے مابین بیع النسیئۃ کی صورت میں بیع ہوئی ، یعنی بائع نے مبیع مشتری کے حوالے کیا ، لیکن مشتری نے متعین مدت تک ثمن ادا کرنے کے وعدہ پر بیع کی ، ایسی صورت میں دلال بائع سے سامان کی پرچی لے کر ثمن ادا کرنا دو حال سے خالی نہیں ہوگا: ایک صورت یہ ہوگی کہ دلال بحیثیت وکیل کے بائع سے وہ سامان کم قیمت میں اپنے لئے فروخت کرے گا اور مشتری کو زیادہ قیمت میں دے گا ، دوسری صورت یہ ہوگی کہ دلال کا بائع کو پرچی کی قیمت ادا کرنا کفالت یا حوالہ کے طور پر ہوگا ۔

پہلی صورت کے اعتبار سے قابل غور بات یہ ہے کہ آیا دلال کا بائع سے وہ سامان

اپنے لئے خریدنا اور مشتری کو زیادہ قیمت میں فروخت کرنا درست ہوگا ؟ جیسا کہ محور اول کے سوال نمبر:۲ میں یہ بحث آچکی ہے کہ اس صورت میں دلال کا مطالب اور مطالَب ہونا لازم آئے گا اور یہ بیع میں درست نہیں ۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں :

''فَلَوْ تَوَلَّى طَرَفَيْ الْعَقْدِ لَصَارَ الشَّخْصُ الْوَاحِدُ مُطَالِبًا وَمَطْلُوبًا وَمُسَلِّمًا وَمُتَسَلِّمًا وَهَذَا مُمْتَنِعٌ'' (بدائع۲،۴۸۹)۔

(اگر ایک شخص دوطرف کا ذمہ دار ہوگا تووہی طالب ہوگا اور وہی مطلوب اور یہ ممتنع ہے)۔

''وقال الشامی:الوکیل بالبیع لا یملك شراؤہ لنفسہ لأن الواحد لا یکو ن مشتریا وبائعا'' (شامی۸،۲۵۷)۔

(علامہ شامی رقمطراز ہیں کہ وکیل بالبیع اپنے لئے سامان کی خریدکا مالک نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ایک ہی شخص مشتری اور بائع نہیں ہوسکتا)۔

بدائع اور شامی کی عبارت اس بات پر دال ہے کہ اس صورت میں دلال کا بائع سے کم قیمت میں پرچی کو خریدنا مشتری کی حیثیت سے ہوگا اور مشتری سے پرچی کے مطابق روپیہ وصول کرنا بائع ہونا لازم ہوگا ، اور یہ بیع میں درست نہیں ، البتہ نکاح میں درست ہے، کیوں کہ اس میں حقوق مؤکل کی طرف لوٹتے ہیں، لیکن بیع میں حقوق وکیل کی طرف۔

دوسری صورت یہ کفالت کے قبیل سے ہے ،لہذا کفیل نے مکفول عنہ کی اجازت سے کفالت کی ذمہ داری لی ہے تو اس کا مطالبہ کفیل سے درست ہوگا ورنہ نہیں ، اگر دلال بائع اور مشتری کے درمیان بیع النسیئہ کی صورت میں عقد کرانے کے بعد اصیل (مشتری) سے اس کی طرف سے مبیع ادا کرنے کی ضمانت لے لیتا ہے، اس پر مشتری (مکفول لہ) قبول کرلیتا ہے، تو ایسی صورت میں کفیل مکفول لہ سے اصل دین کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے،چاہے وہ بائع کو دیا ہو یا اس سے کم دیاہو ، بشرطیکہ عقد کفالت میں کفیل نے اس کا اظہار کیاہو ۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں :

''وأما ما یرجع به الکفیل علی الأصیل: فهو أنه یرجع عند الحنفیة بما ضمن، لا بما أداه؛ لأنه ملك ما في ذمة الأصیل، فیرجع بما تمت الکفالة علیه. فلو کانت الکفالة علی شيء جید، فأدی ما هو أدنی منه، فإنه یرجع علی الأصیل بالجید'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۵،۴۹)۔

تیسری شکل اس کی یہ ہے کہ دلال کا بائع سے قرض کی پرچی قیمت سے کم میں حاصل کرنا اور مشتری سے پوری رقم وصول کرنا ثمن (اعتباری) کو اسی جنس کے ثمن کے عوض فروخت کرنا ہے اور یہ بیع صرف کے قبیل سے ہے، اس صورت

مینبرابری اور یدا بیدضروری ہے، دوسری وجہ یہ کہ پرچی دین کے قائم مقام ہے اور دین کا تبادلہ دین کے عوض ہو تو مجلس میں سپردگی ضروری ہے اور برابری بھی۔

لیکن یہاں دلال کم میں پرچی لیتا ہے اور مشتری سے پرچی کے مطابق لیتا ہے تو یہ ربوا ہے اور ربوا حرام ہے ، اس لئے یہ صورت ناجائز ہے، جیسے:بیع صرف میں تفاضل ناجائز ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں :

''فإذا كان بيع عين بعين، فإنه يجب على العاقدين التسليم معاً، تحقيقاً للمساواة في المعاوضة المقتضية للمساواة...وكذلك إن تبايعا ديناً بدين، كما في عقد الصرف'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴،۱۷۶)۔

نیز فقہ اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینار (ممبئی) کے تجاویز میں سے ایک تجویز سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

''قرض کی دستاویز (رسیدات ، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہوجائے ، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق واجب رقم سے کم لے کر اس معاملہ سے علیحدہ ہوجاتا ہے، اس طرح کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے ''(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ،۱۷۰)۔

''ہاں اگر تیسرے شخص کے بجائے عاقدین کے مابین فوری ادا کرنے پر بائع دین میں کم کرے تو یہ ''ضع وتعجل '' کی بنیاد پر درست ہوگا '' (حوالہ سابق ،۱۶۸)۔

جواب (۲):

ربوا ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو،''وفي الشرع عبارة عن فضل مالا يقابله عوض في معاوضته مال بمال''(عنایۃ علی ھامش الفتح ۶،۱۴۷)۔

قرآن مجید میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا :

''وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا'' (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵) (اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام)۔

ربوا کی دو شکلیں ہیں: ربوا نساء اور ربوا فضل

ربوانساء : اس کی صورت یہ ہے کہ دوچیزیں ایک ہی جنس کی ہو اور ان کا ذریعہ پیمائش ایک ہی ہو تو ایسی صورت میں خریدو فروخت کے مقابلہ میں ایک طرف سے نقد اور دوسرے طرف سے ادھار کا معاملہ درست نہیں، اسی کو ''ربوا نساء '' کہتے ہیں ۔

ربافضل : فقہاء نے عام طور پر ربوا کی تعریف کی ہے، وہ اسی نوع پر صادق آتی ہے ، یعنی فریقین میں سے ایک کی طرف سے ایسا اضافہ جس کے عوض دوسرے فریق کی طرف سے کچھ نہ ہو ، یہ صورت ایام جاھلیت میں بھی مروج تھی ، ایک شخص کسی

سے قرض لیتا تھا ، جب ادائیگی کا وقت آتا تو قرض دہندہ دریافت کرتا کہ ادا کروگے یا اس پر سود ادا کروگے ، چنانچہ مقروض مزید مہلت حاصل کرکے سود دینے کو تیار ہوتا اور قرض دہندہ مان لیتا جیسا کہ '' الجامع لاحکام القرآن ''میں ہے :

''فکان الغریم یزید في عدد المال ویصیر الطالب علیہ'' (۳ ،۳۴۸)۔

بہر حال سود چاہے حاجاتی قرض پر لیا جائے یا تجارتی قرض پر مروجہ اصطلاح کے مطابق وہ بہر صورت حرام ہے ، کیوں کہ آیات قرآنیہ اور احادیث میں ان صورتوں میں زائد رقم کو ربوا میں شامل کرکے ناجائز قراردیا ہے ۔

فتح مکہ کے بعد جب حضرت عتاب بن اسید کو آپ ﷺ نے مکہ کا گورنرمقر کیا تو ان کے سامنے یہ معاملہ آیا کہ بنوعمرو بن عمیر بن عوف کی سودی رقوم بنو مغیرہ کے ذمہ باقی نہیں، چنانچہ اول الذکر نے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ، لیکن بنومغیرہ نے ادا کرنے سے انکار کیا ، حضرت عتاب نے آپ ﷺکو اس قضیہ کے تحت خط لکھا ، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی :

''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا...''(سورۃ البقرۃ: ۲۷۸)۔

لیکن اگر کسی کو اپنے آپ سے کسی مضرت کو دفع کرنا مقصود ہو یا اپنا جائز حق حاصل کرنا ہو تو فقہاء نے اس قاعدہ سے مستثنی کرکے سود دینے کی گنجائش دی ہے، مثلاً جان ومال کی حفاظت اور سلطان وامیر کو عدل وبرابری پر آمادہ کرنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش دی ہے۔

''إلَّا فِي مَسَائِلَ ....الرِّشْوَةُ لِخَوْفٍ عَلَى مَالِهِ أَوْ نَفْسِهِ أَوْ لِيُسَوِّيَ أَمْرَهُ عِنْدَ سُلْطَانٍ أَوْ أَمِيرٍ'' (الاشباہ ۱ ،۴۸۷)۔

اسی طرح فقہاء نے کبھی حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا ہے ، جس طرح ضرورت کی بناپر ناجائز بقدر ضرورت جائز ہے اسی طرح حاجت کی بنا پر بھی ۔

امام سیوطی کا بیان ہے:''الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت أو خاصۃ'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی ،۳۲۶)۔

حاجت سے مراد یہ ہے کہ جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو ، تو ایسی صورت میں سودی قرض لینے کی اجازت فقہاء نے دی ہے۔

''یَجُوزُ لِلْمُحْتَاجِ الِاسْتِقْرَاضُ بِالرِّبْحِ''(الاشباہ والنظائر ۱ ،۳۲۷)۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر خریدار بائع کی طرف سے پیش آنے والے ضرر سے بچنے کے لئے سود پر قرض لے کر بائع کو قیمت ادا کیا ہے یا مشتری کی اجازت سے کسی دوسرے نے سود پر قرض لے کر بائع کو ادا کیا ہے، تو دونوں صورتوں میں اس کے لئے سودی قرض لینا اور دوسرے کے لئے اس قرض کا سودادا کرنا درست ہوگا۔

جواب (٣):

اس شق کا تعلق بیع وشراء سے ہے ، بیع صحیح میں ایک مال کا تبادلہ دوسرے ما ل کے عوض عاقدین کی رضا سے ہوتاہے ، اس لیے مبیع اور ثمن کی حیثیت سے معقود علیہ کی چھ شرطیں ہیں:معقود علیہ ہو،مبیع مشتری کے حوالہ کرنے کے لائق ہو، بائع اور مشتری مبیع کی حقیقت سے آگاہ ہوں ، عقد کے وقت یا اس سے پہلے عاقدین کے سامنے ثمن معروف ہو اور مبیع میں یا عاقدین کی طرف سے ربا یا کسی زائد شرط کی قید نہ ہو ۔

ان شرطوں میں پانچویں شرط بہت ہی اہم ہے، یعنی عاقدین کے سامنے ثمن معروف ہو، اسی وجہ سے مجہول رقم کے عوض بیع درست نہیں، چنانچہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''أن يكون الثمن معروفاً للعاقدين حال العقد أو قبله: فلا يصح بيع برقم مجهول، ولا بما باع زيد إلا إن علم به العاقدان'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ٤،١٦٢)۔

اسی طرح عاقد کے اعتبار سے بیع میں دوشرطوں کا لحاظ ضروری ہے:

ایک شرط یہ ہے کہ عاقدین عاقل ہو ، دوسری شرط یہ ہے کہ متبایعین اس بیع پر راضی ہوں، اور اس میں دونوں کو اختیار ہو۔

''أما شروط العاقد؛ فهي إثنان:١- الرشد إلا في يسير.٢-التراضي من المتبايعين والاختيار'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ٤،١٥٨)۔

رہا مسئلہ عاقدین کی شرطوں کا تو اس کی دوشرطیں ہیں: ایک عاقدین کا عاقل یا سن رشد کو پہنچنا، دوسری شرط یہ ہے کہ متعاقدین راضی ہوں ۔

مذکورہ صورت میں عقد کے وقت جوثمن طے ہوا اور جس پر عاقدین نے اپنی رضاکا اظہار کیا ، اور مشتری نے مجلس عقد میں قبولیت کا اظہار کیا، پھر وہی سامان دوسرے سے پانچ سو روپے کیرٹ کے اعتبار سے فروخت کرنے کے بعد مشتری کا بائع سے ثمن میں کم کرنے کا مطالبہ کرنامعقود علیہ کی شرط کے خلاف ہے کہ طے شدہ سے ہٹ کر کم کرنے کا مطالبہ کررہا ہے، دوسری بات یہ ہے بائع اس کے معرفت پانچ سوروپے کیرٹ کے اعتبار سے فروخت کرنے پر راضی ہوا تھا اب چار سو روپئے ادا کرنا اور سوروپئے کم کرنے کا مطالبہ بالکل تراضی طرفین کے خلاف ہے ، اس لئے مشتری کا بائع سے سوروپئے کم کرنے کا مطالبہ غیر شرعی اور ناجائز ہوگا ، جیسا کہ قرآن میں بھی اس کی صراحت ہے:

''إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ''(نساء : ٢٩)اور حدیث میں تراضی طرفین بیع میں ضروری ہے:''اِنَّمَا الْبَيْعُ عَنْ تَرَاضٍ''(رواہ ابن حبان)۔

تیسری بات یہ ہے کہ عاقدین کے ایجاب وقبول پر بیع منعقد ہوئی ہے، لیکن دونوں کا مجلس عقد میں ہونا ضروری ہے ، مجلس کے اختتام کے بعد عاقدین کوئی بات کرے اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔

حدیث میں ہے: ‘‘البیعان بالخیار مالم یتفرقا’’(الحدیث)۔

یہاں بیعان سے بائع اور مشتری ہیں، اور تفریق سے تفرق بالاقوال مراد ہے، لہذا ایجاب وقبول سے پہلے دونوں کی رضا کا اعتبار ہوگا، لیکن جب ایجاب وقبول دونوں کی طرف سے ہوگیا، اب کوئی عدم رضایا ثمن میں کمی کی شرط لگائے تو شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔

لہذا مذکورہ صورت میں مشتری کا بیچنے والے سے یہ کہنا کہ اس کی قیمت کم کرو شرعاً ناجائز ہوگا۔

البتہ بائع اپنی مرضی سے متعین ثمن سے کچھ حصہ وضع کردے یا پوری رقم سے مشتری کو بری کردے تو اس مینکوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ بائع کا عمل اللہ کے یہاں مستحسن اور قابل رحمت ہوگا ، حدیث میں اس اعتبار سے بائع کو تحریض بھی کی گئی۔

بخاری شریف میں ہے :‘‘ رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرَى، وَإِذَا اقْتَضَى بدینہ أی طالب بہ ’’ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴،۱۱۴)۔

جواب (۴):

عام طور پر اس بات میں لوگوں سے کوتاہی ہوتی ہے کہ اپنے عیب دار سامان کو اچھا اور بہتر کہہ کر پیش کرتے ہیں، لیکن دوسرے کا سامان گرچہ عمدہ اور اچھا ہوتا ہے، مگر اس میں وہ عیوب ونقائص نمایاں کرتے ہیں جو نہیں ہوتی ہیں، تاکہ صاحب سامان اس کی قیمت کم لگائے ۔

اس سلسلہ میں سورہ مطففین کی ابتدائی آیات سے بڑی رہنمائی ملتی ہے:

‘‘وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَي النَّاسِ يَسْتَوْفُوْن وَاِذَا كَالُوْہُمْ اَوْ وَّزَنُوْہُمْ يُخْسِرُوْنَ (مطففین: ۳)۔

(بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے،جب لوگوں سے ناپ لیں تو پورا پورا لیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم گھٹا دیں)۔

دوسری سورۂ ھود کی آیت ہے:

‘‘وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَہُمْ’’ (ھود : ۸۵)۔

(اور اے میری قوم ! تم ناپ تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو)۔

اسی طرح حدیث میں تطفیف اور ناپ وتول میں کمی کو فقر اور موت کے عام ہونے کا سبب قرار دیا ہے ۔

‘‘مانقص قوم العہد إلا سلط علیھم عدوھم وما حکموا بغیر ما أنزل اللہ إلا فشا فیھم الفقر ...’’ (الحدیث)۔

دوسری حدیث میں تناجش سے منع کیا ہے ، نجش اور تناجش بائع اور مشتری کے

اس عمل کو کہتے ہیں جس سے دوسرے فریق کو نقصان پہنچنا لازم آئے، تلبیس یا اضرار کی صورت ہو ، جیسا کہ صاحب موسوعہ نے لکھا ہے:''ویظہر النجش الیوم في أسواق الأوراق المالیۃ الحدیثۃ بالإشاعات الکاذبۃ'' (موسوعہ الاقتصاد الاسلامی ۱،۲۵۹)۔

گرچہ تطفیف طفیف سے ماخوذ ہے، اس کا معنی قلیل ہے اور مطفف اس کو کہتے ہیں جو اپنے ساتھی کے حق کو کم کرتا ہے یا کیل ووزن میں کم کرتا ہے ، لیکن یہ لفظ عام ہے، لہذا ہر شخص پر تطفیف کا حکم اور اس کا وبال عائد ہوگا جو دوسرے کے حق کو دبانے یا کم کرنے کی کوشش کرے ۔

اسی طرح لفظ '' نجش'' کا معنی سامان میں عیب بنا کر اس کی قیمت کم کرنا ہے، والنجش النقص وھو یکون في السلعۃ بالتعیب والتزھید فیھا أو المخادعۃ عن القیمۃ'' (موسوعہ الاقتصاد الاسلامی ۱،۲۶۱) ۔

مگر تطفیف کی طرح اس کے معنی میں عموم ہے جیسا کہ صاحب موسوعہ نے تحریر کیا ہے:

''والنھی عن التطفیف وبنجش الناس أشیاءھم لا یقف عند الکیل والوزن فی البیع والشراء وإنما یمتد إلی کافۃ الحقوق'' (موسوعہ الاقتصاد الاسلامی ۱،۲۶۱)۔

تطفیف اور نجس کی ممانعت بیع وشراء کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے؛ بلکہ یہ عام ہے، اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس کے ذریعہ کسی کا حق تلف ہو رہا ہو۔

اس توجیہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مشتری کا یہ عمل (یعنی مال میں زیادہ عیب نکالنا، تاکہ بیچنے والا قیمت کم لگائے) تطفیف ونجش کے قبیل سے ہے، جو بائع کے حقوق کو تلف کرنے کے مترادف ہے، نیز اس کے مال کو باطل طریقہ پر حاصل کرنا بھی ہے، یہ دونوں ناجائز ہے ۔

''والذین لا یعدل بین الناس في العطاء ...والموظف الذی لا یعطی الدولۃ حقھا من العمل أو یأخذ حقا لیس لہ أکثر مما ھو لہ... کل أولئك من المطففین ومن الذین ینجشون الناس أشیاءھم'' (حوالہ سابق ،۲۶۱)۔

اسی طرح اپنے سامان کی زیادہ تعریف کرنا بھی درست نہیں، اس بنا پر مشتری کو نقصان وضرر پہنچنا لازم آئے گا، اسی لئے تصریہ، تلقی بالجلب سے اللہ کے رسول نے منع فرمایا ہے۔

''وذھب جمھور الفقھاء إلی أن التلقی محرم ...''(حوالہ سابق)۔

نیز اپنے سامان کی زیادہ تعریف کرنا نجش کے قبیل سے ہے، مگر آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایاہے: ''ولاتناجشوا'' (بخاری رقم الحدیث ،۲۱۴۰)۔

الغرض تصریہ اور تلقی جلب میں دونوں کی ممانعت کا دار ومدار احد الامرین ہے: ایک قیمت غلط بتانا، دوسری چیز اضرار باہل البلد ہے، یہی دونوںچیزیں احناف کے یہاں

ممانعت کی وجہ ہے، مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں :

''فالحاصل أن النهی عنہ عندالحنفیۃ معلول بعلۃ وهی الضرر أو التلبیس فمتی وجدت العلۃ تحقق النهي وإلا فلا''(تکملۃ فتح الملہم ۱ ،۳۳۱)۔

(حنفیہ کے یہاں ممانعت کی علت یا تو ضرر ہے یا دھوکہ ہے، جب وہ علت پائی جائے گی ممانعت آئےگی ورنہ نہیں)۔

نیز یہ صورت تلقی جلب والی صورت کے مشابہ ہے، اس میں شہری تجار دیہاتی تجار سے شہر میں آنے سے پہلے سامان خرید لیتے ہیں ، ان کو بتاتے ہیں کہ قیمتیں اتری ہوئی ہیں، بازار میں مندا ہے، بائع کو یقین دلاکر کم قیمت میں اس سے مال خرید لیتے ہیں اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے:

''مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُبَيِّنْهُ، لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتِ اللَّهِ، وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ'' (ابن ماجۃ ۷۵۵،۷)۔

''من اشتری شیئا لم یرہ فهو بالخیار إذا رآہ''۔

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ''۔

''(وَمِنْهَا) أَنْ يَكُونَ مَالًا لِأَنَّ الْبَيْعَ مُبَادَلَةُ الْمَالِ بِالْمَالِ''(بدائع ۴ ،۳۳۰)۔

''وَهَذَا بِخِلَافِ الْوَكِيلِ بِالشِّرَاءِ''(بدائع ۴ ،۳۴۷)۔

اور حدیث میں ہے:''لاَ تُصَرُّوا الإِبِلَ وَالغَنَمَ، فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ فَإِنَّهُ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْتَلِبَهَا: إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ، وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا''(متفق علیہ)۔

جواب (۵):

یہ سوال عقد استصناع کے قبیل سے ہے ، عقد استصناع ،عقد معاوضہ کی ایک شکل ہے، البتہ اس عقد کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ سلم کی طرح یہ بھی بیع معدوم کی ممانعت سے مستثنی ہے ، اس میں عوضین ادھار ہوتا ہے ، مگر امت کی ضرورت اور عرف وعادت کی بنا پر کچھ شرطوں کے ساتھ فقہاء کرام نے گنجائش دی ہے، بہر حال یہاں اس کی تعریف ، ثبوت کی دلیل اور جواز کی شرطیں لکھی جارہی ہیں ۔

استصناع کی تعریف :

کسی تیار کنندہ کو یہ آرڈر دینا کہ وہ اپنے پاس سے میڑیل لگا کر خریدا رکے لئے متعین چیز تیار کردے اور تیار کنندہ کا اس ذمہ داری کو قبول کرلینے کا نام استصناع ہے ، جیسا کہ شرح المجلہ میں ہے:

''الاستصناع عقد مقاولۃ مع أهل الصفۃ علی أن یعملوا شیئا أن یکون العمل والعین من الصانع'' (۱،۹۹، مادہ: ۱۲۴)۔

اسی طرح علامہ شامی نے اس کی تعریف کی ہے:

''طلب العمل من الصانع في شیء مخصوص علی وجہ مخصوص'' (رد المحتار ۴۷۴،) ۔

(تیار کنندہ سے کسی خاص چیز کو خاص صورت میں تیار کرنے کے لئے طلب کرنا)۔
استصناع کا ثبوت :
اس کا ثبوت قرآن وحدیث اور اجماع سے ہے ۔
اللہ تعالی کا ارشاد ہے:
''قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا''(سورہ کہف : ۹۴ ۹۵-)۔
ان آیات میں حضرت ذوالقرنین سے اسکی قوم نے ایک ایسی دیوار بنانے کے لئے کہا جو یاجوج وماجوج سے حفاظت کا ذریعہ بن سکے، اور اس عمل پر انہوں نے ذوالقرنین کو اجرت دینے کا وعدہ بھی کیا ، اور یہی صورت استصناع کی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر ؓسے روایت ہے :
''أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اصْطَنَعَ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ وَكَانَ يَلْبَسُهُ، فَيَجْعَلُ فَصَّهُ فِي بَاطِنِ كَفِّهِ، فَصَنَعَ النَّاسُ خَوَاتِيمَ، ثُمَّ إِنَّهُ جَلَسَ عَلَى المِنْبَرِ فَنَزَعَهُ... فَنَبَذَ النَّاسُ خَوَاتِيمَهُمْ'' (بخاری مع فتح الباری ۱۱ ،۵۳۷)۔
(آپ ﷺ نے سونے کی ایک انگوٹھی بنوائی ، اسے آپ پہنتے ، پھر اس کے نگینہ کو اپنے ہتھیلی کے باطن میں کردئے ، پھر لوگوں نے بھی انگوٹھیاں بنوائیں ، پھر آپ ﷺنے منبر پر چڑھنے سے پہلے انگوٹھی نکال لی ،تو لوگوں نے بھی پھینک دیا)۔
استصناع کے شرائط :
اس کے جواز کی کئی شرطیں ہیں، ان میں سے چند شرطیں درجہ ذیل ہیں:
پہلی شرط یہ ہے کہ جس چیز کا آرڈردیا جارہا ہو اس کی جنس ،نوعیت ، مقدار اور صفات کی تصریح ہو، تاکہ کم کیف میں نزاع کا اندیشہ نہ ہو، ڈاکٹر وھبہ زحیلی رقمطراز ہیں:
''وَأَمَّا شَرَائِطُ جَوَازِهِ.فَمِنْهَا بَيَانُ جِنْسِ الْمُسْتَصْنَعِ وَنَوْعِهِ وَقَدْرِهِ وَصِفَتِهِ؛ لِأَنَّهُ مَبِيعٌ فَلَا بُدَّ أَنْ يَكُونَ مَعْلُومًا، وَالْعِلْمُ إِنَّمَا يَحْصُلُ بهذا الأشياء'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ ،۳۹۴)۔
دوسری شرط یہ ہے کہ جس چیز کا آرڈر پر تیار کرنے کا معاہدہ ہوا ہے، وہ تجار کے درمیان آرڈر کرانے کا رواج ہو، علامہ کاسانی لکھتے ہیں :
''مِنْهَا أَنْ يَكُونَ مَا لِلنَّاسِ فِيهِ تَعَامُلٌ كَالْقَلَنْسُوَةِ،وَالْخُفِّ وَالْآنِيَةِ''(بدائع الصنائع ۴ ،۴۴۴)۔
تھوڑے فرق کے ساتھ اس شرط کو ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے بھی لکھا ہے :
''أن يكون المصنوع مما يجري فيه تعامل الناس كالمصوغات والأحذية والأواني'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴ ،۳۹۴)۔
تیسری شرط مصنوع کی حوالگی کی مدت متعین کی جائے، اس میں ائمہ کرام کے مابین اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے یہاں تاجیل کی شرط لگانا درست نہیں، البتہ صاحبین

کے یہاں تاجیل کی شرط لگانا ضروری ہے ، لیکن ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے صاحبین کے قول کو راجح قرار دیا ہے :

‘‘وقال الصاحبان:ليس هذا بشرط، والعقد استصناع على كل حال، حدد فيه أجل أو لم يحدد’’ (حوالہ سابق ۴ ،۳۹۶)۔

اس تفصیل کی روشنی میں صورت مسئولہ کی دو شکلیں ہوتی ہیں :

(۱) ایک شکل یہ ہے کہ صانع نے مستصنع کے آرڈر وصف ، نوعیت مقدار اور صفات کے اعتبار سے سامان تیار کیا ہے تو ایسی صورت میں دونوں کے مابین عقد لازم ہوگا یا نہیں؟ اس میں ائمہ احناف کے مابین اختلاف ہے، چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ کے یہاں عقد لازم نہیں ہوگا، بلکہ صانع اور مستصنع دونوں کو خیار حاصل ہوگا، جیسا کہ علامہ کاسانی نے ذکر کیا ہے :

‘‘وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهُ غَيْرُ لَازِمٍ فِي حَقِّ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا حَتَّى يَثْبُتَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْخِيَارُ’’ (بدائع الصنائع ۴ ،۴۴۴)۔

لیکن امام یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں عقد لازم ہوگا اور صانع اور مستصنع میں سے کسی کو کوئی خیار حاصل نہیں ہوگا ، یہ رائے راقم کے نزدیک بھی راجح ہے ، وجہ ترجیح یہ ہے کہ اگر مستصنع کو خیار کا حق دیا جائے گا تو صانع کو ضرر لاحق ہوگا، کیوں کہ وہ مال آرڈر کی بنیاد پر تیار ہوا ہے، بسا اوقات اس صورت میں مال کی فروختگی بازار میں نہیں ہوگی تو اس صورت میں وہ مال پڑا رہ جائے گا جو صانع کے لئے باعث ضرر ہے، اس کا تذکرہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے بھی کیا ہے :

‘‘وقال أبو يوسف: العقد لازم إذا رأى المستصنع الشيء المصنوع ولا خيار له، إذا جاء موافقاً للصفة أو الطلب والشروط، لأنه مبيع بمنزلة المسلم فيه...وربما لا يرغب غيره في شرائه على تلك الصفة، بأن ضرر المستصنع بإبطال الخيار له أكثر من ضرر الصانع’’ (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴،۳۹۷)۔

نیز خیار کا حق دینے میں دونوں میں نزاع کا بھی اندیشہ ہے ، اس لئےرفع ضرر دفع نزاع کی بنیاد پر امام ابویوسف کا قول زیادہ قرین قیاس ہے۔

اور صاحب مجلہ الاحکام العدلیہ نے بھی امام یوسف کی رائے کو راجح قرار دیتے ہوئے اس صورت میں عقد کو لازم قرار دیا ہے۔

‘‘لذا أخذت المجلة برأي أبي يوسف، فقررت في المادة (۳۹۲)’’۔

لیکن یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ صانع مال تیار کرنے کے بعد مستصنع کے ہاتھ اس وقت فروخت کرتا ہے ، جب کہ اس مال میں ملاوٹ بھی ہے جس کی اطلاع تاجر کو دیدی ہے اور تاجر نے رضامندگی کا اظہار کیا ہے تو یہ درست ہے۔

‘‘ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ’’ (نساء: ۲۹) ۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ طے شدہ شرطوں کے خلاف صانع نے سامان تیار کیا ہے یا اس میں عیب نمایاں ہے تو اس صورت میں مستصنع کو خیار ہوگا ۔

''إذا جاء المصنوع مغايراً للأوصاف المشروطة، يتخير المستصنع بفوات الوصف" (حوالہ سابق ۳۹۸،۴)۔

(جب سامان وصف مشروط کے خلاف ہے کہ مستصنع کو اختیار ہوگا)۔

مجلۃ الاحکام میں بھی اسی طرح مذکورہے:

''وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبينة، كان المستصنع مخيّراً" (بحوالہ حاشیۃ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۹۸،۴)۔

لہذا جب سامان میں عیب ظاہر ہوگیا جس سے صانع نے مستصنع کو مطلع نہیں کیا تو ایسی صورت میں اس کو خیار ہوگا کہ وہ سامان طے شدہ قیمت کے عوض لے یا بیع کو فسخ کردے جیسا کہ صاحب ھدایہ نے لکھا ہے:

''وإذا اطلع المشتري على عيب في المبيع فهو بالخيار، إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء رده" (ھدایہ ثالث ۳ ،۲۳) ۔

جب مشتری مبیع کے عیب پر مطلع ہو گیا، اسے دواعتبار سے خیار ہوگا: یا تو وہ سامان پوری قیمت میں لے گا یا اس کو مشتری کو واپس کر دے گا۔

جواب (۶):

قرآن وحدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ تمام تر معاملات میں فریقین کی مکمل رضامندی کے بغیر معاملہ طے نہ ہو ، اور دونوں کو ایسی آزادی حاصل ہو، جس میں دوسروں کے لئے نقصان اور ضرر کا باعث نہ ہو، اسی لئے سامان کی قیمت اور ثمن کی تعین میں فریقین کو پورا اختیار ہے ، اس میں حکومت کو دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ فریقین کو عرف وتعامل کے اعتبار سے ثمن طے کرنے کا حق حاصل ہے ، جیسا کہ حضرت انس کی روایت سےیہ بات ثابت ہے:

''قَالَ :غَلَا السِّعْرُ فِي الْمَدِيْنَةِ عَلى عَهدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فقَالَ النَّاسُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، غَلَا السِّعْرُ فَسَعِّرْ لَنَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ"....(سنن ابي داؤد ۲۷۲،۲)۔

(رسول ﷺ کے زمانہ میں بھاؤ زیادہ ہوگیا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بھاؤ متعین کر دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیمتوں میں گرانی اور ارزانی کرنے والا اللہ ہے)۔

اس روایت سے علامہ ابن قدامہ نے دو پہلو سے استدلال کیا ہے :

(۱) صحابہ نے درخواست کی اگر اس کی اجازت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ضرور تسعیر فرماتے ، معلوم ہوا کہ امیر کے لئے یہ جائز نہیں ہے: ''إنہ لم يسعر وقد سألوه ذلك

ولو جاز لأجابهم إليہ''

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا بھاؤ طے کرنا باعث ظلم ہوتا اور ظلم حرام ہے، اس لئے آپ ﷺ نے عمل نہیں کیا، اس کی تائید حضرت عمرکے عمل سے بھی ہوتی ہے:

''إنہ مر بحاطب بن أبي بلتعہ وھو يبيع زبيبا لہ في السوق فقال لہ إما أن تزيد في السعر وإما أن ترفع من سوقنا... فقال لہ إن الذی قلت لك ليس بعزيمۃ منی ولا قضاء إنما ھو شيئ أردت بہ الخير لأھل البلد فحيث شئت فبع وكيف شئت فبع'' (موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیۃ۱؍۱۹۱)۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث میں نجش، تصریۃ ، عزر ، بیع منابذہ، بیع ملامسہ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بائع کے لئے درست نہیں ہے کہ مشتری کو دھوکہ دے، اسی طرح مبیع کی مروجہ قیمت سے زیادہ قیمت اور بھاؤ کرنا منع ہے، مگر بہت سے لوگ اخلاقی ھدایات سے چشم پوشی کرتے ہوئے سامان کے بھاؤ میں غلو سے کام لیتے ہیں۔

اس لئے فقہاء نے گراں فروشی کی صورت میں تعیین قیمت کا حق حکومت کو دیا ہے کہ حکومت اصحاب رائے کے مشورہ سے تاجروں کو متعین قیمت پر فروخت کر نے پر مجبور کرسکتی ہے ۔

''صرح فقہاء الحنفيۃ بأنہ يجوز للحاكم أن يسعر على الناس إن تعدى أرباب الطعام من القيمۃ تعديا فاحشا، وعجز عن صيانۃ حقوق المسلمين إلا بالتسعير، وذلك بعد مشورۃ أھل الرائ والبصيرۃ وھو المختار وبہ يفتی'' (موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیۃ۱؍۱۹۱- ۱۹۲)۔

(فقہاء احناف نے صراحت کی ہے کہ جب ارباب غلہ قیمت غبن فاحش کی صورت میں اضافہ کرے اور حقوق المسلمین کی حفاظت تسعیر حکومت پر موقوف ہوتو ایسی صورت میں اھل رائے اور اھل بصیرت کے مشورے سے حکومت کو بھاؤ وتاؤ کرنے کا اختیار ہوگا)۔

غبن فاحش یہ ہے کہ سامان کی ڈبل قیمت کرے، جیساکہ امام زیلعی نے ذکر کیا ہے:

''كما عرفہ الزيلعی وغيرہ والتعدي الفاحش ھو البيع بضعف القيمۃ''(حوالہ سابق) ۔

اب سوال یہ ہے کہ اس میں کیا معیار ہوگا جس بنیاد پر بائع کے لئے نفع لینا درست ہوگا اور اس سے زیادہ لینا درست نہیں ہوگا ؟

گرچہ شریعت میں نفع کے لئے کوئی خاص معیار مذکور نہیں ہے، البتہ حدیث العتق میں قیمۃ عدل (سامان کے مثل قیمت) کاتذکرہ ہے :

''مَنْ أَعْتَقَ عَبْدًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ آخَرَ، قُوِّمَ عَلَيْهِ فِي مَالِهِ قِيمَةَ عَدْلٍ، لَا وَكْسَ، وَلَا شَطَطَ''

(صحیح مسلم ۳۲،۲)۔

اسی بنا پر جان ، مال ، بضع اور منافع تلف کرنے پر ضمان مثلی کی صورت میں واجب ہوتا ہے جیسے نکاح میں مہر مسمی نہیں ہوتا ہے تو مہر مثلی واجب ہوتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں سامان کے مثل قیمت لینا عدل ہوگا اور اس سے زیادہ لینا غبن فاحش میں داخل ہوگا ، جیسا کہ امام ابن تیمیہ کا نظریہ ہے :

''یقول ابن تیمیۃ عوض المثل ....وھو أمر لا بد منہ في العدل الذي بہ تتم مصلحۃ الدنیا والآخرۃ، فھو رکن من أرکان الشریعۃ مثل قولھم قیمۃ المثل وأجرۃ المثل ومھر المثل ونحو ذلك...یحتاج إلیہ فیما یضمن بالإتلاف من النفوس والأموال والأبضاع وما یضمن بالمثل من الأموال والمنافع'' (موسوعۃ الاقتصادالاسلامی ۱ ،۴۱۲ طبع دار السلام)۔

لہذا اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے درجہ میں آجائے مکروہ ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ نفع کی دوصورت ہیں: ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے خوب گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لے کر جلد بیچا جائے۔

الغرض شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی حدیث العتق کو پیش نظر رکھتے ہو ئے صاحب مال کو سامان کے مثل نفع لینے کا حقدار قرار دیا ہے اور حکومت کو یہ مجاز دیا ہے کہ اضطراری حالت میں وہ صاحب مال کو ثمن مثلی کے عوض فروخت کرنے پر مجبور کرسکتےہیں (موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیہ ۱۹۲،۱)۔

اس سلسلہ میں حدیث العتق کو علامہ ابن قیم نے معیار بنایا ہے :

''مَنْ أَعْتَقَ شِرْكًا لَهُ فِي عَبْدٍ، فَكَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ الْعَبْدِ، قُوِّمَ عَلَيْهِ قِيمَةَ الْعَدْلِ، وَأَعْطَى شُرَكَاءَهُ '' (صحیح ابن حبان ۱۵۴،۱۰)۔

(جس شخص نے مشترک غلام کو آزاد کیا اور اس کے پاس غلام کی قیمت کے برابر مال ہے تو قیمت عدل متعین کرکے صاحب حصہ کو دیدے)۔

الغرض ابن تیمیہ اور ابن قیم کی توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ واجب منفعت عامہ کا تقاضہ اور مصلحت یہی ہے کہ حکومت پر سامان کی قیمت کی تحدید واجب ہے اور یہی امام مالک اور امام شافعی کا رجحان ہے (موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیہ ۱۹۲،۱)۔

لیکن قیمت مثلی میں معیار کیا ہوگا ؟ اس سلسلہ میں اس کے تجار کے یہاں اس کی جو قیمت مروج ہوگی وہی مثلی ہوگی، جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے توجیہ کی ہے۔

''فھنا یجب التسعیر علیھم بحیث لا یبیعون إلا بقیمۃ المثل ولایشترون إلا بقیمۃ المثل'' (حوالہ سابق)۔

(لہذا یہاں ان پر تسعیر (بھاؤ کرنا) واجب ہے، تاکہ بائع ثمن مثلی میں بیچےاور مشتری ثمن مثلی میں خریدے)۔

الغرض مذکورہ بالا بحث سے سامان کی قیمت کے سلسلہ میں درجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) تمام حالت میں بائع اور مشتری کو سامان کی قیمت لگانے کا اختیار ہے، اس میں حکومت کو مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

(۲) ہاں جب غبن فاحش کے ساتھ معاملہ ہو اور اس صورت میں بائع یا مشتری پر ظلم لا زم آتا ہو تب حکومت کو سامان کی تسعیر کا حق ہوگا کہ اصحاب رائے کے مشورے سے سامان کا بھاؤ کرے۔

(۳) ثمن مثلی کے مطابق نفع لینا درست ہے ، اس سے زیادہ لینا یا سامان سے ڈبل قیمت لینا غبن فاحش ہے اور یہ ناجائز ہے ۔

(۴) ثمن مثلی وہ ہے جو عرف میں قیمت مروج ہو یا تجار اس کی جو قیمت لگاتے ہوں۔

محور سوم :

جواب (۱):

عہد جدید میں بہت سے مالیاتی ادارے اسلامی بنیاد پر بیع مرابحہ کی صورت میں معاملہ کرتے ہیں اور قسط پر خرید وفروخت کرتے ہیں، یعنی نقد کے معاملہ میں ادھار کی صورت میں مبیع کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، اس سلسلہ میں حدیث اور فقہاء کی توجیہات سے بڑی رہنمائی ملتی ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ....''۔

اس حدیث کی روشنی میں امام ترمذی نے لکھا ہے کہ اگر کسی تاجرنے مشتری سے کہا یہ سامان دس روپئے میں نقد بیچتا ہوں اور بیس روپئے میں ادھار اور مجلس سے جدا ہونے سے پہلے دونوں نے ایک صورت کو متعین کرلیا تو اس کی گنجائش ہے۔

''وقال أبوعيسى حَدِيثُ أَبِي هُرَيْرَةَ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. وَالعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَهْلِ العِلْمِ قَالُوا: بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ أَنْ يَقُولَ: أَبِيعُك هَذَا الثَّوْبَ بِنَقْدٍ بِعَشَرَةٍ، وَبِنَسِيئَةٍ بِعِشْرِينَ،فَإِذَا فَارَقَهُ عَلَى أَحَدِهِمَا فَلاَ بَأْسَ إِذَا كَانَتِ العُقْدَةُ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمَا'' (جامع الترمذي لابن العربي المالكي ۵ ،۲۳۹)۔

علامہ کاسانی نے دونوں کے مابین فرق کیا ہے:

''وَلَا مُسَاوَاةَ بَيْنَ النَّقْدِ، وَالنَّسِيئَةِ؛ لِأَنَّ الْعَيْنَ خَيْرٌ مِنْ الدَّيْنِ، وَالْمُعَجَّلَ'' (بدائع ۱۸۷،۵)۔

(نقد اور ادھار یکساں نہیں، اس لئے کہ نقد ادھار سے بہتر ہے اور فی الفور ادا کی جانے والی شئی دیرسے اداکی جانے والی شئی سے زیادہ بہتر ہے)۔

اور فقہاءشوافع واحناف کے یہاں یہ درست ہے، بشرطیکہ مجلس عقد سے جدا ہونےسے پہلے مشتری کی طرف یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ بائع سے نقد معاملہ کیا ہے یا ادھار ؟ مفتی تقی عثمانی صاحب نے جمہور فقہاء کی رائے کی بنیاد پر مجلس میں ہی

دونوں میں سے ایک کوطے کرنا ضروری قرار دیا ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک یہ سودا جائز ہے، بشرطیکہ عقد کے اندر ایک بات طے کرلی جائے کہ ہم نقد خرید رہے ہیں یا ادھار (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴۴،۲)۔

البتہ مالکیہ کے یہاں اس مسئلہ میں مزید وسعت ہے کہ اگر مجلس میں نقد یا ادھار میں سے ایک پر معاملہ طےنہیں ہوا تب بھی یہ معاملہ درست ہے اور خریدار کو بعد میں بھی ان دونوں میں سے ایک صورت کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے (بدایۃ المجتھد ۲ ،۱۵۴)۔

اوردرر الحکام شرح المجلۃ کی ایک عبارت سے مالکیہ کے نظر یہ کی تائید ہوتی ہے:

‘‘وعلى هذا إذا باع إنسان من آخر مالا على أن يدفع الثمن معجلا ثم أجل البائع الثمن بعد البيع إلى أجل معلوم صح التأجيل لازما’’ (۱۹۴،۱)۔

بہرحال جب نقد اور ادھار کے اعتبار سے بائع کے لئے ثمن میں کمی اور زیادتی کا اختیار ہے تو مذکورہ سوال نمبر :ا کے بابت ایک ماہ کے اند ر ثمن کی ادائیگی کی شرط پر مبیع کی قیمت میں تیس فیصد ڈسکاؤنٹ درست ہوگا ، جبکہ مشتری مجلس ہی میں دونوں سے ایک صورت پر رضامندگی ظاہر کرچکا ہو، تاکہ دونوں میں نزاع کی صورت پیدا نہ ہو ، جیسا کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینار میں تجاویز پاس ہوئی ہیں، یہاں بطور تائید کے پیش کئے جارہے ہیں :

‘‘(۱) معاملہ کو مکمل کرتے وقت بات اس پر ختم کی جائے کہ یہ خرید وفروخت ادھار اتنی قیمت پر اور اتنی مدت کے لئے ہورہی ہے۔

(۲) ادھار قیمت یکمشت اداکی جائے یاچند حصوں وقسطوں میں دونوں صورتیں درست ہیں :

(۳) اس طرح کی خرید وفروخت کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت قیمت متعین ہوجائے ، ابتدء خواہ صرف ادھار قیمت ذکر کی جائے یانقد و ادھار دونوں ’’ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ،۱۶۸) ۔

الف: اگر معاملہ طے پاتے وقت ہی بائع نے خریدار کے سامنے نقد کی صورت میں مبیع کی قیمت تقریبا ایک لاکھ مقرر کی اور ایک ماہ کے اندر ادا کرنے کی صورت میں تیس فیصد ڈسکاؤنٹ کا وعدہ کیا اور مشتری نے مجلس میں اس پر رضامندگی کا اظہار کیا تو یہ صورت درست ہوگی، جیسا کہ امام ترمذی نے اس صورت کی گنجائش دی ہے۔

‘‘أبيعك هذاالثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس إذاكانت العقدة على واحدة منهما’’ (حوالہ سابق)۔

لیکن اگر مشتری ایک ماہ میں ادا نہیں کرسکا تو یہاں دوصورتیں ہوں گی :

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مجلس عقد میں دونوں میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ چار مہینے میں ادا کریں گے، اس اعتبار سے قیمت میں اضافہ ہوگا ، قیمت میں اضافہ مبیع

کا بدل قرار پائےگا، اس لئے کہ ادھار خرید وفروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی رباکے تحت نہیں آتی ، چنانچہ فقہ اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینارکی چوتھی تجویزمیں اس کی صراحت ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ۱۶۹)۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ ایک مجلس میں ایک ماہ سے زیادہ مدت کے اندر قیمت میں اضافہ کرنے کی صورت میں مجلس میں قیمت کی زیادتی کا تذکرہ نہینہوا ،تو ایسی صورت میں مشتری پر وہی قیمت عائد ہوگی جو نقد ادا کرنے کی صورت میں عائد ہوتی ہے، اس سے زیادہ لینا قطعاً درست نہیں ہوگا، ربا میں داخل ہوگا ، اسلام سے پہلے سودکی وہی صورت تھی، بقول امام مالک:

''وكان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين فإذا حل قال له : أتقضى، أم تربى فإن قضاه أخذه وإلا زاد ه في الحق وزاده في الأجل" (المدونة الكبرى ۱۸۵)۔

(ب) اگر طے شدہ کے مطابق ایک ماہ میں مشتری نے قیمت ادا نہیں کی ، البتہ دو یا تین مہینے کے بعد ادا کرنا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں سامان کی قیمت میں کتنی فیصد ڈسکاؤنٹ ہوگا؟ چوں کہ عقد میں اس پہلو سے کوئی صراحت نہیں ہے،لیکن بازار میں عرف رائج ہے تو عرف وتعامل کے اعتبار سے بائع کو ڈسکاؤنٹ کرنا ہوگا،شرح المجلہ میں ہے:

''أما إذا كان جرى العرف والعادة في ذلك المحل بإعطاء جميع الثمن أوبعض معين منه بعد أسبوع أو شهر لزم اتباع العادة والعرف في ذلك''(شرح المجلة ۱۹۹۱)۔

جواب (۲):

یہ سوال عقد استصناع سے متعلق ہے ، اس زمانہ میں اس کا دائرہ بڑا وسیع ہوگیا ہے، بلا شبہ صانع مطلوبہ شئی کو مستصنع کے آرڈر اور اوصاف کے مطابق بنانے کی کوشش کر تا ہے، لیکن کبھی ناگزیر حالات کی بنا پر طے شدہ اوصاف کے مطابق تیار کرنے میں کمی رہ جاتی ہے،ایسی صورت میں صانع کے مال کو ٹال (Reject) کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

اس کا حکم جاننے کے لئے مجبوراور ناگزیر حالات ذکر کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عقد استصناع میں ناگزیر حالات :

ایک حالت یہ ہے کہ صانع نے کسی عمارت بنانے یا حکومت سے ہاسپیٹل ، پل بنانےکا ٹھیکہ لیا ، ثمن بھی متعین ہوگیا، مگر یکایک ملک میں مالی ایسا بحران پیدا ہوا کہ مٹیریل دستیاب نہیں ہورہاہے، یا دستیاب تو ہورہا ہے، لیکن اتنا گراں ہوگیا کہ طے شدہ معاوضہ سے پورا کرنا ممکن نہیں، اسی طرح صانع کے کارخانہ میں آگ لگ گئی ، ملک مینجنگی حالات پیدا ہو گئے۔

(۲) اسی طرح کبھی مستصنع کے ساتھ بھی حالات پیدا ہوتے ہینمثلا مستصنع نے اپنے لڑکے کے لئے مکان بنانے کا حکم دیا، مکان تیار ہونے سےپہلے لڑکا مرگیا ، مستصنع نے ایک تیل ٹینکر بنانے کا حکم دیا، لیکن تیل کی کمپنی کو ایسا نقصان ہوگیا کہ اس کادیوالیہ ہوگیا۔

ان حالات مینعلماء کی رائے یہ ہے کہ قول رسول ‘‘امربوضع الجوائح ’’ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے تین شکلوں میں عقد کو ختم کرے:

(۱) حقوق اور ذمہ داریوں میں مناسب تبدیل کرلی جائے، تاکہ عقد کے اندر ، ‘‘لا ضرر ولا ضرار ’’ پر عمل کرتے ہوئے عدل کا توازن برقرار رہے۔

(۲)عقد کو فسخ کردیاجائے، جیساکہ بیع سلم میں مسلم فیہ ختم ہوجاتا ہے، عقد فسخ کیا جاتا ہے، اسی طرح صانع اور مستصنع کو یہ حق حاصل ہوگا ۔

(۳) اگر حالات آئندہ قریب میں بہتر ہونے کی امید ہو تو صانع کو مہلت دی جائےکہ سامان کے عیوب کو زائل کردے۔

عقد استصناع میں شئی مصنوع کی گارنٹی:

مصنوع میں کوئی عیب پیدا ہوجائے تو صانع اسے درست کرے گا یا بدل کر دے گا یا نہیں ؟ اس کی دو صورتیں ہیں :

(۱) یہ شرط اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ کبھی سامان کی درستگی میں اصل قیمت سے زیادہ صرفہ آتا ہے جس سے صانع کا ضرر ہے اور بنی کریم ﷺ نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے ۔

‘‘نهى النبي عن بيع الغرر’’ (مسلم : ۱۱۵۳)۔

(۲) عقد ہی کے وقت صانع کی طرف سے شرط تھی کہ عیب پایا جائے گا تو اس کاذمہ دار ہوگا ، تو ایسی صورت میں صانع پر ضروری ہوگا کہ درست کرکے دے یا بدل کر کے دے،جیسا کہ آج کل صاحب سامان وارنٹی دیتا ہے اور بعض سامان میں گارنٹی بھی، چونکہ شئی مصنوع کی گارنٹی کا تعارف وتعامل بھی ہے ، اس لئے المعروف کالمشروط کی بنا پر عقد استصناع میں شئی مصنوع کی گارنٹی کی شرط متعینہ مدت تک کے لئے درست ہے۔

مذکورہ بالا توجیہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر مصنوع میں مقررہ اوصاف کے اعتبار سے کمی رہ گئی تو مستصنع کو یہ اختیار ہوگا کہ اس کی درستگی کے لئے یا سامان کے مطابق اجرت مثل صانع کو دے کر سامان لے لے، لیکن اسے ٹال سمجھ کر کے (Reject) کرنا اور صانع کو اس کی اجرت نہ دینا شرعاً درست نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ قول رسول ﷺ ‘‘لا ضرر ولا ضرار’’ کے خلاف ہوگا۔

چنانچہ علامہ کا سانی نے بھی اسے صانع کے حق میں باعث ضرر قرار دیا ہے، اور فقہاء نے ''ما جعل علیکم في الدین من حرج '' کی بنیاد پر ''الضرر یزال ''(ضرر کو دورکیا جائے) کا حکم دیا ہے ، اس لئے فروخت کنندہ کا عیب دار سامان صانع سے لینا اور اس کی اجرت مثلی کا نہ دینا درست نہیں ہوگا ۔

علامہ کا سانی لکھتے ہیں :

''أَنَّ الصَّانِعَ قَدْ أَفْسَدَ مَتَاعَهُ وَقَطَعَ جِلْدَهُ، وَجَاءَ بِالْعَمَلِ عَلَى الصِّفَةِ الْمَشْرُوطَةِ، فَلَوْ كَانَ لِلْمُسْتَصْنِعِ الِامْتِنَاعُ مِنْ أَخْذِهِ؛ لَكَانَ فِيهِ إضْرَار بِالصَّانِعِ''(بدائع ۴،۹۵- ۹۶)۔

رہا مسئلہ اگر عرف میں صانع کو اجرت مثلی نہ دینے کا عرف ہو تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے کئی شرطیں مقرر کی ہیں، ان میں سے اہم شرط یہ ہے:

(۱) عرف نص شرعی سے معارض نہ ہو، لیکن یہاں یہ صورت پائی جارہی ہے ، یعنی عرف حدیث کے خلاف ہے ، حدیث میں بیع غرر سے ممانعت اسی وجہ سے ہے، جہاں مستصنع کو ضرر سے بچانے کا حکم ہے، اسی طرح صانع کوبھی ، کیوں کہ صانع سے مال وصول کرنا اور عیب کی وجہ سے اسے اجرت نہ دینا سراسر بائع کو ضرر پہنچاناہے ، چاہے عرف میں اس پر تعامل ہوگا یا نہیں ہوگا، یہ شرعاً درست نہیں ہوگا، مثلاً اس وقت ربا اور سود کا معاملہ عام ہوچکا ہے ، مگر یہ ایسا تعامل ہے جو نص کے خلاف ہے، اس لئے اس عرف کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں کاریگر کو اجرت نہ دینے کا عرف ہے (جو نص کے خلاف ہے)، اس لئے شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہوگا ، لہذا مستصنع پر اجرت مثلی لازم ہوگی، چنانچہ فقہ اکیڈمی کے آٹھویں فقہی سمینار کے تجاویز میں ہے:

''اگر عرف عام نص سے متصادم ہو، یہاں تک کہ عرف عام کے اعتبار میں نص کا ترک لازم آئے تو عرف عام شرعاًقابل قبول نہیں ہوگا ''(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے : ۳۸)۔

جواب (۳):

یہ صحیح ہے کہ کتابت خطاب کے قائم مقام ہے ، جس طرح عاقدین بالمشافہ معاملہ کرتے ہیں، اسی طرح کتابت کی صورت میں بھی ،لیکن اگر عاقدین کے درمیان زبانی ایجاب وقبول ہوگیا تو اس کی تحریر بنانا ضروری نہیں، اس لئے عام حالات میں مبیع کی قیمت دونونفریق کی مرضی سے طے ہوتی ہے، اسے بل، رجسٹر (BHUCHER) میں لکھنا بہتر ہے ۔

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ''(بقرۃ : ۲۸۲)۔

(اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو)۔

لیکن اگر کسی قانونی مصلحت کی وجہ سے پوری قیمت لکھنا متعذر ہو ،یا پوری قیمت لکھنے میں کسی ضرر شدید میں مبتلا ہونا لازم آتا ہو تو متعاقدین کی مرضی سے اور ظلم سے بچنے کے لئے قیمت درج کرنے میں تخفیف کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث اور فقہاء کی تشریحات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سورہ کہف میں ہے کہ حضرت خضر نے ایک کشتی میں عیب نمایاں کردیا ، یہ دراصل ایک ظالم وغاصب بادشاہ سے بچانے کے لئے کیا تھا، اس لئے اس کی گنجائش ہوگی۔

''اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا'' (کہف : ۷۹)۔

صاحب تفسیر مظہری نے بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

''لأن إرادة التعييب مسبب عن خوف الغصب''(تفسير المظهري ۵ ،۴۰۷)۔

نیز اس کی نظیربیع التلجئۃ ہے، اس میں عاقدین ظالم کے خوف سے باہم بیع ہونے کا اظہار کرتے ہیں، حالاں کہ اس سے پہلے بیع کے بارے مینباہم کوئی بات نہیں ہوتی، لیکن ظالم کے ظلم سے بچنے کے لئے بیع کے ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔

شیخ وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''فبيع التلجئة أو الأمانة: بأن يظهر العاقدان بيعاً لم يريداه باطناً، بل أظهراه خوفاً من ظالم'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی اس کی گنجائش ملتی ہے کہ دومشکل حالات میں جو آسان حالت ہوتی اسے آپ ﷺ اختیار کرتے:

''عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّهَا قَالَتْ:مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا، مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا، فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ''(بخاري، رقم : ۳۵۶۰)۔

(حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہﷺ کو دوچیزوں میں خیار ہوتا تو ان میں سے زیادہ آسان والی صورت اختیار کرتے ، بشرطیکہ اس میں معصیت لازم نہ آئے)۔

آیت اور احادیث بالاکے پیش نظر علامہ ابن نجیم نے بھی یہ قاعدہ مرتب کیا ہے:

''وَهِيَ مَاإِذَا تَعَارَضَ مَفْسَدَتَانِ رُوعِيَ أَعْظَمُهُمَا ضَرَرًا بِارْتِكَابِ أَخَفِّهِمَا...لِأَنَّ مُبَاشَرَةَ الْحَرَامِ لَا تَجُوزُ إِلَّا لِلضَّرُورَةِ'' (الاشباہ ۳۱۹،۱)۔

(جب دو مفسدات پیش ہوں تو اس میں اشد مفسدہ کا لحاظ کرتے ہوئے اخف مفسدۃ کا ارتکاب کرے.... اس لئے کہ حرام کا ارتکاب ضرورۃً درست ہے)۔

بہرحال اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ عام حالت میں زبانی جو اجرت طے ہوئی ہے وہی پرچی میں لکھی جائے، لیکن اگر طے شدہ قیمت کے مطابق بل، یا رسید میں (قیمت)درج کرنے میں حکومت یا کمپنی کی طرف سے ظالمانہ ٹیکس عائد ہونے کا

اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں بیع التلجئۃ اور بیع وفاء کی طرح اشد ضرر اور ظالمانہ ٹیکس کے گراں باری سے بچنے لے لئے ۳۰۰۰ (تین ہزار) کے بجائے ۳۰۰ (تین سو) لکھنے کی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ عاقدین اس پر متفق ہوں، ہاں اگر لکھی ہوئی قیمت پر ٹیکس عرف کے مطابق ہے اور مثلی ہے، ظالمانہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

جواب (۴):

لغت میں مبیع کے مقابلہ میں جو عوض ہوتا ہے اس کو ثمن کہتے ہیں؛ چاہے وہ عین ہو یا سامان ، لیکن اصطلاح میں جو مبیع کابدل ہوتا ہے اور ذمہ مینمتعین ہوتا ہے وہ ثمن ہوتا ہے اور اثمان کا اطلاق نقود پر ہوتا ہے ، جیساکہ صاحب موسوعہ لکھتے ہیں:

‘‘الثمن لغۃ:العوض ...والثمن اصطلاحا: مایکون بدلا للمبیع وتعین في الذمۃ ’’ (موسوعۃ الاقتصاد الاسلامي ۳۹۲،۱) ۔

مبیع اور ثمن میں واضح فرق یہ ہے کہ مبیع متعین کرنے سے متعین ہوجاتی ہے، لیکن ثمن متعین نہیں ہوتا (الفقہ الاسلامی ۱۶۵،۴)۔

اسی طرح قیمت اور ثمن میں واضح فرق ہے، قیمت وہ ہوتی ہے جس میں لوگ(تجار)ایک چیز کا بھاؤ یکساں صورت میں متعین کرتے ہیں، لیکن ثمن کا اطلاق اس مقدار پر ہوتا ہے جس پر فریقین راضی ہوتے ہیں: شیخ وھبہ زحیلی لکھتے ہیں :

‘‘وقیمۃ الشيء:هي ما يساويه بين الناس.والثمن:هو ما تراضى عليه المتبايعان مقابلاً للمبيع’’ (الفقہ الاسلامی ۴ ،۱۶۵)۔

حدیث میں ہے : المسلمون عند شروطھم (حوالہ سابق)۔

جیساکہ سوال نمبر :۳ کے تحت تفصیل سے بات آچکی ہے کہ کسی مصلحت شرعی کے تحت قیمت کی رسید لکھنے میں تخفیف کرسکتے ہیں، اسی طرح اگر قیمت فریقین کے مابین مال کے مطابق طے ہوچکی ہے اور مشتری کے ذمہ میں لازم ہوچکی ہے، اس کے بعد اگر کسی عذر شرعی کی وجہ سے ایکسپورٹ میں دس فیصد قیمت لکھی جاتی ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس سلسلہ میں دونوں فریق راضی ہوں اور نزاع کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، جیسا کہ صاحب موسوعہ نے لکھا ہے کہ وہ امور جن کا تعلق ثمن سے ہے اس میں تین شرطوں کا ہونا ضروری ہے:

(۱) ‘‘السلامۃ من الغرر والربا ۔

(۲) الطہارۃ عینا ووصفا ۔

(۳) صلاحیۃ الانتفاع بہ انتفاعا شرعیا علی الوجہ الذي یناسبہ۔

(۴)علم الطرفین بہ عینا وقدرا وصفۃ’’ (موسوعۃ الاقتصاد الاسلامی ۳۹۷،۱)۔

(۱ : غرر اور ربا سے محفوظ ہو ۔۲ :عین اور وصف کے اعتبار سے پاک ہو۔

۳: ثمن سے مناسب طریقہ پر انتفاع کرنا جائز ہو۔ ۴ : عاقدین ثمن کے عین ، مقدار اور صفت سے باخبر ہو)۔

اسی بنا پر فقہاء احناف نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے کہ وہ شرط جو عقد کے تقاضہ کے مطابق ہے توعقد کی وجہ سے بغیر شرط کے وہ واجب ہوگی، لیکن بیع فاسد نہیں ہوگی۔

''أما إذا كان الشرط مما يقتضيه العقد ...ولا يوجب فساد البيع'' (موسوعۃ فتاوی المعاملات ۹۱۴،۲)۔

اس لئے مذکورہ صورت میں صرف دس فیصد قیمت لکھنے کی شرط بیع کے تقاضہ کے مطابق ہے، اس لئے درست ہے۔

جواب (۵):

قرآن وحدیث میں جہاں حصول مال کی ترغیب دی گئی ہے وہیں رزق حلال اور مال حلال کی تحصیل ضروری قرار دیا ہے اور عام حالت میں مالِ غیر کا استعمال درست نہیں ہے۔

(۱) ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا'' (البقرہ: ۲)۔

(اے لوگو!ستھری اور پاک چیزیں کھاؤاور بھلے کام کرو)۔

(۲) ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ''(البقرۃ: ۲)۔

(اے ایمان والوں ! پاکیزہ چیز کھاؤ جو ہم نے تم کو دیئے)۔

(۳) ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ'' (نساء : ۲۹)۔

حدیث شریف میں ہے :

''أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ '' (مشکوٰۃ) ۔

(سن لو! کسی آدمی کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوتا ہے جب تک وہ بخوشی اجازت نہ دیدے)۔

اسی بنا ہر مجاہدین کے لئے مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے استعمال درست نہیں ہے ، جو تقسیم اور امیر کی اجازت سے پہلے استعمال کرے اسے غلول سے حدیث میں تعبیر کیا ہے اور ایسے مال کاصدقہ بھی قبول نہیں ہوتا۔

''لايقبل الله صدقة من غلول'' (ابوداود شریف ۹، ۱) ۔

چوں کہ کاریگر کا یہ جملہ کہنا ذرات گھسائی میں چلی گئیں، جبکہ وہ موجود ہیں، ظاہر ہے یہ عمل جھوٹ، غرر اور خیانت میں شامل ہے : رسول اللہ ﷺ نے تینوں سے منع فرمایا ہے، بلکہ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ کہنے کا حکم دیا ہے :

''إذا بايعت فقل : لا خلابة'' (سنن البيهقي۲۷۳،۵) ۔

(جب تم معاملہ کرو تو یہ کہو کوئی دھوکہ نہینہے)۔

جواب (۶):

قرآن وحدیث میں معاملات کے سلسلہ میں کچھ بنیادی اصول ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عاقدین کے درمیان معاملات کی درستگی، معاملات کی صفائی پر

موقوف ہے ، اس میں کوئی اجمال اور ابہام نہ ہو، نہ مبیع میں ابہام ہو اور نہ ثمن میں،اس لئےرسول اللہ ﷺ نے ایسے بائع پر عمل کو باعث لعنت قرار دیا ہےجو مبیع کے عیب کو بیان نہ کرے۔

''مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُبَيِّنْهُ، لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتِ اللَّهِ، وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ''(ابن ماجہ ۶۵۵،۷)۔

(جس شخص نے عیب واضح کرنے سے پہلے سامان فروخت کیا تو اللہ تعالی ہمیشہ اس سے ناراض رہتے ہیں اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں)۔

اس حدیث سے کئی باتیں ثابت ہوئیں، ایک بات یہ کے بائع پر مبیع کے عیب کو بیان کرنا ضروری ہے ، عیب چھپانا درست نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ مبیع مال متقوم ہے یا نہیں ؟اس میں بائع کی خبر معتبر ہوگی، اس لئے کہ رسول اللہ نے مبیع کے عیوب کو بیان کرنے کا حکم دیا ہے، مشتری کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا ۔

اس طرح قیمتی پتھروں کی آرائش میں جو دھاگے لگا ئے جاتے ہیں وہ دس گرام وزن کے برابر ہوتے ہیں یا آٹھ گرام کے برابر اس میں کاریگر کی بات معتبر ہوگی نہ کہ خریدار کی ، اس لئے کہ عرف کے بدلنے سے دھاگے کا وزن دس گرام کے بجائے آٹھ گرام ہوتا ہے اور بائع اس کی خبر امانت داری کے ساتھ دیتا ہے تو مشتری کو اس کی بات پر اعتماد کرنا واجب ہے، لیکن وہ اس کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور دوگرام پتھر دھاگوں کی قیمت میں لیتا ہے تو یہ عمل تطفیف ہے اور تطفیف حرام ہے۔

قرآن میں ہے :

''وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَي النَّاسِ يَسْتَوْفُوْن وَاِذَا كَالُوْہُمْ اَوْ وَّزَنُوْہُمْ يُخْسِرُوْن'' (مُطَفِّفِيْنَ: ۳)۔

لہذا خریدار کا بائع کی بات نہ ماننا اور اور دوگرام پتھر کو دھاگے کی قیمت میں فروخت کرنا یہ خریدار کی طرف سے تطفیف اور بخس ہے، اور قرآن میں دونوں کی ممانعت ہے، اس لئے خریدار کا یہ عمل شرعاً ناجائز ہوگا ۔

ہاں اگر پتھر اور دھاگے کی مقدار میں خریدار کو شبہ ہو تو اس کے ماہرین سے تحقیق کرالے، پھر بائع کی بات کی تصدیق ہوجائے تو اس اعتبار سے پتھر کا معاوضہ دے کر پتھر کی خرید کرے ۔

جواب (۷):

قیمت اور ثمن مبیع کا بدل ہوتا ہے، اور بازار میں مبیع کی جوقیمت مروج ہوتی ہے وہی قیمت اصلاً مبیع کا بدل ہے ، اس میں کمی کرنا یا بائع کی ضرورت کی بنیاد پر کم قیمت پر پرچی بنانا تطفیف وبخس ہے اور دونوں کی قرآن وحدیث میں ممانعت ہے،جیسا کہ اس پہلے سوال نمبر :۶ میں وضاحت کی گئی ہے۔

اس لئے خریدار کا بائع کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، البتہ بائع

اپنی ضرورت وحاجت کی بنیاد پر ایک قیراط پانچ سینٹ کی پرچی بنانے کے بجائے ایک قیراط مال پر پرچی بنا کر راضی ہوجائے تو ایسی صورت میں اس کی گنجائش ہوگی ۔

''اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ''(نساء : ۲۹) ۔

اور حدیث میں ہے : ''اِنَّمَا الْبَیْعُ عَنْ تَرَاضٍ'' (رواہ ابن حبان)۔

جواب (۸):

قرآن وحدیث میں جھوٹ اور غلط بیانی کرنا گناہ کبیرہ ہی نہیں، بلکہ یہ بہت ہی ناسور بیماری ہے جو عام حالت میں بالکل درست نہیں، اس کے دلائل اوپر سوال نمبر:۵ میں آچکے ہیں، اس لئے کسی مضارب کا یہ کہنا کہ مال ڈوب گیاہے یہ غیرشرعی عمل ہوگا، لہذاجھوٹ اور غلط بیانی کی وجہ سے جو مال جمع کیا ہے وہ مال حرام ہوگا اور اس کا استعمال درست نہیں ہوگا۔

لیکن اگرصاحب مال اپنی ضرورت اور کاغذی مجبوری کی بنا پر اصل قیمت کے بجائے پچیس فیصد لےکر آپس میں رفع دفع اور مصالحت کرلیتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی۔

محور چہارم :

جواب (۱):

محور اول سوال نمبر:۵ بھی بیع نسیئہ سے متعلق تھا ، اس کے بابت تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ قسطوں پر خرید وفروخت شرعاًدرست ہے، نیز ادھار کی صورت میں نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت میں فرق کی گنجائش ہے ،تاہم جمہور فقہاء کے نزیدک یہ شرط ہے کہ مجلس عقد میں یہ طے کرلینا ضروری ہے کہ آیا بیع نقد ہوگی یا ادھار؟

اس لئے مذکورہ صورت میں جب ڈائمنڈ دومہینے کی ادھاری پر بائع نے فروخت کردیا تو اس سے پہلے ثمن کا مطالبہ بیع نقدکی صورت میں شرعاً درست نہیں ہوگا۔

جواب (۲):

اسی طرح بائع نے ڈائمنڈ دومہینے کی ادھاری پر بیع کیا تو اس سے پہلے ثمن کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا، ہاں اگر دونوں میں بیع حال کی صورت میں بیع ہوئی ہو مگر بائع نے ثمن دینے میں دومہینے کی مہلت دے دی تو بائع اس صورت میں فوری ضرورت کے تحت اس سے پہلے ثمن کا مطالبہ کرسکتا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴۳،۲) ۔

جواب (۳):

یہ حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں ہر چیز کے اصل ہونے کا دارومدار سرٹیفکٹ پر ہوتا ہے، عہد رسول ﷺ میں خط کے اصل ہونے کے لئے خط کے نیچے دستخط اور سکہ لگانا ضروری ہوتا تھا، اسی طرح سونا چاندی اور ڈائمنڈکے اصلی ہونے کی دلیل صاحب

جواہر کے پاس سرٹیفکٹ کا ہونا ضروری ہے، چاہےسرٹیفکٹ دینے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ، کیوں کہ غیرمسلموں کےزیر نگرانی لیبارٹری کی رپورٹ پر سرٹیفکٹ جاری کرنے کی گنجائش ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۴۲)۔

لہذا اگر بائع نے گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچ دیا اور مشتری نے اعلی جان کر خرید لیا تو دیکھنے کے بعد خیار رویت اور خیار عیب کی بنیاد پر یہ حق حاصل ہوگا کہ بیع کو فسخ کردے یا موجودہ ڈائمنڈ کے اعتبار سے قیمت طے کرکے معاملہ کو باقی رکھے (دارقطنی، بیہقی۵،۲۶۷)۔

جواہرات کے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی عبد القیوم قاسمی پالنپوری•

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ أجمعین۔

تمہید: اس سوالنامہ میں بہت سے سوال دلالی کے متعلق ہیں، اس لئے پہلے مناسب ہے کہ یہ معلوم کرلیا جائے کہ دلالی جائز ہے یا نہیں؟

احناف کے نزدیک بھی دلالی جائز ہے:

دلالی: کسی کو کسی چیز کے بیچنے یا خریدنے میں مدد کرنے اور بائع ومشتری کے درمیان رابطہ قائم کرانے اور سودا کرانے کو کہتے ہیں، اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں دلال کے لئے کوئی اجرت (مثلاً پانچ ہزار) مقرر کرلی جائے تو اس کو امام مالک، شافعی اور امام احمدؒ جائز فرماتے ہیں اور حنفیہ کے یہاں بھی محقق ومفتی بہ قول کے مطابق جائز ہے، لیکن عام طور پر دلالی کی جو صورت ہوتی ہے، اس میں اس طرح اجرت متعین نہیں ہوتی ہے، بلکہ فیصد کے حساب سے مقرر کرلی جاتی ہے، کہ تم جتنے میں بیچوگے یا خریدوگے اس کا دو فیصد یا چار فیصد تم کو ملے گا، اس صورت کو بعض فقہاء ناجائز کہتے ہیں، لیکن احناف کے مفتی بہ قول کے مطابق یہ صورت بھی جائز ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ نے بعض متاخرین حنفیہ سے نقل کیا ہے (خلاصہ از انعام الباری۶؍۴۵۶ تا ۴۵۸)۔

دلال کے لئے وہی احکام ہونگے جو وکیل بالبیع یا وکیل بالشراء کے لئے ہیں:

وکیل وہ ہے جو دوسرے کے حکم سے اس کے لئے کسی شئی کے خریدنے یا بیچنے وغیرہ کا کام اجرت یا بلا اجرت انجام دے:''تصح الوکالۃ بأجر وبغیر أجر'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴؍۷۴۵) اور فقہ السنہ میں بھی تحریر ہے کہ کبھی وکالۃ بالاجرت ہے اور کبھی بلا اجرت ہوتی ہے، ''والوکالۃ قد تکون تبرعاً من الوکیل وقد تکون بأجر'' (فقہ السنہ۳؍۲۱۴)۔

اور دلال سے مراد وہ شخص ہے جو کسی کو کسی چیز خریدنے یا بیچنے میں مدد دے، اور بائع ومشتری کے درمیان (بالاجر یا بلا اجر) رابطہ قائم کرے اور سودا کرائے، دلال بعض اوقات بائع کا وکیل ہوتا ہے اور کبھی مشتری کا وکیل ہوتا ہے اور بعض اوقات

• خادم تدریس وافتاء جامعہ نذیریہ، کاکوسی، شمالی گجرات۔

دونو نکا وکیل ہوتا ہے (انعام الباری۶،۴۵۳)۔

معلوم ہوا کہ دلال وکیل ہوتا ہے تو دلال کے لئے بھی وہی احکام ہونگے جو وکیل کے لئے ہوتے ہیں، اگر وہ بعض صورتوں میں وکیل نہ ہو تو بھی جب خریدار یا بیچنے والے نے اس کو امانت دار سمجھ کر اس پر اعتماد کیا ہے اور اپنا کام سونپا ہے، اس لئے دلال کے لئے کوئی ایسا کام جس سے اپنے کام سونپنے والے کو دھوکہ دینے تک پہنچائے ہرگز جائز نہ ہوگا، جیسا کہ وکیل کے لئے ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ وکیل کے بارے میں فقہاءؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

الف: مؤکل نے کسی شخص کو کوئی معین چیز کے خریدنے کا وکیل بنایا ہے اور اس کے لئے اس نے ثمن بھی متعین کردیا ہے تو اس وکیل کے لئے اس چیز کو اس ثمن یا اس سے کم میں اپنے لئے یا کسی دوسرے شخص کے لئے خریدنا جائز نہ ہوگا، اگر خریدے گا تو وہ چیز اس کی یا دوسرے شخص کی نہیں ہوگی، بلکہ مؤکل ہی کی ہوگی، البتہ مؤکل کے معین کئے ہوئے ثمن سے زیادہ میں وہ چیز خریدے گا تو وہ چیز مؤکل کی نہیں ہوگی، بلکہ وکیل کی ہوگی، درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام میں لکھا ہے:

‘‘وإذا اشتری الوکیل ذلک الشئی المعین بأزید من الثمن الذی عینہ الموکل کان ذلک الشئی للوکیل، ولو کانت تلک الزیادۃ قلیلہ جدا’’ (۳،۵۹۵)۔

ب: اور اگر غیر معین شئی (مثلاً فلاں قسم کے جواہرات) خریدنے کا وکیل بنایا اور اس کا ثمن بھی معین کردیا ہے تو وکیل کے لئے اس قسم کے جواہر اپنے لئے خریدنا جائز ہے خواہ اس ثمن یا اس سے کم ثمن میں خریدے، درمختار میں لکھا ہے: ‘‘وإن (وکل) بشراء شئی بغیر عینہ فالشراء للوکیل إلا إذا نواہ للمؤکل وقت الشراء أو شراءہ بمالہ أی بمال الموکل’’ (درمختار۵،۵۱۸)۔

فقہاء کرام کی ان تصریحات کی روشنی میں محور اول کے اول، دوم سوال کے جواب حسب ذیل میں:

محور اول کے سوالات کے جواب:

جواب (۱، ۲):کسی خریدار نے جب کسی دلال سے کہا کہ فلاں چیز معین مجھے خریدنا ہے اور میں اس کو اتنی قیمت تک یا اتنی قیمت میں خرید سکتا ہوں اور آپ کو ۴فیصد مثلاً اجرت ملے گی، اب وہ چیز خریدار کی بتائی ہوئی قیمت میں یا اس سے کم میں مل رہی ہے تو اس کو خریدار کے لئے ہی خریدنا ہوگا، دلال کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنے خریدے یا دوسرے فرضی یا حقیقی شخص کے لئے خریدے اور پھر خریدار کی بتائی ہوئی قیمت میں خریدار کو دیدے اور اپنے لئے اجرت کے ساتھ نفع حاصل کرے یا اجرت چھوڑ کر اجرت سے زیادہ نفع حاصل کرے، اس لئے کہ یہ خریدنا وکیل کا خریدار کے

لئے ہی واقع ہوا ہے، اس لئے اصل قیمت میں خریدار کو دینا ہوگا اور وہ فقط اجرت کا مستحق ہوگا، فتاوی ہندیہ میں لکھا ہے: ‘‘ولیس للوکیل شراء عین شراءہ لنفسہ أو لمؤکل آخر، لأنہ یودی إلی تغریر الأمر من حیث أنہ اعتمد علیہ’’ (فتاوی ہندیہ)۔

درر الحکام میں ہے:‘‘لیس لمن وکل باشتراء شئی معین أن یشتری ذلک الشئی (بالثمن الذی عینہ الموکل أو بأقل منہ) لنفسہ حتی لا یکون لہ، وإن قال عند اشتراءہ اشتریت ہذا لنفسی، بل یکون للمؤکل، إلا أن یکون قد اشتراہ بثمن أزید من الثمن الذی عینہ الموکل أو بغبن فاحش’’ (شرح درر الحکام ۵۹۳،۳، المادہ: ۱۴۸۵) (اور اگر کسی غیر معین شئی کے خریدنے کا وکیل بنایا ہے کہ خریدار کہتا ہے میرے لئے فلاں قسم کے جواہرات اتنے اتنی قیمت میں خریدو، تو اس صورت میں اس قسم کے جواہرات اپنے لئے یا دوسرے کےلئے خرید سکتا ہے، درمختار میں تحریر ہے: ‘‘وإن (وکل) بشراء شئی بغیر عینہ فالشراء للوکیل إلا إذا نواہ للموکل وقت الشراء أو شراءہ بمالہ أی بمال المؤکل’’ (درمختار۵۱۸،۵)۔

لیکن یہ چیز اسی خریدار کو بیچنا ہے تو یہ صراحت کرنا ضروری ہے کہ اس کو میں نے آپ کے لئے نہیں خریدا ہے، اور جس قیمت میں خریدا ہے اس کو میں نے اپنے لئے خریدا ہے اور میں اپنی چیز آپ کو اتنے میں بیچ رہا ہوں، اس صراحت کے ساتھ اس خریدار کو بیچے گا تو جائز ہے، ورنہ یہ عمل فریب اور دھوکہ دہی تک پہنچانے کی وجہ سے جائز نہ ہوگا، ‘‘لأنہ یودی إلی تغریر الآمر من حیث أنہ اعتمد (فلا یجوز)’’ (فتاوی ہندیہ) اور اس صورت میں اس نے خریدار کے لئے کوئی کام نہیں کیا، اس لئے ۴ فیصد اجرت کا بھی مستحق نہیں ہوگا۔

جواب ۳ : ایسی مارکیٹ سے مال نہیں خریدنا چاہئے، حدیث میں ہے:‘‘ دع ما یریبک إلا ما لا یریبک’’ (ان کاموں کو چھوڑ جو تجھے شک میں ڈالے اور متوجہ ہو ان کاموں کی طرف جس کے (جواز کے) بارے میں تجھے کوئی شرک نہ ہو)۔

اس بارے میں اصول یہ ہے کہ جس مال کے بارے میں یقین ہو یا قرائن سے غالب گمان یہ ہے کہ یہ چوری کا مال ہے تواس کو خریدنا جائز نہیں ہے، خریدنے کے بعد بھی یہ اپنا مال نہیں ہوگا، اگر خرید چکا ہے تو واپس کردے، اگر مالک کا علم ہوجائے تو اس کے حوالہ کردے، پھر چاہے تو اس سے معاملہ کرکے خرید لے (فتاوی محمودیہ۲۸۰،۱۱)۔

علامہ شامی نے لکھا ہے:‘‘لو ظہر غیر حلال أی مسروقاً أو مغصوباً یرجع علیہ المشتری’’ (رد المحتار۷۲،۵)، ‘‘وغالب الظن عند الفقہاء ملحق بالیقین وہو الذی یبتنی علیہ الأحکام، یعرف ذلک من تفصح کلامہم فی الأبواب’’ (الاشباہ والنظائر، الفائدۃ الثانیہ۶۳)۔

جواب ۴ : اگر محض بلا قرائن شبہ ہو چوری کا ہونے کا تو اس شبہ کا اعتبار نہیں، اس کے قول کا اعتبار کرکے خریدنا درست ہے، ہاں اگر قرائن سے غالب گمان ہوجائے کہ یہ چوری کا مال ہے تو خریدنا جائز نہیں، اگرچہ مال والا یہ کہتا ہو کہ یہ درست مال ہے۔

جواب ۵ : اصل جواب سے پہلے تمہیداً یہ معلوم ہوجائے کہ ایک عقد ہوتا ہے مساومہ جس میں بائع ومشتری ایک ثمن پر متفق ہوجاتے ہیں اور اس میں چیز کتنے میں خریدی تھی اور اس پر کتنا فیصد نفع لیا جارہا ہے اس کا ذکر نہیں ہوتا ہے۔

اور دوسرا ہے عقد مرابحہ جس میں بائع مبیع کتنے میں خریدی تھی اور اس پر کتنے فیصد نفع لے رہا ہے اس کا ذکر کرتا ہے اور تیسرا عقد ہے تولیہ جس میں بائع مبیع جتنے میں پڑی ہے اتنے ہی میں دینے کی صراحت کرتا ہے۔

اب شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز ادھار خریدی ہے اور پھر خریدار اس کو دوسرےکو عقد مساومہ سے بیچ رہا ہے تو اسے خریدار کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ چیز میں نے ادھار خریدی ہے، اور اگر ادھار خریدے اسی چیز کو عقد مرابحہ یا تولیہ سے دوسرے کو بیچتا ہے تو اس کےلئے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ چیز میں نے ادھار خریدی تھی اور اتنے میں پڑی تھی، فتاوی ہندیہ میں لکھا ہے:

‘‘ولو اشتری نسیئۃ لم یبعہ مرابحۃ حتی یبین، وہذا فی الأجل المشروط’’ (ہندیہ۴،۹۲)۔

‘‘والمعروف أیضاً کالمشروط، وفی الدر المختار:وکذا حکم التولیۃ’’ (۴،۲۴۵) (بہشتی زیور ۵،۱۸ اخری)۔

اس تمہید کے بعد سوال(۵) کا جواب یہ ہے کہ ایک چیز ادھار خریدا اور اپنے قبضہ میں لے کر دوسرے کو نقد زیادہ قیمت سے بیچا اور اس میں اصل خرید قیمت اور کتنا فیصد نفع لیا جارہا ہے اس کا ذکر نہیں آیا تو یہ صورت جائز ہے۔

اور اگر اس ادھار خریدنے والے نے مبیع قبضہ میں لے کر دوسرے کو عقد مرابحہ سے بیچا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ وضاحت کرے کہ یہ چیز ادھار اتنے میں نے خریدی ہے اور اتنے فیصد نفع سے تم کو بیچ رہا ہوں۔

جواب ۶ : یہ عقد باطل ہے اور اس طرح نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ غیر مملوک یعنی جو اپنی ملک نہیں ہے اس کو بیچ رہا ہے اور غیر مملوک کی بیع باطل اور حدیث شریف میں بھی اس کی ممانعت وارد ہے، درمختار میں لکھا ہے: ‘‘(وبطل) بیع ما لیس فی ملکہ، وفی رد المحتار: بأن المراد بیع ما سیملکہ قبل ملکہ لہ ثم رأیت کذلک فی الفتح فی أول فصل بیع الفضولی وذکر إن سبب النہی فی الحدیث ذلک’’ (رد المحتار مع الدر۵،۵۸-۵۹)۔

‘‘وعن حکیم بن حزامؓ قال:نہانی رسول اللہﷺ أن أبیع ما لیس عندی’’ (رواہ الترمذی)، ‘‘وفی روایۃ أبی داؤد قال: لا تبع ما لیس عندک’’ (مشکوۃ،۲۴۸)۔

البتہ اس صورت میں اگر دوسرے سے بیچنے کا وعدہ کرتا ہے اور سودا ومعاملہ طے نہیں کرتا ہے، پھر اس چیز کے مالک سے وہ چیز خرید کر اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد دوسرے سے نفع کے ساتھ سودا کرتا ہے تو یہ صحیح ہے اور نفع جائز ہوگا۔

محور دوم کے سوال کے جوابات:

جواب ۱ : یہ صورت جائز نہیں، اس لئے کہ اس میں دین اس شخص کو بیچا جارہا ہے جس پر دین نہیں ہے، اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اور نیز اس میں ایک ملک کی کرنسی کو اسی ملک کی کرنسی سے کمی زیادتی کے ساتھ بیچا جارہا ہے جو سود ہے، بدائع الصنائع میں لکھا ہے: ''ولا ینعقد بیع الدین من غیر من علیہ الدین'' (۱۴۸،۵ کتاب البیوع) (دین کی بیع اس شخص سے جس پر یہ دین لازم نہیں ہے منعقد نہیں ہوتی ہے)۔

اور ''نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے '' میں لکھا ہے: ''ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار '' (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے،۱۲۶)۔

جواب ۲ : اس مقصد کے لئے خود سودی قرض لینا، یا دوسرے کے ذریعہ سودی قرض حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور اس دوسرے شخص کا بھی اپنے علاوہ کے لئے بھی سودی قرض حاصل کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور اس پر سخت وعید وارد ہوئی ہے، اور دوسرے کا یہ عمل تعاون علی الاثم میں داخل ہے۔

جواب ۳ : اس صورت میں خرید کردہ مال کی قیمت واقعۃً مارکیٹ میں ۵۰۰،روپے فی کیرٹ یا اس سے زیادہ ہے تو خریدار کا بائع سے غلط بیانی کرکے قیمت کم کرانے کی کوشش کرنا جائز نہیں اور اگر واقعۃً مارکیٹ میں اس کی قیمت ۴۰۰،روپے فی کیرٹ یا اس سے بھی کم ہے اور بائع نے عمدہ بتاکر ۵۰۰،روپے فی کیرٹ وصول کئے ہیں تو اس صورت میں وصف کی کمی کی وجہ سے خریدار کو یہ اختیار ہوگا کہ معاملہ ختم کرکے اس کو وہ مال واپس کردے یا سابقہ قیمت پر راضی رہے، سودا باقی رکھ کر کچھ قیمت کرانا اور پھر قیمت کم دینا صحیح نہیں ہے، ''فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے: ''وإذا اشتری شیئاً لم یعلم بالعیب وقت الشراء ولا علمہ قبلہ والعیب یسیر أو فاحش فلہ الخیار: إن شاء رضی بجمیع الثمن وإن شاء ردہ، کذا فی شرح الطحاوی، ولیس لہ أن یمسکہ ویأخذ النقصان کذا فی شرح القدوری للأقطع'' (فتاوی ہندیہ۳،۶۶)۔

جواب ۴ : سامان کو خریدتے ہوئے اس مال میں واقعی جو عیب ہیں ان کو بیان کرکے قیمت کم کرانے کی کوشش کرنا شرعاً صحیح اور درست ہے، البتہ جو چیزیں عیب شمار نہیں ہوتی ہیں ان کو بھی عیب قرار دینا اور غلط بیان کرنا جائز نہیں ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''من غش فلیس منا''، اسی طرح بائع کے لئے مال میں موجود خوبیاں واوصاف بیان کرنا درست ہے، غیر واقعی اوصاف وخوبیاں بیان کرنا جائز نہیں۔

جواب ۵ : مال تیار کرنے والے کو جب ملاوٹ کا علم ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے سستا مال چاہئے ملاوٹ ہونے یا نہ ہونے سے مجھے غرض نہیں، تو ملاوٹ والا مال تیار کرکے اس کو دینا جائز ہے، اس لئے کہ عقد کے وقت وہ اس عیب پر راضی ہے۔

پھر یہی مال تیار کرانے والا تاجروں سے عیب بتا کر اس میں ملاوٹ ہے بیچتا ہے تو معاملہ درست ہے، اس میں ایک صورت یہ ہے کہ ملاوٹ سے تاجروں کو مطلع نہیں کیا، لیکن تاجروں کو معلوم ہے کہ یہ ملاوٹ والا مال ہے، اس کے باوجود اس کو خریدتے ہیں تو یہ معاملہ بھی درست ہے، تاجروں کو علم ہونا کافی ہے، صراحۃً مطلع کرنا ضروری نہیں ہے۔

اور اگر تاجروں کو ملاوٹ کا علم نہیں اور وہ اس کو بے عیب اور بغیر ملاوٹ والا سمجھ کر خرید رہے ہیں تو ان کو اس عیب کی وجہ سے مال کو واپس کرنے کا حق رہے گا اور خود تیار کرنے والے کے لئے خریداروں کو اس سے مطلع کرنا ضروری ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''من غشّ فلیس منا'' ، ''وقال النبی ﷺ: من باع معیباً لم ینبہ لم یزل فی لعنۃ اللہ ویلعنہ الملائکۃ'' (بحوالہ فتاوی دار العلوم زکریا۵،۷۱)۔ ''وفی الدر المختار: ''لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام'' (۵،۴۷)۔

جواب ۶ : اپنا مال بیچنے میں شرعاً کوئی تحدید نہیں کہ مخصوص تناسب تک نفع لینا درست ہو اور اس سے زیادہ نفع لینا درست نہ ہو، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں: کوئی حد مقرر نہیں، مگر زیادہ نفع لینا مروت کے خلاف ہے (فتاوی محمودیہ قدیم طباعت میرٹھ ۱۳،۳۴۹، فتاوی عثمانی ۳،۲۵۳)۔

''لا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس لقولہ علیہ الصلاۃ والسلام لاتسعروا فإن اللہ ہو المسعّر الخ، ولأن الثمن حق العاقد فإلیہ تقدیرہ فلا ینبغی للإمام أن یتعرض لحقہ إلا إذا تعلق بہ دفع ضرر العامۃ'' (ہدایہ۴،۴۷۲ طبع پاکستان رحمانیہ)۔

محور سوم کے سوالوں کے جوابات:

جواب ۱ : اگر خریدار نے کوئی مال ادھار ایک لاکھ میں اس شرط کے ساتھ خریدا کہ اگر ثمن ایک ماہ میں ادا کردیا تو تیس فیصد ثمن میں کمی کردی جائے گی یا شرط نہیں کی مگر مارکیٹ کا عرف اور چلن یہ ہے۔

ان دونوں صورتوں میں ثمن میں سے کمی کرنا بیع مساومہ میں جائز نہیں، البتہ بیع مرابحہ میں متاخرین احناف کا فتوی یہ ہے کہ مدیون مقررہ مدت سے پہلے دین ادا کردے تو ما بقی ایام کے مقابلہ جتنا نفع آتا ہے اس کو بائع کو چھوڑنا ہوگا۔

(ج) اور تیسری صورت کہ جس میں اس قسم کی نہ کوئی شرط طے کی ہے اور نہ عرف ہے، اور ادھار خریدار کے رقم جلد ادا کرنے کی وجہ سے بائع کچھ ڈسکاؤنٹ دیدیتا ہے تو یہ درست اور اس کی طرف سے احسان ہے، حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

دین مؤجل اگر جلد ادا کردیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس

وقت جائز ہے جب یہ چھوڑنا تعجیل (جلد دینے) کے لئے شرط نہ ہو، لیکن اگر سقوط بعض دین تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط وکمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ ابوبکر جصاصؒ نے ''ضع وتعجل '' کے جواز پر جتنے آثار وروایات ملی ہیں ان کو اسی پر محمول کیا ہے (احکام القرآن۱؍۴۶۷)۔

آگے تحریر فرماتے ہیں: دین موجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا بیع مساومہ میں تو ناجائز ہے یعنی ان بیوع میں تو ناجائز ہے جس میں بائع اپنا منافع بیان کئے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعہ فروخت کرے۔

ہاں اگر بیع مرابحہ ہو جس میں بائع مدت کے مقابلہ میں ثمن میں جو زیادتی کرتا ہے اس کو صراحتاً بیان کردے اس کے بارے میں متاخرین احناف کا فتوی یہ ہے کہ اس صورت میں مدیون اگر مدت مقررہ سے پہلے دین ادا کردے تو بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مدت مقررہ تک جتنے ایام باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا پڑے گا، علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''قضی المدیون الدین المؤجل قبل الحلول أو مات فحلّ بموتہ فأخذ من ترکتہ، لا یأخذ من المرابحہ التی جرت بینہما إلا بقدر ما مضی من الأیام وہو جواب المتاخرین، قنیہ، وبہ أفتی المرحوم أبو السعود آفندی، مفتی الروم وعلّلہ بالرفق للجانبین'' (رد المحتار۶؍۷۵۷، ۵؍۱۶۰، فقہی مقالات۱؍۱۱۴۔۱۱۶)۔

جواب ۲ : کاریگر کے تیار کرنے میں مقررہ معیار میں معمولی کمی رہ گئی ہو تو کاریگر پر کوئی ضمان واجب نہ ہوگا اور وہ اجرت کا مستحق ہوگا، ہا ں اگر غیر معمولی بگاڑ دیا ہے تو کاریگر پر اس مال کا ضمان واجب ہوگا اور اجرت کا بھی مستحق نہ ہوگا اور تیار کردہ مال کاریگر کو دیا جائے گا، یہ جواب حسب ذیل مسئلہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ کسی شخص نے رنگریز کو سفید کپڑا سرخ رنگنے کے لئے دیا، لیکن اس نے خراب اور ردی رنگا، پس اگر اس نے تجربہ کار وماہرین کی رائے کے مطابق بہت خراب رنگا ہے تو وہ سفید کپڑے کا ضامن ہوگا اور اگر رنگنے میں معمولی خرابی اور فرق ہے تو اس پر ضمان بھی نہ ہوگا اور اس کی متعین اجرت دی جائے گی، کما فی درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام: ''وأما إذا صبغہ الصباغ أحمر ولکن بصباغ ردئ ینظر فإن کانت رداءۃ الصباغ فاحشۃ فی نظر أہل الخبرۃ ضمن قیمۃ الثوب الأبیض، وإن کانت غیر فاحشۃ لا یلزم الضمان ویؤدی الأجر المسمی: رد المحتار'' (درر الحکام شرح المجلۃ۱؍۷۷۔۷۰۹)۔

جواب ۳، ۴ : جہاں تک ہوسکے ملکی قوانین جو معصیت نہ ہوں ان پر عمل کرنا چاہئے، اور قانون کی خلاف ورزی کوئی دانشمندانہ فعل نہیں، سوال نمبر تین اور چار میں پوچھی ہوئی صورت میں ظالمانہ ٹیکسوں سے بچاؤ کے لئے ایسا کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

جواب ۵ : یہ بچے ذرات زیور بنوانے والوں کے ہیں، ان کی رضامندی کے بغیر

کاریگر کے لئے جائز نہ ہونگے۔

جواب ۶ : جب اس کا ثمن وزن سے متعین ہوتا ہے، جتنا وزن ہو اس کا پورا ثمن خریدار کو دینا ضروری ہے، لہذا مذکور صورت میں خریدار کا یہ عمل درست نہیں ہے۔

جواب ۷ : جب اس سودے میں بھی مال کی قیمت وزن سے متعین کی گئی ہے تو جو وزن ہو اس کی پوری قیمت دینا خریدار کا تاجر پر واجب ہے، بائع کی رضامندی کے بغیر کم دینا جائز نہیں، خلاصہ یہ کہ یہ عمل بائع کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں۔

جواب ۸ : جب اس شخص نے جھوٹ بولا ہے اور اپنے کو مقروض ودیوالیہ ظاہر کیا، اور مال فروخت کرنے والے نے مجبوراً دیوالیہ سمجھ کر معاف کیا ہے، اس لئے معافی نہیں ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو اس کی یہ معافی دیوالیہ ہونے کی شرط پر معلق سمجھی جائے گی اور جب واقعۃً وہ دیوالیہ نہیں ہے، اس لئے معافی نہیں ہوئی، بقیہ رقم بائع کو لوٹانا ضروری ہے، اس شخص کے لئے اس طرح حاصل کردہ مال حلال نہیں۔

محور چہارم کے سوالوں کے جواب:

جواب۱ : ایک چیز کو نقد کم قیمت سے اور ادھار زیادہ قیمت سے بیچنا جائز ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں طے ہوجائے کہ نقد بیچایا ادھار، پس صورت مسئولہ میں کوئی شخص ڈائمنڈ کو جس قیمت سے ادھار بیچا جاتا ہے اس سے ۶ یا ۸ فیصد تخفیف کرکے نقد بیچے تو جائز ہے۔ مبسوط سرخسی میں لکھا ہے: ‘‘وإذا عقد العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا وبالنقد كذا أو قال إلى شهرين بكذا فهو فاسد ..... وهذا إذا افترقا على هذا، فإن كان يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وأتما العقد عليه فهو جائز’’ (مبسوط سرخسی۱۳؍۸-۹)۔

جواب ۲ : اس صورت میں جلدی دینے کی شرط پر قیمت میں سے کچھ کمی کرنے کی بات ہے، اس سلسلہ میں محور سوم کے سوال اول کے جواب میں تفصیل گزری، ملاحظہ فرمالیا جائے، حاصل یہ ہے کہ دین مؤجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ وقیمت ساقط کرنا بیع مساومہ میں ناجائز ہے، البتہ بیع مرابحہ میں متاخرین حنفیہ کا فتوی یہ ہے کہ بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مدت مقررہ تک جتنے ایام میں باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن (قیمت جلد ادا کرنے کی صورت میں) چھوڑنا پڑے گا (رد المحتار۵؍۱۶۰، فقہی مقالات ۱؍۱۱۴-۱۱۶)۔

جواب ۳ : اس صورت میں خریدار کو اختیار ہے کہ اسی قیمت پر رکھنا چاہے تو رکھے یا اگر چاہے تو اسے بائع کو لوٹا دے، مشتری کے لئے جائز نہیں ہے کہ عقد باقی ہوتے ہوئے ڈائمنڈ اپنے پاس روکے رکھے اور طے شدہ قیمت میں کمی کرائے، فتاوی ہندیہ میں لکھا ہے: ‘‘وإذا اشترى شيئاً لم يعلم بالعيب وقت الشراء ولا علمه قبله والعيب يسير أو فاحش

فلہ الخیار: إن شاء رضی بجمیع الثمن وإن شاء، ردہ: کذا فی شرح الطحاوی، ولیس لہ أن یمسکہ ویأخذ النقصان'' (ہندیہ)، البتہ پہلا سودا ختم کرکے کم قیمت پر نیا سودا کرسکتا ہے۔

جواب ۴ : اس صورت میں جوہری یہ نقلی ڈائمنڈ لوٹا سکتا ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے: ''والعیب یسیر أو فاحش فللمشتری الخیار إن شاء رضی بجمیع الثمن وإن شاء ردہ، ثم ینظر إن کان الاطلاع علی العیب قبل قبض المشتری فلہ أن یردہ علیہ وینفسخ العقد بقولہ رددت ولا یحتاج إلی رضا البائع ولا إلی قضاء القاضی، وإن کان بعد القبض لا ینفسخ إلا برضاء أو قضاء'' (ہندیہ)۔

جواب ۵ : اس صورت میں جب آپ کی بات سن کر زید نے کہا ہو کہ ہاں میں نے مثلاً اس کے نصف میں شرکت کی، یا مثلاً آدھی رقم ادا کردی تو یہ صورت درست ہے اور شرکت صحیح ہوئی،اس لئے کہ اس کو یہ کہا جائے گا کہ زید نے آپ سے آدھا ڈائمنڈ ایک لاکھ ساڑھے بارہ ہزار میں خریدا، پس تم دونوں اس میں نصفا نصف کے شریک ہونگے۔

جواب ۶ : 'ب ' نے 'ج ' سے جو کہا کہ تم شرکت کرنا چاہتے ہو، اس کے جواب میں 'ج ' نے کہا ہاں شرکت کرنا چاہتا ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے لئے اس کا آدھا حصہ ایک لاکھ ساڑھے بارہ ہزار میں خریدو، پس 'ب ج ' کی طرف سے وکیل بالشراء ہے، پس 'ب ' کو آدھا حصہ 'ج ' کی بتائی ہوئی قیمت میں ملے یا اس سے کم میں موکل کے لئے خریدنا ہوگا، اپنے لئے خریدے گا تو بھی اپنے لئے نہیں ہوگا، اور اس نے دولا کھ میں خریدا تو آدھا 'ج ' کا حصہ ہے ایک لاکھ کے عوض میں، پس دونوں میں ' ب ' کے خریدنے کے بعد شرکت صحیح ہوگی، 'ج ' سے ایک لاکھ سے زیادہ وصولی نہیں کرسکتا ہے (عربی حوالجات اور تفصیل محور اول کے سوال اول، دوم کے جواب میں ملاحظہ فرمالیں)۔

جواہرات کی تجارت سے متعلق چند مسائل

مولانا محمد ابرار خان ندوی•

دلال کا بائع ومشتری سے قیمت کا چھپانا اور منافع حاصل کرنا:

بیع کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ دھوکہ وغرر سے خالی ہو، نیز بائع ومشتری ثمن ومبیع سے مکمل طور پر واقف ہوں، ایسی ناواقفیت جو نزاع کا باعث بن سکتی ہو، خریدوفروخت کے معاملہ کو فاسد کردیتی ہے۔

علامہ ابوبکر الکاسانی رقمطراز ہیں:

''العلم بالمبیع والثمن علماً مانعاً من المنازعۃ شرط صحۃ البیع'' (بدائع الصنائع۵؍۱۵۶)۔

(مبیع اور ثمن کے بارے میں ایسی جانکاری جو نزاع کو ختم کردے صحت بیع کے لئے شرط ہے)۔

لہٰذا ہیرے وجواہرات کی تجارت میں یہ صورت کہ بائع جس قیمت پر بیچنا چاہتا ہے اور مشتری جس قیمت پر خریدنا چاہتا ہے، بروکر کوشش کرکے دونوں کو اصل قیمت خریدوفروخت سے ناواقف رکھ کر الگ قیمت پر رضامند کرلے، مثلاً بائع سو روپے میں بیچنا چاہتا ہے اور خریدار ۷۵؍روپے میں خریدنے پر قادر ہے، بروکر کوشش کرکے خریدار کو ۷۵؍روپے میں خریدنے پر اور بائع کو ۶۵؍روپے میں بیچنے پر راضی کرلے، اور دونوں میں جو دس روپے کا فرق ہے وہ بروکر اپنے پاس رکھ لے، بائع ومشتری کو اس کی خبر بالکل نہیں دیتا ہے، بلکہ ان سے چھپاتا ہے، یہ خریدار وبیچنے والے دونوں کے ساتھ دھوکہ اور خیانت ہے۔

ارشاد نبوی ہے: ''من غش فلیس منا'' (صحیح مسلم، باب قول النبی ﷺ: من غش فلیس منا) (دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں ہے)۔

اصل ثمن جس پر مبیع کا تبادلہ ہورہا ہے، بائع ومشتری دونوں اس سے ناواقف ولاعلم ہیں، بظاہر ثمن معلوم ہے، لیکن حقیقت میں اصل ثمن مجہول ہے، اصل ثمن ان کو معلوم ہوجائے تو موجودہ معاملہ پر اپنی رضامندی ہرگز نہ کرینگے، جبکہ بیع کی صحت کےلئے رضامندی شرط ہے۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''الرضا شرط البیع والرضا لا یتعلق إلا بالمعلوم'' (بدائع الصنائع۵؍۱۵۶) (رضا بیع

• جامعۃ الہدایہ، جے پور ، راجستھان۔

کے لئے شرط ہے اور رضامندی معلوم چیز سے متعلق ہوتی ہے)۔

لہذا خریدار وفروخت کرنے والے کو دھوکہ دے کر، اور ان سے چھپا کر رقم حاصل کرنا ناجائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا یحل مال امرء مسلم إلا بطیب نفس منہ'' (مسند احمد ۷۲٫۵، شعب الایمان للبیہقی۷۶۹٫۲) (مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے چھبیسویں سمینار ۲۰۱۷ء منعقدہ اجین میں یہ تجویز منظور کی تھی:

دلال کی اجرت جائز ہے، مگر اجرت معلوم ہو اور معاملہ کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے، لہذا زمین کی خریدوفروخت کے دلال کا ایک فریق سے قیمت کو چھپاکر زیادہ لینا یا جھوٹ بول کر زیادہ لینا جائز نہیں (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ۲۷۳-۲۷۴)۔

دلال بائع سے خرید کر فروخت کرے:

بائع جس قیمت پر بیچنا چاہتا ہے؛ بلکہ دلال نے بائع کو جس قیمت پر تیار کیا ہے دلال اس قیمت پر خود خرید لے، اور پھر خریدار جس قیمت پر خریدنے پر تیار ہوا ہے اس قیمت پر اسے بیچ دے، تو اس کی دو شکلیں ہیں:

اول۔ دلال اپنی فیس نہ لے تو جائز ہے:

دلال اپنی دلالی کی فیس نہ لے تو جائز ہے، کہ اب اس کی حیثیت دلال کی نہیں ہے، بلکہ وہ بائع سے خریدنے کے بعد اس چیز کا مالک ہے، اور وہ اپنی مملوکہ چیز خریدار کے ہاتھوں فروخت کررہا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

''إذا اشتری متاعاً ثم رقمہ بأکثر من الثمن الأول، ثم باعہ مرابحۃ علی رقمہ جاز'' (البحر الرائق۱۷۹٫۶، باب المرابحۃ والتولیۃ، زکریا بکڈپو دیوبند)۔

(کوئی سامان خریدے، پھر جس قیمت پر خریدا تھا، قیمت اس سے زائد ہوجائے، پھر خریدی ہوئی قیمت پر نفع کے ساتھ اسے فروخت کردے تو جائز ہے)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''من اشتری شیئاً ثم أغلی فی ثمنہ فباعہ مرابحۃ علی ذلک جاز'' (الفتاوی الہندیہ، کتاب البیوع مطلب بیع المرابحۃ) (کوئی چیز خریدے پھر خریدنے کے بعد اس کی قیمت بڑھ جائے، پھر وہ اسے نفع کے ساتھ فروخت کردے تو جائز ہے)۔

دوم۔ دلال اپنی فیس لے تو ناجائز ہے:

دلال اپنی فیس لیتا ہے تو ناجائز ہے، کیونکہ دلال کی حیثیت وکیل کی ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

‘‘الوکیل بالبیع أو بالشراء إذا اشتری لنفسہ أو باع مال المؤکل، لم یجز عندہم جمیعاً’’ (البحر الرائق۵؍۴۳۳، کتاب البیوع، زکریا بکڈپو)۔

(خرید یا فروخت کرنے کا وکیل اپنے لئے خریدے، یا مؤکل کے مال کو اپنے لئے فروخت کرے، تو یہ سب کے نزدیک ناجائز ہے)۔

دلال کا فرضی خریدار کے ذریعہ معاملہ کرنا:

دلال بائع کو مثلاً ساٹھ روپے میں بیچنے پر تیار کرلے اور خریدار کو ۷۰روپے میں خریدنے پر آمادہ کرلے، لیکن بائع سے اصل مشتری کو ملانے کے بجائے فرضی مشتری کو ملا دے، اور جب وہ چیز ساٹھ میں حاصل ہوجائے تو مشتری کو ستر روپے میں فروخت کردے اور دس روپے کا نفع خود رکھ لے، تو اگر دلال اپنی اجرت دلالت نہیں لیتا ہےتو معاملہ جائز ہے اور فرضی خریدار کو اپنی طرف سے چار فیصد جو دلالی کی فیس دے رہا ہے وہ اجرۃ الوکالۃ ہے۔

چور بازار سے جواہرات کی خریداری:

کاریگر قیمتی جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مالک کی اطلاع وعلم کے بغیر چھپا لیتے ہیں، (یہ عمل ناجائز ہے، غیر کی ملکیت کو اس کی اجازت کے بغیر لینا ہے) اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مخصوص مارکیٹ میں فروخت ہوتے ہیں، حالانکہ اس مارکیٹ میں صحیح واچھا مال بھی بکتا ہے، اگر حتمی طور پر معلوم ہوجائے کہ فلاں دوکان کا مکمل یا زیادہ تر مال چوری کا ہے، یا فلاں مال چوری کا ہے، تو اس دوکان سے مال خریدنا جائز نہیں ہے، یا ایسے قرائن موجود ہوں جن سے مال کا چوری کا ہونا پتہ چلے تو اس مال کو لینا جائز نہیں ہے، ارشاد نبوی ہے:

‘‘من اشتری سرقۃ وہو یعلم أنہا سرقۃ فقد اشترک فی عارہا وإثمہا’’ (فیض القدیر ۱۱؍۵۶-۵۴ بحوالہ فتاوی محمودیہ۱۶؍۸۶، ڈابھیل)۔

(یہ جانتے ہوئے کہ یہ مال چوری کا ہے اس کو خریدے، تو وہ اس چوری کے گناہ وجرم میں شریک ہے)۔

شیخ سید سابقؒ نقل فرماتے ہیں:

‘‘یحرم علی المسلم أن یشتری شیئاً وہو یعلم أنہ أخذ من صاحبہ بغیر حق، لأن أخذہ بغیر حق ینقل الملکیۃ من ید مالکہ، فیکون شراءہ لہ شراء ممن لا یملک، مع ما فیہ من التعاون علی الإثم والعدوان’’ (فقہ السنہ۳؍۱۳۰، حرمۃ شراء المغصوب والمسروق، دار الکتاب العربی، بیروت)۔

(مسلمان کے لئے حرام ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ چیز اس کے مالک سے ناحق طور پر لی گئی ہے، اسے خریدے، اس لئے ناحق اس کا لینا اس چیز کو مالک کی ملکیت سے نکال دیتا ہے، تو اس کا خریدنا ایسے شخص سے ہے جو اس کا مالک نہیں

ہے، نیز اس میں گناہ وسرکشی میں تعاون ہے)۔

البتہ کسی مال کے بارے میں حتمی طور پر معلوم نہ ہو اور نہ ہی ظن غالب ہو اور نہ ہی ایسے قرائن پائے جائیں کہ یہ چوری کا ہے تو اس مارکیٹ سے خرید وفروخت کرنے کی اجازت ہے، احتیاط کا پہلو ہے کہ دوسرے مارکیٹ میں اس طرح کا مال ملتا ہو تو مشکوک مارکیٹ سے خریداری کرنے سے احتراز کیا جائے۔

مال خریدنےکے بعد چوری کا شبہ ہو:

مال خریدنے کے بعد دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ مال چوری کا تو نہیں ہے، بیچنے والا دریافت کرنے پر انکار کرے، اور کہے درست وصاف ستھرا حلال کمائی کا مال ہے، تو اس مال کو لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

''الیقین لا یزول بالشک'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم، القواعد الفقہیہ، علی احمد الندوی) (یقین شبہ سے ختم نہیں ہوتا)۔

ادھار خرید کر نقد نفع کے ساتھ بیچنا:

ادھار خریدنے کے بعد مال پر قبضہ کرلیا، اور قیمت ادا کرنے سے پہلے اس مال کو دوسرے شخص کے ہاتھ نفع کے ساتھ فروخت کردے، اس کے بعد جس سے ادھار لیا تھا اس کی قیمت ادا کردے اور جو نفع ہوا ہے اس کو خود رکھ لے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، خریدنے کے بعد وہ اس چیز کا مکمل مالک ہے، دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا بھی مکمل اختیار ہے۔

صاحب المحیط البرہانی لکھتے ہیں:

''لو اشتری ثوباً ولم ینقد ثمنہ، ثم باعہ مرابحۃ جاز'' (المحیط البرہانی۱۰؍۱۸۵، الفصل ۱۵ بیع المرابحہ والتولیہ)۔

(کپڑا خریدا، اور اس کی قیمت ادا نہیں کی تھی کہ اسے منافع کے ساتھ فروخت کردیا تو جائز ہے)۔

نیز علماء کویت کا فتوی بھی جواز کا ہے، ایک استفتاء کے جواب میں ان کا فتوی ہے:

''أجابت اللجنۃ بما یلی:لا مانع شرعاً من شراء السیارۃ أو أی سلعۃ أخری بالأقساط مؤجلۃ، وبیعہا بثمن حال، سواء کان أکثر من ثمنہا المؤجل أو أقل، شریطۃ أن تباع بغیر من اشتریت منہ أولاً، وہذہ الصورۃ تسمی عند الفقہاء (بالتورق) واللہ أعلم'' (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ۱۰؍۱۴۶، کتاب المعاملات، باب البیوع)۔

(قسطوں پر ادھار قیمت کے ذریعہ گاڑی یا کوئی اور سامان خریدا جائے اور پھر اسے نقد قیمت لے کر بیچ دیا جائے اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے،چاہے وہ نقد قیمت ادھار قیمت سے زیادہ ہو یا کم، البتہ یہ شرط ہے کہ پہلے جس سے خریدا ہے اس کے علاوہ سے بیچا جائے، فقہاء کرام کے نزدیک اس صورت کو (تورق) کہا جاتا ہے)۔

قیمت معلوم کرکے اس چیز کو خریدار کے ہاتھ فروخت کرنا:

بائع سے صرف قیمت معلوم کرلی جائے، خریدوفروخت کا کوئی معاملہ طے نہ کیا جائے اور نہ ہی اس چیز پر قبضہ کیا جائے، البتہ اس طرح کے سامان کا خریدار تلاش کرکے، اس سے زیادہ قیمت طے کرلی جائے، اس کے بعد صاحب مال سے باقاعدہ خرید کرکے اس شخص سے جو اس طرح کا مال خریدنا چاہتا ہے، طے شدہ قیمت پر فروخت کردیا جائے اور دونوں قیمتوں میں جو فرق ہے، اسے اپنا نفع سمجھ کر رکھ لیا جائے، اس صورت کے حکم کی بابت دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: اس کوآرڈر تصور کیا جائے کہ سامان کے مالک سے قیمت دریافت کرنے کے بعد اس طرح کے مال کے طالب اور خریداری کے خواہشمند سے آرڈر حاصل کیا جارہا ہے، باقاعدہ خریدوفروخت کا معاملہ نہیں ہورہا ہے، اس کے بعد اصل مالک سے خرید کر اب باضابطہ اس طرح کے مال کے خواہشمند جس سے آرڈر حاصل کیا ہے اس کو طے شدہ قیمت پر فروخت کیا جارہا ہے، یہ بیع استصناع کی صورت ہے اور یہ جائز ہے۔

شیخ سید سابق لکھتے ہیں:

''الاستصناع ہو شراء ما یصنع وفقا للطلب وہو معروف قبل الإسلام، وقد أجمعت الأمۃ علی مشروعیتہ'' (فقہ السنہ۳،۱۳۴)۔

(استصناع آرڈر پر بنائی جانے والی چیز کے خریدنے کو کہتے ہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ چیز معروف تھی، اور امت کا اس کی مشروعیت وجواز پر اتفاق ہے)۔

دوسری صورت: یہ بیع ما لم یملک ہے، اصل مالک سے سامان خریدے بغیر صرف قیمت معلوم کرکے دوسرے شخص کو مال بیچا جارہا ہے، جو مال نہ اس کی ملک ہے اور نہ ہی قبضہ میں ہے۔

''عن حکیم بن حزام قال نہانی رسول اللہ ﷺ أن أبیع ما لیس عندی'' (سنن الترمذی۳،۵۳۴، باب ما جاء فی کراہیۃ بیع ما لیس عندک، حدیث: ۱۲۳۳)۔

(حکیم بن حزام سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ جو چیز میری ملک نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کی بیع سے مجھے منع فرمایا ہے)۔

علامہ کاسانی نے حضرت حکیم بن حزام کا واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے:

''روی أن حکیم بن حزام کان یبیع الناس أشیاء لا یملکہا ویأخذ الثمن منہم، ثم یدخل السوق، فیشتری ویسلم إلیہم، فبلغ ذلک رسول اللہ ﷺ ، فقال: لا تبع ما لیس عندک'' (بدائع الصنائع۵،۱۴۷)۔

(مروی ہے کہ حکیم بن حزام لوگوں سے ایسی چیزیں بھی بیچ دیا کرتے تھے جس کے وہ مالک نہیں تھے اور لوگوں سے ان کی قیمت لے لیا کرتے، پھر بازار جاکر سامان

خریدتے اور ان کے سپرد کرتے، یہ خبر آپ ﷺ کو پہنچی، آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز تمہارے پاس نہیں ہے اس کو مت بیچو)۔

بیع کی صحت کے لئے شرط ہے کہ معقود علیہ بائع کی ملک ہو۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکا للبائع عند البیع، فإن لم یکن لا ینعقد'' (بدائع الصنائع ۱۴۶۔۱۴۷،۵)۔

(انعقاد بیع کے لئے شرط ہے کہ مبیع خریدوفروخت کے وقت بائع کی ملکیت ہو، اگر وہ بائع کی ملکیت میں نہیں ہے تو بیع نہیں ہوگی)۔

محور دوم:

پرچی کی خرید وفروخت کا حکم:

جواہرات کی تجارت میں خاص طو ر سے اور دیگر تجارتی اشیاء کی خریدوفروخت میں عام طور سے یہ رواج ہے کہ خریدار اپنے ذمہ واجب الاداء رقم کی پرچی بائع کو دیتا ہے، اور دلال بائع سے اس پرچی کو نقد رقم دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلیتا ہے، اور قیمت کی ادائیگی کا جو وقت مقرر ہے اس میں خریدار سے پوری رقم وصول کرتا ہے، اس طرح دلال بغیر کسی سامان کی خریدوفروخت کے، اور بنا کسی محنت کے پرچی کے ذریعہ خوب پیسہ کماتا ہے، پرچی کی خریدوفروخت کا یہ مروجہ طریقہ ناجائز ہے۔

دراصل یہ پرچی کی بیع نہیں ہے، بلکہ پرچی میں جو رقم تحریر ہے اس کی بیع ہے اور یہ ثمن کی بیع ہم مثل وہم جنس ثمن سے کمی زیادتی کے ساتھ بیچنا ناجائز وممنوع ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''لا تبیعوا الذہب بالذہب إلا سواء بسواء، والفضۃبالفضۃ إلا سواء بسواء، وبیعوا الذہب بالفضۃ والفضۃ بالذہب کیف شئتم'' (کنز العمال ۱۱۱،۵، الفصل الثانی فی احکام الربا، حدیث: ۹۷۹۲)۔

(سونے کو سونے کے بدلہ اور چاندی کو چاندی کے بدلہ نہ بیچو مگر برابر برابر، سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے سے جیسے چاہو بیچو)۔

دلال نقد ثمن کے ذریعہ ادھار ثمن کو کم میں خرید رہا ہے، یہ کم کرنا سود ہونے کے سبب ناجائز ہے۔

شیخ علاء الدین حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

''إذا باع الدین من غیر من ہو علیہ ..... لا یصح '' (الدر المختار مع الرد ۳۳،۷، مطلب فی بیع الجامکیہ، زکریا بکڈپو) (مقروض کے علاوہ دوسرے شخص سے دین

کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے دسویں فقہی سمینار اکتوبر ۱۹۹۷ء بمقام ممبئی میں یہ تجویز منظور کی تھی:

''قرض کی دستاویز (رسیدات، پرچیاں، وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے اور مالک ہوجائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق رقم سے کم لے، اس معاملہ سے علاحدہ ہوجاتا ہے، اس طرح کی خریدوفروخت جائز نہیں ہے '' (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے،۲۰۸، قسط پر خرید وفروخت)۔

ادائیگی ثمن کے لئے سودی قرض لینا:

مشتری سامان خریدنے کے بعد ساما ن فروخت نہ ہونے یا کسی اور سبب مقررہ وقت پر قیمت ادا کرنے سے قاصر ہو، دوسری جانب بائع کا شدید مطالبہ ہو کہ قیمت چاہئے، اب وہ بائع کے دباؤ میں سودی قرض حاصل کرکے قرض سے چھٹکارا چاہتا ہے، تو ایسے شدید حالات میں بھی سودی قرض لینے کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ ہی کسی اور کےلئے اجازت ہے کہ وہ مقروض کے قرض کی ادائیگی کے لئے سودی قرض حاصل کرے، کہ یہ بھی سودی معاملہ میں تعاون ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''عن جابر بن عبد اللہؓ أنہ قال: لعن رسول اللہﷺ آکل الربا ومؤکلہ وشاہدیہ وکاتبہ'' (سنن الترمذی۳،۵۱۲، باب ما جاء فی أکل الربا، حدیث: ۱۲۰۶)۔

(حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے اور اس کو لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی ہے)۔

افتاء کونسل کویت نے ایک استفتاء کے جواب میں یہ فتوی دیا، استفتاء کا خلاصہ یہ ہے کہ میں ۱۵۰۰ دینار کا مقروض ہوں، قرض خواہ قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کررہے ہیں اور اگر میں نے ان کا قرض ادا نہیں کیا تو وہ مجھے جیل میں ڈلوادینگے، اور میں اپنے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا اکیلا ہوں، تو کیا قرض ادا کرنے کےلئے سودی بینک سے قرض لے سکتا ہوں؟

افتاء کونسل نے جواب میں یہ فتوی دیا:

''لا یجوز الاقتراض بالربا وہو من المحرمات التی شددت الشریعۃ فی الزجر عنہا، وإنما السبیل المدین أن یسد حاجتہ بالقرض الحسن أو بالأخذ من سہم المغارمین فی الزکاۃ، فإن للسائل من المغارمین حیث توجہت علیہ المطالبۃ وعجز عن السداد'' (مجموعۃ الفتاوی الشرعیہ ۱۰،۲۰۷-۲۰۶)۔

(سودی قرض لینا جائز نہیں ہے، یہ ان محرمات میں سے ہے جس سے شریعت نے بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے، مقروض کے لئے یہ راستہ ہے کہ وہ اپنی (قرض) ضرورت کو قرض حسنہ یا زکاۃ میں جو غارمین کا حصہ ہے اس سے پورا کرے، قرض خواہ مطالبہ کررہے ہیں اور یہ اس کو پورا کرنے سے عاجز ہے، تو یہ سائل مغارمین میں داخل ہے)۔

سودی قرض حاصل کرنے کے بجائے زکوۃ لے جس سے قرض ادا کرے۔

''فإن كان مديوناً فدفع إليه مقدار ما لو قضى به دينه لا يبقى له شئى أو يبقى دون المأتين لا بأس به'' (الفتاوى الهندیہ ۱۸۸،۱، الباب السابع فى المصارف)۔

(اگر وہ مقروض ہے تو اسے زکوۃ سے اتنی مقدار دیدی جائے کہ قرض کی ادائیگی کے بعد اس کے پاس کچھ نہ بچے، یا بچے تو مگر وہ دو سو درہم سے کم ہو تو کوئی حرج نہیں)۔

بلکہ ایسے مقروض کو زکوۃ دینا افضل ہے۔

''والدفع إلى من عليه الدين أولى من الدفع إلى الفقير'' (الفتاوى الهندیہ ۱۸۸،۱، الباب السابع فى المصارف)۔

(مقروض کو زکوۃ دینا فقیر کو دینے سے افضل ہے)۔

نیز بائع کو بھی چاہئے کہ نرمی وسہولت کا معاملہ کرے، اسے مزید مہلت دے، سودی قرض لینے پر مجبور نہ کرے، ''من أنظر معسراً أو وضع عنه أظله الله فى ظله يوم لا ظل إلا ظله'' (كنز العمال ۲۲۰،۶، الفصل الثانى فى الانظار والمسامحة، حديث: ۱۵۳۹۱)۔

فروخت کرنے کے بعد بائع سے قیمت کم کرنے کا مطالبہ:

بائع سے پانچ سو روپے کیرٹ کے حساب سے معاملہ طے کیا، اور مشتری کو سات سو روپے کیرٹ کے حساب سے فروخت کرنے پر بات طے کی تو یہ بیع نہیں ہے، بلکہ وعدۂ بیع ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس کے بعد بائع سے وعدہ کے مطابق طے شدہ قیمت پر سامان خرید کر مشتری کو طے شدہ قیمت پر فروخت کردے، درست ہے، کیونکہ وہ نہ دلال ہے اور نہ دلالی کی فیس لے رہا ہے، بلکہ ایک چیز خرید کر نفع کے ساتھ بیچ رہا ہے، اسی کا نام تجارت ہے۔

قیمت کم کرنے کا مطالبہ درست نہیں:

بائع سے پانچ سو روپے کیرٹ کے حساب سے ادھار خرید کر نقد سو روپے کیرٹ کے حساب سے فروخت کرنے کے بعد بائع سے یہ کہنا کہ مال پانچ سو روپے کیرٹ کا نہیں تھا، لہذا قیمت کم کرو جبکہ اسی مال کی قیمت سات سو روپے کیرٹ کے حساب سے وصول کرچکا ہے، صریح جھوٹ وکذب بیانی ہے، ایسا شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''إن التجار هم الفجار، فقيل يا رسول الله أليس قد أحل الله البيع؟ قال: نعم، ولكنهم يحلفون فيأثمون، ويحدّثون فيكذبون'' (فقہ السنہ ۱۳۲،۳)۔

(بے شک تجار فاسق وفاجر ہیں، دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اللہ نے بیع

کو حلال نہیں کیا ہے، فرمایا: ہاں کیا ہے، لیکن وہ قسم کھاتے ہیں تو گناہ میں مبتلا ہوتے، اور گفتگو کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں)۔

البتہ اگر بائع اس کے کہنے پر قیمت کم کردے تو قیمت کا کم کرنا درست ہے، لیکن جھوٹ بول کر قیمت کم کرانے والا سخت گنہگار اور ممنوع وناجائز کا مرتکب ہے۔

صاحب المحیط البرہانی لکھتے ہیں:

''وفی المنتقی: رجل باع رجلاً ثوباً ثم لقیہ المشتری، وقال إنک غلیت علیّ، وبعتنی بأکثر مما یساوی، وقال البائع إنی قد بعتک بعشرۃ وکان باعہ بعشرین، فہذا حط للعشرۃ عن الثمن'' (المحیط البرہانی٩،٥١٣، کتاب البیوع، الفصل ١١ الحط والزیادۃ فی الثمن)۔

(منتقی میں ہے کہ ایک شخص نے کسی سے کپڑے بیچا، پھر مشتری اس سے ملا اور کہا تم نے مجھے مہنگا دیا ہے اور عام بھاؤ سے زیادہ قیمت میں مجھے بیچا ہے، بائع نے کہا میں نے دس درہم میں بیچا ہے، حالانکہ اس نے بیس درہم میں بیچا تھا تو یہ دس درہم قیمت سے کم ہوجائینگے)۔

مبیع کے عیوب ومحاسن بیان کرنا:

سامان خریدتے وقت اس کو زیادہ عیب دار ثابت کرنے کی کوشش کرنا؛ تاکہ بائع کم سے کم قیمت پر راضی ہوجائے، لیکن جب اسی مال کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے؛ تاکہ مشتری زیادہ قیمت میں خریدے تو ڈھیر ساری تعریفیں کرے کہ کوالٹی بہت اعلی ہے اور ایسی خوبیاں بیان کرے جو اس سامان میں نہیں ہیں یہ دونوں چیزیں شرعاً جرم، جھوٹ اور دھوکہ ہے، اور اس طرح کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔

''عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہﷺ: لا تتلقوا الرّکبان، ولا یبیع حاضر لباد'' (مختصر صحیح البخاری١،٢٢٤، باب ہل یبیع حاضر لباد بغیر أجر)۔

(حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ تم قافلوں سے نہ ملو، اور کوئی شہری دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے)۔

تلقی رکبان وتلقی جلب یہ ہے کہ تجارتی قافلہ دیہات سے سامان لے کر شہر آتا تھا، لیکن ہوشیار وچالاک افراد ان افراد وقافلوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ان کا سارا مال سستے داموں میں خرید لیتے تھے اور انہیں یہ باور کراتے تھے کہ اس وقت بازار کا بھاؤ بہت سستا ہے، اور شہر والوں کو گراں داموں میں دیتے تھے، اس سے شہر والوں اور دیہات سے مال لے کر آنے والوں دونوں کا نقصان ہوتا تھا، اللہ کے رسولﷺ نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔

تلقی جلب وتلقی رکبان مکروہ ہے، ائمہ ثلاثہ کے یہاں بائع کو خیار فسخ حاصل ہے، احناف کے یہاں بیع کو ختم کرنے کا حق نہیں ہے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے

ہیں: اس حدیث کے الفاظ بالکل صاف اور واضح ہیں، اس لئے ائمہ ثلاثہ کا مسلک زیادہ قوی ہے (درس ترمذی۴،۷۷، باب ما جاء فی کراہیۃ تلقی البیوع)۔

بیع کو ختم کرنے کا اختیار ہے:

لہذا خریدتے وقت مبیع میں عیب نکالنا تاکہ قیمت کم کر اسکے اور اسی سامان کو تعریف کرکے زیادہ قیمت میں فروخت کرنا مکروہ ہے، اور ایسی خوبیانبیان کرکے زیادہ قیمت میں فروخت کرے جو خوبیاں اس سامان میں موجود نہیں ہے، تو مشتری کو خیار فسخ حاصل ہوگا۔

جواہرات میں ملاوٹ اور اس کی بیع:

جواہرات کی تیاری میں ملاوٹ کی کافی گنجائش رہتی ہے، رنگ، شیشہ، وغیرہ کی آمیزش اس ہنرمندی سے کردی جاتی ہے کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے، اور نقلی واصلی جواہرات میں تمیز کرنا دشوار ہوجاتا ہے، مال تیار کرانے والا کاریگروں سے کہتا ہے کہ سستا مال چاہئے، لہذا کاریگر اس میں رنگ، شیشہ وغیرہ کو شامل کرکے سستا مال تیار کرتے ہیں، پھر مالک اس مال کو تاجروں کے ہاتھ فروخ کرتا ہے، تو اس کے حکم کی بابت دوصورتیں ہیں:

۱۔ تاجر کو بتادیا جائے کہ اس میں ملاوٹ ہے تو اس کی بیع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام فرید الدین عالم بن العلاء الانصاری لکھتے ہیں:

''وفی الملتقط:لا بأس ببیع المغشوش إذا بین، أو کان ظاہراً،و ہو قول أبی یوسف'' (الفتاوی التاتارخانیہ۸،۳۰۴)۔

(ملتقط میں ہے، سامان کے کھوٹ کو بیان کردیا جائےتو اس کی بیع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہی امام ابویوسف کا قول ہے)۔

اور تاجر یہ جاننے کے بعد کہ یہ جواہرات خالص نہیں ہیں، ان میں ملاوٹ کی گئی ہے خریدتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس ملاوٹ پر راضی ہے، اسے کوئی اعتراض نہیں ہے، اب اسے بیع کو ختم کرنے اور مبیع کو واپس کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتےہیں:

''وقدمنا عن الذخیرۃ أن قبض المبیع بعد العلم بالعیب رضی بالعیب'' (رد المحتار۴،۹۰)۔

(ہم نے ذخیرہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عیب پر واقفیت کے بعد مبیع پر قبضہ عیب کے ساتھ لینے پر رضامندی کی دلیل ہے)۔

صاحب المحیط البرہانی تحریر فرماتے ہیں:

''والتثبت بالمبیع بعد العلم بالعیب مع إمکان الرد دلیل الرضا بالعیب، والرضا بالعیب یسقط حق المشتری بالرد فی الرجوع بنقصان العیب'' (المحیط البرہانی۱۰،۱۱۲ کتاب البیوع، الفصل ۱۴ فی العیوب)۔

(مبیع کو واپس کرنے کے امکان کے باوجود عیب کو جاننے کے بعد مبیع پر قبضہ کرنا عیب کے ساتھ رضامندی کی دلیل ہے، اور عیب کے ساتھ رضامند مشتری کے حق مبیع کو واپس کرکے عیب کے نقصان کی تلافی کو ساقط کردیتا ہے)۔

تاجر کو ملاوٹ کے متعلق بتایا جائے تو کہے مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں، مجھے تو سستا مال چاہئے، یہ عیب اور ملاوٹ کے ساتھ رضامندی کی دلیل ہے، اب اسے مبیع کو واپس کرنے کا حق واختیار باقی نہیں ہے۔

''ویسقط أیضاً بالرضا بالعیب، وہو نوعان:صریح وما یجری مجری الصریح دلالۃ، فالصریح أن یقول رضیت بالعیب الذی بہ، أو اخترت، أو أجزت البیع'' (بدائع الصنائع۵٫۲۹۱)۔

(عیب پر رضامندی سے مبیع کو واپس کرنے کا حق ساقط ہوجاتا ہے، رضا بالعیب کی دوصورتیں ہیں ایک صریح رضامندی، دوسری وہ رضامندی جو صریح پر دلالت کرے، صریح جیسے وہ کہے میں اس میں عیب کے ساتھ راضی ہوں، یا میں نے اس سے اختیار کرلیا، یا میں بیع کی اجازت دیتا ہوں)۔

۲۔ خریدار کو ملاوٹ سے مطلع ہی نہ کیا جائے، کہ ان جواہرات میں ملاوٹ کی گئی ہے، یہ خریدار کے ساتھ دھوکہ ہے، بتانا ضروری ہے۔

''عن عقبۃ بن عامر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: المسلم أخو المسلم، لا یحل لمسلم باع من أخیہ بیعاً وفیہ عیب إلا بینہ'' (رواہ احمد وابن ماجہ والدارقطنی، فقہ السنہ۳٫۱۴۶)۔

(عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کوئی چیز فروخت کرے اور اس میں عیب ہو، مگر اس کو واضح کردے)۔

عیب کو چھپانا حرام ہے۔

''کتمان عیب السلعۃ حرام، وفی البزازیۃ، وفی الفتاوی، إذا باع سلعۃ معیبۃ علیہ البیان'' (البحر الرائق ۶٫۵۸، باب خیار العیب)۔

(سامان کے عیب کو چھپانا حرام ہے، بزازیہ، اور فتاوی میں ہے، جب کوئی عیب دار سامان بیچے تو اس کو واضح کردینا لازم ہے)۔

عیب کو پوشیدہ رکھ کر بیچنا مشتری کے ساتھ دھوکہ ہے۔

''أما بیان نفس العیب القائم بہ فلا بد منہ، لئلا یکون غاشاً لہ للحدیث الصحیح من غش فلیس منا، کما فی البحر'' (مجمع الانہر ۲٫۷۷، باب المرابحۃ والتولیہ)۔

(اس میں موجود عیب کو ظاہر کردینا لازم ہے، تاکہ وہ مشتری دھوکہ دینے والا شمار نہ ہو، حدیث صحیح ہے، جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں نہیں ہے)۔

خریدار کو خیار فسخ ہے:

اصلی جواہرات بہت قیمتی ہوتے ہیں، خریدار کو بتایا نہیں گیا کہ ان جواہرات میں ملاوٹ شامل ہے، اور یہ اصلی نہیں ہیں، بعد میں خریدار کو اس کی خبر ہو تو اسے جواہرات کو واپس کرنے کا اختیار ہے۔

''إذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع، فهو بالخیار، إن شاء أخذه بجمیع الثمن، وإن شاء ردّه'' (مختصر القدوری،۱۰۶، باب خیار العیب)۔

(مشتری کو مبیع کے اندر جب عیب کا پتہ چلے تو اسے اختیار ہے، اگر لینا چاہتا ہے تو پوری قیمت دے کر لے لے، اور اگر لینا نہیں چاہتا تو اسے ختم کردے (واپس کردے))۔

اس لئے اصلی جواہرات اور نقلی وملاوٹی جواہرات کی قیمت میں بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے، اس سے خریدار کو بھاری نقصان اٹھانا پڑسکتا ہے، نقصان سے بچانے کی خاطر اسے بیع کو ختم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

صاحب المحیط البرہانی لکھتے ہیں:

''لأن حق الرد إنما یثبت للمشتری دفعاً للضرر عنه'' (المحیط البرہانی ۹۶،۱۰ کتاب البیوع ، الفصل ۱۴ فی العیوب)۔

نفع کی تحدید:

شریعت میں خریدوفروخت میں نفع کی تحدید نہیں کی گئی ہے، مالک کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنا سامان جس قیمت پر چاہے فروخت کرے۔

''لأن الثمن حق العاقد فإلیه تقدیره'' (الہدایہ۴،۴۵۵)۔

(ثمن بائع کا حق ہے، تو اس کی تقدیر (تعیین وحدبندی) اسی کو حاصل ہے)۔

انسانی مروت کا تقاضا ہے کہ مناسب قیمت وصول کی جائے، ہاں اگر کوئی شخص عام قیمت کے مقابلہ بہت گراں قیمت میں اپنا سامان فروخت کرتا ہے تو اسے اختیار ہے اور یہ معاملہ بھی درست ہے، مگر غبن فاحش کے سبب مکروہ ہے، اور غبن فاحش عرف پر مبنی ہے۔

سید سابق غبن فاحش کی بابت فقہاء کی آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''وأولی ہذہ الآراء أن الغبن یقید بالعرف والعادة'' (فقہ السنہ۳،۱۴۸، خیار الغبن فی البیع والشراء)۔

(ان تمام آراء میں سب سے بہتر رائے یہ ہے کہ غبن میں عرف کا اعتبار ہے)۔

نفع غبن فاحش کو پہنچ جائے:

غبن فاحش کی صورت میں خریدار مبیع کو واپس کرنے یعنی معاملہ کو ختم کرنے کا اختیاررکھتا ہے۔

''وفی الجامع الصغیر: من اشتری شیئاً وصار مغبوناً فیه غبناً فاحشاً أن له أن یرده علی البائع بحکم الغبن'' (المحیط البرہانی۱۰،۱۸۴، کتاب البیوع، الفصل ۱۵ بیع المرابحة والتولیة)۔

(جامع صغیر میں ہے، کسی نے کوئی سامان خریدا، اور اس میں اس کے ساتھ غبن فاحش ہوجائے، تو غبن کے سبب اسے مبیع بائع کو لوٹانے کا حق ہے)۔

قاضی امام علی نسفی بیان کرتے ہیں کہ ان کے استاذ فقیہ عبد اللہ مشتری کو فسخ بیع کے اختیار کا فتوی دیتے تھے۔

''الفقیہ عبد اللہ کان یفتی بثبوت الخیار للمشتری إذا کان مغبوناً'' (الفتاوی التاتارخانیہ ١٠،١٦٢)۔

(مشتری کے ساتھ جب غبن ہوجائے تو فقیہ عبد اللہ فتوی دیا کرتے تھے کہ اسے خیار فسخ حاصل ہے)۔

جواہرات کی قیمت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے، بظاہر دو پتھر ہیں دیکھنے میں یکساں معلوم ہوتے ہیں، مگر قیمت میں بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے، لہذا ایک معمولی قیمت والے پتھر کو گراں قیمت والے پتھر کے دام میں فروخت کردیا جائے، بعد میں جب پتہ چلے تو خریدار کو غبن فاحش کی بنا پر بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

امام برہان الدین ابی المعالی محمود بن صدر الشریعہ ابن مارہ البخاری غبن فاحش کی وجہ سے بیع کے فسخ کرنے اور نہ کرنے کی بابت فقہاء احناف کی مختلف آراء ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''والصحیح أن یفتی بالرد إذا وجد التغریر، وبدونہ لا یفتی'' (المحیط البرہانی ١٠،١٨٨، کتاب البیوع، الفصل ١٥، بیع المرابحۃ والتولیہ)۔

(صحیح یہی ہے کہ اگر اس میں غرر ودھوکہ پایا جائے تو بیع کو واپس کرنے کا فتوی دیا جائے گا، اگر غرر نہیں ہے تو واپس کرنے کا فتوی نہ دیا جائے)۔

ہیرے اور جواہرات کی خریدوفروخت

مفتی نثار احمد گودھروی•

محور اول:

عاقدین یا بائع اور مشتری کے درمیان معاملات طے کرانے میں جو شخص اپنا کردار ادا کرتا ہے اس کو سمساریعنی دلال کہا جاتا ہے اور یہ معاملہ اجارہ میں آتا ہے اور اجارہ کے درست اور صحیح ہونے کے لئے اجرت اور منفعت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

''والسمسرة اصطلاحا هی التوسط بین البائع والمشتری والسمسار هو الذی یدخل بین البائع والمشتری متوسطاً لإمضاء البیع وهو المسمی الدلال لأنه یدل المشتری علی السلع ویدل البائع علی الأثمان'' (الموسوعة الفقهیة)۔

اگر دلالی میں باقاعدہ معاملہ طے ہوا اور کسی قسم کی جہالت نہ ہو تو فی نفسہ اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اور اگر معاملہ مجہول ہو تو مذہب احناف میں اس کو فاسد قرار دیا گیا اور کام پورا ہونے پر اجر مثل کا مستحق ہوگا، نہ کہ مقررہ اجرت کا۔

لیکن اگر جہالت معمولی ہو یا کثرت تعامل کی وجہ سے موجب نزاع نہ ہو تو اس کو فقہاء متأخرین نے ضرورة جائز قرار دیا، اس لئے کہ اجارہ کے مسائل کا دار و مدار اکثر عرف و عادت پر ہوتا ہے اور ہر زمانہ کی مصلحتوں کو بھی بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جواب :

(۱) بروکر اگر بائع کو کم بیچنے اور مشتری کو اس سے زیادہ پر خریدنےپر آمادہ کر دیتا ہے اور درمیان میں جو فرق رہتا ہے وہ بروکر بائع اورمشتری کو نہ بتائے اورخود رکھ لے توشرعًا یہ جائز نہیں، بروکر اور دلال فقط اپنی طےشدہ دلالی کا حقدارہے، یہ ایک طرح کا بائع اور مشتری کے ساتھ دھوکہ شمار ہوگا اور دھوکہ جائز نہیں۔

(۲) اگر دلال پہلے بائع کے پاس سے وہ چیز خرید کر اپنی ملکیت میں لے لے، پھر وہ مشتری کو اپنی مرضی کے مطابق جس قیمت پر چاہے بیچ دےتو اس کی گنجائش ہے، اس صورت میں دلال بائع کے سامنے مشتری کی حیثیت اختیار کرلے گا،اب وہ دلالی کا حق دار نہیں ہوتا، اس لئے دلالی کا مطالبہ بھی درست نہ ہوگا۔

دلال کا بائع کو ایک قیمت پر آمدہ کرنے کے بعد فرضی مشتری تیار کرکے بائع

• دار الافتاء ، جامعہ رحمانیہ ، وناکپور ، گودھرا،پنچ محل۔

کےساتھ بات کروانا اور ایک فرضی سودا کروانا درست نہیں، یہ ایک دھوکہ ہے اور شریعت میں دھوکہ منع ہے۔

ایک آدمی کی دوحیثیتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتی ہے کہ آدمی بائع بھی ہو اور دلال بھی ہو، جو بائع ہوگا وہ دلال نہ ہوگااور جو دلال ہوگا وہ بائع نہ ہوگا، کیونکہ بائع کا تعلق خریدو فروخت سے ہے، جب کہ دلال کاتعلق اجارہ سے ہے، نیز دلال اس کو کہتے ہے کہ جو بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ طے کرائے اور ایک ثالثی کا کردار ادا کرے، رہااس فرضی مشتری کو دلال کی حیثیت سے پیش کرنا یہ بھی دھوکہ ہے جو جائز نہیں اور یہ معاملہ اجارہ کے اصول سے بھی درست نہیں۔

(۳) کاریگر حضرات کا قیمتی جواہرات کے ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکرے کہ جو مارکیٹ میں متقوم ہے اور اس کی ایک حیثیت ہوتی ہے، بچا کر رکھنا درست نہیں، اگر مالک کو پتہ چلے تو اس پر وہ ضرور ناراضگی کا اظہار کرے تو یہ چوری شمار ہوگی، دلی رضامندی کے بغیر کسی کا مال لینا چوری میں داخل ہے: ''السرقۃ أخذ المال بغیر طیب نفس''۔

اگر متعین طور پر یہ بات معلوم ہو کہ یہ چوری کا مال ہے تو اس کا خریدنا جائز نہیں، اس لئے کہ حرام مال لینے والے کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتا اور اس میں اصل مالک کی ملک برقرار رہتی ہے۔

''المال الحرام لا یدخل فی ملک الآخذ یسیراً کان أم کثیراً وما دام أن المال الحرام لا یملکہ أخذہ ویبقی ھذا المال علی ملک صاحبہ۔

الأصل المقرر فی التشریع الاسلامی أنہ لایجوز المسلم أن یتصرف فی ملک غیرہ بغیرإذنہ، فإن تصرف فی ملک غیرہ بغیر إذنہ کان تصرفہ باطلًا وھو مضمون علیہ حتی یردہ إلی مالکہ وھذا الأصل یمتد حکمہ إلی المال الحرام۔

قال ابن رشد: لا یحل أن یشتریہ منہ إن کان عرضًا ولا یبایعہ فیہ إن کان عیناً، فمن علمت أنہ سرق مالًا أو خانہ فی أمانۃ أوغصبہ فأخذہ من المغصوب قھراً بغیر حق ولا ثمن مبیع ولا وفاءً عن قرض فإن ھذا عین مال المظلوم ومن فعل شیئا من ذلک وھوعالم سبیلہ سبیل الغاصب فی جمیع أحوالہ، فمن عاملہ بھذا المال إذا کان یعلم أن ہذا المال مصدرہ من کسب حرام وکان أربابہ فقد ثبت الحرام فی ذمتہ'' (احکام مال الحرام ۲۳۶)۔

عبارات کا حاصل یہ ہے کہ چوری کا مال مال حرام ہے، اس لئے اگر متعین طور پر چوری کا مال معلوم ہو تو اس کا خریدنا اور دیگر معاملہ کرنا جائز نہیں، خریدنے والے کے ذمہ بھی حرام رہے گا اور گناہ بھی ہوگا۔

اگر چوری اور درست (غیر چوری) دونوں قسم کا مال جمع ہے تو ایک قول کے مطابق غالب کونسا مال ہے وہ دیکھا جائے گا ، اگر غالب مال حرام ہے تو سارا مال حرام ہوگا اور غالب مال حلال ہے تو حلال شمار ہوگا۔

''والمال الحرام إذا اختلط بالمال الحلال فإن حكمہ حكم الغالب منها، فإن غلب الحرام حرم وإن غلب الحلال جاز مالم يتيقن إن ما يعاملہ بہ، فإن تيقن من المال الحرام حرم عليہ وهذا قول الحنفية وابن القاسم المالكية والحنابلة فی قول وشيخ الإسلام ابن تيمية''۔

قال السمرقندی من الحنفية :

''فإن كان غالب مالہ من حرام فلا ينبغی لہ ان يقبل مالم يخبره أن ذلک المال أصلہ حلال، فإن كان غالب مالہ حلالًا فلا بأس بأن يقبل مالم يتيقن عنده أنہ من حرام''۔

وقال ابن نجيم فی الأشباه والنظائر :

''إذا كان غالب مال المهدی حلال فلا بأس بقبول بعينہ مالم يتبين أنہ حرام فإن كان غالب مالہ الحرام لا يقبلها۔

قال مالک فيمن بيده مال حرام و حلال فإن كان ما بيده من الحرام شيئا يسيرا فی كثرة الحلال فلا بأس بمعاملتہ، وأما إن كان الحرام كثيراً فلا ينبغی معاملتہ''۔

وللدسوقی فی باب الغريم :

''اعلم أن أكثر مالہ حلال وأقلہ حرام المعتمد جواز معاملتہ''۔

دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ اگر دونوں مال یعنی حلال و حرام مخلوط ہو تو معاملہ کرنا اور بیع و شراء کرنا مکروہ ہوگا، یہ قول شافعیہ اور مالکیہ میں سے ابن وہب اور مذہب حنابلہ کا ایک قول ہے۔

القول الثانی

''يكره مبايعہ من كان فی مالہ حلال و حرام مختلط، والأولی للمسلم أن لا يعامل إنسانًا اختلط مالہ الحرام بما جاز من مال حرام وممن ذهب إلی هذا القول الشافعية وابن وهب من المالكية وهو أحد الأقوال فی مذهب الحنابلة''۔

دوسرے قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مخلوط صورت میں معاملہ کرنا مکروہ ہوگا اور بعض لوگوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے، اس لئے کہ کسی مال میں غالب اور مغلوب کا اعتبار اور اس کی حد متعین کرنا مشکل ہے۔

(۴) مال خریدنے کے بعد کسی وجہ سے شبہ پیدا ہوا کہ یہ مال چوری کا ہے تو بیچنے والے سے دریافت کر ے کہ یہ مال چوری کا تو نہیں؟ اگر مالک جواب میں کہے کہ نہیں یہ تو درست اور غیر چوری کا مال ہے۔

اب دیکھا جائے گا کہ مالک کی حالت مستور ہے اور اس مال کے حرام ہونے کا بظاہر کوئی قرینہ نہ ہو تو وہ درست ہوگا اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا بھی درست ہوگا۔

''فإن كان المسلم صاحب مال وكان حالہ مستورًا فلا شبهة فی معاملاتہ، ويقول شيخ الإسلام ابن تيميہ والأصل فيما بين المسلم أن يكون ملكا لہ إن ادعی ملكہ وأما المسلم المستور فلا شبهة فی معاملتہ اصلًا''۔

حاصل یہ کہ اگر مالک یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میرا مال ہے اور چوری کا نہیں ہے تو اس کی بات کا اعتبار ہوگا اور معاملہ کرنا درست ہوگا اور اس پر یہ نص بھی دلالت کرتی ہے۔

''إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولا يسأل عنه وإن سقاه شرابًا من شرابه فليشرب من شرابه ولا يسأل عنه۔

فيقاس على الطعام والشراب جواز معاملته بمال إذا لم يظهر ما يدخل على أنه مكسب من حرام''۔

دوسری بات یہ ہےکہ اگر کسب مال کے مصدرمیں شبہ پیدا ہوگیا تو دیکھا جائیگا کہ شک وجود حرام میں پیدا ہو اور وہ بھی کمزور ہے اور محض ایک اندازہ اور ظن کے درجہ میں ہے تو ایسے مال میں بھی معاملہ کرنا جائز ہوگا۔

''فإن وقع الشک فی مصدرکسب المال الذی یعامل بہ غیرہ بسبب نوع العمل أو المهنة التی یمارسها هذا المسلم، ففی هذه الحالة إما أن یکون الشک فی وجود الحرام ضعیفا لعدم قیام الإمارة القویة المؤیدة لوجود الحرام وإنما هو مجرد ظن و تخمین فهذا یجوز معاملته فی مالہ''۔

اگر شک قوی ہے اور قرائن سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے تو مسلمان کے حق میں احتیاط ہے، یعنی توقف سے کام لے اور کسی دوسرے مسلم دیندار سے اس کے بارے میں تحقیق کر کے اطمینان حاصل کرے، جیسا نبی کریم ﷺ پوچھ لیا کرتے تھے۔

''كان النبی ﷺ إذا أتی بطعام من غير أهله سأل عنه فإن قيل هدية أكل وإن قيل صدقة قال كلوا ولم يأكل''۔

اور اگر کسی سے سوال کرنا متعذر ہو اور اطمینان بخش جواب ممکن نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ معاملہ کرنے میں توقف کرے، یہاں تک کہ حلال و حرام کا پتہ چل جائے۔

''لقولہ علیہ السلام:دع ما یریبک إلی مالا یریبک، وروی عن رسول اللہ ﷺ أنہ وجد تمرة ساقطة فقال لولا أن تکون من الصدقة لأکلتها وهو من باب الورع'' (احکام مال الحرام ۲۶۵)۔

(۵) اگر بائع اور مشتری کے درمیان ایجاب وقبول ہوجائے اور مشتری سامان اپنے قبضہ میں لے لے، پھر مشتری وہ مال دوسرے کو نقد ثمن کے عوض فروخت کر دے تو یہ معاملہ مشتری کے لئے جائز اور درست ہوگا، اس لئے کہ شریعت میں معاملات دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک ادھار اور دوسرا نقد اور کسی بھی سامان کے مالک بننے کا مدار معاملہ کی تکمیل پر ہوتا ہے، اس لئے اگر بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ کی تکمیل ہوگی اور وہ معاملہ کسی ایسی شرط کے ساتھ معلق نہیں ہے جو اس کو پائے تکمیل تک پہنچانے سے روکے تو پہلا معاملہ جو بائع اور مشتری کے درمیان ہوا وہ درست ہو جاتا ہے، چاہے وہ نقد ہو یا ادھار، جب پہلا معاملہ درست ٹھہرا تو دوسرا معاملہ مشتری اول جو اب بائع کا درجہ رکھتا ہے اس کا دوسرے کو بیچنا بھی درست ہوگا، عرف و تعامل میں

زیادہ تر معاملات اسی طرح ہو رہے ہیں۔

‘‘قال القدوری: فإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع ویثبت الملک لکل منھا، وفیہ إشارۃ إلی أن البیع یتم بھما، ویجوز البیع بثمن حال و موجل إذا کان الأجل معلوماً’’ (قدوری شریف)۔

(۶) سامان کی قیمت دریافت کرنے والا اگر بائع کے ساتھ باقاعدہ سودا نہیں کرتا اور دوسرےکے ساتھ دریافت کی ہوئی قیمت سے زیادہ پر معاملہ کر لیتا ہے تو یہ معاملہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں جھوٹ ہے اور مشتری کے ساتھ سراسر دھوکہ ہے، اس لئے کہ یہ قیمت کا فرق نفع شمار نہ ہوگا۔

اگر قیمت دریافت کر کے معاملہ طے کر لیتا ہے، اگرچہ اس پر قبضہ کر کے سامان کو بائع کے پاس بطور امانت کے رکھ دیتا ہے تو پھر اس کا آگے زیادہ قیمت کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہوگا اور نفع بھی حلال ہوگا، کیونکہ یہ اپنی مملوک چیز کا نفع لینا ہوا۔

محور دوم:

(۱)خریدار نے اپنے ذمہ واجب الاداء رقم کی جو پرچی بائع کو دی وہ پرچی دلال کے ہاتھوں مقررہ قیمت سے کم قیمت میں نقد کے ذریعہ لینا درست نہیں، یہ معاملہ سودی ہے جو کسی حال میں جائز نہیں۔

فقہ البیوع میں ہے:

‘‘الکمبیالۃ وثیقۃ یکتبھا المشتری فی غالب الأحوال لصالح البائع فی بیع مؤجل، یعترف بھا أن الثمن وجب فی ذمتہ وأنہ یلزم أدائہ فی تاریخ آجل وإن حلول ھذا التاریخ الآجل یسمی فی الاصطلاح نضج الکمبیالۃ (Maturity) وإن البائع (حامل الکمبیالۃ) ربما یرید استعجال الحصول علی مبلغھا، فلا ینتظر إلی تاریخ نضبح الکمبیالۃ، بل یبیعھا إلی طرف ثالث والرائج فی السوق الرأسمالیۃ أن المشتری الکمبیالۃ یشتریہا بأقل من قیمتھا الاسمیۃ، والظاہر أن حسم الکمبیالۃ بھذا الطریق تعامل ربوی لا یجوز بحال’’ (فقہ البیوع)۔

حضرت مولا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

دس ہزار کی چٹھی سارے ساڑھے نو ہزار روپے میں خریدنا گویا روپیہ کا تبادلہ روپیے سے ہوا، ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار اور ایک طرف سے زیادہ اور دوسری طرف سے کم، یہ دونوں صورتیں ناجائز او رگناہ ہے اور سود میں داخل ہے، لہذا یہ صورت جائز نہیں ’’ (کتاب الفتاوی ۳۴۳٫۵)۔

بائع کچھ عرصہ کے بعد ملنے والی رقم کو کسی تیسرے کے ہاتھ کم قیمت پر نقد فروخت کر دیتا ہے، یہ معاملہ ‘‘ بیع الدین بغیر من علیہ الدین ’’ میں داخل ہو کر ناجائز ہے۔

جائز اور متبادل صورت:

متبادل اور جائز صورت یہ ہے کہ تاجر خریدار سے اپنا دین وصول کرنے کے لئے

تیسرے شخص کو اپنا دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور اس پر وکالت کی اجرت مقرر کر دے، پھر اس پرچی میں لکھی ہوئی رقم اس کے پاس سے قرض لے لے، اس صورت میں دونوں معاملات الگ الگ ہونگے: پہلا معاملہ متعین اجرت کے بدلہ میں وکیل بنانے کا ہوگا اور دوسرا معاملہ اس سے قرض لینے کا ہوگا، البتہ اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط اور مربوط نہ ہو، ورنہ ایک عقد میں دو معاملے کرنے کی خرابی لازم آتی ہے جو کہ شرعًا ناجائز ہے۔

(۲) بائع سے کوئی سامان خریدنے کے بعد اگر خریدار کسی وجہ سے قیمت کی ادائیگی کے موقف میں نہیں ہے تو اولًا کوشش اس بات کی کرے کہ کسی مسلمان سے بلا سودی قرضہ مل جائے، اگر بلا سودی قرضہ کوشش کرنے کے باوجود نہیں ملتا اور وقت مقررہ پر اگر قیمت ادا نہ کی گئی تو عزت کی پامالی کا خطرہ یقینی ہے تو اپنی عزت بچانے کے لئے بقدر ضرورت سودی قرض لے کر یا سود کی ادائیگی کی ذمہ داری لے کر اپنے آپ کو چھڑائے اور بچائے اور اس پر توبہ و استغفار بھی کرتا رہے۔

(۳) خریدار اگر بائع سے پانچ سو روپیے فی کیڑٹ کے حساب سے خریدنے کی بات کرتا ہے اور وہ اگلے شخص کو اس سے زیادہ مثلًا سات سو روپیے فی کیرٹ کے حساب سے فروخت کرتا ہے، اب وہ بائع کو پوری قیمت دینے کے بجائے یہ کہے کہ یہ مال پانچ سو روپیے فی کیرٹ کا نہیں تھا، اس لئے اس کی قیمت کم کرو، اگر خریدار کا یہ کہنا مبنی برحقیقت ہے اور اس پر کوئی قرینہ بھی ہے تب تو اس کا کہنا اور قیمت کم کروانا درست ہوگا، لیکن اگر خریدار بائع کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے اور اس پر دباؤ ڈال کر اس بات کا اقرار کرواتا ہے اور بائع بدرجۂ مجبوری ایسا کرنے پر آمدہ ہوتا ہے تو خریدار کے لئے ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں، یہ ایک قسم کا بائع کے ساتھ دھوکہ شمار ہوگا۔

(۴)اگر کوئی سامان عیب دار ہے، اس کے عیب کی مقدار کو بتانے اور بیان کرنے کی اجازت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''المسلم أخ المسلم لا یحل لمسلم باع أخیہ بیعا وفیہ عیب إلا بینہ لہ''، حاصل یہ کہ سامان میں جو عیب حقیقۃ ہو اور جس مقدار میں ہو اس کو بیان کر دینا ضروری ہے، عیب چھپا کر سامان کو بیچنا یہ ایک مسلمان کی شان کے خلاف اور دھوکہ ہے۔

البتہ اگر عیب بیان کرنے میں اس قدر مبالغہ کرنا، تاکہ بائع متأثر ہو کر کم قیمت پر راضی ہو جائے جائز نہیں، اور یہ ہی سامان جو اس کے نزدیک عیب دار تھا دوسرے کو اس کی مصنوعی تعریف کرکے فروخت کرنا جائز نہیں، یہ ایک طرح کا دھوکہ اور جھوٹ ہے، ''من غشنا فلیس منا''۔

مال کی بےجا تعریف کرنا یا عیب چھپانا یا جعلی اور نقلی مال کو اصلی ظاہر کر کے دھوکہ دے کر زیادہ رقم وصول کرنا گناہ عظیم ہے۔

وفی الدر : ‘‘لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام لقولہ علیہ السلام : من باع معیبا لم ینبہ لم یزل فی لعنت اللہ و یلعنہ الملائکۃ’’۔

(۵)ملاوٹ کے بارے میں اگر خریدار اور لوگوں کے درمیان یہ بات مشہور ومعروف ہو اور ہر ایک جانتا ہے کہ سستا مال ملاوٹ سے خالی نہیں ہوتا اور ملاوٹ کے بغیر مال اتنا سستا مل نہیں سکتا، تب تو اس کی گنجائش ہے۔

دوسری صورت میں اگر خریدار بلا ملاوٹ کے سستا مال چاہتا ہے تو اس کو بتانا ضروری ہے کہ سستے مال میں ملاوٹ ضرور ہوتی ہے، اس کو چھپانا جائز نہیں، بشرطیکہ یہ بات معروف نہ ہو۔

(۶) شریعت میں نفع کے بارے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ اس کو فطری اتار چڑھاؤ پر رکھا ہے، البتہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ طلب و رسد میں تناسب و توازن قائم رہے، تاکہ قیمت میں بھی توازن برقرار رہے ، البتہ کسی سامان پر اتنا زیادہ نفع لینا جو غبن فاحش کے زمرےمیں آتا ہو کراہت سے خالی نہیں۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

شریعت مقدسہ نے تجارت میں منافع حاصل کرنے کی کوئی خاص حد متعین نہیں کی کہ کوئی مال خرید کر آپ صرف اتنے فیصد نفع لے کر فروخت کر سکتے ہیں ، اس سے زیادہ نہیں، بلکہ اس کو عاقدین پر چھوڑا کہ وہ باہمی رضامندی سے جس طرح چاہیں معاملہ طے کرلیں، البتہ اس حد تک منافع لینا جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو یا لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا لازم آتا ہو خلاف مروت ہے۔

کتاب الفتاوی میں ہے :

‘‘شریعت میں نفع کے لئے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا، بلکہ یہ تاجرین کے عرف و رواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آ جائے مکروہ ہے اور غبن فاحش یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زیادہ سے زیادہ قیمت لگائی جاتی ہو اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے ’’ (کتاب الفتاوی ۲۱۳،۵)۔

کتاب النوازل میں ہے :

‘‘آپ اپنا مال جس قیمت پر چاہیں بیچ سکتے ہیں، شریعت میں اس کی کوئی قید نہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاجروں کے عرف کا لحاظ رکھا جائے، عام طور پر دوکاندار جس مال کو جس تناسب سے فروخت کرتے ہیں، اس کا لحاظ رکھا جائے اور عوام الناس کے ساتھ خیر خواہی کو مد نظر رکھتے ہوئے گراں قیمت پر فروخت کرنے سے احتراز کیا جائے ’’ (کتاب النوازل ۴۴۷،۱۰)۔

تمام فتاوی کا حاصل یہ ہے کہ نفع کی کوئی تحدید شرعا نہیں ہے، اس کو عرف

رواج پر چھوڑا ہے، بشرطیکہ اس سے دھوکہ نہ ہو، اس لئے قیمتی پتھرونکو جس قیمت پر فروخت کرنا چاہے گنجائش ہے۔

محور سوم:

(۱) بائع اور خریدار کے درمیان اگر یہ معاملہ موجل اور ادھار ہو اور اس میں ایک ماہ کی ادائیگی میں تیس فیصد ڈسکاونٹ کی شرط لگائی جائے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ دیون موجلہ میں کم کرنا اور ڈسکاونٹ دینا جائز نہیں، اس لئے کہ دین کا جو حصہ ڈسکاونٹ کی صورت میں معاف کیا جاتا ہے وہ مدت کے عوض ہوتا ہے اور اس میں ربو کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

''اگر مدت متعین ہو تو اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہوگاکہ جس پر دین واجب ہے وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الاداء دین کو کم کرا رہا ہے، اگر اصل معاملہ میں کوئی مدت ادائے دین کی متعین نہ ہو تو جائز ہے کہ یہ ایک طرح کا تبرع ہے'' (نئے مسائل ۲۰۸)۔

''ومما یتعامل بہ بعض التجار فی الدیون المؤجلۃ أنھم یسقطون حصۃ من الدین بشرط أن یعجل المدیون باقیہ قبل حلول الأجل، وھذا التعجیل إن کان مشروطاً بالوضع من الدین فإن المذاہب الأربعۃ متفقۃ علی عدم جوازہ، ھذا إذا کان البیع موجلًا، أما إذا کان البیع حالًا فلا بأس بالصلح علی بعض الدین تعامل التعجیل'' (فقہ البیوع ۵۲۶،۱)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں :

''دین موجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ چھوڑنا تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعًا دائن کچھ دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں''۔

علامہ جصاص فرماتے ہیں :

''جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ '' تم میرا دین جلد ادا کر دو میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا ''، بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلد ادا کر دے ''۔

قابل ترجیح بات:

اگر بائع نے خریدار کے ساتھ ادھار معاملہ کیا ہے اور بائع خریدار کے ساتھ ایک ماہ کی ادائیگی میں تیس فیصد ڈسکاونٹ کی بات بائع کی طرف سے ایک وعدہ ہے اور وہ

ایک جانب سے ہے اور یہ صلح نہیں ہے، جیسا سوال سے ظاہر ہے۔

البتہ اگر اس کو صلح قرار دیں تو موجل سے معجل کے ساتھ صلح کرنا ہوا اور دین میں کمی کرنے کو شرح کافی للاسبیجابی میں جائز لکھا ہے:

''وذکر فی شرح الکافی للاسبیجابی جواز هذا الصلح مطلقًا علی قیاس قول أبی یوسفؒ لأنه إحسان من المدیون فی القضاء بالتعجیل وإحسان من صاحب الدین فی الاقتضاء بحط بعض حقه''۔

شرح کافی میں اس صلح کو حضرت امام ابو یوسف کے قول کے مطابق جائز کہا ہے، کیونکہ مدیون نے جلدی دینے کا احسان کیا اور دائن نے وصولی میں اپنا بعض حق معاف کر کے احسان کیا۔

شرح عقود میں مذکور ہے کہ قضا والے معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتوی ہونا چاہیے، کیونکہ آپ قضا کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے معاملات کا تجربہ رکھتے تھے (شرح عقود،۲۹)۔

نیز دین ادا کرنے اور وصول کرتے وقت احسان کرنے کی فضیلت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے: ''قال وخیارکم من إذا کان علیه الدین أحسن القضاء وإن کان له أجمل فی الطلب'' (مشکوۃ شریف)۔

اس تجربہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر بائع خریدار سے ڈسکاونٹ کا وعدہ کرے اور خریدار اس وعدے کو نبھائے اور لوگوں میں اس طرح کا معاملہ کرنے کا عرف اور تعامل بھی ہو تو بائع کے لئے ڈسکاونٹ دینا درست ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ شرط نہ ہو، بلکہ وعدہ ہو، یعنی بائع وعدہ کرے کہ ان شاء اللہ اگر آپ نے ایک ماہ میں ادا کر دیا تو میرا وعدہ ہے کہ آپ کو تیس فیصد ڈسکاونٹ دونگا تو یہ درست ہے (فتاوی دار العلوم زکریا ۵،۵۰۵)۔

(۲) اگر خام مواد بنوانے والے (مستأجر) کا ہے اور کاریگر (اجیر) سے مطلوبہ چیز تیار کرواتا ہے اور کاریگر کو اس پر اس کی اجرت جو بھی ہو دیتا ہے تو یہ معاملہ اجارہ میں آتا ہے اور اس پر اجارہ کے احکام جاری ہونگے، اجارہ یعنی کسی شخص کی خدمات ایک متعین معاوضے کے بدلہ میں حاصل کی جائے اور یہ بنانے والا کاریگر اجیر مشترک کے درجہ میں ہوگاجس کو اپنے عمل کی اجرت ملنی چاہے۔

''یجوز إجارة الآدمی للخدمة أو لإجراء صنعه ببیان مدة أو بتعیین العمل بصورة أخری'' (شرح المجلة،۳۰۳)۔

''الأجیر المشترک یضمن الضرر والخسار الذی تولد عن فعله و صنعه إن کان بتعدیه أو لم یکن، إن الفقهاء قد استحسنوا بتضمین الأجیر المشترک ما هلک بعمله ولو بلا تعد وتقصیر صیانه لأموال الناس'' (شرح المجلة ۳۰۳)۔

اگر کاریگر مطلوبہ شئی تیار کر دیتا ہے اور مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جاتی

ہے اور اس کمی کو تاجروں کی عرف و عادت میں عیب اور ٹال مال سمجھا جاتا ہو اور اس سے قیمت میں بھی نقص آتا ہو تو کاریگر اس کا ضامن ہوگا۔

مگر حضرات فقہاء کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اجرت اور ضمان جمع نہیں ہوسکتے، اس لئے مستأجر اجیر کو ضامن نہ بناتے ہوئے اجرت نہ دے تو یہ درست ہے: ''الأجر والضمان لا یجتمعان۔

''ما إذا تجاوز المستآجر إلی ما فوق المشروط بوجہ یوجب الضمان فلا تلزمہ الأجرۃ، وکذا لا تلزمہ الأجرۃ فی المواضع التی یجب فیھا الضمان''۔

(۳) اگر تاجر لوگ کسی مصلحت سے ایسا قانون بناتے ہیں اور وہ قانون شریعت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف یعنی قرآن و حدیث کے خلاف نہیں اور اس سے لوگوں کو نقصان بھی نہیں ہے تو ایسا قانون بنانا اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

''المعروف بین التجار کالمشروط بینھم۔

مثلاً لو اشتری شیئًا من السوق بثمن معلوم ولم یصرحا بحلول ولا تأجیل وکان المتعارف فیما بینھم أن البائع یأخذ کل جمعۃ أوکل شھر جمیع الثمن أو بعضاً معیناً منہ انصرف إلیہ بلا بیان لأنہ حیث کان ذلک متعارفًا عند التجار فصار کأنھا قد اتفقا علیہ'' (شرح مجلہ)۔

(۴) فریقین اگر معاملہ اس طرح کرنے پر راضی ہیں اور ان کے عرف عادت میں شامل ہے اور فریقین میں سے کسی کو دھوکہ نہیں ہوتا تو یہ معاملہ جائز رہے گا، اس لئے کہ بیع نام ہے آپسی رضامندی کے ساتھ معاملہ کرنے کا، اور تجار کے عرف وعادت اور ان کی رضامندی کا شریعت نے اعتبار کیا ہے، بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہو اور کسی کے نقصان پر مشتمل نہ ہو: ''المعروف بین التجار کالمشروط بینھم''۔

(۵) جو ذرات اور ٹکرے زیور بنانے کے وقت نکل آتے ہیں اگر وہ متقوم ہے اور اس کی مالی حیثیت اور اس کا اعتبار ہے تو اس بچے ہوئے ذرات کو اپنے پاس رکھنا درست نہیں اور گھسائی کا جھوٹا بہانہ بنانا جائز نہیں، پہلے وہ ذرات اور ٹکروں کی مالکِ زیور کو خبر دی جائے، بعد میں مالک کو پورا اختیار رہے گا؛ چاہے وہ کاریگر کو دے یا نہ دے، کاریگر فقط اپنے مزدوری کا حقدار ہوگا۔

(۶) قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں، اگر وہ واقعۃً دس گرام ہیں تب تو کوئی مسئلہ نہیں، لیکن اگر کم ہے اور خریدار اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو، وہ دس گرام مانتا ہو، ایسی صورتِ حال میں تاجروں کے درمیان قیمت میں زیادہ فرق نہ پڑتا ہو اور لینے دینے والے اس حقیقت سے آگاہ بھی ہو اور اس سے دھوکہ بھی نہ ہو تو گنجائش ہے، لیکن اگر ایسا کرنے سے کسی فریق کو دھوکا ہو اور قیمت میں حد سے زیادہ تفاوت پڑتا ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں، جو حقیقۃ ہو اس کو بتانا ضروری ہے، اس لئے کہ کبھی چیز دیکھنے میں معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا مآل یعنی انجام اور

نتیجہ ضرر رساں ہوتا ہے۔

(۷) اگر یہ معاملہ بائع اور مشتری کے درمیان رضامندی کے ساتھ نہ ہوتا ہو اور بائع کو اس تاجر سےمجبوراً معاملہ کرنا پڑتا ہو تو یہ معاملہ جائز نہیں، اس لئے معاملہ ہمیشہ آپسی رضامندی کے ساتھ ہونا چاہیے، عقود میں جبر نہیں ہوتا، باہمی رضامندی ضروری ہے: ''إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم''، خلاصہ یہ کہ بائع کو تو کم قیمت دیکر دوسرے کے پاس سے پوری قیمت وصول کرنا درست نہیں۔

(۸) مال کو فروخت کرنے کے لئے لے جانے والا اگر غلط بیانی سے کام لیتا ہے جبکہ ایسا کوئی حادثہ حقیقۃً پیش نہیں آیا فقط جھوٹ اور تلبیس سے کام لیتا ہے اور بیچنے والا مجبورًا اس کو قبول کرتا ہے تو ایسی مجبوری کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں اور فروخت کنندہ جس نے غلط بیانی سے کام لیا وہ مال اس کے لئے حلال نہ ہوگا اور وہ گناہ کا مرتکب ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''من غشنا فليس منا'' (الحديث)۔

محور چہارم:

(۱) ایک مال کی دو طرح کی قیمت، یعنی نقد الگ اور ادھار الگ طے کرنا درست ہے، بشرطیکہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت قیمت متعین ہو جائے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

''ادھار خرید و فروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی ربا کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید و فروخت میں جو بھی قیمت ہو وہ مبیع یعنی خرید کردہ سامان کے مقابل ہوتی ہے، اس طرح ادھار خرید و فروخت کے مقابلہ میں طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے مقابلہ میں ہوتی ہے '' (دسواں فقہی سیمنار ممبئی)۔

اس لئے ڈائمنڈ کا مال نقد فروخت کرتے وقت ۸/۶ فیصد لیس (تخفیف) کرنا درست ہوگا۔

(۲) ادھاری معاملہ میں پیسوں کی فوری ضرورت پڑنے پر کچھ فیصد قیمت میں سے کم کرنا درست نہیں، اس لئے کہ یہ کمی اور تخفیف اجل کے مقابلہ میں ہوگی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

''اگر اصل معاملہ میں ادائے دین کی مدت معین ہو تو جس پر دین واجب ہے وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الاداء دین کو کم کر رہا ہے، تو اس طرح کا معاملہ جائز نہیں۔

اگر ادائے دین کی کوئی مدت معین نہ ہو تو یہ ایک طرح کا تبرع ہے جو جائز اور درست ہے'' (دسواں فقہی سمینار ممبئی)۔

مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں :

''ضع و تعجیل یعنی دیون میں سے کمی کرنے کی ممانعت صرف دیون موجلہ یعنی ادھار دیون میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد

کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے یا دائن کو فوری ضرورت ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصہ کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کر دے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱۱۳،۳)۔

(۳) بغیر سرٹیفکٹ کے صرف دیکھ کر خرید نے پر اکتفا کرنے کی نوبت آئے اور اس صورت میں بائع نے گھٹیا ڈائمنڈ کو اعلی کہہ کر بیچ دیا اور مشتری نے بائع کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو اعلی سمجھ کر خرید لیا، پھر رپورٹ نکالنے پر معلوم ہوا کہ ڈائمنڈ گھٹیا تھے تو بائع قیمت میں کمی کر وا سکتے ہیں یا نہیں یا بائع کو خیار فسخ حاصل ہوگا ؟

شریعت کی اصطلاح میں اس کو خیار مغبون اور تغریر کہتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ کے یہاں خیار مغبون مشروع ہے، یعنی اگر کسی شخص نے بیع کر لی اور بیع کے اندر دھوکہ ہوگیا، یعنی اگر بائع ہے تو کم قیمت پر بیچ دیا یا مشتری ہے تو زیادہ قیمت پر خرید لیا اور اس دھوکہ کی وجہ سے یہ کمی اور زیادتی ایک ثلث کی مقدار پہنچ گئی تو ان کو اختیار ہوگا؛ اگر وہ چاہے تو بیع کو فسخ کر دے۔

حضرت امام احمدؒ کا مسلک :

حضرت امام احمدؒ کے یہاں خیار مغبون اس شرط کے ساتھ ہے جب بائع اور مشتری مسترسل ہو، یعنی سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہو۔

خیار مغبون کے بارے میں احناف اور شوافع کا مسلک:

احناف اور شوافع کے یہاں خیار مغبون مشروع نہیں، مشتری کو ہوشیار رہنا چاہیے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اعلی اور گھٹیا کی اور اس کے بھاؤ کی تحقیق کرے اور پھر علی وجہ البصیرت بیع کرے، اگر اس نے بازار میں بھاؤ معلوم نہیں کیا اور بیع منعقد ہو گئی تو اب اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں، اگر بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ دھوکہ لگا ہے تو اپنے آپ کو ملامت کرے، کیونکہ دھوکہ خود اپنی بے عملی اور غفلت کی وجہ سے ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ خیار مغبون مشروع ہے، مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں، جبکہ احناف اور شوافع کے یہاں مشروع نہیں۔

متاخرین احناف اور خیار مغبون پر فتوی:

متأخرین احناف نے اس مسئلہ میں امام مالک کے قول پر فتوی دیا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ آج دھوکہ بازی بہت عام ہے، لہذا ایسی صورت میں مالکیہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے مغبون کو اختیار دیا جائے گا، کیونکہ دھوکہ اس کے کہنے کی بنیاد پر ہوا، ویسے ہی دھوکہ لگ گیا تو اور بات ہے، لیکن جب اس نے گھٹیا کو اعلی کہہ کر دھوکہ دیا، اس لئے دوسرے فریق کو اختیار دیا جائے گا اور فتوی بھی اس پر ہے۔

دکتور وہبہ زحیلی فرماتے ہیں :

‘‘أجاز الحنفیۃ ھذا الخیار وھو أن یغرر البائع المشتری أو علی العکس تغریراً قولیا وھو التغریر فی السعر أو تغریراً فعلیاً وھو التغریر فی الوصف إذا کان الغبن فاحشا۔

وحکمہ إعطاءالمغبون الحق فی فسخ العقد دفعاً للضرر عنہ’’ (الوجیز فی الفقہ الاسلامی ۲،۶۴)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مشتری کو بائع کے گھٹیا کو اعلی کہنے کی وجہ سے دھوکہ لگا ہے تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار رہے گا، لیکن بائع اگر بجائے فسخ کرنے کے قیمت کی کمی پر راضی ہو جائے تو کمی کروانا بھی درست ہوگا، بائع اگر خود اپنا حق ساقط کردے تو اس کو اختیار ہے، اگر بائع قیمت کی کمی پر راضی نہ ہو تو فقط اختیار دیا جا سکتا ہے بیع کو جاری رکھنے اور فسخ کرنے کا۔

(۴) اگر بائع نے مشتری کو ریڈل ڈائمنڈ کے بجائے C.V.D. ڈائمنڈ دے دیا اور رپورٹ نکالنے سے اس کا یہ دھوکہ ظاہر ہو گیا تو مشتری کو خیار فسخ ملے گا۔

‘‘قد أفتی المتأخرون من الحنفیۃ بإثبات الخیار لمن غبن فاحشاً بتغریر البائع، مثل أن یقول المشتری قیمتہ کذا فاشتراہ فظہر أقل فلہ الرد فأما إذا لم یغرر البائع فلا خیار لہ وبہ أفتی الصدر الشہید وکذلک یثبت الخیار للبائع المغرور، وراجع لہ الأشباہ والنظائر’’ (تکملہ فتح الملہم ۱،۳۸۰)۔

(۵) اگر مشتری کا بائع سے سودا مکمل ہو چکا ہے، اس کے بعد مشتری اور زید کے درمیان شرکت کی بات ہوتی ہے تب تو دونوں مشترک ہو جائینگے اور نفع میں بھی دونوں شریک ہونگے، سودا کی تکمیل سے مشتری اس چیز کا مالک بن چکا ہے، اب وہ جس قیمت پر چاہے شرکت کی دعوت دے۔

(۶) اگر ب نے ج کے ساتھ شرکت کا عقد کر لیا سوا دو لاکھ روپئے میں اور الف اور ب کے درمیان پہلے سودا کی تکمیل نہ ہوئی تھی، فقط بات چیت تھی تو اگر ب نے الف کے پاس سے ۲ لاکھ میں خریدا تو ج کے ساتھ شرکت دو لاکھ میں ہوگی، اس مسئلہ میں ج کو اصل قیمت بتانا ضروری ہے، کیونکہ ب مالک بنے بغیر ج کو شرکت کی دعوت دیتا ہے، جبکہ پہلے مسئلہ میں مشتری اس کا مالک بن چکا ہے، پھر شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے (ھذا ما عندی، واللہ اعلم بالصواب)۔

جواہرات کی خرید وفروخت سے متعلق نئے مسائل

مولانا عمر بن یوسف کوکنی•

محور اول:

(۱) بروکر کے لیے اپنی دلالی کی فیس:

بائع اور مشتری کے درمیان بروکرکی حیثیت ایک وکیل کی ہوتی ہے اور یقینادونوں کے درمیان ربط کے لیے اس کی محنت وکاوش کو ایک دخل ہوتا ہے ، لہذا بروکر اپنی محنت پر باہمی رضامندی سے ۴٪ فیصد یا اس جیسی متعین اجرت مقرر کرتا ہے تو یہ درست ہے اور وہ بائع ومشتری کے درمیان ربط کے بعد اپنی اجرت کا حقدار ہے۔

چنانچہ علامہ ماوردیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''قد ذكرنا أن الوكالة تجوز بجعل وبغير جعل ولا يصح الجعل إلا أن يكون معلومًا'' (الحاوی الکبیر (۲۲۴٫۸، ط: دار الفكر بيروت، نیز دیکھئے: روضۃ الطالبین ۵۶۰٫۳، ط: د ک ع)۔

مزید روشنی ڈالتے ہوئے علامہ محمد زحیلی کا بیان ہے :

''وتجوز الوكالة بأجر على العمل؛ لأن النبيﷺ وكّل السعاة في جمع الزكاة أعطاهم على ذلك أجراً مقابل عملهم'' (المعتمد في الفقه الشافعی ۳٫ ۳۴۹، ط: دار القلم دمشق)۔

بروکر کا عاقدین کو ایک قیمت پر آمادہ کرنا اور درمیانی فرق (رقم) اپنے لیے رکھنا:

بروکر اپنی کوشش سے بائع اور مشتری کو ایک قیمت پر آمادہ کرتا ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، عامتاً عاقدین بروکر کی اس چالاکی سے با خبر رہتے ہیں یا ابتداءً واقف نہ ہوں، لیکن اطلاع کے بعد عاقدین کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً رضامندی کا اظہار ہوتا ہے ؛ کیونکہ بروکر کے اس تصرف میں بائع کو اپنی منشا کے مطابق ثمن حاصل ہوا ہے اور مشتری بھی مناسب قیمت میں مبیع پر قادر ہوا ہے یعنی بظاہر دونوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا جو دونوں کے درمیان باعث نزاع ہو، اسی وجہ سے ایسے موقع پر بعد میں عاقدین عقد کو فسخ نہیں کرتے، بلکہ اس کو نافذ ہی کرتے ہیں؛ اس لیے دونوں کو ایک مناسب قیمت پر آمادہ کرکے ان کے درمیان مثلاً ۱۰٫ روپئے کا جو فرق ہوتا ہے وہ رقم بروکر کے لیے جائز ہے۔

اس درمیانی فرق کی رقم کا جواز اس وقت ہے جبکہ بائع نے ۷۵٫ روپئے میں بیچنے کی تعیین نہ کی ہو اور اس سے کم میں بیچنے سے منع نہ کیا ہو، جیسا کہ کوئی بائع

• جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن، رائے گڈھ، مہاراشٹر۔

اپنے وکیل سے کہے کہ یہ چیز ۶۵؍ روپئے میں فروخت کرو اور جو زیادہ ہو وہ آپ کے لیے، تو ایسی صورت میں اضافہ وکیل کے لیے مباح ہے، علامہ دکتور وھبہ زحیلیؒ کا کلام ملاحظہ ہو:

''ولا بأس أن یقول شخص لآخر بع ھذا الشئ بکذا وما زاد فھو لک أو بینی وبینک'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ۵؍۳۳۲۶، ط: دار الفکر دمشق)۔

البتہ بائع نے ۷۵؍ روپئے ہی میں بیچنے کی تعیین کی ہو تو اس سے کم میں فروخت کرکے زیادتی بروکر کے لیے رکھنا درست نہیں۔

علامہ خطیبؒ کا بیان ہے :

''وإن قال بع ھذا بمائۃ لم یبع بأقلّ منھا ولو یسیرًا وإن کان بثمن مثلہ لأنہ مخالف للإذن''(مغنی المحتاج ۲؍۲۸۳، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

(۲)بروکرکا دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع ہونا:

صحت عقد کے لیے بائع اور مشتری کا علیحدہ فرد ہونا ضروری ہے، ایک ہی فرد بائع بھی ہو اور مشتری بھی ہو تو یہ درست نہیں، جیسا کہ صورت مسئولہ میں بروکر کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی ہو رہی ہے، اور ایک ہی فرد (وکیل) مشتری وبائع نہیں ہو سکتا ۔

چنانچہ امام شافعیؒ رقمطراز ہیں:

''وإذا وکل الرجل الرجل أن یبتاع لہ طعامًا فابتاعہ ثم وکلہ أن یبیع لہ من غیرہ ... فھو جائز... وإن وکلہ أن یبیعہ من نفسہ لم یجز البیع من نفسہ''(کتاب الام۳؍۸۸، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

مزید علامہ محمد زحیلی نے اس طرح رشنی ڈالی ہے:

''...ولذلك لا یصح لشخص أن یتولی طرفی العقد، ولا یصح للوکیل أن یشتري لنفسه ما توکل فی بیعه ولا أن یبیع ما یملکه لمن وکّله بالشراء''(المعتمد فی الفقہ الشافعی۳؍۱۷)۔

لہذا دلاّل کا بائع سے خود ہی مال خرید کر خریدار کے ہاتھوں اس مال کو فروخ کرنا درست نہیں، مذکورہ صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''الوکیل بالبیع مطلقًا... أما ابنہ الصغیر فلا یصح البیع لہ مطلقًا وکذا لا یبیع من نفسہ علی الصحیح المعروف ... والوکیل بالشراء کالوکیل فی البیع فی أنہ لا یشتری من نفسہ'' (روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین ۳؍۵۳۸، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

نیز بائع کو ایک رقم پر آمادہ کرنے کے بعد حقیقی مشتری سے رابطے کے بجائے فرضی مشتری سے ملائے تو حقیقۃً یہاں مشتری موجود نہیں، بلکہ دلال خود ہی خرید کر رہا ہے، اس صورت میں بھی دلال کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر مشتری اور بائع کی ہو رہی ہے، لہذا گذشتہ تصریح کے پیش نظر درست نہیں۔

نیز صورت مذکورہ میں ایک قسم کی دھوکہ دہی بھی معلوم ہوتی ہے جو معاملات

میں ایک دوسرے کے ساتھ نصیحت کے تقاضہ کے خلاف ہے۔

(۳) مال مسروق کے ساتھ مخلوط مال کی خرید وفروخت کا حکم:

کاریگر حضرات جواہرات کے چھوٹے ٹکڑے مالک کے علم کے بغیر بچا لیتے ہیں، وہ سب کاریگر کی طرف سے غصب ہے، وہ ان ٹکڑوں کے مالک نہیں اور انھیں فروخت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں۔

چنانچہ شیخ الاسلام زکریا انصاری کا بیان ملاحظہ ہو:

''فبیع الفضولی وتصرفاتہ وتصرفات الغاصب أی کل منھما باطل لعدم ولایتھما علی المعقود علیہ'' (اسنی المطالب شرح روض الطالب ۲۴،۴، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

''لا طلاق إلا فیما تملک ولا عتق إلا فیما تملک ولا بیع إلا فیما تملک'' (سنن ابی داود، باب فی الطلاق قبل النکاح (ر: ۲۱۹۰)۔

اور غصب وچوری کے ایسے مال کو کوئی خریدے تو خریدار کی اس پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا خریدار ایسے مال کو خریدنے کے بعد بھی اس کا مالک نہیں ہوسکتا، چاہے مال کے مغصوب ہونے کا اسے علم نہ ہو، بلکہ اس مال کے حقیقی مالک کے لیے وہ ضامن ہوگا۔

علامہ نوویؒ کا چشم کشاں کلام ملاحظہ ہو:

''والأیدي المترتبۃ علی ید الغاصب أیدي ضمان وإن جھل صاحبھا الغصب'' (منہاج الطالبین،۲۹۱)۔

اور علامہ ابن حجر مکی ؒ کا بیان ہے:

''وعلی الغاصب الرد فورًا عند التمکن للمنقول'' (تحفۃ المحتاج مع الحواشی ۲۹۷،۷، نیز دیکھئے: المعتمد ۵۲۵،۳)۔

جس مارکیٹ میں چوری کا مال بھی ہو اور درست مال بھی تو مارکیٹ کے جو تجار چوری کا مال لیتے ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے درست مال سے اس چوری وغیرہ کے مال کو علیحدہ رکھیں، تاکہ خالص مملوکہ مال خریدنا ممکن ہو۔

جیسا کہ علامہ نووی ؒ فرماتے ہیں:

''ولو خلط المغصوب بغیرہ وأمکن التمییز لزمہ وإن شق'' (منہاج الطالبین،۲۹۵، ط: دار المنہاج)۔

لیکن یہ صورت حال بظاہر ہندوستان جیسے ممالک میں انتہائی مشکل ہے، کیونکہ یہاں اکثر معاشرت ومعاملات مسلم وغیر مسلمین کے درمیان مختلط رہتے ہیں اور مارکیٹ کے اکثر تجار چوری وغیرہ کا مال لینے اور اس سے نفع حاصل کرنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے، بلکہ زیادتیِ نفع اور فروغِ تجارت کے لیے ایسا کرنے کو مفید تصور کرتے

ہیں، ایسی صورت حال میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ مال چوری یا غصب وغیرہ ہی کا ہے تو ایسے مال کو خریدنا جائز نہیں۔

''یحرم مبایعة من یعلم أن جمیع ماله حرام لما روی أبو مسعود البدري ؓ أن النبي ﷺ ''نهی عن حلوان الکاهن ومهر البغيّ'' (صحیح مسلم، باب تحریم ثمن الکلب (ر: ۱۵۶۷)، کأن یکون جمیع ماله من ثمن بیع محرم... أو کان کسبه بطریق محرم کالیانصیب أو الرشوة أو الأجرة علی محرم، أو کان المال مغصوبًا، فإنه یحرم بیعه وأخذ الثمن منه، کما یحرم الشراء منه... لکن إن وقع العقد کان صحیحًا لتوافر أرکانه وشروطه مع التحریم، لأنه مشارکة له في الإثم والمعصیة، فإن کان المال مغصوبًا فالعقد باطل؛ لأن الغاصب باع مالا یملك'' (المعتمد۳،۶۷)۔

اور اگر کسی مال کے چوری یا غصب ہونے کا یقین نہ ہو، بلکہ درست مال کے ساتھ مختلط ہونے کا احتمال ہو تو خریدار کو چاہیے کہ ایسے مشتبہ مال سے قریب ہی نہ ہو اور حتی الامکان درست مال خریدنے کی فکر کرے؛ کیونکہ بیچنے والا مال مغصوب یا مسروق کا حقیقی مالک نہیں اور اس میں تصرف کا بھی اسے کوئی حق نہیں۔

چنانچہ علامہ خطیب شربینی ؒ تحریر فرماتے ہیں:

''وقال الزرکشي: إذا قلنا إنه کالتّالف ویملکه الغاصب فلا یتصرف فیه وهو محجور علیه فیه حتی یعطي المالك بدله'' (مغنی المحتاج۱،۳۶۲)۔

نیز حدیث ''إن الحلال بین وإن الحرام بین وبینهما مشتبهات ...'' (صحیح بخاری، باب فضل من استبرأ لدینه (ر: ۵۲) کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

تاہم درست مال کےساتھ چوری وغیرہ کا مال مخلوط ہو اور اصل مالک کا علم نہ ہو جیسا کہ سوالِ مذکور میں تصریح ہے تو بیچنے والے کو مالِ مسروق یا مغصوب کا ضامن قرار دیتے ہوئے اس کے پاس مال خریدنے کی گنجائش ہوگی۔

''أما إذا کان المال مختلطاً من حرام وحلال فلا تحرم مبایعته ولکن یکره التعامل معه للشبهة فیه'' (المعتمد فی الفقه الشافعی۳،۶۷)۔

مزید اس پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ نوویؒ رقمطراز ہیں:

''من ورث مالاً ولم یعلم من أین کسبه مورثه أمن حلال أم من حرام ولم تکن علامة فهو حلال بإجماع العلماء، فإن علم أن فیه حرامًا وشك في قدره أخرج قدر الحرام بالإجتهاد'' (المجموع شرح المهذب ۹،۴۲۸)۔

نیز مارکیٹ میں ایسے معاملات کا عموم بلوی ہو تو ایسے مال کی خریداری سے منع کرنے میں ایک قسم کی مشقت ہے، اس لیے رفعِ مشقت کی بنا پر بھی بدرجۂ مجبوری ایسے مخلوط مال کے خریدنے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

چنانچہ علامہ ابن حجر مکیؒ کا کلام ملاحظہ ہو:

‘‘وقد قال ابن عبدالسلام عقب قول الإمام وغيره: لو عمّ الحرام قطراً بحيث ندر وجود الحلال فيه جاز أخذ المحتاج إليه وإن لم يضطر ولا يتبسط’’ (تحفة المحتاج مع الحواشي ٣٦٣،٧، نیز دیکھیے: المجموع ٩، ٤١٧، مغنی المحتاج٢، ٣٩، الاشباہ والنظائر، ٧٥، ١٠٧)۔

(۴) چوری کا شبہ ہونے پر بیچنے والا چوری کا مال ہونے کی نفی کرے:

جب صاحب مال خود ہی چوری کا مال ہونے کی نفی کر رہا ہے اور اس کے خلاف خریدار کے پاس مال مسروق ہونے پر کوئی بیّنہ بھی نہیں ہے تو اصل چوری کا نہ ہونا ور مال میں خیانت کا نہ ہونا ہے ، لہذا مالک (بیچنے والے) کا قول اصل کے موافق ہے، اس لیے اس کا اعتبار ہوگا اور ایسے مال کا خریدنا جائز ہے۔

قاعدۃ: ‘‘الأصل العدم’’(الاشباہ والنظائر ١٢٧،١)۔

(۵) خریدے ہوئے سامان کی قیمت ادا کرنے سے پہلے زیادہ قیمت میں فروخت کرنا:

اگر زید نے بائع سے ادھار ثمن کے بدلہ میں سامان خریدا ہو جس کی بنا پر بائع کو قیمت ادا نہ کی ہو، لیکن زید نے مبیع پر قبضہ کر لیا ہو تو بظاہر بائع اور زید کے درمیان بیع مکمل ہوئی اور مبیع زید کی ملکیت میں داخل ہوگی؛ کیونکہ ثمن کی تاخیر انعقادِ عقد کے لیے مانع نہیں، لہذا مبیع کے قبضہ میں آنے کے بعد ادائیگی ثمن سے پہلے زید کسی اور شخص کے ہاتھ زیادہ قیمت میں فروخت کرے تو کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا، یہ بیع درست ہے اور جو زائد رقم ملی ہے وہ اس کا نفع ہے، اس کے لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

‘‘یشترط في المبیع أن یکون مملوکًا لمن یقع العقد لہ’’(المعتمد٢٧،٣، نیز دیکھئے: اسنی المطالب٢٣،٤)۔

نیز قیمت خرید سے زیادہ قیمت کے عوض بیچنے میں کوئی قباحت نہیں، جبکہ قیمت معلوم ومتعین ہو؛ کیونکہ یہ صورت بھی (أحل الله البیع) (سورۃ البقرہ: ٢٧٥) کے عموم میں داخل ہے، نیز حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ آپ ایسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے ۔

‘‘عن ابن عمر ؓ أن رجلًا باع من رجل سُرُجًا ولم ینقد ثمنہ، فأراد صاحب السرج الذی اشتراہ أن یبیعہ ، فأراد الذی باعہ أن یأخذ بدون ما باعہ منہ فسُأل عن ذلك ابن عمر ، فلم یر بہ بأسًا، وقال ابن عمر:‘‘فلعلہ لو باعہ من غیرہ باعہ بذلك الثمن أو أنقص’’ (سنن بیہقی باب الرجل یبیع الشئی إلی أجل ثم یشتریہ بأقل (ر: ١٠٨٠٢)۔

(۶) مبیع پر قبضہ سے پہلے کسی دوسرے سے اس کا معاملہ طے کرنا:

صورت مسئولہ کے مطابق جو سامان دوسرے شخص کو فروخت کر رہا ہے وہ سامان ابھی معاملہ طے کرنے والے نے خریدا ہی نہیں اور وہ اس کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوا تو کیسے وہ کسی دوسرے سے اس کا معاملہ طے کر سکتا ہے...؟ کیونکہ جس سامان کو بیچنے جا رہے ہیں عقد کے وقت اس پر ولایت ہونا ضروری ہے۔

‘‘الشرط الثالث:الولاية للعاقد على المعقود عليه بملك أو نيابة أو ولاية’’ (اسنى المطالب ۲۳،۴)۔

بلکہ بائع سے سامان خریدنے کے بعد اگر مشتری نے اس پر قبضہ نہ کیا ہو تو قبل القبض اس سامان کو بیچنا جائز نہیں؛ کیونکہ مبیع کی تسلیم پر اسے قدرت نہیں... تو بیع سے پہلے ہی اس سامان کا کسی دوسرے کے ہاتھ معاملہ کرنا بدرجۂ اولی جائز نہیں ہوگا۔

چنانچہ حدیث ابن عباسؓ میں ہے:

‘‘من ابتاع طعامًا فلا يبعه حتى يقبضه’’ (صحيح مسلم: باب بطلان بيع المبيع قبل القبض (ر: ۱۵۲۵)۔

نیز بائع کو تسلیم مبیع ممکن نہ ہو، لیکن مشتری تسلّم (قبضہ کرنے) پر قادر ہو تو اس صورت میں بھی بیع درست ہوتی ہے، یہاں صورت مسئولہ میں مشتری کو تسلّم پر بھی قدرت نہیں؛ کیونکہ وہ سامان فی الحال معاملہ طے کرنے والے کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوا ہے، لہذا گر مشتری کسی سامان کی قیمت دریافت کرکے اسے خرید نہ کرے تو خریدنے سے پہلے اس سامان کا کسی اور سے معاملہ طے کرنا درست نہیں۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری کا بیان ہے:

‘‘الشرط الرابع: القدرة على التسلّم للمعقود عليه حسًّا أو شرعًا ليوثق بحصول العوض وليخرج عن بيع الغرر المنهي عنه في خبر مسلم’’ (اسنى المطالب ۲۶،۴)۔

محور دوم:

(۱) دلال کا نقد کم رقم ادا کرکے پرچی کی زائد رقم خریدار سے وصول کرنا:

خریدار کی جانب سے جو نقد رقم دلال ادا کر رہا ہے وہ دلّال کی طرف سے خریدار کے لیے قرض کے مشابہ ہے اور وقت آنے پر ادا کردہ رقم سے زائد یعنی پرچی کی مکمل رقم وصول کرتا ہے، یہ بظاہر قرض پر نفع حاصل کرنے کی صورت معلوم ہوتی ہے، لہذا دلال کے لیے ادا کردہ رقم سے زائد رقم حاصل کرنا درست نہیں؛ کیونکہ زائد رقم وصول کرنا دلال کی طرف سے زیادتی کے ساتھ قرض لوٹانے کی شرط کے مشابہ ہے۔

‘‘إذا اشترط المقرض رد زيادة على قدر القرض أو شرط رد الصحيح عن المكسر أو الجيد عن الردئ أو شرط منفعة فيفسد العقد بذلك على الصحيح؛ لأنه يحرم كل قرض جر منفعة لشبهه بالربا؛ لقولهﷺ ‘‘كل قرض جر منفعة فهو ربا’’ (سنن بيهقى، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا (ر: ۱۰۹۳۳، المعتمد۱۷۳،۳)۔

اگر صورت مسئولہ میندلال کی طرف سے زیادتی کے ساتھ قرض لوٹانے کی شرط نہ ہو، لیکن ایسے معاملات میں اس قسم کا عرف رائج ہو تو کم از کم مکروہ ضرور ہے۔

‘‘فإذا جرى العرف برد الزيادة أو تقديم المنفعة فيكره تقديم الزيادة ويكره قبولها’’ (حوالہ

سابق۳،۱۷۲)۔

چونکہ زائد رقم وصول کرنے میں سود ہونے کا احتمال ہے، اس لیے اس صورت کا عدم جواز ہی احوط ہے، علامہ ماوردیؒ کا بیان ہے:

‘‘والتنزه عن قبول الهدية من المقترض أولى في جميع الحالات’’ (دیکھئے: الحاوی الکبیر۵،۳۵۸، الغرر البہیۃ ۳،۷۱)۔

اور علامہ خطیب شربینی ؒ تحریر فرماتے ہیں:

‘‘إذا قال شخص لغيره اقترض لي مائة ولك على عشرة فهو قرض وجعالة صحيحان، فلو اقترضه من ماله لم يستحق العشرة’’ (مغنی المحتاج۲،۱۵۱، المعتمد۳،۱۷۴)۔

(۲) سودی قرض لینا:

سودی قرض لینا جائز نہیں، قرآن وحدیث کے دلائلِ صریحہ سے سود کے لین دین کی حرمت وشناعت بالکل واضح ہے؛ اس لیے تجارت میں ایسی صورت اختیار کرے جس سے سودی لین دین کے لیے مجبور نہ ہو، تاہم کسی جائز حاجت کی وجہ سے دین کا بوجھ بڑھ گیا اور اس کی ادائیگی دشوار ہو، نیز بائع کا اصرار ناقابل تحمل ہو تو حفظ عزت کی خاطر بدرجہ مجبوری سودی قرض حاصل کرکے دین ادا کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے، البتہ ارتکاب معصیت کا استحضار کرتے ہوئے توبہ و استغفار بھی کرے اور جلد از جلد سودی قرض ادا کرکے بری الذمہ ہونے کی بھی فکر کرے، سوال مذکور کے مطابق خود ہی سودی قرض لینے کی صورت دوسری صورت کے مقابلہ میں اھون معلوم ہوتی ہے۔

‘‘وفی الأشباه لابن نُجيم ومثله فی المنثور للزركشی :ما حرُم أخذه حرُم اعطاءه كالربا..... إلا فی مسائلَ فی الرشوة لخوف على نفسه..... وينبغی أن يكون مثله إعطاء الربا للضرورة، فيأثم المقرض دون المقترض’’ (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ۶،۱۶۶)۔

(۳) مال کی قیمت طے پانے کے بعدقیمت میں کمی کرنا:

پانچ سو روپئے فی کیرٹ مال خریدنے کی بات طے کرنے میں صرف بات چیت (مساومہ) کی حد تک ہی معاملہ ہوا ہو ، با ضابطہ بیع نہ ہوئی ہو اور اس سے پہلے ہی سات سو روپئے کے حساب سے کسی دوسرے کو فروخت کرے تو مال کا مالک بننے سے پہلے ہی بیع لازم آرہی ہے تو یقیناً اس طرح فروخت کرنا درست نہیں، جیسا کہ محور اول کے سوال ۶ میں گزرا۔

اور اگر پانچ سو میں خریدنے کی بات مساومہ کی حد تک نہ ہو، بلکہ دونوں کے درمیان حقیقۃً بیع ہو تو پانچ سو روپئے فی کیرٹ مبیع کا ثمن طے پایا ہے اور عقد اس ثمن پر لازم ہوا ہے، لہذا مقررہ ثمن یہ بائع کا حق ہے اور بائع نقد مقررہ ثمن پر قبضہ سے پہلے مبیع سپرد کرنے سے انکار کر سکتا ہے اور مقررہ نقد ثمن ادا کرنے سے پہلے خریدار اس میں اصل بائع کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔

‘‘(للمشترى قبض المبيع) استقلالًا (إن كان الثمن مؤجلًا أو سلّمه وإلا) أى وإن كان حالًا ولم يسلمه كله أو بعضه (فلا يستقل به) بل لابد من إذن البائع فيه لأن حق الحبس ثابت له، فإن استقل به لزمه رده ولا ينفذ تصرفه فيه’’ (مغنى المحتاج ٢،٥٤٠)۔

البتہ ایک متعین ثمن پر عقد طے ہونے کے بعد خریدار ثمن میں کمی کا مطالبہ کرے اور بائع اس کے لیے راضی ہو، نیز خریدار جس نقصان کی خبر دے رہا ہے بائع اس میں اس کی تصدیق کرے تو یہ درست ہے۔

‘‘ولو زعم أنه مائة وعشرة وصدقه المشترى فى ذلك، لم يصح البيع فى الأصح. قلت ‘‘الأصح’’ صحته كما لو غلط المشترى بالزيادة’’ (مغنى المحتاج٢،١٠٠)۔

اور اگر واقعۃً مبیع میں عیب تھا اور عقد کے وقت مشتری کو عیب پر مطلع کرنے میں بائع نے کوتاہی کی تو ایسی صورت میں بائع کو مشتری کا مطالبہ پورا کرنا چاہیے، یعنی پانچ سو روپئے فی کیرٹ کے بجائے چار سو روپئے فی کیرٹ پر آمادہ ہونا چاہیے۔

علامہ خطیبؒ تحریر فرماتے ہیں:

‘‘من علم في السلعة عيباً لم يحل له أن يبيعها حتى يبينه حذرًا من الغش لخبر الشيخين ‘‘من غشّنا فليس منّا’’ فيجب على البائع أن يعلم المشترى بالعيب... سواء اكان المشترى مسلمًا أم كافرًا، لأنه من باب النصح، وكالعيب في ذلك كل ما يكون تدليسًا’’ (مغنى المحتاج٢،٧٩)۔

(۴) دوسرے کا مال عیب دار ظاہر کرنا اور اپنے سامان کی تعریف کرنا:

سوا ل میں مذکور صورت اپنے مفاد کےلیے دوسرے کو نقصان میں مبتلا کرنے کی معلوم ہو رہی ہے، یہ سراسر تقاضۂ نصیحت کے خلاف ہے اور اپنے ساتھی کو دھوکہ دینے کے زیادہ قریب ہے، لہذا یہ عمل درست نہیں، تاہم کوئی ایسی صورت میں بیع کرے تو نفس بیع تو درست ہوگی، حدیث مینہے:

‘‘من غشّنا فليس منّا’’ (صحيح مسلم، باب قول النبىﷺ : من غشنا فليس منا (ر: ١٠١)۔

‘‘لأن التغرير لا يمنع الصحة كما لو رُوّج عليه معيبًا’’ (مغنى المحتاج٢،٩٩)۔

(۵)ملاوٹ شدہ مال بیچنا:

مال میں ملاوٹ سے اس کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہو تو ملاوٹ ایسا عیب ہے جس پر مشتری کو اطلاع ہو تو خیار رد مبیع حاصل ہوگا۔

‘‘كل ما ينقص العين أو القيمة نقصًا يفوت به غرض صحيح إذا غلب في جنس المبيع عدمه سواء قارن العقد أم حدث قبل القبض’’ (منهاج الطالبين على هامش المغنى٢،٦٤)۔

اگر مال بنانے والا تاجر کو ملاوٹ کی خبر دیتا ہے، پھر بھی تاجر کہے مجھے سستا مال چاہیے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو تاجر مبیع کے عیب پر مطلع ہونے کے بعد بھی اس کے خریدنے کے لیے تیار ہے، یہ خریدار کی طرف سے رضامندی کی علامت ہے، لہذا ایسی صورت میں ملاوٹ والے مال کی خرید وفروخت درست ہوگی؛ کیونکہ عیب

دار مبیع کی بیع تو درست ہے اور عیب پر مطلع ہونے کے بعد مشتری کو رد کا اختیار ہے، رد کرنا ضروری نہیں، تو مشتری عیب دار مبیع رکھنے پر راضی ہو تو بائع کی طرف سے کوئی دھوکہ نہیں۔

''للمشتری الخیار بظهور عیب قدیم'' (حوالہ سابق۲،۶۳)۔

اور اگر بائع نے عیب پر مطلع نہیں کیا تو بائع کی تقصیر ہے، نفس بیع تو درست ہوگی، البتہ مشتری کو خیار رہے گا۔

چنانچہ علامہ خطیبؒ ''رد بالعیب علی الفور'' کی علت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ولأن الأصل في البیع اللزوم والجواز عارض، ولأنه خیار ثبت بالشرع لدفع الضرر عن المال فکان فوریًا کالشفعة فیبطل بالتاخیر بغیر عذر'' (مغنی المحتاج۲،۷۱)۔

(۶) قیمتی پتھروں کی قیمت مقرر کرنا:

صورت مسئولہ کی بنیاد حکم تسعیر پر معلوم ہوتی ہے اور ''تسعیر '' ایک مختلف فیہ حکم ہے۔

حضرات شوافع کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حاکمِ وقت تجار کے سامان کی کوئی قیمت محدود ومقرر نہیں کر سکتا۔

چنانچہ شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کا بیان ہے :

''ویحرم التسعیر بأن یأمر الوالی السوقة أن لا یبیعوا امتعتهم إلا بسعر کذا ولو في وقت الغلاء للتضییق علی الناس في أموالهم'' (اسنی المطالب۴،۹۳)۔

جیسا کہ ایک مرتبہ رسول اللہﷺ کے زمانہ میں دام بڑھ گئے تو صحابہ کرام نے نبی کریمﷺ سے دام مقرر کرنے کی درخواست کی تو رسول اللہﷺ نے فرمایا:

''إن اللّٰہ هو المسعّر القابض الباسط الرازق وإنی لأرجو أن ألقی ربّي ولیس أحد منکم یطلبنی بمظلمة فی دم ولا مال'' (سنن ابی داود، باب فی التسعیر (ر: ۳۴۵۱)۔

اس حدیث کے ظاہر سے دلالت ہوتی ہے کہ اصل تو عدم تسعیر ہے اور تجار اپنے سامان کو اپنی مرضی کے مطابق مناسب قیمتوں میں فروخت کر سکتے ہیں ۔

جیسا کہ ایک اور حدیث میں ہے :

''دعوا الناس یرزق الله بعضهم من بعض'' (صحیح مسلم، باب تحریم بیع الحاضر للبادی (ر: ۱۵۲۲)۔

لیکن بسا اوقات تجار کی طرف سے اپنے سامان کی حد سے زیادہ قیمتیں عامۃ الناس کے لیے یقیناً ضرر اور مشقت کا سبب ہوتی ہیں، ایسے وقت میں مصلحتِ عامہ اور لوگوں سے دفع ضرر کی خاطر ارباب حل ونظر اور ماہرین اقتصادیات کی طرف سے

سامان کی مناسب قیمت مقرر کی جائے جس میں مصالحِ عاقدین کی بھی رعایت ہو تو حرج معلوم نہیں ہوتا، نیز ایسی تحدید قیمت حدیث میں وارد ممنوعہ تسعیر میں داخل نہیں ہوگی (ان شاء اللہ) ۔

چنانچہ دکتور وھبہ زحیلیؒ رقمطراز ہیں:

‘‘ولا يجبر الناس على البيع وإنما يمنعون من البيع بغير السعر الذي يحدّده الإمام على حسب ما يرى من المصلحة فيه للبائع والمبتاع ولا يمنع البائع ربحاً ولا يسوغ له منه ما يضر بالناس... وليس في التسعير مخالفة لنص الحديث السابق...” (الفقہ الاسلامی وادلتہ۴؍۲۲۹۶، وما بعدہا)۔

محور سوم:

(۱)ایک ماہ کی مدت میں قیمت کی ادائیگی پر قیمت میں ڈسکاونٹ دینا:

صورت مسئولہ میں بائع کے ڈسکاونٹ کے وعدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بائع ایک ماہ کی مدت میں ادائیگی ۷۰؍ہزار روپئے اور نہ ادا کرنے پر ایک لاکھ روپئے قیمت مقرر کر رہا ہے، یعنی نقد فروختگی میں قیمت کم کر رہا ہے ادھار فروختگی کے مقابلہ میں تو عقد کے وقت یہی خریدار نقد (ایک ماہ میں) یا ادھار میں سے کسی ایک قیمت پر معاملہ طے کرے تو عقد میں ثمن متعین ہو جاتا ہے، اس لیے یہ معاملہ درست ہوگا، اور اگر عقد کے وقت میں کسی ایک قیمت پر معاملہ طے نہ ہو، بلکہ دونوں کا اختیار رہے تو ایسی صورت میں عقد کے وقت ثمن متعین نہیں ہو رہا ہے، اس لیے یہ معاملہ درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ عقد میں ثمن معلوم ومتعین ہونا شرط ہے۔

‘‘أن يبيعه إياه أى العبد بألف نقدًا أو بألفين نسيئة ليأخذ بأيهما شاء هو أو البائع... والبطلان في ذلك للجهل بالعوض” (اسنی المطالب ۳؍۷۴، نیز دیکھئے: المہذب مع المجموع ۱۰؍۳۶۹)۔

ادھار فروختگی میں قیمت زیادہ مقرر کرنے کو سود نہیں کہا جاسکتا ؛ کیونکہ ‘‘اجل” کو معاملات میں بڑا دخل ہے اور ثمن کا ایک حصہ اجل کے مقابل ہوتا ہے، علامہ خطیبؒ کا بیان ہے :

‘‘وليصدق البائع في قدر الثمن والأجل... لأن الأجل يقابله قسط حق الثمن” (مغنی المحتاج۲؍۹۹)۔

‘‘ولا يؤثر في بيع الأجل أن يكون الثمن أكثر من الثمن المعجل” (المعتمد ۳؍۳۸)۔

(الف، ب ،ج):

مذکورہ مسئلہ کی بنیاد ثمن کے متعین ہونے نہ ہونے پر رکھی جائے تو تینوں صورتوں میں حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا، البتہ نقد ثمن (ایک ماہ) کے عوض معاملہ طے ہوا ہو اور ایک ماہ میں ثمن ادا نہ کرنے کی وجہ سے ۳۰؍ فیصد کا اضافہ کرے تو یہ

اضافہ درست نہیں ہونا چاہیے ؛ کیونکہ ثمن کے متعین ہونے کے بعد تاخیر (اجل) کی وجہ سے زیادتی میں سود کا شبہ ہے۔

''فدعوا الربا والريبة'' (سنن ابن ماجہ، باب التغليظ فی الربا (ر: ۲۲۷۶)۔

(۲) Reject کیے ہوئے مال کے بنانے کی اجرت نہ دینا:

بعض اشیاء کی منفعت کو مدة (زمانہ) اور عمل دونوں کے ذریعہ متعین کیا جا سکتا ہے تو وہاں دونوں میں سے کسی ایک کے ذریعۂ منفعت کو متعین کرنا ضروری ہے، جیسے کاریگر کے عمل (منفعت) کو زمانہ اور عمل دونوں کے ذریعہ متعین کر سکتے ہیں تو کسی ایک سے ہی متعین ہونی چاہیے، البتہ اگر کاریگر کی محنت کو عمل کے ساتھ متعین کرنے کا قصد ہو اور تعجیل کے لیے زمانہ کی بھی قید لگائے تو دونوں سے تعیین درست ہے۔

''فلو جمع بينهما كأن اكترى شخصًا لخياطة ثوب بياض النهار... لم يصح للغرر... نعم إن قصد التقدير بالعمل وذكر اليوم للتعجيل فينبغی أن يصح'' (اسنی المطالب ۴۰۰٫۵)۔

اگر تاجر کاریگر سے مخصوص نوعیت کا مال بنانے کی شرط لگائے یا مخصوص نوعیت کا صراحۃً ذکر نہ کرے، لیکن وہاں ایک خاص نوعیت سے عمل کا عرف ہو اور کاریگر کی شرط کے مطابق یا عرف کے مطابق مقررہ معیار میں کمی رکھی ہو تو مطلوبہ شرط یا عرف کے مطابق عمل نہ ہونے کی وجہ سے کاریگر اجرت کا مستحق نہیں قرار پائے گا؛ کیونکہ اس میں لوگوں کی اغراض مختلف ہوتی ہیں، تو معیار کی کمی کاریگر کی کوتاہی سمجھی جائے گی، چنانچہ اجارہ کے ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ خطیبؒ کا بیان ہے :

''ويقدر تعليم القرآن بمدة أو تعيين سور... افهم كلام المصنف أنه لا يشترط أن يبين قراءة نافع ونحوه إذ الأمر فيها قريب، وقضيته أن يعلمه ما شاء من القراءات لكن قال الماوردي والروياني تفريعًا على ذالك يعلّمه الأغلب من قراءة البلد ... فإن عين له قراءة تعينت، فإن أقرءه غيرها لم يستحق أجرة في أحد وجهين يظهر ترجيحه'' (مغنی المحتاج ۴۲۱٫۲)۔

''ولو أعطاه ثوبًا ليخيطه فخاطه قباء وقال امرتنی بقطعه قباء فقال بل قميصًا فالأظهر تصديق المالك بيمينه، ولا أجرة عليه أی المالك للخياط إذا حلف المالك؛ لأن عمل الخياط صار حينئذ غير مأذون فيه'' (مغنی المحتاج۴۳۸٫۲)۔

لہذا ٹال یعنی Reject کیے ہوئے مال کی اجرت نہ دینے کا عرف ہو تو عرف کا لحاظ کرتے ہوئے بنوانے والے کا یہ عمل درست معلوم ہوتا ہے۔

تنبیہ:

لیکن تاجر جب اسے قبول کر رہا ہے اور مناسب دام میں فروخت بھی کر رہا ہے تو عیب دار مال میں یہ تصرف رضامندی پر دلالت کرتا ہے، لہذا کاریگر کو اس کے عمل

کے مطابق اجرت مثل دینے میں زیادہ قباحت معلوم نہیں ہوتی ، تاکہ کاریگر اپنی اجرت عمل سے بالکلیہ محروم نہ ہو۔

(۳) قانونی مصلحت کے تحت حقیقی قیمت کے بجائے کم قیمت درج کرنا:

عقد کے وقت مبیع کا ثمن متعین ہونا ضروری ہے، لہذا عاقدین کی رضامندی سے ایک ثمن متعین ہو اور قانونی مصلحت کے تحت حقیقی ثمن کے علاوہ کا اظہار کرے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو یہ عمل جائز ہونا چاہیے۔

چنانچہ علامہ نووی ؒ کے کلام سے اس پر روشنی حاصل کی جا سکتی ہے:

''بيع التلجئة، صورته أن يخاف غصب ماله أو الإكراه على بيعه فيبيعه لإنسان بيعًا مطلقًا، وقد توافقا قبله على أنه لدفع الشر لا على حقيقة البيع والصحيح صحته'' (روضۃ الطالبین۳،۲۳)۔

(۴) ایکسپورٹ میں اصل قیمت کے بجائے دس فیصد قیمت ہی لکھنا:

اگر عاقدین کے درمیان باہمی رضامندی سے ایک ثمن متعین ہو پھر ایکسپورٹ میں دس فیصد قیمت ہی کا اظہار کرے تو ما قبل کی ۳ کی طرح اس صورت کے جائز ہونے میں حرج معلوم نہیں ہوتا۔

(۵) جواہرات کی ڈھلائی میں جدا ہونے والے ذرات کاریگر کے لیے رکھنا کیسا ہے؟

جواہرات سے الگ ہونے والے ذرات اگر کچھ قیمت رکھتے ہیں اور ان سے کسی بھی ذریعہ فائدہ حاصل کرنا ممکن ہے تو ذرات بھی اصلاً مالک جواہرات کی ملکیت ہیں، اور دوسرے کی مملوکہ چیز کو ناحق لینا چاہے کم ہو یا زیادہ یہ غصب ہے، لہذا یہ ذرات بچا کر رکھنا اور ان سے فائدہ حاصل کرنا کاریگر کے لیے جائز نہیں۔

''قال الماوردي: الغصب منع الإنسان حق ملكه والتصرف فيه بغير استحقاق'' (حاشیۃ المحقق علی الروضۃ۴،۹۲)۔

(۶) قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لیے لگائے جانے والے دھاگوں کا حکم:

قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لیے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں ان کی مقدار میں اختلاف ہونے کی صورت میں بائع جو مقدار بیان کر رہا ہے اگر خریدار اسے قبول کرے تو ٹھیک ہے، ورنہ دونوں ایک متعین مقدار پر راضی ہو جائیں، جیسا کہ خریدار کی بات پر بائع معاملہ طے کرتا ہے تو یہ درست ہے؛ کیونکہ خریدار کے انکار پر بائع کو اس کا قول قبول کرنا ضروری نہیں، نیز عرف میں متعین مقدار پر عاقدین کی رضامندی ہو جاتی ہے۔

''إذا اختلفا في قدر الثمن أو جنسه أو صفته ... فإن كان لأحدهما بينة قضى بها... وإلا توقفنا إلى ظهور الحال وإن لم تكن بينة تخالف'' (روضۃ الطالبین۳،۲۳۰)۔

(۷) ایک قیراط پانچ سینٹ کے مال کی پرچی ایک قیراط مال پر بنانا:

مال کے مقابلے میں جو قیمت ادا کی جاتی ہے وہ عقد میں ثمن کہلاتی ہے، اب جس عوض کو ثمن بنایا جا رہا ہے اس کی صفت ومقدار کا معلوم ومتعین ہونا ضروری ہے۔

''ویشترط في الثمن أن یکون نقدًا وأن یکون معلوم القدر'' (المعتمد۳،۲۳)۔

لہذا اگر ثمن متعین ہے اور بیع کی دیگر شرائط پائی جا رہی ہیں تو نفس بیع تو درست ہوگی، یہ اور بات ہے کہ خریدار کا اپنے بائع کے ساتھ کم قیمت اور اپنے مشتری کے ساتھ زیادہ قیمت کی صورت اختیار کرنا خیر خواہی وہمدردی کے جذبہ کے خلاف ہے، حالانکہ معاملات میں سماحۃ ونصیحت مطلوب ہے، جیسا کہ حدیث جابرؓ میں نبی کریمﷺ کا فرمان ہے:

''رحم اللہ رجلًا سمحا إذا باع وإذا اشتری وإذا قضی وإذا اقتضی'' (صحیح بخاری، باب السہولۃ والسماحۃ فی الشراء والبیع (ر: ۲۰۷۶)۔

(۸) خدا ناترس حضرات کا غلط بیانی سے کام لینا:

اگر یہ شخص واقعۃً دھوکہ دے کر قیمت کم کرنے پر مجبور کرتا ہے اور مال والا اپنے اختیار سے قیمت کم کرتا ہے تو دیگر شرائط بیع کے پائے جانے کی وجہ سے نفس بیع درست ہوگی، لیکن اس میں دھوکہ دے کر باطل طریقہ پر اپنے بھائی کا مال کھانا لازم آرہا ہے، اس لیےاس شخص کے لیے یہ مال حلال نہیں ہوگا۔

چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ہے :

''یاأیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل...'' (سورۃ النساء: ۲۹)۔

اور ایک حدیث میں ہے :

''عن ابن عمرؓ أن النبيﷺ نھی عن النجش'' (صحیح بخاری، باب النجش (ر: ۲۱۴۲)۔

''أرأیتك إن منع اللہ الثمرۃ بم تستحلّ مال أخیك'' (صحیح مسلم، باب وضع الجوائح، رقم: ۱۵۵۵)۔

نیز معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ نصیحت اور نہایت سچائی کا طریقہ اختیار کرنا مطلوب ہے اور اس سے معاملات میں برکت ہوتی ہے اور اس قسم کی دھوکہ دہی بے برکتی کا سبب ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم بن حزامؓ کی حدیث میں ہے :

''إن النبيﷺ قال :البیّعان بالخیار ما لم یتفرقا، فإن صدقا وبیّنا بورك لھما في بیعھما وإن کذبا وکتما محقت برکۃ بیعھما'' (صحیح مسلم، باب الصدق فی البیع والبیان، رقم: ۱۵۳۲)۔

محور چہارم:

(۱)ادھار فروختگی کے مقابلے نقد قیمت میں تخفیف کرنا:

ادھار قیمت کے مقابلہ میں نقد قیمت ادا کرنے میں ۶؍ یا ۸؍ فیصد لیس (تخفیف) کرنا

درست ہے، جیسا کہ (محور سوم ۱کے تحت) اس کی وضاحت گزر چکی۔

(۲) ادھار قیمت میں فروخت کرنے کے بعد جلدی قیمت وصول کرنے میں تخفیف:

دو ماہ کی ادھاری پر زائد قیمت میں مال فروخت کیا، لیکن ایک ماہ کے بعد مقررہ قیمت میں تخفیف کرکے وصول کرنا چاہے تو بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا ۔

‘‘ولو صالح من عشرة حالّة على خمسة مؤجلة برئ من خمسة وبقيت خمسة حالّةً؛ لأنه سامح بحط البعض ووعد بتأجيل الباقي، والوعد لا يلزم والحط صحيح. ولو عكس بأن صالح من عشرة مؤجلة على خمسة حالّة لغا الصلح ؛ لأن صفة الحلول لا يصح إلحاقها والخمسة الأخرى إنما تركها في مقابلة ذلك فإن لم يحصل الحلول لا يصح الترك” (مغنی المحتاج ۲۲۲،۲)۔

نیز دکتور وھبہ زحیلیؒ کا عمدہ کلام ملاحظہ ہو:

‘‘قاعدة (ضع وتعجل) إن أخذ مال من المقترض مقابلَ تعجيل بقية القرض بالنص على ذلك في عقد القرض حرام أيضًا عند أئمة المذاهب الأربعة، لأن نقص ما في الذمة لتعجيل الدفع شبيه بالزيادة؛ لأن المعطيَ جعل للزمان مقدارًا من الثمن بدلًا منه ” (الفقه الاسلامی وأدلتہ ۳۷۲۶،۵، نیز دیکھیے : الموسوعة الفقهية الكويتيہ ۳۹،۲)۔

(۳) اعلی کہہ کر فروخت کیے ہوئے ڈائمنڈ کا گھٹیا ہونا ظاہر ہوجائے:

صورت مسئولہ کے مطابق مشتری نے بجائے بائع پر اعتماد کرتے ہوئے اعلی سمجھ کر Diamond خریدا پھر وہ گھٹیا نکلا تو مشتری کو طے شدہ قیمت میں کمی کروانے کا حق ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ جو عیب ظاہر ہوا وہ ایسا مخفی ونازک ہے کہ ماہرین ہی اس پر مطلع ہو سکتے ہیں اور مشتری سے وہ مخفی رہ سکتا ہے، اس لیے ابتداءً مشتری نے مبیع پر رضامندی کا اظہار بھی کیا ہو تو وہ معتبر نہیں اور مشتری کو عیب کی بنا پر خیارِ رد حاصل ہوگا۔

‘‘ولو شرط البراءة عن عيب عينه فإن كان مما لا يعاين كزنا أو سرقة أو إباق برئ منه لأن ذكرها إعلام بها، وإن كان مما يعاين كبرص فإن أراه إياه فكذلك وإلا فلا يبرأ منه لتفاوت الأغراض...يؤخذ من هذا رد ما أفتى به بعضهم في بائع أقبضه المشترى الثمن وقال له استنقده فإن فيه زيفا فقال البائع: رضيت بزيفه فظهر فيه زيف بأنه لا رد له به، ووجه رده أن الزيف لا يعرف قدره في الدرهم بمجرد مشاهدته فلم يؤثر الرضا به” (حاشیۃ الجمل مع شرح المنہج۴۸۸،۴)۔

(۴) ریئل بول کر خریدے ہوئے ڈائمنڈ CVD ڈائمنڈ نکلے:

ریئل ڈائمنڈ اور CVD ڈائمنڈ کا فرق ایسا ہے جس سے قیمت مختلف ہوتی ہے اور اس میں اغراض بھی بدلتی رہتی ہیں اور وہ عیب جس سے عین یا قیمت میں ایسا نقص پیدا ہو جس سے غرض صحیح فوت ہو تو ایسے عیب کی بنا پر مشتری کو خیار حاصل ہوتا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں جب الف کے سامنے مبیع کا عیب ظاہر ہو تو اسے لوٹانے کا

حق حاصل ہے۔

‘‘للمشترى الخيار بظهور عيب... كل ما ينقص العين أو القيمة نقصًا يفوت به غرض صحيح إذا غلب في جنس المبيع عدمه’’ (منہاج الطالبین۲؍۶۴)۔

(۵) خریدی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت بتلا کر اس مبیع میں کسی دوسرے کو شریک کرنا:

صورت مسئولہ کو بیع اشراک کی صورت مانیں تو بیع اشراک میں بیع تولیہ کی طرح ثمن اول پر عقد مقصود ہوتا ہے۔

‘‘إذ خاصة التولية وإن كانت بيعًا جديدًا التنزيل على الثمن الأول’’ (تحفۃ المحتاج مع الحواشی۴؍۴۷۱)۔

لہذا اگر خریدار زید کو خریدے ہوئے ڈائمنڈ میں شریک کرنا چاہتا ہے تو ثمن اول پر یہ معاملہ کرنا ہوگا، ثمن اول ہے ۲؍ لاکھ روپئے، ۲؍ لاکھ ثمن میں زید کو نصف ڈائمنڈ میں شریک کرنا چاہے تو زید اصل خریدار کو ۱؍ لاکھ روپئے ادا کرے تو نصف میں شریک ہوگا، اور وہ ڈائمنڈ دونوں کے درمیان مشترک ہوگا، اور سوا دو لاکھ چونکہ ثمن اول نہیں ہے، لہذا اس قیمت میں یہ اشراک بظاہر درست نہیں ۔

‘‘والإشتراك هو أن يقول المشترى كمن مرّ فى التولية اشركتك في المبيع وهو بيع فتترتب عليه أحكامه فإن صرح بالمناصفة أو غيرها من الكسور... صح، قال الإمام وغيره ولابد في الإشراك من ذكر البيع بأن يقول أشركتك في بيع هذا أو في هذا العقد، ولا يكفى أن يقول أشركتك في هذا... وقوله أشركتك بالنصف أو مناصفة يقتضى أنه باعه النصف بنصف الثمن’’ (اسنی المطالب۴؍۲۲۹، نیز دیکھئے: تحفۃ المحتاج مع الحواشی ۴؍۲۷۲)۔

(۶) کم قیمت میں ڈائمنڈ خریدکر اس سے زیادہ قیمت میں کسی دوسرے کو شریک کرنا:

بندہ کی ناقص رائے میں نتیجہ کے اعتبار سے یہ صورت ما قبل کے ۵ کے مشابہ معلوم ہوتی ہے، یعنی یہ بھی ‘‘بیع اشراک ’’ کی صورت ہے، لہذا اس میں بیع اول کے ثمن ۲؍ لاکھ میں ج کو شریک کرنا درست ہے اور اپنی طرف سے ثمن میں زیادتی کرکے سوا دو لاکھ میں ج کو شریک کرنا درست نہیں۔

ہیرے جواہرات کی خریدوفروخت کے اہم مسائل

مفتی عبد المنان قاسمی•

اللہ تعالی نے انسان سے دنیا میں بہت ضرورتیں متعلق رکھی ہیں، وہیں اس میں ایک جذبہ زیبائش وآرائش بھی رکھا گیا ہے، اس جذبہ کی تسکین کے لئے انسان نت نئے ڈیزائن کے لباس تیار کرتا ہے، بالوں کی تراش وخراش کرتا ہے ، رقت پیدا کرنے والے مواد سے بھی استفادہ کرتا ہے، لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ وہ قدرتی پتھروں، دھاتوں اور مصنوعی اشیاء کے زیورات کے ذریعہ سے بھی اپنے آپ کو سنوارتا ہے، اسی جذبۂ حسن آرائی نے ان پتھروں کو جن سے نہ انسان کا پیٹ بھر سکتا ہے نہ جسم کی سترپوشی ہوسکتی ہے، لوگوں کے لئے مرعوب بنادیا ہے اور مہنگی قیمتوں میں ان کی خریدوفروخت ہوتی ہے۔

جواہرات کی تراش وخراش، زیورات کی بناوٹ اور ان کی خرید وفروخت میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کام کرتی ہے اور معاشی اعتبار سے بھی یہ ان کے لئے ایک نفع بخش کاروبار ہے، اس پس منظر میں چند سوالات کےجوابات ذیل میں مذکور ہیں:

محور اول:

۱۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بائع مثلاً سو روپے میں بیچنا چاہتا ہے، خریدار ۷۵ روپے میں خریدنا چاہتا ہے اور بروکر کوشش کرکے خریدار کو ۷۵ روپے پر اور بیچنے والے کو ۶۵ روپے میں بیچنے پر تیار کرلیتا ہے، دونوں میں دس روپے کا جو فرق ہوتا ہے، وہ بروکر بائع اور مشتری کو نہیں بتاتا ہے، خود رکھ لیتا ہے، جبکہ اس کو دلالی کی فیس ۴ فیصد الگ سے ملتی ہے۔ اب چونکہ بائع اپنا سامان ۶۵ روپے میں بیچنے پر راضی ہے، اور بروکر خریدار سے جتنا میں فروخت کرے وہ بائع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا بروکر دس روپے رکھ لیتا ہے، یہ اس کے لئے جائز ہوگا اس شرط کے ساتھ کہ سامان پر خود قبضہ کرکے پھر مشتری سے فروخت کرے۔

۲۔ اس صورت میں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع جس قیمت پر تیار ہوا دلال خود اس قیمت میں وہ مال خرید لیتا ہے، اور خریدار جس قیمت پر تیار ہوا تھا، اس قیمت پر اس کو فروخت کردیتا ہے، گویا اس کی حیثیت دلالی سے ہٹ کر بائع اور مشتری کی ہوجاتی ہے اور یہ بات اس کی اختیار میں ہوتی ہے کہ وہ ۴ فیصد اپنی فیس نہ لے یہ

• دار الحدیث پرمائی ویٹی، نوگاؤں، آسام۔

صورت جائز ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلال نے بائع کو ساٹھ روپے میں بیچنے پر تیار کرلیا اور خریدار تیار کیا جو ستر روپے میں خریدنے پر آمادہ تھا، لیکن دلال نے بائع سے حقیقی مشتری کو ملانے کے بجائے ایک فرضی خریدار تیار کرکے اسے بائع کی بات کرادی اور جب وہ چیز ۶۰ روپے میں حاصل ہوگئی تو خریدار سے ۷۰ روپے میں فروخت کیا اور دس روپے کا فائدہ خود رکھ لیا، نیز ایسے معاملات میں بعض دفعہ بروکر چار فیصد دلالی فیس اس فرضی خریدار کو دے دیتا ہے اس صورت میں فرضی خریدار دلال کا دلال ہوا، لہذا اس کو دلالی کا چار فیصد مل گیا، پہلے دلال اگر قبضہ کرکے فروخت کرے تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ اصل بائع کے سامنے خریدار متعین نہیں ہے اور دلال قبضہ کرکے دے تو کوئی شبہ نہیں رہتا، لیکن اصل بائع سے فرضی مشتری کو ملا دینا یہ دھوکہ دہی کی صورت ہے، ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، لہذا اس کے لئے یہ کراہت سے خالی نہیں۔

۳۔ کاریگر حضرات قیمتی جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مالک کے علم واطلاع کے بغیر بچالیتے ہیں او راس طرح کا مال ایک خاص مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا ہے جس میں چوری کا مال بھی ملتا ہے اور درست مال بھی، چوری کا مال اور مالک کی اجازت کے بغیر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ لیتا ہے وہ بھی چوری ہی کا ہے، لہذا جان بوجھ کر ایسا مال خریدنا جائز نہیں ہوگا، اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ چوری کا نہیں درست مال ہے تو اس کو خریدنا جائز ہوگا۔

۴۔ زید نے ایک شخص سے اس کا لایا ہوا مال خریدا، کسی وجہ سے اس کو شبہ ہوا کہ یہ مال چوری کا ہے اس نے بیچنے والے سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ مال چوری کا نہیں ہے، جبکہ چوری کا مال ہونے کی یقینی کوئی ثبوت نہیں، نیز مالک مال بھی یقین دہانی کررہا ہے کہ یہ چوری کا مال نہیں ہے، صرف شبہ سے چوری کا مال نہیں کہا جاسکتا ہے، لہذا یہ مال خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ شبہات سے پرہیز کرے تو نہ خریدے ''اتقوا من مواضع الشبہات'' کی وجہ سے۔

۵۔ زید نے ایک شخص سے اپنا خریدا ہوا مال قبضہ میں لے لیا ہے، ابھی قیمت ادا نہیں کی اور اگلے شخص سے زیادہ قیمت میں فروخت کردیا اور جو پیسے آگئے اس میں سے جس شخص سے ادھار خریدا تھا اس کو پیسہ ادا کردیا اور پیسہ بچ گیا اس کو اپنے نفع کے طور پر رکھ لیا، چونکہ مال اس نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور پیسہ اس کے ذمہ ادھار تھا بعد میں ادا کردیا، لہذا صورت جائز ہونا چاہئے۔

۶۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک بائع سے کس متعینہ سامان کی قیمت دریافت کی، ابھی خریدوفروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا، نہ اس شخص کا اس چیز پر قبضہ حاصل ہوا، البتہ وہ دوسرے شخص سے جو اس طرح کا سامان خریدنا چاہتا ہے، معاملہ

طے کرلیتا ہے اور اس سے زیادہ قیمت طے ہوتی ہے، اب وہ سابق شخص سے سامان حاصل کرکے اپنے خریدار کو فروخت کرتا ہے اور دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کو اپنا نفع تصور کرتا ہے، چونکہ یہاں نہ بیع طے ہوئی اور نہ قبضہ ہوا، لہذا وہ دوسرے کے ساتھ اس کو بیچ نہیں سکتا اور نفع بھی حلال نہیں ہوگا، ''نہی النبیﷺ عن البیع قبل القبض''۔

محور دوم:

۱۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار نے اپنے ذمہ واجب الاداء رقم کی جو پرچی بائع کو دی، دلال وہ پرچی بائع سے نقد پیسہ دے کر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کرلیتا ہے اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے حاصل کرتا ہے، یہ روپے کو کمی بیشی کے ساتھ خرید فروخت ہورہا ہے، یہ سود ہوگا، لہذا جائز نہیں ہے، یہ پرچی چیک کے حکم میں ہے۔

۲۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع سے ایک سامان خریدا، قیمت کی ادائیگی کا مقررہ وقت پورا ہوگیا، خریدار سامان فروخت نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے قیمت ادا کرنے کے موقف میں نہیں ہے، اب یا تو بائع کی اصرار کی وجہ وہ خود سودی قرض لے کر اپنی عزت بچانے کے لئے پیسہ حاصل کرتا ہے یا اپنے کسی دوسرے ساتھی سے کہتا ہے کہ تم سودی قرض لے کر بائع کا پیسہ ادا کردو، تم کو جو سود دینا پڑے گا وہ میں ادا کردونگا تو اس مقصد کے لئے سودی قرض لینا یا دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز نہیں ہوگا، یا تو سامان واپس کردے یا مہلت لے لے، یہ دونوں صورتوں میں کوئی ایک ممکن نہ ہو اور مجبوری کی حالت ہو تو اجبار کی حالت کا تجزیہ وتحقیق کرکے مقامی مفتی کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں، کبھی سود دینے کی مجبوری ہو تو خفت کا حکم ہوسکتا ہے۔

۳۔ ایک صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ پانچ سو روپے کیرٹ کے حساب سے مال خریدنے کی بات طے ہوتی ہے اور اگلے شخص کو سات روپے کے حساب سے فروخت کرنے کی بات طے کرتا ہے، نیز پہلے شخص سے مال لے کر دوسرے شخص سے مال فروخت کرکے اس سے قیمت وصول کرتا ہے، اب وہ بیچنے والے کو پوری قیمت ادا کرنے کے بجائے اسے کہتا ہے کہ یہ مال پانچ سو روپے فی کیرٹ کا نہیں تھا، اس لئے اس کی قیمت کم کرو، مثلاً اسے چار سو روپے فی کیرٹ پر آمادہ کرلیتا ہے، یہ صورت جائز نہیں، یا تو وہ سامان واپس کردے یا پوری طے شدہ قیمت ادا کریں۔

۴۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مال خریدتے ہوئے اس مال کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ بیچنے والا کم سے کم قیمت پر راضی ہوجائے، لیکن اسی مال کو بیچنے کے وقت ڈھیر ساری تعریفیں کرتا ہے تو اس میں پہلی

صورت میں بائع کو دھوکہ میں ڈالنا ہے اور دوسری صورت میں جھوٹ بولنا یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

۵۔ اس مال کی تیاری میں کافی ملاوٹ کی گنجائش ہوتی ہے، مال تیار کرانے والا کہتا ہے کہ مجھے سستا مال چاہئے، لہذا مال تیار کرنے والا شیشے کو شامل کرتے ہوئے مال بناتا ہے یا مونگ ڈالتے ہوئے مال تیار کرتا ہے، پھر مال بنانے والا اس مال کو تاجر کے ہاتھ بیچتا ہے، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ تاجر کو بتا دیا جائے کہ مال میں ملاوٹ ہے، لیکن اس نے کہا کہ مجھے سستا مال چاہئے ملاوٹ رہنے یا نہ رہنے سے مجھے غرض نہیں، دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو عیب سے مطلع بھی نہیں کیا گیا، ایسی صورت میں سستا مال تیار کرنے کا رواج وعرف ہو تو ویسا ہی تیار کرے، چاہئے وہ رواج ملاوٹ کا ہو یا اور کوئی صورت، تو یہ بلا بیان کئے ملاوٹ کو صرف سستا مال کہہ کر فروخت کرے تو جائز ہوگا۔

۶۔ قیمتی پتھروں کی تجارت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز ایک روپیہ میں فروخت کی جاسکتی ہے اور ایک ہزار روپے میں بھی، شرعاً نفع کی کوئی تحدید نہیں، لیکن غبن فاحش کی حد تک پہنچنا مناسب نہیں ہے، ''نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع الغرر''۔

محور سوم:

۱۔ بیع میں مثلاً مبیع کی قیمت ایک لاکھ مقرر کی گئی ہے بائع نے تیس فیصد ڈسکاؤنٹ کا وعدہ کیا؛ بشرطیکہ ایک ماہ میں قیمت ادا کردی جائے اب اگر ایک ماہ میں ادا نہیں کی گئی تو اس کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف: معاملہ طے پاتے وقت ہی خریدار کے سامنے یہ بات رکھ دی گئی تھی۔

ب: یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی مگر مارکیٹ کا چلن یہی ہے۔

ج: نہ یہ شرط پے پائی اور نہ ہی اس قسم کا عرف ہے۔

بائع کو اپنے سامان فروخت کرتے وقت ڈسکاؤنٹ دینا یا نہ دینا اس کی اختیار کی بات ہے، ڈسکاؤنٹ طے ہو یا نہ ہو یا مارکیٹ میں اگر چلن نہ بھی ہو یا اس قسم کا عرف بھی نہ ہو، تب بھی بائع کو ڈسکاؤنٹ دینے کا اختیار ہے، ناجائز ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ کاریگر مطلوبہ شئی تیار کرکے دیتا ہے لیکن مقررہ معیار میں کچھ کمی رہ جاتی ہے، بنوانے والا اس شئی کو حاصل کرلیتا ہےاور اسے فروخت بھی کرتا ہے، لیکن کاریگر کو اس کی کوئی اجرت ادا نہیں کرتا، اس کو تاجروں کی اصطلاح میں ''ٹال '' کہتے ہیں یعنی (Reject)کیا ہوا مال، اگر مارکیٹ میں یہ طریقہ معروف ومروج ہے، جبکہ مقررہ معیار میں کمی رہ جانا بنوانے والا کو معلوم ہے، اسی وجہ سے بنانے کی کوئی اجرت نہیں دیتا، چونکہ مارکیٹ میں یہ مروج ومعروف بھی ہے، لہذا یہ ناجائز نہیں ہونا چاہئے، جبکہ

دونوں کو معلوم ہے یہ تعاطی کی صورت بھی ہوسکتی ہے۔

۳۔ قانونی مصلحت کے تحت عام طور پر قیمت درج کرتے ہوئے ایک زیرو کم کردیا جاتا ہے، جیسے ۳۰۰۰ (تین ہزار) ہے تو ۳۰۰ (تین سو) لکھا جاتا ہے، تاجر بھی اپنی یادداشت میں تین سو ہی لکھتا ہے، لیکن فریقین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد تین ہزار ہے، جبکہ بائع ومشتری کو معلوم ہے، نیز بائع ومشتری جس قیمت پر بھی راضی ہو وہ بیع درست ہے، اگر نہ بھی لکھا ہو پھر بھی دونوں کی رضامندی جس قیمت پر ہو وہ درست ہوگی (نوٹ: قانونی مصلحت کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے جواب ہے)۔

۴۔ ایکسپورٹ میں اصل قیمت کے بجائے مثلاً دس فیصد قیمت ہی لکھی جاتی ہے جو بینک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، بقیہ رقم کسی اور طریقہ سے وصول کی جاتی ہے، لیکن یہ فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے، اگر بائع ومشتری دونوں راضی ہو تو جائز ہوگا (نوٹ: اگر انکم ٹیکس سے بچنا مقصود ہو جو قانونا جرم ہے تو پھر مسئلہ عزت کا ہوسکتا ہے)۔

۵۔ کاریگر جب جواہرات کو زیور وغیرہ کے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو کچھ ذرات اور ٹکڑے نکل آتے ہیں، یہ کاریگر کے پاس ہی رہ جاتے ہیں، زیور بنوانے والے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتنی مقدار گھسائی میں چلی گئی، یہ بچے ہوئے ذرات کاریگر کے لئے جائز نہیں ہونگے۔

۶۔ قیمتی پتھروں کی آرائشی چیزوں کے لئے جو دھاگے لگائے جاتے ہیں، بازار میں ان کا وزن دس گرام مانا جاتا ہے، دس گرام سے زیادہ جو وزن ہوگا وہ پتھر کا ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دھاگے آٹھ گرام کے ہوتے ہیں اور خریدنے والا تاجر کو بتایا جاتا ہے، لیکن وہ اس کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور اس کا وزن دس گرام ہی مانتا ہے، گویا دوگرام پتھر بھی دھاگوں کے ریٹ میں فروخت ہوتا ہے، اب خریدار اگر اس کو دس یا آٹھ گرام ہونے کے باوجود اس کو مان کر خرید لیتا ہے، تو چونکہ مارکیٹ میں یہ دس گرام مانا جاتا ہے، لہذا عرف بن چکا ہے، عرف ورواج ہونے کی وجہ سے خریدار کے لئے جائز ہوگا، لیکن بائع یعنی کاریگر کے لئے آٹھ گرام دے کر دس گرام کا پیسہ لینا درست نہیں ہوگا، چونکہ خریدار مجبور ہے، لیکن کاریگر مجبور نہیں۔

۷۔ بعض دفعہ ایک مال مثلاً ایک قیراط پانچ سنٹ کا ہوتا ہے، لیکن خریدنے والا تاجر ایک قیراط مال پر اس کی پرچی بناتا ہے، پانچ سنٹ کی قیمت ادا نہیں کرتا، البتہ چونکہ پہلے بائع کے لئے صرف ایک قیراط کی قیمت کی پرچی لکھی گئی، اس لئے وہ مجبوراً اس پر راضی ہو، لیکن خود وہ جب کسی اور سے اس مال کو فروخت کرتا ہے تو پورے ایک قیراط پانچ سنٹ کی قیمت لگاتا ہے، بائع جب مان رہا ہے چاہے مجبورا ہو تو کراہت کے ساتھ بیع درست ہوگی: ''یجوز للبائع أن یزید فی المبیع شیئاً''، اور تاجر جب فروخت کرتا ہے خریدار اس کو مان رہا ہے تو یہ بیع بھی درست رہے گی، چونکہ پہلی

صورت میں پانچ سنٹ اس کی طرف سے چھوٹ دیا جارہا ہے، اگر وہ نہیں مانے گا تو بیع نہیں ہوگی، جب مان لیا تو بیع ہوگی، لیکن دوسری صورت میں برابر کا حساب ہے، لہذا یہ بلا کراہت درست ہے۔

۸۔ بعض دفعہ ایک شخص مختلف لوگوں سے مال لے کر باہر چلا جاتا ہے، تاکہ اسے فروخت کرے، اب خدا ناترس حضرات غلط بیانی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ مال ڈوب گیا، لہذا اب ۲۵ فیصد قیمت لے لو اور بیچنے والا اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، کیونکہ لکھی ہوئی قیمت اسے بہت کم ہوتی ہے ایک زیرو کم کرنے کی وجہ سے، اس قیمت کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، یہاں وہ اپنے مال کی قیمت کم کررہا ہے، اگرچہ مجبوری کی صورت ہے، لیکن اپنے اختیار سے کررہا ہے، ‘‘یجوز للبائع أن یحط فی ثمنہ’’ (ہدایہ)، لہذا اس کے لئے حلال ہے، لیکن دھوکہ باز کے لئے حلال نہیں ہے۔

محور چہارم:

جے پورکے بعض تاجروں کے سوالات کے جوابات:

جواب ۱۔ بیچ سکتے ہیں، ادھار میں قیمت کچھ زائد اور نقد میں کم کرنا ناجائز نہیں ہے۔

جواب ۲۔ بائع کو اختیار ہے کہ اپنے سامان کی قیمت کم کرے یا قیمت بڑھا دے، لیکن اگر مشتری بیع رد کردے تو دونوں کی سہولت اور رضامندی سے اس وقت عقد جدید کے طور پر ایسا کرسکتے ہے۔

جواب ۳۔ اگر ڈائمنڈ گھٹیا ثابت ہوا تو اب بائع سے طے شدہ قیمت سے کمی کرواسکتے ہیں۔

جواب ۴۔ واپس لوٹا سکتا ہے۔

جواب ۵۔ یہ صورت اس وقت درست ہوگی جب کہ اس کی تجویز قبول کرلیں۔

جواہرات کی خریدوفروخت کی جدید صورتیں

مولانا محمد صابر حسین ندوی•

معدنیات خدا تعالی کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے،ان کی تخلیق صرف اور صرف انسانی فائدہ کیلئے ہے، ''وھوالذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعا''(بقرۃ: ۲۹)؛ انسانی معیشت میں ان خزینوں کا سب سے بڑا کردار ہے، خصوصا سونا اور چاندی باتفاق ''ثمن حقیقی'' کا درجہ رکھتے ہیں، حتی کہ ان کا عبادات سے بھی گہرا تعلق ہے،لیکن انہیں معدنیات میں ہیرے جواہرات کی اہمیت بھی کسی سے کم نہیں،دن بدن اس کے نرخ میں اضافہ کی خبریں آتی ہیں،خاص بازاروں کا انعقاد اور تاجروں کی دلچسپی کا محور بھی بن گیا ہے،اکثر ملک اور شہروں میں ا س کا خاص بازار لگنے لگا ہے،لوگ اپنے سرمایہ کو ہیرے میں تبدیل کرکے جمع کرنا پسند کرنے لگے ہیں،بالخصوص ہندوستان میں جےپور کو خاص مقام حاصل ہے،وہ عمومی مرکز بنتاجا رہا ہے؛اس کی بڑھتی قدر وقیمت اور اہمیت کے پیش نظر نت نئے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں،جس میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت درکار ہے، ایسے میں اس طرف ''اسلامک فقہ اکیڈمی ،ہند ''کی توجہ قابل قدر ہے، ''فجزاھم اللہ أحسن الجزاء''۔

سوالات کے جوابات سے قبل چند ضروری وضاحتیں درج کی جارہی ہیں؛تاکہ مسائل پر تشفی بخش بحث ہو، اورفقہی اصول وضوابط کے اعتبار سے جدید مسائل کا حل منقح ہو کر سامنے آئے،اولا: یہ سمجھ لینا چاہئے کہ معدنیات کی زبان میں ہیرے سے مراد کاربن یعنی فحم کی ایک شکل ہے،اس شکل میں فحم کی قلمیں مخصوص ڈھانچے کی شکل میں جڑی ہوتی ہیں،جو ہیرے کا ڈھانچہ کہلاتا ہے،ہیرا ''گریفائٹ '' کی نسبت کم مستحکم ہوتا ہے، ہیرے کو اس کی مخصوص خصوصیات کی وجہ سے جانا جاتا ہے،کسی بھی دوسرے مادے کی نسبت ہیرے سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ حرارتی موصل ہوتے ہیں، ان خصوصیات کی وجہ سے ہیرا کاٹنے اور چمکانے والے اوزاروں میں استعمال کیا جاتا ہے، ہیرے کی بصری خصوصیات قابل ذکر ہیں،انتہائی سخت ڈھانچے کی وجہ سے اس میں بہت کم ملاوٹیں ممکن ہیں،اس کے علاوہ شفاف ہونے کی وجہ سے ہیرا عموما بے رنگ ہوتا ہے؛تاہم انتہائی معمولی ملاوٹ کی وجہ سے ہیرے کا رنگ نیلا ، پیلا، بھورا، سبز، جامنی، گلابی،مالٹائی یا سرخ بھی ہوسکتا ہے،انہیں خصوصیات کی وجہ سے ہیرے

• جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک۔

کو سب سے اہم قیمتی پتھر شمار کیا جاتا ہے (ur.m.wikipedia.org) ۔

دلالی (بچولیا) کا حکم:

شرعی نقطہ نظر سے کسی بھی خیر کے کا م میں تعاون مطلوب و ممدوح ہے،قرآن اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہے:''تعاونوا علی البر والتقوی---'' (بقرۃ: ۲)، بسا اوقات عام تاجروں کو خاص تاجروں یا خریدار سے خریداری کرنے کیلئے بچولئے،درمیانی شخص کی ضرورت پڑتی ہے ،تا کہ وہ مطلوبہ شئی آسانی و سہولت کے ساتھ حاصل کر سکیں،فقہ کی اصطلاح میں اسے ''سمسرۃ '' کہا جاتا ہے، اور دلالی کرنے والے کو ''سمسار '' کہتے ہیں،اسے دلال کہنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ مشتری کو سامان کی طرف اور بائع کو قیمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے (الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ۱۰،۱۵۲)، ابوغرزہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے دورمیں اس کا خوب رواج تھا،اور ایسوں کو دلال کہا جاتا تھا؛لیکن آپ ﷺ نے ان کا نام ''تجار '' رکھا تھا:''قال ابی غرزۃ ؓ :کنا فی عھد رسول اللہ ﷺ نسمی السماسرۃ فمر بنا رسول اللہ ﷺ فسمانا باسم ھو أحسن منہ، فقال:یامعشر التجار إن البیع یحضر اللغو والحلف فشبوہ بالصدقۃ''(ابوداود۲،۶۴۰)، جس کا تذکرہ حدیث کے ایک لفظ ''الرائش '' مینبھی موجود ہے، چنانچہ راوی نے اس کی خود وضاحت یوں کی ہے ''الذی یسعی بینھما''یعنی جو فریقین کے درمیان کا کردار ادا کرے ،اور جو لوگ صاحب جاہ واقتدار ہوں، ان کے اور ضرورتمندوں کے درمیان سفارش کے لئے دوڑدھوپ کرے، اور انکی ضرورتوں کی تکمیل اور حاجت روائی کے لئے سفارشی بن جائے،اسی کو عام زبان میں دلالی سے تعبیر کیا جاتا ہے(مستدرک للحاکم۴،۷۰۶۸،۱۹۵)۔

دلالی ،واسطہ یاسفارشی بننے کی دوصورتیں ہیں :

۱۔ممدوح ثالث:یہ وہ ثالث ہے جسکی تعریف قرآن و حدیث نے بھی کی ہے ''من یشفع شفاعۃ حسنۃیکن لہ نصیب منھا''(نساء: ۸۵)،حضور اکرم ﷺ نے بھی فرمایا: ''اشفعوا فلتوجروا،ولیقض اللہ علی لسان نبیہ ماشاء'' (سنن ابی داؤد : ۱۵۱۳)یعنی سفارش کرو اور عند اللہ ماجور ہو۔

۲۔مذموم ثالث:یہ وہ ثالث یا بچولیاہے جسکی تذمیم خود قرآن کریم نے کی ہے ''من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا'' (نساء: ۸۵)۔

ثالث یا بچو لیا اور واسطہ بننے والوں کی اول الذکر قسم کی محنتانہ دینے یا لینے میں اس شرط کے ساتھ کہ ایک دوسرے کا ناجائز استحصال نہ ہو، اور مقصود جائز حق کی حصول یابی ہو تواجازت دی جا سکتی ہے،بدیگر صورت محنتانہ لینا و دینا ''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' (بقرۃ:۲) کے تحت اجازت نہ ہو گی،بلکہ کسی مزدور کی مزدوری اور

محنتی کا محنتانا نہ دینا غیرشرعی ہے، حضور اکرمﷺنے فرمایا :کہ مزدوروں کوان کی مزدوری پسینہ سوکھنے سے پہلے دیدو ‘‘أعطوا الأجیر أجرہ قبل أن یجف عرقہ’’(ابن ماجہ فی الرھون من سننہ)، ‘‘من استاجر أجیراًفلیعلمہ أجرہ’’(رواہ البیھقی) اور اس کا لینا بھی عین جائز ودرست ہے؛ کیونکہ حضورﷺ نے ایسے مزدوروں کی جانب سے خصامت کا اعلان کیا ہے، جنکی مزدوری نہ دی جائے ‘‘ثلاثۃ أنا خصمھم یوم القیامۃ وعد منھم رجلاً استاجر أجیراً فاستوفی منہ ولایعطیہ أجرہ’’(صحیح البخاریـ:‘فی البیوع والاجارۃ ’، وابن ماجہ: ‘فی الرھون)۔

خرید وفروخت : اسلامی اصول:

تجارت وپیشہ اور خرید وفروخت کی حیثیت صرف آپسی ضروریات کی تکمیل کی نہیں ہے ؛بلکہ اسلام اسے ایک عبادت تصور کرتا ہے،اسی لئے ا س کے متعلق ضروری احکام واصول فراہم کرتا ہے،اگر ا س کی مخالفت کی گئی تو وہ ‘‘یاأیھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ’’(بقرۃ: ۲۰۸) کا مخالف ہوگا،چنانچہ خرید و فروخت سے متعلق بیان کردہ فقہاء کرام کے چند شرائط کا سمجھ لینا ضروری ہے:

۱۔معاملہ بالتراضی ہو۔‘‘یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل’’ (نساء: ۲۹)۔

۲۔عوضین معلوم اور متعین ہوں؛ایسی جہالت نہ ہو جو باہم جھگڑے کا سبب بنے (بدائع الصنائع۵؍۱۵۸، فتاوی ہندیہ۳؍۳)۔

۳۔ثمن کی ادائیگی کے لئے مدت متعین ہو؛ مفضی الی النزاع کوئی چیز نہ ہو؛ معمولی جہالت نقصان دہ نہیں (فتاوی ہندیہ۳؍۳)۔

۴۔ثمن اموال ربویہ(نمک،گیہوں،سونا،چاندی،کھجور،جو)میں سے نہ ہو جن پر قبضہ مجلس عقد میں ہی ضروری ہوتا ہے (مسلم : ۱۵۸۴، مساقات)۔

۵۔بدلین مال متقوم ہو؛یعنی ایسا مال ہوکہ اسے خرید وفروخت کیا جاسکے (فتاوی ہندیہ۴؍۲)۔

۶۔اس میں غرر یا دھوکہ نہ ہو جیسے کہ کوئی ناجائز شرط لگا دی جائے (ہدایہ للمرغینانی۳؍۴)۔

عہد ووفا کا خیال:

تجارت ایک مبارک پیشہ ہے،اسے غیر اخلاقی غلاظتوں سے پاک رکھنا چاہئے؛دراصل یہی وہ طریقہ خاص ہے جس کے ذریعہ ملکی معیشت بہتر سے بہتر بنتی ہے،اور ہر فرد تک خوشحالی پہونچتی ہے، اسی لئے اگر معاملات میں دھوکہ ودغا کیا جائے تو نہ صرف بازار کا عمومی مزاج بگڑتا ہے ؛بلکہ معیشت بھی اوندھے منہ گر جاتی ہے،چنانچہ ضروری ہےکہ آپسی معاملات حتی الامکان صاف وشفاف رکھے جائیں، اور

آپسی عہد وپیمان کا خصوصی خیال رکھا جائے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:''وأوفوا بالعهد،إن العهد كان مسئولا''(اسراء: ۳۴،دیکھئے:تفسیر القرطبی برائے سورہ نحل: ۹۱)، نیز اسلامی نقطہ نظر میں دھوکہ دینا بھی اسوہ نبویﷺکے خلاف ہے ''من غشنا فليس منا'' (مسلم: ۱۰۱)،عہد ومعاہدہ کی خلاف ورزی جب معاملات میں ہو؛ تو اسے ''غرر '' سے تعبیر کرتے ہیں، غرر کی اصطلاحی تعریف میں گو کہ اہل علم کی تعبیرات مختلف ہیں؛ لیکن حاصل ان سب کا یہی ہے کہ غرر وہ بات ہے ،جس کا انجام معلوم نہ ہو ''الغرر ما يكون مستور العاقبة'' (مبسوط۱۳؍۱۹۴)، علامہ جرجانی لکھتے ہیں:''بأنه مايكون مجهول العاقبة لا يدرى أيكون أم لا''(التعريفات للجرجانی)،بیع وشراء میں اگرچہ معمولی غرر جو مفضی الی النزاع نہ ہو؛ برداشت کرلیا جاتا ہے؛ لیکن عموما غرر کی صورت میں بیع کا اعتبار نہیں ہوتا (دیکھئے:بداية المجتهد۲؍۱۷۱، مجموع۹؍۲۵۸)۔

جواب ۱=الف:دلالی یا واسطہ کا کردار ادا کرنا جائز ہے؛خواہ ا س کا تعلق خریدار کی طرف سے ہو یا بیچنے والے کی طرف سے،نیز حسب شرط وعرف اجرت لینا اور دینا بھی درست ہے،اور اگر شرط وعرف نہ ہو تو یہ بائع کے اختیار میں ہے، علامہ دکتور عبدالرحمن بن صالح الأطرم حفظہ اللہ رقمطرازہیں:''فإذا لم يكن شرط ولا عرف،فالظاهر أن يقال :إن الأجرة على من وسطه منها،فلو وسطه البائع فی البيع كانت الأجرة عليه، ولو وسطه المشترى لزمته الأجرة، فإن وسطاه كانت بينهما'' (الوساطة التجارية:ص-۳۸۲۔دیکھئے:حاشية الدسوقی۳؍۱۲۹)،فتاوی اللجنۃ الدائمۃ میں بھی دلالی کی اجرت پر جواز نقل کیا گیا ہے،اس کے اندر ا س کی تلقین بھی ہے کہ بائع ومشتری اجرت کے معاملہ میں ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں، اور دلال کو مناسب اجرت دیں اور دلال کسی قسم کی خیانت نہ کرے: ''-------ينبغی أن يكون (الأجرة) فی حدودماجرت به العادة بين الناس ،مما يحصل به نفع الدلال فی مقابل مابذله من وساطة وجهد لإتمام البيع بيع البائع والمشترى،ولا يكون فيه ضرر على البائع أو المشترى بزيادة فوق المعتاد''(فتاوی اللجنة الدائمة۱۳؍۱۲۹)۔

ب:جب دلال متعاقدین میں سے کسی ایک کی طرف سے کام کررہاہو تو ا س کیلئے جائز نہیں کہ وہ قیمت میں گھٹائے یا بڑھائے ،اس لئے کہ یہ دھوکہ اور امانت میں خیانت ہے،اس کیلئے ضروری ہے کہ عقد کے وقت کئے گئے معاہدہ پر قائم رہے،کیونکہ اب وہ وکیل ہے اور وکیل مؤتمن ہوتا ہے،ایسے میں جو نفع ہوگا وہ مؤکل کا ہوگا:''(وهبة بائع لوكيل)اشترى منه،(كنقص) من الثمن،فتلحق بالعقد (لأنها لموكله)''(مطالب أولی النهى: ۳؍۱۳۲)، اور اگر دلال کی اجرت معین نہ ہواور سامان کی خرید وفروخت پر منحصر ہو؛ تب بھی اسے امانت کا خیال رکھنا چاہئے ،کسی تیسرے سے معاہدہ نہ کرنا چاہئے،یہ بھی خیانت ہے (دیکھئے:الوساطة التجارية:ص-۱۱۵)۔

ج:جب دلال متعاقدین میں سے کسی ایک کا ہو تو اس کی حیثیت گویا ''جعالہ '' کی

ہوتی ہے، اس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کے کسی حصہ پر زیادتی کرے،اور اگراس نے زیادتی (ثمن وغیرہ میں)کی تو یہ زیادتی غصب فاحشہ میں شمار کی جائے گی،جو کہ منع ہے،چنانچہ اگر کوئی بائع کہے کہ اسے سو روپئے میں بیچ دو اور تمہارے لئے دس روپئے ہیں،اور بازار میں ا س سامان کی قیمت ستر روپئے تھی ،اب دلال کا مشتری پر اپنے کردار کو واضح کرنا ضروری نہیں ہے،جب تک کہ مشتری اپنی قیمت پر راضی ہے،اور اگر ا س نے ایسا کیا تو وہ دھوکہ دینے والا ہوگا،اسی لئے فقہاء نے یہ بات لکھی ہے کہ دلال کی اجرت بازار کے اعتبار سے رکھی جائے،اور اس میں اسی اعتبار سے کم وبیش کی جاسکتی ہے؛لیکن ثمن اصلی کی پیروی لازم نہیں ہے،علامہ کاسانی بیع المرابحۃ کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''لابأس بأن یلحق برأس المال أجرۃ القصار والصباغ والغسال والقتال والخیال والسمسار وسائق الغنم ، والکراء،ونفقۃ الرقیق من طعامھم وکسوتھم ومالا بد لھم منہ بالمعروف، وعلف الدواب،ویباع مرابحۃ وتولیۃ علی أکل اعتبارا للعرف،لأن العادۃ فیما بین التجار أنھم یلحقون ھذہ المؤن برأس المال ویعدونھا منہ'' (بدائع الصنائع۵؍۲۲۳)۔

مذکورہ وضاحتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بروکر یا دلال کا یہ عمل درست نہیں؛ بلکہ یہ خیانت اور استحصال کے مترادف ہے،جسے اسلام پسند نہیں کرتا،اس لئے ضروری ہے کہ اپنے عہد کا پاس رکھا جائے۔واللہ اعلم

جواب : ۲ =کسی کا مال باطل طریقہ پر کھانا جائز نہیں ہے،''یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (نساء: ۲۹)؛ چنانچہ اگر دلال اور بائع کے درمیان کوئی بات طے ہوجائے تو پھر وہ اس کا پابند ہوجاتا ہے، اب اگرکوئی اس میں سے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کھائے گا تو باطل مانا جائے گا،اور وہ آیت مذکورہ کا مستحق ٹھہرے گا، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''المسلمون علی شروطھم'' (ابوداود: ۳۵۹۴،ترمذی: ۱۳۵۲)، صورت مسئلہ میں یہی بات ملحوظ رہنا چاہئے!،نیز یہ خیال رہے کہ دلال کی حیثیت جب الگ مشتری کی ہوجائے گی تو اس کے احکام بھی عام مشتری اور بائع کے کر دئے جائیں گے،ایسا نہیں ہے کہ صرف دلالی (مبغوض لفظ)پیشہ ہونے کی بنا پر وہی حکم لگایا جائے،چنانچہ صورت مسئلہ میں یہ بات واضح ہے کہ معاملہ دلال سے نہیں ؛بلکہ دلال نامی مشتری سے ہے،ایسے میں ا سکے لئے جائز ہے کہ جس قیمت پر چاہے مال خریدے اور بیچے؛لیکن متعینہ دلالی فیصد سے پر ہیز کرنا ہو گا،اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ بروکر سے قرار پاتے ہوئے کسی مشتری کی طرف منسوب ہوجائے؛ ایسے مینبحیثیت دلال مال لے کربیچنے کی صورت میں متعینہ رقم سے زائد اگر ملے، تو وہ سب کا سب مالک اول کا ہوگا؛کیونکہ ا سکی حیثیت محض وکیل کی تھی اور وکیل موکل کیلئے مؤتمن کی حیثیت رکھتا ہے۔

جواب۲ (ب):دلالی کرنا دراصل خیرخواہی کرنا ہے،جو مطلوب وممدوح ہے،اسی لئے دلالی کی اجرت لینے یا دینے کی اجازت دی گئی ہے،خود امام بخاری رحمہ اللہ نے ''باب أجر السمسرة'' کا عنوان باندھا ہے اور ا س کے تحت ابن سیرین،عطاء،اور حسن رحمہم اللہ اجمعین کا یہ قول نقل کیا ہے:''إذا قال بعہ بکذا فما کان من ربح فھو لک،أو بینی وبینک فلا بأس''، اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی بطور استشہاد نقل کیا ہے:''لابأس أن یقول:بع ھذا الثوب فمازاد علی کذا وکذا فھو لک''؛ ایسے میں ا سکی اہمیت ونزاکت کاا ندازہ لگایا جاسکتا ہے(صحیح البخاری مع الفتح۵،۳۵۸-۳۵۷)۔

اسی لئے سمسار یا دلالی میں دھوکہ دینا خواہ وہ فرضی خریدار بنا کر ہو یا کسی بھی صورت میں ہو قطعا قابل قبول نہیں ہے،مذکورہ صورت مسئلہ فقہ اسلامی کے مزاج کے خلاف ہے،ا سکے اندر صریح دغا اور ضرر کے ساتھ استحصال پا یا جارہا ہے،اللہ کے رسولﷺ فرماچکے''من غش فلیس منا''،اسی لئے ضرورت ہے کہ ایسے معاملوں سے بچا جائے؛البتہ اس کی اجازت ہے کہ بروکر خود مشتری بن جائے اور سامان کو بائع سے ا سکی مرضی کے مطابق خرید لے؛خواہ وہ کم پیسوں ہی میں کیوں نہ ہو،اس کے بعد اسے آگے بیچ دے،علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے:''--------لأنہ وکیل مخالف ،وإن تعذر ردہ ضمن النقص''(المغنی ۶،۸۱)۔واللہ اعلم

جواب ۳ : چوری کرنا حرام ہے،اسی طرح چوری کا مال خریدنا یا بیچنا بھی جائز نہیں؛خواہ وہ مال کسی کافر نے چوری کیا ہو یا مسلمان نے،خواہ اسے ہدیۃ دیا جائے یا میراث یا بیع وشراء کے طورپر،نیز جس کسی کو معلوم ہوجائے کہ یہ مال مسروق ہے تو اسے چاہئے کہ بقدر استطاعت نکیر کرے،اور توبہ کا حکم دے ،اور سامان کو اس کے اصل مالک تک پہونچانے کی ہر ممکن کوشش کرے،اسی طرح جو کوئی چوری کا مال جان بوجھ کر خریدے وہ گنہگار ہوگا،حضور اکرمﷺ نے فرمایا:''من اشتری سرقۃ (أی مالا مسروقا)، وھو یعلم أنھا سرقۃ، فقد شرک فی عارھا وإثمھا'' (مستدرک علی الصحیحین : ۲۲۵۳)، اس پر بھی لازم ہوگا کہ وہ مال اس کے مالک تک پہونچائے، یہی ا س کیلئے توبہ بھی قرار پائے گا،دراصل چور سے چوری کا مال خریدنا اثم اور عدوان میں تعاون ہے،جس کی اجازت نہیں،اسی طرح بیع وشراء کیلئے ضروری ہے کہ مال صاحب مال سے خریدا جائے،جبکہ چور اس مال کامالک ہی نہیں؛ ایسے میں وہ عقد بھی باطل قرار پاتا ہے،اس سلسلہ میں متعدد فتاوی منقول ہیں:

علامہ ابن تیمیہ کا ماننا ہے:''الأموال المغصوبۃ والمقبوضۃ بعقود لاتباح بالقبض إن عرفہ المسلم: اجتنبہ،فمن علمت أنہ سرق مالا أو خانہ فی أمانتہ، أو غصبہ فأخذہ من المغصوب قھرا بغیر حق؛ لم یجز لی أن آخذہ منہ، لا بطریق الھبۃ، ولا بطریق المعاوضۃ، ولا

وفاء عن أجرة، ولا ثمن مبيع، فإن هذا عين مال ذلک المظلوم" (مجموع الفتاوی۲۹،۳۲۳)، ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:''وإن كان الذی معهم أی التتار أو مع غيرهم أموال يعرف أنهم غصبوها من معصوم:فتلک لا يجوز اشترائها لمن يتملكها، لكن إذا اشتريت على طريق الاستنقاذ لتصرف فی مصارفها الشرعية فتعاد إلى أصحابها إن أمكن، وإلا صرفت فی مصالح المسلمين: جاز هذا" (مجموع الفتاوی۲۹،۲۷۶)۔

اس حکم کا تعلق اس صورت سے ہے جس میں یہ یقین ہو کہ مال ؛مال مغصوب ہے، لیکن آج کل خصوصا چور بازار سے موسوم ایسے بہت سے بازار ہوتے ہیں، جن میں حقیقتا دونوں طرح کا مال خرید وفروخت کیا جاتا ہے،کسی خاص مال کے تعلق سے نشان دہی کرنا تقریبا مشکل ہوتا ہے،جیسا کہ صورت مسئلہ کا بھی حال ہے،اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اولا : کوشش ہونی چاہئے کہ مشکوک مقامات سے بچیں ''دع ما يريبک إلى ما لا يريبک فإن الصدق طمأنينة، وإن الكذب ريبة'' (ترمذی: ۲۴۴۲،احمد: ۱۶۳۰، ابن حبان: ۷۲۲)، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام شبہات سے بچا جائے:''ومعنى هذا الحديث يرجع إلى الوقوف عند الشبهات واتقائها، فإن الحلال المحض لايحصل لمؤمن فی قلبه منه ريب-والريب:بمعنى القلق والاضطراب -بل تسكن إليه النفس، ويطمئن به القلب، وأما المشتبهات فيحصل بها للقلوب القلق والاضطراب الموجب للشک''(جامع العلوم والحكم۱،۲۸۰)، یہی بات تقوی کے قریب ہے؛ لیکن مسائل کے اعتبار سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کسی مال کے بارے میں ظن غالب نہ ہوکہ یہ چوری کا مال ہے؛ تب تک اسے چوری کا مال نہ مانا جائے گا، اور اسے خریدنے اور بیچنے کی اجازت ہوگی۔

جواب۴ : قرآن کریم میں بلاوجہ گمان کرنے سے روکا گیا ہے، بلکہ بسا اوقات اسے گناہ میں سے شمار کیا ہے: ''يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولاتجسسوا''(حجرات: ۱۲)،یہ صرف آیت نہیں،بلکہ فقہ اسلامی کا عظیم اصول ہےکہ تجسس اور لایعنی گمان سے اجتناب کیا جائے،کیونکہ انسان صرف ظاہر کا مکلف ہوتا ہے، باطن کاحکم خدا سے متعلق ہوتا ہے،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ظاہر کا ہی اعتبار کیا کرتے تھے؛حالانکہ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی،اسی لئے علامہ نووی نے شرح مسلم میں ایک باب بھی باندھا ہے؛''باب اجراء أحكام الناس على الظاهر''اور اس کے تحت کئی روایات جمع کی ہیں؛ایک روایت میں آپ ﷺنے ا س صحابی کو ڈانٹ پلائی جنہوں نے ظاہر کا اعتبار نہ کیا اور ایک کافر کو کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کردیا، آپﷺ نے فرمایا: ''أفلاشققت عن قلبه'' ایک روایت میں ہے: ''وكيف تصنع بلا إله إلاالله إذا جاء يوم القيامة''(صحیح مسلم: ۹۶-۳۹۹-۳۹۸، دیکھئے:نصرة النعيم فی مكارم أخلاق الرسول ﷺ ۶،۲۲۸۰)۔

علامہ شاطبی نے موافقات میں نقل کیا ہے کہ حکم کا اصل تعلق ظاہر ہی سے ہے،

حتی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صاحب وحی ہونے کے باوجود ظاہر ہی کا اعتبار کرتے تھے:''فإن أصل الحكم بالظاهر مقطوع به فى الأحكام خصوصا، وبالنسبة إلى الاعتقاد فى الغير عموما أيضا، فإن سيد البشر ﷺ مع إعلامه بالوحى يجرى الأمور على ظواهرها فى المنافقين وغيرهم وإن علم بواطن أحوالهم ولم يكن ذلك بمخرجة عن جريان الظواهر على ماجرت عليه''(الموافقات۲،۲۷۱)، علامہ ابن تیمیہ نے اپنے ایک طویل فتوی میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے: ''.....فتقبل منه علانيته وتوكل سريرته إلى الله، فإنا لم نومر أن ننقب عن قلوب الناس ولا نشق بطونهم'' (مجموع الفتاوی۴،۱۴۹)۔

ان تشریحات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسان چونکہ ظاہرکا مکلف ہے، اس لئے اگر ا س نے پوچھ کر مال خریدا اور ا س نے مال کے درست ہونے کا اقرار کیا، تو اس کے خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں ہے؛تاہم حالات حاضرہ کے پیش نظر بہتر ہے کہ اقرار تحریری صورت میں لے ؛تاکہ آئندہ کسی قسم کی کاروائی میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ واللہ اعلم

جواب ۵ : شریعت اسلامی کے اندر کوئی ایسی بیع جس میں غرر ہو وہ منع ہے،یہی وجہ ہے کہ ''لاتبع ماليس عندک'' (ترمذی: ۱۲۳۲، ابوداود: ۳۵۰۳، نسائی: ۴۶۱۳ ، ابن ماجہ: ۲۱۸۷)یعنی جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اسے نہ بیچنے کا حکم ہے،اس حدیث کے تحت علامہ ابن منذر کا کہنا ہے کہ ''مالیس عندک ''میں دو احتمال ہے،اولا یہ کہ کوئی کہے:میں تم کو یہ گھر یا غلام بیچتا ہوں اور وہ حاضر نہ ہو،بلکہ غائب ہو؛ تو یہ بیع غرر کے مشابہ ہے؛کیونکہ ا سکے ذریعہ مال تلف کرنے یا ا سکی مرضی کے خلاف بیچنے کی کوشش ہوسکتی ہے،دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی کہے:میں تم کو اس طرح (غیر معین) کا گھر اس کے مالک کی جانب سے بیچتا ہوں یا اس کے مالک کی جانب سے بیع سلم کرتا ہو،حافظ ابن حجرعسقلانی رحمہ اللہ اسے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:''مالیس عندک'' کا احتمال دوسری صورت سے ہے (دیکھئے: فتح الباری ۶،۴۶۰)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی ایسی صورت جس سے غرر کا خطرہ ہو یا نزاع کا باعث بنے وہ درست نہیں ہے،صورت مسئولہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو الگ الگ معاملے ہیں:

الف:یہ معاملہ درمیانے شخص کا ہے کہ ا س نے مال خریدا، یہ بات الگ ہے کہ اس نے ابھی رقم کی ادائیگی نہینکی؛تاہم ا س سلسلہ میں کوئی نزاع نہیں دونوں نے آپس میں رضامندی کے ساتھ عقد کیا۔

ب:دوسرا معاملہ درمیانے شخص کا کسی تیسرے کے ساتھ ہے؛ کہ وہ اپنا خریدا ہوا مال اسے بیچ رہا ہے، جس پر طرفین کی رضامندی ہے۔

دونوں صورتوں میں نزاع یا غرر کی کوئی کیفیت معلوم نہیں ہوتی،اور نا ہی کوئی

ایسی صورت نظر آتی ہے، جس سے عقد پر ضرب پڑے،ایسے میں اسے جائز کہنا مناسب لگتا ہے؛ البتہ حکمت اور اندیشہ کے تحت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عمومی رواج اس طرح کے کاروبار کا پڑجائے تو معیشت کیلئے خطرہ ہوگا،اور ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ طویل ترین ہوجائے اور ہر بائع قیمت سے محروم ہو؛ایسے میں ممکن ہے کہ نزاع کا باعث بنے، چنانچہ کبھی ایسی صورت پائی گئی تو اسے درست نہیں کہا جائے گا۔ واللہ اعلم

جواب۶: عصر حاضر میں قیمتوں میں حد سے زیادہ اضافہ اور عوام کے استحصال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ فرضی خرید وفروخت کا بازار گرم ہے،شئیر مارکیٹ اور علاقائی بازاروں میں بھی اس کا رواج اس قدر ہے کہ کئی دفعہ مشتری وخریدار کی طویل فہرست ہوجاتی ہے؛لیکن ان میں کسی نے نہ تو مال پر قبضہ کیا ہوتا ہے ،اور ناہی دیکھنے کی بھی نوبت آتی ہے،یہ صورت اگرچہ تاجروں کیلئے ازحد مفید ہے،مگر عمومی بازار اور معیشت خواہ فردی ہو یا ملکی بہت ہی خطرناک ہے،بسااقات یہ بازاروں میں قحط کا ذریعہ بن جاتا ہے،یا ملکی خزانہ کی بربادی کی وجہ بھی ثابت ہوتا ہے؛یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بیع وشراء میں قبضہ کو خاص اہمیت دی ہے،اور قبضہ سے قبل بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

قبضہ لغت میں کسی چیز کا ہتھیلی بھر کر لے لینے کے لئے آتا ہے،جو ملکیت سے کنایہ ہے''القبض لغۃ:تناول الشئی بجمیع الکف، ویقال:ھذا الشئی فی قبضۃ فلان أی فی ملکہ وتصرفہ'' (الصحاح للجوھری،والمفردات للراغب:القبض)،اصطلاح میں قبضہ کہتے ہیں:کسی چیز کو روک لینا اور اس پر قابض ہوجانا، خواہ اسے ہاتھ میں لینا ممکن ہو یا نہ ہو ''ھو حیازۃ الشئی والتمکن منہ سواء أکان مما یمکن تناولہ بالید أم لم یمکن''(القوانین الفقھیۃ لابن جزی : ۳۲۸)، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:قبضہ کے لئے کسی چیز کو ہاتھ میں لینا شرط نہیں ؛بلکہ قبضہ کے معنی قدرت دینا اورعرف وعادت کے اعتبار سے ایسے موانع کو ہٹا دینا ہے، جو اس کے استعمال میں عارض ہو ''القبض ھو التمکن والتخلی وارتفاع الموانع عرفاً وعادتاً حقیقۃ'' (بدائع الصنائع۵،۱۷۸)،عز بن عبدالسلام کا بھی یہی ماننا ہے کہ قبضہ کے معنی تصرف کے ہیں ''قولھم قبضت الدار والأرض والعبد والبعیر یریدون بذلک الاستیلاء والتمکن من التصرف'' (الاشارۃ الی الایجاز: ۱۰۶)۔

ان اصطلاحی تعریفات سے صاف واضح ہوتا ہےکہ عرف و رواج اور اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، چنانچہ فقہاء مالکیہ میں ابو البرکات دردیرؒ نے بھی واضح کیا ہے کہ قبضہ کے معنی لوگوں کے درمیان جاری عرف سے متعین ہوگا ''بالعرف الجاری بین الناس''(الشرح الکبیر علی ھامش الدسوقی۳،۱۴۵)، امام نوویؒ نے بھی عرف ہی کو اس کا مدار قرار دیا ہے (دیکھئے:شرح مہذب۹ ، ۲۷۵)،فقہاء حنابلہ میں علامہ ابن قدامہ کا بیان ہے ''لأن القبض مطلقاً فی الشرع یجب الرجوع فیہ إلی

العرف" (المغنی۴؍۹)، اسی لئے فقہ کے مسلمہ قواعد میں سے یہ ہے کہ کتاب و سنت میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں اور اس کے مفہوم و مصداق کی تعیین و تحدید نہیں کی گئی ہے؛ ان میں عرف ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا، علامہ سیوطی کے الفاظ میں ''کل ماورد بہ الشرع مطلقاً ولا ضابط لہ فیہ ولا فی اللغۃ یر جع فیہ إلی العرف''(اشباہ للسیوطی: ۱۹۶)۔

اگر مبیع پر قبضہ نہ کیا گیا اور ا س سے قبل فروخت کیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے، حتی کہ علامہ ابن منذر نے اجماع نقل کیا ہے (الاشراف علی مذاھب العلماء۶؍۵۰)؛ کیونکہ حضور اکرمﷺ نے فرمایا:''من ابتاع طعاما فلایبعہ حتی یستوفیہ، قال ابن عباس: وأحسب کل شئی مثلہ'' (بخاری: ۲۱۳۵) وفی روایۃ مسلم:''حتی یقبضہ'' (مسلم: ۱۵۲۵)، علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اسی کو اختیار ہے:''المنع من بیع المبیع قبل قبضہ سواء فی ذلک الطعام أو العقار أو غیرھما، وسواء بیع الطعام کیلا أو وزنا أو جذافا واستثنی من ذلک بیع المبیع قبل قبضہ لبائعہ خلافا للمشھور من مذھب الحنابلۃ'' (دیکھئے:مجموع الفتاوی ۲۹؍۵۱۳، الفروع ۴؍۱۳۴، الانصاف۴؍۴۶۶،۴۶۱)۔

شیخ الاسلام نے اس کی علت یہ بتائی ہے کہ مبیع پرقبضہ نہ ہونے کی صورت میں ممکن ہےکہ مبیع سپرد کرتے وقت بائع اس سے عاجز ہوجائے،یا قیمت میں اضافہ دیکھ کر معاملہ توڑدے وغیرہ(ملاحظہ ہو:الاختیارات:۱۲۶)،اس وضاحت سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ مبیع پر قبضہ سے قبل اسے بیچنا درست نہیں ہے،اس سے بہت سے ضرر جیسے ضمان کا نہ ہونا اور غرر ونزاع کا خطرہ ہے،جو بیع کی درستگی میں حائل ہے۔

محور دوم:

جواب (۱): فقہ اسلامی کا معاملات کے سلسلہ میں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا اختیار ہے؛ خواہ اس سے وہ اپنے آپ کو ضرر ہی کیوں نہ پہونچائے،فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کا حق اس کی ملکیت میں نہیں ہے ،تو کسی کو حق نہیں کہ وہ مالک کواس کی ملکیت میں تصرف سے روکے،الا یہ کہ شرعی نقطہ نظر درپیش ہو،جیسے وہ اس سے کسی کو تکلیف دے وغیرہ، علامہ وھبہ زحیلی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ''الفقہ الاسلامی وادلتہ '' میں سیر حاصل بحث کی ہے، اور خصوصا حنفی نقطہ نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، ''حکم الملک ومایقتضیہ من حقوق'' کے تحت آپ رقمطراز ہیں:''---------وبناء علیہ للمالک أن یتصرف فی ملکہ أی تصرف شاء، سواء أکان تصرفا یتعدی ضررہ إلی غیرہ، أم لایتعدی، فلہ أن یبنی فی ملکہ مرحاضا أو حماما أو رحی أو تنورا، ولہ أن یوجر بنائہ لحداد أو قصار؛ ولہ أن یحفر فی ملکہ بئرا أو بالوعۃ، وإن کان یتأذی بہ جارہ، ولیس لجارہ أن یمنعہ، لأن حق الملکیۃ حق مطلق، ویتقید ھذا الحق عند وجود عارض من تعلق حق لآخرین بہ، لکن یجب أن یمنع الإنسان عن کل ما یوذی جارہ

دیانۃ، لقولہ ﷺ:المومن من أمن جارہ بوائقہ''(مجمع الزوائد۸؍۱۶۹، دیکھئے:الفقہ الاسلامی وادلتہ۸؍۴۰۲۵''ش '')۔

صورت مسئولہ میں یہ بات واضح ہے کہ حامل پرچی ایک خاص ملکیت کا مالک ہے، وہ پرچی ہی اس کی ملکیت پر قبضہ کی دلیل بھی ہے،جسے عرفا تسلیم کیا جاتا ہے، ایسے میں اگر وہ پرچی کو فروخت کرتا ہے،تو گویا وہ مالک اپنی ملکیت مینتصرف کر رہا ہے، جس کا اسے پورا حق ہے،نیز مالک سے کوئی باز پرس نہیں کہ وہ کم قیمت پر فروخت کرے یا زیادہ، رہی یہ بات کہ پرچی کو خریدنے والا متعینہ رقم لیتا ہے،تو یہ بھی گویا اس کے بیع وشراء کا ایک حصہ ہے جو دونوں فریق نے برضا تسلیم کیا ہے،اور یہ ظاہر ہے کہ معاملات میں متعاقدین کی رضا مندی ہی اصل ہے۔

جواب (۲):سود کو عربی میں [الربا] کہتے ہیں،ربا،یربو، ربواً و رُبواً وربائً کے لغوی معنی اضافہ کے ہیں، ''الأصل فی معناہ الزیادۃ، یقال:ربا الشئ إذا زاد'' (دیکھئے: المصباح المنیر وتاج العروس اور لسان العرب:مادۃ: ربا)، کتاب وسنت میں متعدد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، شرعی اصطلاح میں ''ربا'' ایسے اضافہ کو کہتے ہیں؛ جس کے مقابلہ میں دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو، ''وفی الشرع عبارۃ عن فضل مالا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال''(عنایۃ علی ھامش الفتح۶؍۲۴۷)،ابن اثیر کا بیان ہے:''الأصل فیہ الزیادۃ علی أصل المال من غیر عقد تبایع'' (النھایۃ شرح الھدایۃ:۲؍۱۹۲)،علامہ زیلعی کہتے ہیں :''فضل مال بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال'' (تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق۴؍۸۵، دیکھئے:التعریفات:باب الراء ''الربا '')، یہی تعریف کم و بیش دوسرے اہل علم نے بھی کی ہے ۔

ربا کی حرمت قرآن و حدیث سے صراحتا ثابت ہے:''أحل اللہ البیع وحرم الربا''(بقرہ: ۲۵۷، اور دیکھئے: بقرۃ: ۲۷۸۔۲۷۹۔۲۷۵)،'' یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات'' (بقرۃ: ۲۷۶)، حضور اکرمﷺ نے صریح طور پرفر مایا:کسی قسم کے قرض پر نفع حاصل کرنا ناجائز ہے ''کل قرض جر منفعۃ فھو ربا'' (مصنف ابن ابی شیبۃ:حدیث: ۲۰۶۹۰، دیکھئے: المغنی۶؍۴۳۶)، ایک روایت میں آپ ﷺ نے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر بھی لعنت فرمائی (بخاری: ۵۹۶۲)، ایک روایت میں آپﷺ نے فرمایا :'' ایک درھم جو شخص بطور سود کھاتا ہے وہ عنداللہ ۷۳؍تہتر بار زنا کرنے سے بدتر ہے '' (مسند احمد: ۳۳۷۵)، ایک اور روایت میں ہے کہ سود کے بہتر درجہ ہیں،اس کا ادنی یہ ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ فحش کام کیا جائے (طبرانی فی الاوسط: ۳۵۳۷)، اسی طرح آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کے قہر کو اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے اسکی حرمت کا اعلان ببانگ دہل فرمایا تھا''ألا إن کل ربا الجاھلیۃ موضوع عنکم کلہ؛ لکم رؤوس المال لا تظلمون

ولا تظلمون''...''كل ربا فی الجاهلیۃ موضوع تحت قدمي هاتين'' (صحیح مسلم، و سنن ترمذی: حدیث: ۳۰۷۸)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عصر حاضر میں نظامہائے حکومت کے متنوع ہونے اور مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے بہت سے احکام میں سہولت پیدا ہوگئی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم کی تصریح سے پتہ چلتا ہے کہ ضرورۃ سودی قرض لئے جاسکتے ہیں ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(الأشباہ مع الغمز:۱۴،۱)، مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ''حاجت ''سے کیا مراد ہے، اصولیین کی اصطلاح میں حاجت اسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ(حفظ دین،حفظ نفس،حفظ نسل،حفظ عقل،حفظ مال) میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف تو نہ ہو ؛لیکن اگر اسکی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہوجائے ''وأماالحاجیات معناها أنها مفتقر إلیها من حیث التوسع ورفع الضیق المودی فی الغالب إلی الحرج والمشقۃ اللا حقۃ بفوت المطلوب''(الموافقات للشاطبی۵،۳)،یہ حاجات بعض اوقات ''ضرورت '' کے حق میں تسلیم کی جاتی ہیں؛ علامہ سیوطی کا بیان ہے ''الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت أوخاصۃ''(الأشباہ للسیوطی: ۱۸۰) اور جیسے ضرورت کی بنا پر ناجائز بقدر ضرورت جائز ہوتا ہے ''وما أبیح للضرورۃ یقدر بقدرها'' (ابن عابدین۵،۲۳۷، روضۃ الطالبین۹،۱۰۴، المغنی۹،۱۴۵)، اسی طرح حاجت کی بنا پر فقہاء احکام میں آسانی پیدا کرتے ہیں، قاعدہ مشہور ہے: ''المشقۃ تجلب التیسیر'' (موسوعۃ الفقہ الاسلامی:قاعدہ نمبر: ۴)، اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ افراد واشخاص کے لئے بھی حاجت اور مشقت کا کوئی ایسا بے لچک پیمانہ نہیں رکھا جا سکتا، جو سب کے لئے مسا وی ہو، بلکہ لوگوں کے حالات ،عادات اور مختلف علاقوں کے عرف اور رواجات و ضروریات کو سامنے رکھ کر ہی حاجت اور مشقت کا تعین کرنا ہوگا ،فقہاء کے یہاں اسکی نظیر موجود ہے مثلا:حجاج کیلئے زاد و راحلہ کا مسئلہ ہے ؛ابن ہمام نے لکھا ہے: ''یعتبر فی حق کل إنسان ما یصح معہ بدنہ''(فتح القدیر:کتاب الحج،دیکھئے:غمز عیون البصائر۱،۲۶۹)، اسی طرح کی بات نفقہ وغیرہ کے متعلق فقہاء نے لکھی ہے ،پس اس سے اصولی طور پر یہ بات منقح ہوتی ہے :

الف:عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

ب:ضرورت؛ یعنی ایسے حالات جن میں کھانے،کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہی کیلئے سودی قرض کے سوا چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

ج۔ حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی، جیسے غیر شادی شدہ

لڑکیوں کی شادی کیلئے اس پر مجبور ہو یا انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کیلئے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو ۔

د۔مشقتوں کے معاملہ میں ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہو ؛نسبتا زیادہ تخفیف برتی جا سکتی ہے ۔

ہ۔افراد واشخاص کیلئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں ؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات او ر ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا (مستفاداز: جدید فقہی مسائل۴؍۸۷۔۸۸)۔

ان تصریحات سے یہ خیال آتا ہے کہ اگر واقعی شرعی طور پرسودی قرض کا محتاج ہوتو قرض لے،یا دلوادے؛لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو نہ خود سودی قرض لے سکتا ہے اور ناہی کسی کیلئے مناسب ہے کہ وہ سودی قرض دلوائے؛کیونکہ سود کھانا اور کھلانا دونوں حرام ہے۔واللہ اعلم۔

جواب (۳): مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں‘‘إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم’’ (حجرات: ۱۰)، ایک دوسرے کو دھوکہ دینا یا استحصال کرنا اس کی شان نہیں؛ بلکہ وہ ایک دوسرے کیلئے خیر خواہ ہوتے ہیں، حضور اکرمﷺ نے دین کو سراپا خیر خواہی کا نام دیا ہے:‘‘الدين النصيحة ۔للہ ولكتابہ ولرسولہ ولأئمة المسلمين وعامتهم’’(صحیح مسلم: ۵۵)، ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی کسی سے خیر خواہی چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ ا سکے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کرے‘‘دعوا الناس يصيب بعضهم من بعض، فإذا انتنصح أحدكم أخاه فلينصحہ’’ (التنوير شرح الجامع الصغير: ۴۲۰۵)، خواہ اس کا تعلق خرید وفروخت سے ہو یا کسی بھی معاملہ سے کیوں نہ ہو، یعنی یہ کہ آپسی خریدوفروخت میں مناسب قیمت کا خیال رکھنا، اور ایک دوسرے کی ضرورت کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے اور یہ ‘‘الدين النصيحة ’’کے مترادف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص نادانی میں اپنا مال کم قیمت میں بیچ رہاہو، اور ابھی متعاقدین کے درمیان تراضی نہیں ہوئی ہے تو ایسی صورت میں ثالث کا بھی کردار ادا کیا جاسکتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے ایسے ہی ایک معاملہ میں جب کسی کم قیمت میں سامان خرید کرنا چاہا ،تو آپ ﷺ آگے بڑھے اور قیمت میں اضافہ کروایا ‘‘من يشترى هذا الحلس والقدح؟ فقال رجل: أخذتها بدرهم، فقال النبى ﷺ:من يزيد على درهم ؟من يزيد على درهم؟فأعطاه رجل درهمين فباعهما منہ’’(ابوداود: ۱۶۴۱، ترمذی۱؍۲۲۹، نسائی۲؍۲۱۷)؛ لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اگر بات طے ہوچکی ہو اور فریقین راضی ہوں تو کسی کو اس سے زائد کی بولی لگانے کی اجازت نہیں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:‘‘لايبيع بعضكم على بيع بعض حتى يبتاع أو يذر’’(بخاری مع الفتح: ۲۰۳۲)۔

یہ احکامات اس لئے ہیں تاکہ لوگ آزادی سے اپنا سامان بیچ سکیں اور اس طرح اللہ کا رزق عام ہو:''لایبیع حاضر لباد أو فی غفلاتھم، دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض'' (مسلم: ۱۵۲۲،دیکھئے:کشف الخفاء۱،۴۰۶)؛ لیکن ا س سلسلہ میں ''لا ضر رلا ضرار'' (الأشباہ للسیوطی: ۷۵،۷۶)''الضرر یزال''(الاشباہ لابن نجیم : ۸۳)''الضرر یدفع بقدر الإمکان'' (الوجیز: ۱۹۸)کا قاعدہ ملحوظ رکھا جائے گا، چنانچہ صورت مسئلہ کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہےکہ معاملہ تو بہرصورت درست ہے؛ کیونکہ باہمی رضامندی پائی جارہی ہے؛ البتہ یہ ا س تناسب میں نہ ہو کہ وہی بیع رضامندی کے بجائے مجبوری میں تبدیل ہوجائے۔واللہ اعلم

جواب (۴): بیع وشراء کے طور و طریقہ منزل من اللہ نہیں ہیں؛بلکہ وقت اور حالات کے پیش نظر مناسب تدابیر اختیار کیے جاسکتے ہیں؛لیکن یہ مناسب نہیں کہ کسی کے ساتھ غیر ناصحانہ سلوک کیا جائے،یہ تکمیل ایمان کے خلاف ہے،نیز اپنے سامان کو بیچنے کیلئے ضرورت سے زیادہ تعریفیں کرنا اس حد تک کہ وہ جھوٹ ہوجائے؛ تو یہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ جھوٹ حرام ہے؛ بلکہ گناہ کبیرہ ہے:''قال:ألا أنبئکم بأکبر الکبائر قال: الشرک باللہ، وقتل النفس، وعقوق الوالدین،--- قول الزور أو---شھادۃ الزور''(بخاری: ۵۶۳۲)، جبکہ تجارت ایک ایسی عبادت ہے جسے اگر ایمانداری کے ساتھ کیا جائے تو اس کا حشر قیامت کے دن شہداء وصدیقین کے ساتھ ہوگا ''التاجر الصدوق الأمین مع النبیین والصدیقین والشھداء'' (ترمذی: ۱۲۰۹،دارمی: ۲۵۳۹، قطنی: ۱۸)،لیکن اگر صدق وصفائی سے کام نہ لیا گیا تو ایسوں کو فجار وفساق کے ساتھ بھی اٹھایا جاسکتا ہے،''---یا معشر التجار، فاستجابوا لہ، ورفعوا أعناقھم وأبصارھم إلیہ، فقال:إن التجار یبعثون یوم القیامۃ فجارا، إلا من اتقی وبر وصدق''(ترمذی: ۱۲۱۰، ابن ماجہ: ۲۱۴۶) ۔

اسی لئے مناسب اور ایمانداری کے ساتھ تجارت کرنا چاہئے ؛لیکن اپنے سامان کی تعریف کر سکتے ہیں؛البتہ دھوکہ نہ دیناور مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں،کیونکہ یہ منافقت ہے، جیسا کہ حضور اکرمﷺ نے فرمایا:''ولاینفق ببعضکم علی بعض'' (ترمذی: ۱۲۶۸) یعنی کوئی ایسا غلط کام نہ کرے کہ مشتری مبیع خریدنے پر مجبور ہوجائے(نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج للرملی۴،۳۹۲)، چنانچہ حضورﷺ نے ایک بائع کی گرفت کی جو مبیع میں سے خراب مال چھپائے ہوئے تھا اور اچھا مال ظاہر کئے تھا، فرمایا:''أفلا جعلتہ فوق الطعام کی یراہ الناس، من غش فلیس منی'' (مسلم: ۲۹۵-۱،۹۶)، اسی روایت کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ مبیع میں موجود صفت کو چھپانا خواہ فعل کے ساتھ ہویا قول کے ذریعہ؛ حرام ہے (تکملۃ المجموع للسبکی۱۲،۱۱۴، مجموع الفتاوی ۲۸،۱۰۴، احیاء العلوم۲،۷۱)۔

ابن عمررضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے نجش سے منع فرمایا

(بخاری: باب النجش۔۔ رقم: ۲۰۳۵، مسلم: ۳۸۹۳)، علماء لغت کا ماننا ہے کہ نجش سے مراد یہ ہے :سامان کو ایسے بیچنا کہ اس کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ کیا جائے،جیسا کہ نضر بن شمیل اور فقہاء حنفیہ وشافعیہ کی وضاحت ہے (لسان العرب۶؍۳۵۱، شرح مسلم للنووی۱۰؍۱۵۹، نیزملاحظہ ہو: اعلام الحدیث فی شرح صحیح البخاری۲؍۱۰۴۶)، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:''-صور الغش-أن یمدح السلعۃ بما لیس فیھا لیروجھا'' (ردالمحتارعلی الدرالمختار۵؍۱۰۱)،اجماعا بھی یہ بات ثابت ہے کہ سامان میں بیع وشراء کے تعلق سے دھوکہ دینا حرام ہے(المعلم بفوائد مسلم للمازری۲؍۲۴۸)، تووہیں حضور اکرمﷺ نے دھوکہ دینے والے اور اس امت پر ہتھیار لے کر نکلنے والوں کو ایک ہی صف میں رکھا ہے''من حمل علینا السلاح فلیس منا ومن غشنا فلیس منا'' (مسلم: ۲۹۴-۱؍۹۶)، اس لئے دھوکہ دین قیم سے خروج کا باعث ہے،کیونکہ یہ لوگوں پر ظلم اور حرام مال کھانا ہے، چنانچہ امام غزالی بھی کہتے ہیں: جو چیز خود کے دل پر بوجھ بنے اسے کسی دوسرے کیلئے بھی اٹھا نہیں رکھنا چاہئے''فکل ما لو عومل بہ شق علیہ وثقل علی قلبہ فینبغی أن لا یعامل غیرہ بہ'' (احیاء العلوم ۲؍۷۰)، اسی لئے بہتر ہے''خیر الأمور أوسطھا'' (بدائع الصنائع ۱؍۲۳۳) کے تحت درمیانہ راہ اختیار کریں۔

جواب (۵): بیع وشراء میں اگر دھوکہ دیا جائے تو مشتری کیلئے خیار کا حق ہوتا ہے، حنفیہ کے نزدیک رفقا علی الناس یہی فتوی منقول ہے (تبیین الحقائق۴؍۳۱۶،ردالمحتار علی الدر۵؍۱۴۳)، مالکیہ کے مشہور قول کے مطابق اسے بائع کے دھوکے یا دلال کے غبن فاحش کے ساتھ خاص کیا گیا ہے (مواھب الجلیل۶؍۳۵۰، حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر۲؍۲۸۸)، اس لئے کہ ان کے نزدیک راجح یہ ہے کہ قول کے ذریعہ دھوکہ دینا عقد میں تضامن کو لازم نہیں کرتا؛ بلکہ فعلا ہوتو ضمانت ہوتی ہے، حاشیہ العدوی میں ہے ''وحل عدم الضمان فی الغرور القولی ما لم ینضم لہ عقد، وإلا فیضمن کأن یقول ھی سلیمۃ، ویتولی العقد علیھا فھو کالفعل''(حاشیۃ العدوی علی الخرشی۷؍۲۶)، غبن فاحشہ ہو یا نہ ہو فقہاء شوافع خیار دیتے ہیں(تکملۃ المجموع للسبکی۱۳؍۱۵-۱۲؍۱۰۱)، حنابلہ کا ظاہری مذہب یہی ہے کہ اگر غبن فاحشہ ہے تو خیار ہے ورنہ نہیں ہے (کشاف القناع۳؍۲۱۳)، اور ان سب کی حجت یہ ہے ؛چونکہ بائع یا اس کے وکیل نے تدلیس کی،دھوکہ دیا اور مسلم کے ساتھ خلابۃ (دھوکہ)جائز نہیں ہے،اور جب یہ ثابت ہوجائے تو اسے غش فی التصریۃ (بکری کے تھن کا دودھ) اور متلقی الرکبان کے مشابہ ماناجائے گا، اور یہ بھی واضح ہے کہ مشتری نے دھوکے کی وجہ سے بیع کی ہے؛ ایسے میں جب دھوکہ ختم ہوگا تو رضامندی ختم ہوجائے گی، اور جب رضامندی ہی نہ رہی تو بیع کا انعقاد نہیں ہوسکتا (الروضۃ الندیۃ شرح الدرر البھیۃ لمحمد صدیق حسن خان۲؍۱۱۶، ط: ۲بیروت)۔

گزشتہ تفصیلات کی روشنی میں یہ خیال آتا ہے کہ بیع وشراء میں اصل تراضی

ہے، اب جب خریدار خود ملاوٹ والا مال لینے پر راضی ہے،اور ا س کی منشا(سستا مال) بھی پوری ہورہی ہے؛ایسے میں بظاہر اس شکل میں کوئی قباحت نہیں؛البتہ عیب (ملاوٹ) نہ بتانے کی صورت میں مشتری کو خیار حاصل ہوگا؛یہی رفقا علی الناس زیادہ مناسب ہے؛ نیز دھوکہ دینے پر ممکن ہوتو بائع کی افہام وتفہیم کی جائے،اور اگر کوئی نتیجہ نہ نکلے تو ''پیمینٹ بل'' کے ذریعہ مناسب کاروائی بھی کی جاسکتی ہے، تاکہ آئندہ دوسرے مشتری کو دھوکے سے محفوظ کیا جاسکے،واللہ اعلم۔

جواب (۶):شریعت میں قیمتوں پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے ؛بلکہ اسے بیچنے والے اور خریدار پر چھوڑ دیا گیا ہے،اسی لئے قرآن کریم مینہے:''یاأیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم'' (نساء: ۲۹)، یعنی یہ آپسی رضامندی سے جو قیمت طے کر لی جائے وہی مناسب ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے بھی کوئی تحدید نہیں کی ہے؛ البتہ علامہ زیلعی وغیرہ نے''تعسیر'' کی تعریف میں یہ بات نقل کی ہے :''التعسیر:إذا تعدی أصحاب الطعام تعدیا فاحشا''یعنی سامان کو جب ضرورت سے زیادہ پر بیچا جانے لگے تو وہ ''تعدی فاحش'' ہے (تبیین الحقائق۶؍۲۸، دیکھئے:ابن عابدین ۵؍۲۵۶)، امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''احیاء العلوم '' میں قیمتوں کے بڑھانے اور گھٹانے پر بحث کی ہے، اور احتکار کے ذیل میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ (احتکار) قیمت میں اضافہ کا سبب بنے تو جائز نہیں ہے،ساتھ ہی ان کا ماننا ہے کہ بعض صورتوں میں قیمتوں کی تحدید کردی جائے؛جیسے کہ غلہ جب کم پڑنے لگ جائیں یا قحط وغیرہ کا خطرہ ہو۔۔۔''ویحتمل أن یخصص بوقت قلة الطعام،وحاجة الناس إلیه حتی یکون فی تاخیر بیعه ضرراً،فأما اتسعت الأطعمة وکثرت واستغنی الناس عنها ولم یر غبوا فیها إلا بقیمة قلیلة، فانتظر صاحب الطعام ذلک، ولم ینتظر قحطا، فلیس فی هذا إضرار۔۔۔۔'' (احیاء العلوم۲؍۳۷۳)۔

دراصل ایک مسلمان دوسرے مسلمان کیلئے خیرخواہ ہوتاہے ،اس کی بعثت آسانیاں پیدا کرنے کیلئے ہوئی ہے،اسے چاہئے کہ لوگوں کیلئے مشکل پیدا نہ کرے ،اور ان کی حاجت روائی کی فکر کرے:''المسلم أخوالمسلم'' ومن کان فی حاجة أخیه؛کان الله فی حاجته'' (بخاری مع الفتح: ۲۳۱۰)، وقال:من یسر علی معسر یسر الله علیه فی الدنیا والآخرة (مسلم: ۴۸۷۳، جامع العلوم والحکم۲؍ ۲۸۴)، ''وقال:یسروا ولا تعسروا'' (بخاری: ۹۶، کتاب العلم)؛ لہذا یہ تو مناسب نہیں کہ قیمت کی تعیین کردی جائے؛ اتنا ضرور ہے کہ استحصال اور تعدی فاحش سے روکا جائے، اور امام غزالیؒ کے نقطہ نظر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کبھی حالات ناموافق ہوجائیں تو مناسب ہے کہ ملکی معیشت کا خیال کرتے ہوئے اور عوام کی خاطر قیمتوں میں مناسب تحدید کی جائے۔

محور سوم:

جواب (۱): بائع اپنے سامان پر پوری ملکیت رکھتا ہے،اور یہ بات مسلم ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا اختیار ہے،خواہ وہ اپنے سامان (استحصال سے بچتے ہوئے) کو کتنی ہی رقم میں فروخت کرے،یہ بات فریقین پر وارد ہوتی ہے کہ آیا دونوں راضی ہیں یا نہیں؟اس کے بعد اگر کوئی مشتری سے کسی شرط پر قیمت میں چھوٹ کی اجازت دیتا ہے، تو اس کا بھی اسے حق ہے،جیسا کہ حضور اکرمﷺ نے بھی یہ تلقین فرمائی ہے کہ مخاطب کے اعتبار سے اپنی متعینہ قیمت میں گنجائش پیدا کرو!،تو بہتر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا :جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دے (سنن ابن ماجہ۲،۲۴۴۴،۶۰)، لہذا صورت مسئولہ کی اولین تینوں صورتوں میں جواز معلوم ہوتا ہے،جس کی وجہیں درج ذیل ہیں:

الف:(۱)تجارت کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ وہ ''یاأیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم''(نساء: ۲۹)ہو، چنانچہ جب مخاطب کو معلوم ہے کہ وقت پر رقم کی ادائیگی میں ڈسکاونٹ ملے گا ،جس پروہ خود راضی بھی ہے؛ ایسے مینبیع کے جواز میں کوئی رکاوٹ معلوم نہیں ہوتی۔

(۲) یہ بھی واضح ہے کہ بائع کی طرف سے ملنے والا ڈسکاونٹ بطور انعام ہے،اس رقم کا مد مقابل کوئی دوسری رقم نہیں ہے،بلکہ یہ تشجیعی اور رغبتی اسکیم ہے،جس سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ب:یہ بات بھی طے ہے کہ فقہ اسلامی میں عرف کا ایک خاص مقام ہے،اسے بطور دلیل کے پیش کیا جاتاہے،جب تک کہ وہ کسی نص قطعی سے معارض نہ ہو،چنانچہ فقہاء کا ماننا ہے:''الثابت بالعرف کالثابت بدلیل الشرعی''، ''المعروف بالعرف کالمشروط باللفظ''، ''الثابت بالعرف کالثابت بالنص''، ''المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً''، ''المعروف بین التجار کالمشروط بینهم'' (دیکھئے:شرح مجلة الاحکام:ص۵۱،المادة: ۴۴، اشباه للسیوطی: ۹۲، وللمصری: ۹۹،وجیز: ۲۵۱،والقواعد للندوی: ۶۵) ،نیز معاملات کی قسموں میں اصل اباحت ہے جب تک کہ وہ کسی مسلم اصول سے نہ ٹکرائے''الأصل فی المعاملة الإباحة''، لہذا مارکیٹ کے چلن کا اعتبار کرتے ہوئے، اس صورت میں گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ج:(۱)اس صورت میں اگرچہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بائع کسی طرح دھوکے کا مرتکب ہے، اور اس کی زد مشتری پر آرہی ہے؛ اگر ایسا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام میں دھوکہ دینا اسوہ نبوی کے خلاف ہے ''من غشنا فلیس منا'' (مسلم: ۱۰۱)، معاملات میں اسے ''غرر'' سے تعبیر کرتے ہیں، غرر کی اصطلاحی تعریف میں گو کہ اہل علم کی تعبیرات مختلف ہیں ؛لیکن حاصل ان سب کا یہی ہے کہ غرر وہ بات ہے، جس کا انجام

معلوم نہ ہو ''الغرر مایکون مستور العاقبۃ'' (مبسوط۱۳؍۹۴۱)، علامہ جرجانی لکھتے ہیں: ''بأنہ مایکون مجھول العاقبۃ لا یدری أیکون أم لا ''(التعریفات للجرجانی)،حقیقت یہ ہے کہ غرر کی صورت ہے اور یہ مفضی الی النزاع ہے، اسی لئے حرام ہے(فتاوی ہندیہ۳؍۳)؛ لیکن اگر معمولی غرر ہو یا جہل ہو جو مفضی الی النزاع نہ ہو تو معاملہ پر اثر نہیں پڑتا ''فأما إن کان أحدھما مجھولا جھالۃ مفضیۃ المنازعۃ فسد البیع وإن کان مجھولا جھالۃ لا تفضی إلی المنازعۃ لا یفسد الخ''(بدائع الصنائع۴؍۵-۳۶۶)۔

(۲)صورت مسئلہ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہےکہ یہ ایک انعامی صورت ہے، جو مشتری کیلئے رغبتا دی جارہی ہے،حالانکہ بیع وشراء کی اصل تکمیل ہوچکی ہے، اس سے اس رقم کا کوئی تعلق نہیں ہے،لہذااس ڈسکاونٹ میں شرعا کوئی قباحت نظر نہیں آتی، واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

جواب (۲): بیع کی قسموں میں ایک بیع استصناع بھی ہے ،لغت میں کسی چیز کو بنانے کیلئے آرڈر دینا استصناع کہلاتا ہے''واستصنع الشئی:دعا إلی صنعہ'' اور کہا جاتا ہے ''استصنع الشئی'' اس نے فلاں چیز بنانے کا حکم دیا (لسان العرب۷؍۴۶۰، القاموس المحیط۳؍۸۶۰)، اصطلاح شرع میں کسی انسان کا کسی چیز کے کاریگر سے متعین قیمت کے عوض کوئی چیز بنانے کا حکم کر نا اور ساتھ ہی اس کی نوعیت ،مقدار اور صفت کو بیان کر دینا اور کاریگر کا اسے قبول کر لینا ''استصناع '' کہلاتا ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں :''أما صورۃ الاستصناع فھی أن یقول إنسان لصانع من خفاف أو صفار أو غیرھما: اعمل خفا،أو آنیۃ من أدیم أو نحاس من عندک بثمن بکذا،وبین نوع مایعمل وقدرہ وصفتہ فیقول الصانع :نعم''(بدائع الصنائع۴؍۵۳)، ایک دوسری جگہ پر ہے کہ یہ وہ عقد مبیع ہے جس میں عمل شرط ہے ''عقد علی مبیع فی الذمۃ شرط فیہ العمل'' (بدائع۲؍۲۶۷، دیکھئے:مبسوط للسرخسی۱۲؍۱۳۸، تحفۃ الفقھاء۲؍۵۳۸،مجلۃ الحکام العدلیۃ:المادۃ؛۳۸۸،اور حنابلہ کیلئے دیکھئے: کشاف۳؍۱۳۲، الفروع ۲ ؍۴۵۸)۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں کہ اس معاملہ پر حضور اکرمﷺ سے ہی اجماع ثابت ہے''والإجماع من لدن رسول اللہ ﷺ دون نکیر''(بدائع الصنائع ۶؍۲۶۷)۔

دراصل یہ بیع ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے بالخصوص اس کے چند شرائط ہیں:۔

۱۔بیع کی جنس متعین ہو مثلاً: گیہوں،چاول وغیرہ۔

۲۔نوع اور قسم متعین ہو،مثلاً چاول ہے تو کونسی قسم کے؟،اگر مصنوعی چیز ہے تو کمپنی کی شناخت اور کہاں سے بنے ہوئے ہوں اس کی وضاحت ضروری ہے۔

۳۔مال کی صفت متعین ہو :ہائی کوالٹی ،یا کچھ اور۔

۴۔مقدار معلوم ہو مثلاً:کتنا کلو یا کس سائز کا؟۔
۵۔ادائیگی کی مدت معلوم ہو: سامان کب دیا جائے۔
۶۔ثمن کی مقدار اور صفت معلوم ہو : کتنے پیسے اور کونسی کرنسی ہوگی۔
۷۔ سامان کی کچھ رقم پیشگی ادا کرنا ہے یا پوری رقم دینا ہے۔
۸۔بائع مشتری کہاں سے سامان پہنچائے گا۔
۹۔ایسی چیز بنوائی جائے جس کا عام رواج ہوگیا ہو۔
۱۰۔مال تیار کرنے کے تمام اجزاء یا اکثر کاریگر کے ہوں، ورنہ اجارہ ہوجائے گا (دیکھئے:درسی و تعلیمی اہم مسائل: ۳۴۱، جدید معاملات کے شرعی احکام ۱،۱۲۴)۔

جب ا س طریقہ کار کو مستقل بیع(استصناع) کا درجہ حاصل ہے،تو ایسے میں اسے انجام دینے والے مزدور بھی اجرت کا استحقاق رکھتے ہیں، بلکہ کسی مزدور کی مزدوری اور محنتی کا محنتانا نہ دینا غیرشرعی ہے ،حضور اکرمﷺ نے فرمایا کہ مزدوروں کوانکی مزدوری پسینہ سوکھنے سے پہلے دیدو ''اعطوا الأجیر أجرہ قبل أن یجف عرقہ'' (ابن ماجہ فی الرھون من سننہ)، ''من استاجر أجیراً فلیعلمہ أجرہ''(رواہ البیھقی)، اور اس کا لینا بھی عین جائز ودرست ہے؛ کیونکہ حضور ﷺ نے ایسے مزدوروں کی جانب سے خصامت کا اعلان کیا ہے؛ جن کی مزدوری نہ دی جائے''ثلاثۃ أنا خصمھم یوم القیامۃ وعد منھم رجلاً استاجر أجیراً فاستوفی منہ ولایعطیہ أجرہ''(صحیح البخاریـ:'فی البیوع والاجارۃ '، وابن ماجہ :'فی الرھون ')۔ نیزفقہ اسلامی کا ماننا یہ ہےکہ نہ تو کسی کو نقصان پہونچایا جائے اور نہ ہی کسی پر نقصان کا بوجھ ڈالا جائے،بلکہ ہر ممکن ضرر کو دور کیا جائے، ''لا ضرر ولا ضرار''(الأشباہ للسیوطی: ۷۵،۷۶)، ''الضرر یزال''(الاشباہ لابن نجیم : ۸۳)، ''الضرر یدفع بقدر الإمکان'' (الوجیز: ۱۹۸)۔

ان توضیحات وتشریحات کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرف ورواج کو کسی کے استحصال کیلئے قبول نہیں کیا جاسکتا ہے،اور اس بنا پر کسی مزدور کو اس کی مزدوری سے محروم کرنا دراصل ناانصافی ہوگی؛البتہ اتنا کہاجاسکتا ہےکہ ایک مناسب شرح کے اعتبار سے مزدوری کم کر دی جائے؛تاکہ دونوں فریقین کے حق میں معاملہ آسان ہوجائے،واللہ اعلم۔

جواب (۳): شریعت اسلامی میں دھوکہ دینا منع ہے ،حضور اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کو دین محمدی سے پرے قرار دیا ہے ،چونکہ وطن عزیز میں مسلمانوں کے لئے رہائش ؛قانون وآئین کے تحت ہے ،اور یہاں کی حکومت بھی دستور کی پابند ہے ،جو ایک گونا مسلمانوں کا عہد و قرار نامہ بھی ہے ،ایسے میں فرمان نبوی ﷺ بہت اہم ہے ''المسلمون علی شروطھم '' (ترمذی: ۱۳۵۲)،یعنی مسلمان اپنے معاہدوں کے پابند ہوتے ہیں

،خواہ وہ کسی اقلیت میں ہی کیوں نہ ہوں ؛ چنانچہ ڈاکٹر صلاح الدین سلطان لکھتے ہیں:''ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کے واجب ہو نے میں تو کوئی اشکال نہیں بشرطیکہ وہاں کے باشندوں کا ہم سے تعلق مصالحانہ ہو ،اسی طرح قوانین کی پابندی اور نظم و نسق کی تعمیل بھی ہر قسم کے اشکال سے پاک ہے، شرط یہ ہے کہ وہ ہماری شریعت کے خلاف نہ ہوں ''(دیکھئے: فقہ الاقلیات، تعارف، اصول ۔۳۷)، قرآن کریم کا بھی یہ قاعدہ ہے کہ ''تعاونوا علی البر والتقوی''(بقرۃ: ۲)، اس لئے حکومت کے ہر بھلے کام میں شرکت کرنا ایک گونا ایمانی تقاضہ ہے،نیزفقہاء نے حاکم وقت کو مصلحتاً قانون سازی کی اجازت دی ہے اور انہیں ماننا رعایا کا فریضہ ہوتا ہے:''تصرف الإمام منوط علی المصلحۃ'' (اشباہ للسیوطی: ۸۳، اشباہ لابن نجیم: ۱۳۷)،''أطیعواالله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم''(نساء: ۵۹)۔

البتہ اتباع حرام کو حلال کرنے یا حلال کو حرام کرنے میں جائز نہیں ''المسلمون علی شروطھم إلاشرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً''(ابن ماجہ: ۳۵۳)، اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے: ''لا طاعۃ لبشر فی معصیۃ الله إنما الطاعۃ فی المعروف''(مسند احمد: ۱۷۹)، علامہ عبدالقادر عودۃ لکھتے ہیں :کسی ولی امر کو حق نہیں کہ وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی''لا یملک ولی الأمر أن یحل ما حرمہ الله جل جلالہ أو یبیح مالم یبحہ الله فإذا فعل فعملہ باطل ولا أثر لہ''(التشریع الجنائی الاسلامی۱،۲۸۱)،اس سلسلہ میں فقہاء کرام کا ایک قاعدہ بھی مشہوراور زبان زد ہے:''لا سلطان للعقد فی التحریم والتحلیل''۔

حقیقت یہ ہے کہعصر حاضر میں حکومت کی جانب سے عوام کو خواہ کمیونسٹ ہو یا جمہوری بہت حد تک بے جا؛بلکہ ظالمانہ ٹیکس کا مکلف بنا دیا ہے ،اور نت نئی ترکیبوں کے ذریعہ ، صریح عدم توازن اور شخصی تفاوت کے ساتھ ان کی جیبوں پر شب خوں مارا جارہا ہے،حالانکہ ٹیکس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر جائز اخراجات دیگر جائز ذرائع سے پورے ہوجاتے ہوں، تو عوام پر ٹیکس لاگو کرنا جائز نہیں ،لیکن اگر حکومت کے جائز اخراجات اس کے بغیر پورے نہ ہوتے ہوں؛ جیسا کہ ہمارے زمانے کا حال ہے تو مندرجہ ذیل چند شرائط کے ساتھ ٹیکس لگانے کی گنجائش ہے:۔

۱۔صرف بقدر ضرورت ہی ٹیکس لگایا جاے۔''ما أبیح للضرورۃ یقدر بقدرھا'' (ابن عابدین۵،۲۳۷، روضۃ الطالبین۹،۱۰۴، المغنی۹،۱۴۵)۔

۲۔ٹیکس کی مقدار لوگونکیلئے قابل برداشت ہو۔

۳۔اس ٹیکس کی وصولی کا طریقہ لوگوں کیلئے ایذا رساں نہ ہو ۔

جن ٹیکسوں میں یہ شرائط موجود نہ ہوں وہ ظالمانہ ٹیکس ہیں،اور چونکہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں خاص کر انکم ٹیکس میں یہ شرائط موجود نہیں ،لہذا حکومت پر

لازم ہے کہ اپنے ٹیکسوں کے قوانین پر نظر ثانی کرے اور صرف جائز اور ضروی حد تک ٹیکس لگائے ،محض اپنے خزانے بھرنے اور بے جا فضول خرچی کر نے کیلئے ٹیکس پر ٹیکس نہ لگائے،نیز ظالمانہ ٹیکس (جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے)سے بچنے کے لئے یا تو حکومت سے گفت و شنید کرکے کوئی صورت نکالی جائے جس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہ ہو ؛لیکن اگر حکومت سے گفت و شنید کرکے بھی (خصوصاً ہمارے ملک میں ہندوستان میں)ظالمانہ ٹیکسوں سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہ بن سکے ؛تو ایسی صورت میں بطور حیلہ (اپنے نام کاغذ نہ بنواکر) یا کاغذات میں کم منافع ظاہر کرنے کی گنجائش ہے ،بشرطیکہ کسی خلاف شرع امر مثلاً رشوت وغیرہ کا ارتکاب لازم نہ آئے (دیکھئے:فتوی از:دارالافتاء دارالعلوم کراچی۔ فتوی نمبر ۱۶۳۱،۹-www.askmahad.com)۔

ان بنیادی وضاحتوں کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ان تاجروں پر لگائے گئے قوانین ظالمانہ ہیں،تو ایک حد تک حیلہ کرنے کی اجازت ہے ،اور اگر مناسب ہو تو چاہئے کہ ''تعاونوا علی البر والتقوی'' کے تحت ایمانداری اور دیانت داری کا ثبوت پیش دیں،واللہ اعلم۔

جواب (۴):اصل بات یہ ہے کہ ایکسپورٹ وغیرہ میں کم قیمت لکھوانا بھی ٹیکس سے بچنے کا ایک حیلہ ہے،جو عمومی رائج ہے،مذکورہ بالا بحث کے مطابق اس صورت کا بھی وہی حکم ہوگا،یعنی اگر یہ کام کسی ظلم اور تعدی سے بچنے کیلئے کیا جارہا ہے،تو گنجائش ہوگی ورنہ ایسا کرنا مناسب نہیں؛البتہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق سرکار سے نہ ہو، بلکہ حفاظتی نقطہ نظر سے کیا جارہا ہو؟تو ظاہر ہے کہ بیع وشراء میں آپسی رضامندی اور مستقبل مینکسی قسم کا نزاع نہ ہونااصل ہے، اس لئے اگر یہ صورت ان مضرات سے خالی ہے ،تو پھر یہ عمل درست کہلائے گا،واللہ اعلم۔

جواب (۵):جب کوئی کسی کو اجرت پر رکھ کر ا س سے کام لیتا ہے تو گویا وہ فریقین آپس میں ایک معاہدہ کے تحت ہوتے ہیں،ایک طرف سے سامان اور دوسری طرف سے قیمت ہوتی ہے،ایسے معاہدہ کا پورا کرنا عین اسلامی حکم ہے، قرآن کریم میں ہے:''یاأیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود۔۔۔'' (مائدۃ: ۱)،ایک اور مقام پر ہے:''وأوفوا بالعهد إن العهد کان مسئولا''(اسراء: ۳۴)، یعنی اگر عہد وعقد کو پورا نہ کیا گیا اور خیانت کی گئی تو عنداللہ بازپرس بھی ہوسکتی ہے،نیز حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ آپس میں کئے گئے عہد وشرائط کو پوارا کریں ''المسلمون علی شروطهم'' (دیکھئے:بخاری مع الفتح۴،۴۵۱)۔

اسی طرح قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس کے مطابق بہترین مزدور وہ ہوتا ہے، جس کے اندر کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہو اور وہ پوری طرح سے ایماندار بھی ہو''قالت إحداهما یا أبت استأجره إن خیر من استأجرت القوی الأمین'' (قصص: ۲۶)،اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مزدور کا اپنے اجیر کے ساتھ خیانت کرنا قرآنی وصف کے

خلاف ہے،اس لئے صورت مسئولہ میں کاریگر کیلئے جائز نہیں کہ وہ مالک کے جواہرات میں خیانت کرے اور جھوٹ(جو کہ گناہ کبیرہ ہے) کا سہارا لے،یہ نہ صرف دینی بلکہ عمومی احساس ذمہ داری ودیانت داری کے خلاف ہے،جس کا انکار دنیاوی قوانین میں بھی نہیں ہے (دیکھئے:محمودالفتاوی۲؍۴۸۳)، واللہ اعلم۔

جواب (۶): اس سلسلہ میں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے :

الف:بائع کیلئے ضروری ہے کہ وہ مبیع کے متعلق مشتری کو باخبر کردے،اور معاملات میں سچائی ،وشفافیت کو اختیار کرے ،اگر ایسا کیا گیا تودونوں متعاقدین ا س حال میں جدا ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ رب العزت برکت نازل فرماتا ہے،ورنہ برکت ختم کردی جاتی ہے:''فإن صدقا وبينا بورک لهما فی بيعهما، وإن كذبا وكتما محقت بركة بيعهما'' (بخاری: ۲۰۷۹،مسلم: ۱۵۳۲)،ایک اور روایت میں ہے کہ کسی مسلمان کیلئے یہ درست نہیں کہ اپنے بھائی کو کوئی ایسا مال بیچے جس کے اندر عیب ہو اور وہ اس کی وضاحت نہ کرے:''المسلم أخوالمسلم ،ولا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا فيه عيب إلابينه له''(ابن ماجہ: ۲۲۴۶)، علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہےکہ نے تدلیس یعنی عیب کو چھپا نا خواہ مشتری کے علم میں ہو یا نہ ہو، خواہ اسے مغالطہ یا وہم میں مبتلا کرکے بیچا رہا ہو؛یہ سب حرام ہے (المغنی۴؍۱۱۳)، شیخ خلیل ابن اسحاق لکھتے ہینکہ معاملات میں ناپسند چیزوں کی وضاحت کردینی چاہئے،جس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ خرشی کا کہنا ہے :بائع کو چاہئے کہ وہ مشتری کے سامنے مبیع کی حقیقت کھول کر رکھ دے،یہ اس پر واجب ہے (جواھر الاکلیل شرح مختصر العلامۃ خلیل۲؍۸۶)۔

ب:یہ بات آچکی ہے کہ اسلام میں بیع وشراء باہمی رضامندی پر مشتمل ہے، نیز اس کے اندر عرف کا بھی خیال رکھا گیا ہے،بشرطیکہ کسی نص قطعی سے نہ ٹکرائیں،اسی لئے علامہ ابن تیمیہ نے وضاحت کی ہے کہ معاملات میں اگر کوئی نئی صورت پیش آئے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہ کرتی ہو ؛تو اسے جائز مانا جاتا ہے:''والأصل فی هذا أنه لايحرم على الناس من المعاملات التی يحتاجون إليها إلا مادل الكتاب والسنة على تحريمه ----------''(مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ۲۸؍۳۸۶)۔

چنانچہ صورت مسئولہ میں اگر بائع ہیرے میں دھاگے کے آٹھ گرام ہونے کی وضاحت کردےتو زیادہ اولی وافضل ہے،اگر ایسا نہ بھی کیا جائے اور اسے دس گرام کا ہی تصور کیا جارہا ہو،جو بازار میں عام رواج سمجھا جاتا ہو؛نیز اس سے کسی قسم کا عیب لاحق نہ ہوتا ہو اور نا ہی کوئی مفضی الی النزاع ہونے کا خطرہ ہو تو یہ صورت بھی درست ہوگی،واللہ اعلم بالصواب۔

جواب (۷): بیع وشراء کے اصول وضوابط کے تحت صورت مسئولہ میں جواز معلوم ہوتا ہے،لیکن دیکھا جائے تو یہ بات بھی محل نظر ہے کہ ایک طرف جہاں مسلمانوں

کے ساتھ خیر خواہی اور حسن سلوک کی تلقین ہے،اور انہیں آپس میں ''إنما المؤمنون إخوة'' قرار دیا گیا ہے،ایسی صورت میں خود زیادہ فائدہ لینا اور دوسرے کو مناسب فائدہ نہ دینا، مناسب بات نہیں ہے، نیز ''لاضرر ولا ضرار'' کے قاعدہ مسلمہ کے بھی خلاف ہے، اس لئے ایسے عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گئی،اور ہوسکے تو مبتلی بہ کو مناسب طریقہ پرفہم وفہمائش کی کوشش کی جائے گی۔

جواب (۸): آج عموما بازاروں میں خیانت رائج ہے،مالک سے سامان لے کر یا تجارت کی غرض سے مال لے کر ا سکے ساتھ دھوکہ کرنا عام ہوگیا ہے،صورت مسئولہ بھی اسی سنگینی کا ایک حصہ ہے،یعنی خیانت ،جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا،حضرت موسی علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دولڑکیوں کے بکریوں کے پینے کیلئے پانی بھر دیا تھا، تو ان دونوں نے واپس جاکر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور کہا کہ یہ بڑے امانت دار اور طاقت ور ہیں،ان کو اپنے گھر میں ملازم رکھ لیجئے!،قرآن اس کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:''یا أبت استأجره إن خير من استأجرت القوى الأمين'' (قصص : ۲۴)۔

اسی طرح امانت داری کو حضور اکرمﷺ نے ایمان کی علامت قرار دیااور فرمایا:''لاإيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عهد له'' (بیھقی: ۱۲۴۹)،ایک روایت میں یہ پیشن گوئی کی گئی ہے کہ قیامت کے اخیر میں امانت دار کم ہوجائینگے (صحیح بخاری:کتاب الفتن)،خود اللہ تبارک وتعالی نے متعدد مقامات پر امانت داری کا خیال کرنے کی وصیت فرمائی ہے،ارشاد باری ہے:''فليود الذى أوتمن أمانته وليتق الله ربه''(بقرة: ۲۸۳) یعنی جو امین بنایاگیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کرے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

چنانچہ جب کوئی کسی کا مال فروخت کرنے کیلئے لیتا ہے تو وہ گویا اپنے ساتھ اس کی امانت و دیانت کا عہد کرتا ہے،اب اگر اس کی خلاف ورزی کرے اور صاحب مال کے ساتھ دغا کرے تو شرعا یہ خیانت، دھوکہ، جھوٹ اور مکر کے حکم میں ہے،یہ تمام بڑے گناہوں میں ہیں،جو ایمان واسلام کے مغائیر ہیں،نیز کسی کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر کھانے کی اجازت نہیں،یہی وہ شکل ہے جسے اموال باطل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے،جو کہ حرام ہے ؛ایسے مینضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے بچا جائے،واللہ الموفق۔

محورم چہارم:

جواب (۱،۲): بیع وشراء میں اصل اباحت ہے، اللہ تعالی کا راشاد ہے:''أحل الله البيع وحرم الربا'' (بقرة: ۲۷۵)، چنانچہ جب باہمی رضامندی پائی جائے؛ تو بیع جائز ہے،اور اگر ایسا نہ ہوتو ناجائز ہے(نساء: ۲۹)، نیز بیع وشراء میں ایک قسم ''بیع بالتقسیط ''کی ہوتی ہے، عموما فقہاء نے اس کے جواز کا حکم دیا ہے،علامہ ابن قدامہ نے اس کی حکمت یہ

بیان کی ہے کہ اس کے اندر ثمن کی تخفیف ہونے کی وجہ سے مشتری کا فائدہ ہوتا ہے،اسی لئے جواز ہے:''وبیع السلم جائز بالنص والإجماع، وشبیہ ببیع التقسیط، وذکر العلماء من حکمتہ أنہ ینتفع المشتری برخص ثمن، والبائع بالمال المعجل، وھذا دلیل علی أن للأجل فی البیع نصیبا من الثمن، وأن ھذا لابأس بہ فی البیوع'' (المغنی۶؍۳۸۵)۔

چنانچہ نقد معاملہ میں ۶ یا ۸ فیصد کم کرکے معاملہ کرنا یا پیسوں کی فوری ضرورت پر کچھ کمی کرکے پیسے لینا درست ہے،کیونکہ متعاقدین کی رضامندی شامل حال ہے اور یہ قاعدہ بھی مسلم ہےکہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا حق ہے،اس کے علاوہ مذکورہ بیع وشراء کے مخالف قواعد میں سے ایسا کوئی قاعدہ نہیں پایا جاتا ؛ جس سے صورت مسئلہ متاثر ہو، واللہ اعلم۔

جواب (۳): بیع وشراء میں اصل یہ ہے کہ جب اس کے ارکان وشرائط پائے جائیں اور ملکیت تبدیل ہوجائے تو بیع ختم ہوجاتی ہے،تاہم شریعت نے متعاقدین کے درمیان باہمی مصلحت کی خاطر خیارات بھی مشروع کی ہیں،تاکہ ایک دوسرے سے ضرر کور دکیا جائے؛نیز نزاعات وخصومات کو دور کرنا بھی شریعت کے اہم مقاصد میں سے ہے،اسی طرح عدل ومساوات قائم کرنا اور معاملات سے ظلم کے عناصر ختم کرنا بھی ضروری ہے، فقہاء نے تقریبا ''خیارات '' کی بیس قسمیں بتلائی ہیں،ان میں چار اہم یہ ہیں (دیکھئے: بدائع الصنائع۵؍۳۳۸، القوانین الفقہیۃ: ۱۶۴، مغنی المحتاج۲؍۳۰ تا ۹۴، کشاف القناع۳؍۱۸۰ تا ۲۳۶، الفقہ الاسلامی وادلتہ۴؍۵۱۹تا ۵۲۲، المدخل لدراسۃ الشرعیۃ الاسلامیۃ: ۳۷۷ ومابعدھا، ضوابط العقد فی الفقہ الاسلامی: ۲۶۶ تا۲۹۲)۔

۱ :-خیار المجلس:اس صورت میں ایجاب وقبول کے بعد(محل عقد میں ،علی الاختلاف) ہر ایک کو اختیار ہوتا ہے۔

۲ :-خیار الشرط:اس صورت میں متبائعین میں کوئی کسی خاص مدت کیلئے شرط لگا دے،خواہ اس کی کتنی ہی مدت ہو۔

۳ :-خیار العیب:اس میں متعاقدین اس بات پرراضی ہوتے ہیں کہ اگر کوئی عیب پایا جائے تو بیع فسخ کرنے کی اجازت ہوگی۔

۴ :-خیار الرویا:اس میں مشتری کو حق ہوتا ہے کہ بیع کے بعد اگر کوئی چیز اقتضاء حال کے خلاف ہوتو بیع فسخ کردے۔

صورت مسئولہ خیار عیب سے تقریبا مناسبت رکھتا ہے،وہ اس طور پر کہ فقہاء نے خیار عیب کی دو قسمیں کی ہیں:

۱۔وہ عیب جو قدیم ہو، ناکہ جدید ہو۔

۲۔تاجروں کے عرف میں مبیع میں وہ عیب پایا جائے جو اس کی قیمت کم کردے۔

اس طرح کا معاملہ جب سامنے آئے تو فقہاء کا کہنا ہے کہ فورا بیع فسخ کرے،اگر

تاخیر کی گئی تو اختیار ختم ہوجائے گا (المهذب۱/۲۷۴، حاشیۃ الدسوقی۳/۱۲۷)؛ جبکہ احناف اور حنابلہ تراخی (تاخیر کے ساتھ بھی) اختیار دیتے ہیں،اور ان کے نزدیک یہ اختیار تب تک ساقط نہیں ہوتا؛ جب تک دونوں رضامندی کا اظہار نہ کردیں،اس لئے کہ خیار کی مشروعیت ہی ضرر کو دور کرنے کیلئے ہے؛ خواہ وہ تاخیر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو (حاشیۃ ابن عابدین۴/۹۳، المغنی ۴/۱۴۴) ۔

یہاں پر دائمی کمیٹی کا ایک فتوی نقل کیا جاتا ہے،جو اس مسئلہ پر تشفی کیلئے کافی ہے:''اگر سامان میں ایسا عیب ہے،جس سے اس کی قیمت کم ہوجاتی ہے،یا اس سامان میں کمی ہو،جس سے خریدار کو گھاٹا ہوجائے، تو بیچنے والے کیلئے خریدار پر اس عیب کا چھپانا حرام ہے،اگر یہ عیب عقد طے ہونے سے پہلے سامان میں موجود تھا اور خریدار کو پتہ نہیں چلا، مگر اس وقت جب عقد طے ہوچکا ہے،تو خریدار کو اختیار ہے،چاہے تو سامان کو رکھ لے اور چاہے تو اس عیب کا معاوضہ لے لے،اور معاوضہ کی رقم صحیح اور خراب سامان کے بیچ کی قیمت ہوگی،مثلا صحیح سامان کی قیمت نکالی جائے گی اور پھر عیب دار سامان کی ،پھر خریدار بائع سے دونوں قیمتوں کے مابین فرق کی قیمت لے لے گا،نیز خریدار کو یہ بھی اختیار ہے کہ سامان کو واپس کردے،اور بائع سے اس کی قیمت لے لے،،اس بیع کا نام ''بیع میں اختیار '' کا نام دیا جاتا ہے،اس کی دلیل عقبہ بن عامر ؓ کی روایت ہے،کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:ایک مسلمان دوسرے مسلمان میں بھائی ہے، اور اپنے بھائی سے سودا کرتے وقت کسی مسلمان کیلئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے سامان میں موجودعیب ہو تو اس کیلئے وضاحت نہ کرے (ابن ماجہ۲/۷۵۵)، ایک اور روایت میں ہے:کسی مسلمان کیلئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی عیب دار سامان تجار کوفروخت کرے، مگر یہ کہ اس عیب کی وضاحت کردے (بخاری ۳/۱۰)،ایک اور روایت میں ہے: ''خرید وفروخت کرنے والے کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک دونوں جدا نہ ہوجائیں ،اگر انہوں نے سچائی سے کام لیا اور ہر چیز کو صاف صاف بیان کیا تو ان کے فروخت میں برکت دی جاتی ہے،اور اگر چھپایا اور جھوٹ سے کام لیا ،تو ان کے فروخت کی برکت مٹادی جاتی ہے '' (۱۳/۲۱۲، دیکھئے:سوال نمبر: ۱۹، فتوی نمبر: ۱۹۶۳۷ alifta.net)۔

جواب (۴): اسلام میں دھوکہ دینا یا دغا کرنا ناجائز ہے،بیع وشراء میں اگر ایسا کیا جائے تو خدا تعالی برکت ختم کردیتے ہیں،حتی کہ انہی خطرات سے بچنے کیلئے خیارات کی مشروعیت ہے،چنانچہ ہونا تویہ چاہئے کہ جب کسی مال کے تعلق سے دھوکے کا اندیشہ ہوتو خیارات کے تحت بیع وشراء کی جائے(صحیح مسلم: ۱۵۳۳،باب من یخدع فی البیع) ؛ تاکہ دونوں کے درمیان اعتماد بحال رہے،اگر ایسا نہیں ہے تب بھی آپسی امانت ودیانت کا ثبوت دیتے ہوئے معاملہ میں گنجائش پیدا کرنی چاہئے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو

قاضی کا سہارا لیا جاسکتا ہے(المهذب۱؍۲۷۴، حاشیۃ الدسوقی۳؍۱۲۷)، اس حکم کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے:

الف:بائع کا مطلوب مفقود ہے،اسی لئے اسے اختیار ہے؛نیز عرف ورواج میں بھی اصل حیثیت خالص مال کی ہوتی ہے؛جبکہ غیر خالص مال دینے کی صورت میں دھوکہ دھڑی بھی ثابت ہوتی ہے،یہ تمام پہلو شرعی اعتبار سے ناقابل قبول ہیں۔

ب:سرٹیفکیٹ اس بات کی دلیل ہے کہ خالص مال کی بیع وشراء ہوئی ہے؛لیکن معاملہ واقعہ کے خلاف ظاہر ہوا، اسی لئے یہ سرٹیفکیٹ بھی بطور گواہ اپنے معاملہ کو فسخ کردینے یا قانونی کاروائی کرنے اور اپنا حق حاصل کرنے پر شاہد ہے۔

ب:بائع کی حیثیت ایک طرح مظلوم کی بھی ہے،جسے غیر واقع معاملہ کے ساتھ بہلایا گیا ہے؛اور اپنے خالص کمائی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے،ایسے میں بحیثیت مظلوم بھی اپنی آواز بلند کرنے کا حق رکھتا ہے۔

جواب (۵):تجارت وپیشہ میں کئی دفعہ تنہا تجارت کرنا دشوار ہوتا ہے؛اسی لئے آپس میں مشارکت کی جاتی ہے،یہ شرکت مال ،عمل،وجوہ وغیرہ میں ہوا کرتی ہے،شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت دی ہے؛بلکہ یہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ،اجماع اور قیاس سے ثابت ہے،ابن قدامہ لکھتے ہیں:''هی ثابتة بالكتاب والسنة والإجماع''... ''وأجمع المسلمون على جواز الشركة فی الجملة''(المغنی۷؍۱۰۹)، علامہ شامی فرماتے ہیں: ''قيل مشروعيتها ثابتة بالكتاب،والسنة والمعقول،واختلفوا فی النص المفيد لذلک، قال فی الفتح:ولا شک أن مشروعيتها أظهر ثبوتا؛ إذ التوارث، التعامل بها من لدن رسول الله ﷺ وهلم جرا'' (ردالمحتار۷؍۳۲۶)۔

عام معاملات وخریدو فروخت کی طرح ا سکے اندر بھی حنفیہ کے یہاں صر ف دو ارکان ہیں،ایجاب اور قبول ،علامہ مرغینانی لکھتے ہیں:''الضرب الثانی:شركة العقود، وركنها الإيجاب والقبول، وهو أن يقول أحدهما، شاركتک فی كذا وكذا ، ويقول الآخر:قبلت'' (ہدایہ۲؍۶۲۴، دیکھئے:الفقہ الاسلامی وادلتہ۴؍۷۹۶)؛ لیکن جمہور کے نزدیک ایجاب وقبول کے صیغوں کے علاوہ معقود علیہ کو بھی ارکان کہتے ہیں،اس لئے مالکیہ ،حنابلہ اور شوافع کے نزدیک شرکت کے تین ارکان ہیں:۱-عاقدین۔۲-معقود علیہ(مال)۔۳-صیغہ ایجاب(ایجاب وقبول)''فأركانها ثلاثة: العاقدان،والمعقود عليه وهو المال والصيغة''(الشرح الصغیر ۴؍۴۵۶)، اس کے علاوہ اس کے اندربھی ہر مفضی الی النزاع اور وہ سامان جس کے ا ندر شرکت کی اہلیت نہ ہو وغیرہ کے پائے جانے کی صورت میں معاملہ منسوخ ماناجائے گا۔

شرکت کی قسموں میں دو صورتیں ایسی ہیں،جن سے صورت مسئلہ کا تعلق ہے،جن کا خیال ضروری ہے:

(١)شرکت املاک:اس کا مطلب یہ ہے کہ متعدد افراد کسی معین چیز کی حفاظت یا قول صحیح کے مطابق کسی چیز کے مالک بن جائیں ،چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:''(وهی أن یملک متعدد) إثنان فأکثر (عینا)أو حفظا،کثوب هبه الریح فی دارهما،فإنهما شریکان فی الحفظ ''قهستانی''أو (دینا)علی ماهو الحق''(ردالمحتار ٣٦٣،٦)، علامہ وھبہ زحیلی نے بھی اس کی تعریف ایسی ہی کی ہےکہ دو سے زائد افراد بغیر عقد مشارکت کئے کسی چیز کے مالک بن جائیں:''هی أن یمتلک شخصان فأکثر عینان من غیر عقد الشرکة''(الفقه الاسلامی وادلته ٧٩٤،٤)، اسی طرح ''الفقه المنهجی علی مذهب الإمام الشافعی٢١٨،٣'' میں ہے:''أن یملک إثنان فأکثر شیئا واحدا'' (دیکھئے:فتح القدیر٣٧٧،٥، مجمع الانهر٧١٥،١، بدائع الصنائع٧٣،٥، الجوهرة النیرة٣٤٤،١)۔

(٢) دوسری صورت شرکت ملک اختیاری ہے:یعنی عمل اشتراک مینان کے قصد وارادہ کا دخل ہو،مثلا دونوں مل کر کوئی سامان خرید لیں،یا ان دونوں کو کوئی چیز ھبہ کردی جائے اور وہ قبول کرلیں،تو وہ خریدی ہوئی چیز یا ھبہ کی ہوئی چیز ان میں مشترک ہوجائے گی،یعنی اس چیز کے دونوں ہی شرکت ملک کے اعتبار سے مالک ہوجائیں گے (دیکھئے:الفقه الاسلامی وادلته ٧٩٤،٤)، علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:''نوع یثبت بفعل الشریکین ونوع یثبت بغیر فعلهما أما الذی یثبت بفعلها فنحو أن یشتریاشیئا،أو یوهب لهما ،أو یوصی لهما،أو یتصدق علیهما،فیقبلا فیصیر المشتری والموهوب والموصی به والمتصدق به مشترکا بینهما شرکة ملک''(بدائع الصنائع٧٣،٥، مجمع الانهر٧١٥،١)، اسی طرح ''الفقه المنهجی علی مذهب الإمام الشافعی٢١٨،٣''میں ہے:''وقد یکون اختیاریا أی فعل منهما ورغبتهما ،کأن یشتریا شیئا واحدا معا،أو یقبلا هبة لهما من أحد ونحو ذلک''۔

صورت مسئولہ میں شرکت کی بات کہی گئی ہے،جو تقریبا شرکت املاک اور بہت حد تک شرکت ملک اختیاری کے قریب کی شکل ہے،کہ ایک نے دو لاکھ میں ڈائمنڈ خریدا اور پھر اس کی نصف قیمت کی شمولیت کے ساتھ کسی اور کو سوا دولاکھ کی فروخت پر شریک کرلیا،یعنی جب وہ اسے سوا دوالاکھ میں فروخت کردیگا، تو دونوں شرح نفع جو کہ پچیس ہزار ہے،اس میں شریک ہوجائیں گے،اس میں بظاہر کوئی مفسدہ نہ ہونے کی بنا پر یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

مزید غور کرنے پر صورت مسئولہ کی کئی ہیئت اور حکم ہوسکتے ہیں،مثلا:

الف:بظاہر شرکت ایک افضل عمل ہے،لیکن بیان کردہ معاملہ کا دارومدار اگرآپسی رضامندی پر ہے،شرح نفع میں کوئی خاص رقم کی تعیین نہیں ہے،تو یہ صورت جائز ہوگی۔

ب:بیان کردہ صورت میں اگر احتمال یہ ہے کہ بائع نے ٢،٢لاکھ کی قیمت کا ڈائمنڈ خریدا اور شرکت کے وقت سوا لاکھ میں شرکت کروائی،اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سوا لاکھ میں شرکت کرنے والے کے ساتھ غیر ناصحانہ سلوک ہورہا ہے،چہ جائے کہ اسے مال کی اصل قیمت بتاکر سودے کو بہتر سے انجام دے، شرکت میں شریک کرے اور پھر اس سے

منافع کمائیں ؛یہاں بائع اول کی پوزیشن زیادہ طاقت ور اور ثانی مظلوم لگتا ہے؛ایسے میں اگرچہ معاملہ درست ٹھہرے گا ؛لیکن دیانت کے خلاف سمجھا جائے گا،واللہ اعلم۔

جواب (۶):(۱)ب نے الف کا ڈائمنڈ ابھی تحقیق وجستجو کیلئے لیا ہے،ابھی نہ تو وہ اس ڈائمنڈ کا مالک ہے اور ناہی مشارک؛لہذا اس ڈائمنڈ میں کسی بھی طرح تصرف کرنے اور اسے آگے معاملہ کرنے کا جواز حاصل نہ ہوگا،اس کی وجہ یہ ہے:

الف:فی الوقت ب کی حیثیت مالک کی نہ ہونے کی وجہ سے معاملہ مفضی الی النزاع،غرر و جہل کی طرف مائل ہے۔

ب:ابھی ان دونوں کے مابین معاملہ خیار کا ہے، کہ خرید وفروخت ہوگی یا نہیں،اور جب تک خیار رہے؛ ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

ج:مبیع ابھی مجہول القیمہ ہے؛کیونکہ ابھی الف سے ب نے کوئی قیمت طے ہی نہیں کی ؛تو وہ بھلا کیسے ج سے قیمت طے کرسکتا ہے،اور جب کوئی چیز مجہول القیمہ ہو تو وہ بیع کے فاسد ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

د:ایک مفسدہ یہ بھی ہے؛کہ ب ،ج سے جھوٹ کی بنیاد پر معاملہ کررہاہے،اور ایک فرضی راہ ہموار کررہا ہے جب کہ شریعت اسلامی میں جھوٹ کی اجازت نہیں (بخاری:۵۶۳۲)؛ اسی لئے ایسی صورت کی حوصلہ افزائی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

(۲)رہی یہ بات کہ کیا ب نے الف کو جو کم قیمت میں ڈائمنڈ خریدا ہے تو کیا ج کے ساتھ شرکت درست ہوگی؟

الف:اگر دونوں معاملہ الگ الگ رکھے جائیں اور اول معاملہ (الف کا ب کے ساتھ) مکمل ہوجائے،ڈائمنڈ پر خواہ عرفی ہو یا حقیقی قبضہ ہوجائے؛تو معاملہ درست ہوگا۔

ب :حالانکہ صورت مسئلہ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی پہلا معاملہ پورا ہی نہیں ہوا تو پھر شرکت کیسے جائز ہوسکتی ہے؟

(۳)تیسرا جزء یہ ہے کہ کیا الف کو بتلائی گئی قیمت ج کو بتلانے کی ضرورت ہے؟

الف:اس کا بھی تعلق اول معاملہ ہی سے ہے،اگر پہلا معاملہ مان لیا جائے تو پھر ظاہر ہے کہ ب اب اس ڈائمنڈ کا مالک ہوچکا ہے،اور مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا حق ہوتا ہے، اب خواہ وہ اسے کتنے ہی رقم میں بیچے ،اگر مشتری کو قبول ہوتو خریدے ورنہ نہ خریدے،یعنی اسے قیمت بتلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ب:لیکن یہاں پہلا معاملہ ہی مشکوک ہے،حالانکہ اسلام معاملہ میں شفافیت کا قائل ہے،چنانچہ اگر ج اپنی لاعلمی کی بنا پر کسی مواخذہ کا حقدار نہ ہوگا؛تاہم ب کے علم ہونے اور معاملہ میں دوہرا رویہ (ڈبل کراس) کرنے پر عنداللہ مقبوح گردانا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

ڈائمنڈ وجواہرات کی خریدوفروخت

مفتی عبد اللہ خالد ٹیٹی•

محور اول:

جواب ۱ :دونوں کے درمیان جو د س روپئے کا فرق ہوتا ہے ،جو بائع اور مشتری کو معلوم نہیں ہے، وہ بروکر کے لئے لینا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ دلالی نام ہے بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ کرایا جانے کا اور اس میں بائع اور مشتری دونوں کو ثمن کا علم ہوتا ہے، دلال صرف اجرت کا مستحق ہوتا ہے،نفع کا نہیں، چنانچہ مبسوط سرخسی میں سمسار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :

''والسمسار اسم لمن عمل للغیر بالأجرة بیعا وشراء''(المبسوط للسرخسی ۱۲۸،۱۵)۔

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل.....دفع ثوبا إلیہ وقال:بعہ بعشرة،فمازاد فھو بینی وبینک، ولو باع بإثنی عشر أو أکثر، فلہ أجر مثل عملہ، وعلیہ الفتوی''(الفتاوی الہندیہ ۴۵۰،۴۔۴۵۱)۔

اعلاء السنن میں ہے:

''وشرط جوازہا عند الجمہور أن تکون الأجرة معلومة، قلت:والحاصل أن أجرة السمسار ضربان:إجارة وجعالة، فالأول یکون مدة معلومة یجتہد فیہا للبیع، وہذا جائز بلا خلاف، فإن باع قبل ذلک أخذ بحسابہ، وإن انقض الأجل أخذ کامل الأجرة''(اعلاء السنن۱۶،۲۴۵،۲۴۴) ۔

اسی طرح حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''دلال سو روپئے میں خرید کر ایک سو پانچ روپئے میں بیچ دے تو جائز ہے،مگراس صورت میں صرف پانچ روپئے کا نفع ہوا، دلالی کی صورت نہیں ہوئی،دلالی یہ ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ کرایہ جائے ،اس میں بائع اور مشتری دونوں کو ثمن(قیمت) معلوم ہوتی ہے،اور دلال کو اس ثمن کے علاوہ جواجرت ملتی ہے ،خواہ وہ اجرت پانچ دس روپئے کی صورت میں متعین ہو ،خواہ اس طرح کہ فیصد دس روپئے یا فی روپیہ ایک آنہ اجرت مقرر کی جائے،وہ اجرت درست ہے جس قدر بھی ہو ''(فتاوی محمودیہ۱۶،۶۱۹)۔

• خادم التدریس دار العلوم لوناواڑہ، گجرات۔

جواب ۲ : فقہائے کرام کے ایک قول کے مطابق وکیل بالبیع مؤکل کی اجازت سے خود بھی خرید سکتا ہے،اس قول کے پیش نظر اگر دلال متعینہ قیمت پر بائع سے خرید لے اور بائع کو بتلا دے کہ میں نے خود خریدا ہے ،تو خریدنے پر دلال مبیع کا مالک بن گیا ،پھر مشتری سے وہ زائد قیمت میں بیچ دے تو یہ صورت جائز ہوگی ۔

فتاوی بزازیہ میں ہے:

''وإن أمره المؤكل أن يبيعه من نفسه أو أولاده الصغار أو من من لا يقبل له شهادته فباع منه جاز'' (الفتاوى البزازيه على هامش الهنديه ۴۷۵،۵)۔

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

''لا يجوز للوكيل أن يبيع سلعة المؤكل على بيعها لنفسه۔۔۔ أما إذا أذنه المؤكل بأن يبيع لنفسه أو لابنه الصغير ففيه رأيان:أحدهما:أنه لايجوز، لأن العاقد فى هذه الحالة يكون واحدا، ثانيهما:أنه يجوز ويظهر أن الذى يقول بعدم الجواز لعلة كون العاقد واحدا لا يمنع أن يبيع الوكيل السلعة لأجنبى ثم يشتريها منه، ثانيا لأنه فى هذه الحا لة يكون البائع غير المشترى''(كتاب الفقه على المذاهب الاربعة۳،۱۴۵)۔

پھر اس صورت میں وہ چار فیصد فیس کا مستحق نہ ہوگا، اس لئے کہ بیک وقت بیع اور اجارہ کا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

''عن عبد الله بن مسعود ؓ قال:نهى رسول اللهﷺعن صفقتين فى صفقة''(مسند احمد: ۳۷۸۲)۔

جواب ۳، ۴ : فروخت کی جانے والی کسی معین چیز کے بارے میں اگر یقین ہویا ظن غالب ہو یا مختلف قرائن سے معلوم ہوکہ یہ چیز چوری کے ذریعے حاصل کی ہوئی ہے،تو یہ جانتے ہوئے اس چیز کو خریدنا جائز نہیں ہے اور اسکو اسکے اصل مالک تک پہنچانا ضروری ہے،حضر ت نبی اکرمﷺ نے اس پر سخت وعید بیان فرمائی ہے، حدیث شریف میں ہے :

''من اشترى سرقة وهو يعلم أنه سرقة فقد شرك فى عارها وإثمها''(البيهقى: ۵۲۵۸)۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

''لو ظهر غير حلال أى مسروقا أو مغصوبا يرجع عليه المشترى''(رد المحتار ۴۲،۵)۔

اسی طرح بدائع الصنائع میں ہے:

''ولو باع السارق المسروق من إنسان أو ملك منه بوجه من وجوه، فإن كان قائما فلصاحبه أن يأخذه لأنه عين ملكه وللمأخوذ منه أن يرجع على السارق'' (بدائع الصنائع۸۵،۷) ۔

الاشباہ والنظائر مینعلامہ ابن نجیم مصری ؒفرماتے ہیں :

‘‘وغالب الظن عندهم ملحق باليقين وهو الذى يبتنى عليہ الأحكام يعرف ذلک من تصفح كلامہم فى الأبواب’’ (الاشباہ والنظائر: ۶۳)۔

البتہ بازار میں فروخت کی جانے والی چیزیں جائز طریقے سے حاصل کردہ چیزوں کے ساتھ ناجائز طریقوں سے حاصل کردہ چیزیں ہوں اورغالب اور اکثر اشیاء جائز طریقے سے حاصل کردہ ہوں، نیز خریدنے والے کو معین شئی کے متعلق اس بات کا علم نہ ہو کہ یہ مال چوری کا ہے تو شریعت مطہرہ میں دفع حرج کے خاطر خریدنے کی گنجائش رکھی ہے۔

مجمع الانہر میں ہے:

‘‘ألا یری أن أسواق المسلمین لاتخلو عن المحرم والمسروق والغصوب ومع ذلک یحل التناول اعتمادا علی الغالب وہذا لأن القلیل لایمکن الاحتراز عنہ ولا یستطاع الامتناع فسقط اعتبارہ دفعا للحرج’’ (مجمع الانہر۴،۵۸۲)۔

مذکورہ بالا تفصیل کی بنا پر:

سوال نمبر تین کا جواب یہ ہے کہ جب مارکیٹ میں دونوں طرح کے مال ملتے ہوں اور متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ مال چوری کا ہے تو اس کا خریدنا جائز ہے اور اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ چوری کامال ہے تو اس کا خریدنا جائز نہ ہوگا۔

سوال نمبر چار کا جواب یہ ہے:

قرائن سے معلوم ہو رہا ہے کہ چوری کا ہے تو جائز نہ ہوگا، صرف شبہ کی وجہ سے اسکو ناجائز نہ کہا جائے گا۔

جواب ۵ : جب زید اور بائع کے درمیان ایجاب وقبول ہو گیا اور زید نے مبیع پر قبضہ بھی کر لیا تو اب بیع تام ہو گئی، اگرچہ زید نے اس کا ثمن ادا نہ کیا ہو، لہذا اب زید کے لئے اس چیز کو دوسرے آدمی کے ہاتھوں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا جائز ہوگا۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

‘‘وإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع،ولاخیار لواحد منہما إلا من عیب أو عدم رؤیۃ’’(تاتارخانیہ زکریادیوبند۸،۲۲۲، وکذا فی الہدایۃ ۳،۲۰، الجوہرۃ النیرۃ ۱،۲۲۶)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

‘‘من اشتری شیئا، ثم أغلی فی ثمنہ فباعہ مرابحۃ علی ذلک جاز’’(الفتاوی الہندیہ ۳،۱۶۱)۔

جواب۶ : بائع ایسی چیز کو فروخت کرتا ہے جو ابھی اسکی ملکیت میں نہیں ہے، اس طرح کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے،اس لئے کہ شریعت میں آدمی جس چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اور اسکو بیچتاہے تو ایسا کرنا اسکے لئے جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے:

‘‘عن حکیم بن حزامؓ قال:سئلت رسول اللہﷺفقلت:یأتینی الرجل فیسئلنی من البیع ما لیس عندی ابتاع من السوق ثم أبیعہ،قال :لاتبع ما لیس عندک’’(ترمذی شریف۱،۲۳۳) ۔

اس لئے صورت مسئولہ میں اس طرح کرنا جائز نہیں ہے،ہاں البتہ دوسرے شخص سے صرف بیع کا وعدہ کر لیا جائے، حقیقۃ بیع نہ کی جائے ،اور سامان حاصل کرنے کے بعد بیع منعقدکی جائے تو یہ صورت جائزودرست ہے۔

صاحب احسن الفتاوی فرماتے ہیں:

''مال پر قبضہ سے قبل اسکی بیع جائز نہیں ہے،لہذا یہ منافع بھی حلال نہیں،اسکی تصحیح کی دو صورتیں ہیں :

۱---۲ :مال پہونچنے سے قبل بیع نہ کرے، بلکہ بیع کا وعدہ کرے ،بیع مال پہنچنے کے بعد کرے ''(احسن الفتاوی۶،۵۲۵)۔

محور دوم :

جواب ۱ : دلال کا بائع سے اس پرچی کو نقد پیسہ دیکر مقررہ قیمت سے کم میں حاصل کر لینا اور وقت آنے پر پوری رقم خریدار سے حاصل کرنا جائز نہیں ہے،یہ قرض پر نفع اٹھانے کی صورت ہے جو کہ حرام ہے، اور یہ بیع الجامکیہ کے مرادف ہے،اور بیع الجامکیہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کا ملازم یا صاحب وظیفہ جسکو من جانب حکومت مقررہ میعاد پر تنخواہ یا وظیفہ ملتا ہے، وہ کبھی وقت مقررہ سے قبل ضرورت کی وجہ سے کم پیسے میں اپنی تنخواہ یا وظیفہ فروخت کر دیتا ہے ،اور خریدار وقت مقررہ میں صاحب وظیفہ کے نام سے پورا وظیفہ وصول کر لیتا ہے تو حضرات فقہاء نے اس طرح خریدوفروخت کو ناجائز وحرام کہا ہے۔

چنانچہ اعلاء السنن میں ہے:

''إن بيع الصک والبراء ة والجامكية إنما لا يجوز''(اعلاء السنن۱۴،۲۴۴)۔

علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:

''وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية، وفى الشامية:وعبارة المصنف فى فتاواه:سئل عن بيع الجامكية:وهو أن يكون لرجل جامكية فى بيت المال، ويحتاج إلى دراهم معجلة قبل أن تخرج الجامكية، فيقول له رجل:بعتنى جامكيتک التى قدرها كذا بكذا أنقص من حقه فى الجامكية،فيقول له:بعتک،فهل البيع المذكور صحيح، أم لا،لكونه بيع الدين بنقد؟ أجاب:إذا باع الدين من غير من هو عليه كما ذكر لايصح''(الدر المختار مع الشامی۴،۵۱۷،کراچی)۔

جواب ۲ :سود کے سلسلے میں شریعت میں بہت سخت و عیدیں وارد ہوئی ہیں،اسی لئے فقہائے کرام نے سخت مجبوری کے علاوہ سود لینے اور دینے کو ناجائز قرار دیا ہے،اس لئے اس مقصد کے لئے سود لینا اور دوسرے کے لئے اس قرض کا سود ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔

شریعت میں ضرورت کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن ہر ضرورت معتبر نہیں ہے ،بلکہ

اسکے کچھ شرائط وضوابط ہیں۔

علامہ حموی ؒ اشباہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں :

''فالضرورۃ:بلوغہ حدا إن لم یتناول الممنوع، ھلک أو قارب، وہذایبیح تناول الحرام'' (الحاشیۃ للاشباہ والنظائر:۱،۲۵۲)۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب اس سلسلے میں دو شرائط بیان کرتے ہیں:

''۱۔أن تکون الضرورۃ قائمۃ لا منتظرۃ،فیحصل فی الواقع خوف الھلاک أو التلف علی النفس أوالمال''۔

۲۔أن لایکون لدفع الضرر وسیلۃ أخری من المباحات، ویغلب علی ظن المبتلی بہ أن دفع الضرر ممکن بارتکاب بعض المحرمات'' (المصباح: ۵۵۸)۔

صورت مسئولہ میں ایسی ضرورت متحقق نہیں ،اس لئے جائز نہ ہوگا

جواب ۴ : مال کو زیادہ سے زیادہ عیب دار قرار دیکر بیچنے والے کو کم قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا حلال نہ ہوگا، اس لئے کہ مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر کم کرانا حلال نہیں،اور اسی مال کو دوسروں کے سامنے بہت ساری تعریف کرکے بیچنا ایک قسم کا دھوکہ ہے ۔

حدیث شریف میں ہے:

''لا ضرر ولا ضرار فی الإسلام''(مجمع الزوائد۴،۱۳۹)۔

دوسری حدیث شریف میں ہے:

''لا یحل مال امرء مسلم إلا عن طیب نفس منہ''(سنن الدارقطنی۳،۲۲)۔

''من غشنا فلیس منا''(الحدیث)۔

جواب ۵ :اگر مارکیٹ میں سستا مال سے مراد ملاوٹ والا مال ہی ہو تو اس میں وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس طرح مراد نہ ہو تو ملاوٹ کی وضاحت کرنا ضروری ہوگا ۔

جواب۔چیزوں کی خریدو فروخت میں نفع لینے کی مقدار شرعا متعین نہیں ہے ،اس لئے ایک روپئے کی چیز کو ایک ہزار میں بیچنا جائز ہوگا، لیکن اس طور پر زیادہ نفع لینا اگر تجار کے یہاں رواج میں نہ ہو تو مروت کے خلاف ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے :

''غلا السعر علی عہد رسول اللہ ﷺ،فقالوا :یا رسول اللہ قد غلا السعر فسعر لنا ، إن اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرزاق'' (ابن ماجہ:ص: ۱۵۹)۔

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں ہے :

''من اشتری شیئا وأغلی فی ثمنہ جاز''(الہندیہ ۳،۱۳۱)۔

اسی طرح شرح مجلہ میں ہے:

''الثمن المسمى:هو الثمن الذى يسميہ ويعينہ العاقدان وقت بيع بالتراضى سواء كان مطابقا لقيمتہ الحقيقۃ أو ناقصا عنها أو زائدا عليها'' (شرح المجلۃ رستم۱،۷۳) ۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ چشم کشا تحریر حضرت مفتی نظام الدین صاحب کی ہے:

''ہر آدمی کو اپنی مملوکہ چیز کے بارے میں اختیار ہے کہ جتنی زیادہ قیمت چاہے لے،مثلا ایک پیسے کی چیز کا سو روپیہ لے،یا ایک ہزار روپئے کی چیز کے محض سو روپئے لے ،یا اس سے بھی کم یا بالکل نہ لے سب جائز ہے ،باقی اس میں ایسی کمی یا زیادتی یا ایسا تفاوت جو تجار کے یہاں عام طور پر رائج نہ ہو خلاف رواج کہا جاتا ہے اور زیادتی فاحش خلاف مروت کہی جاتی ہے اور بعض صورتوں میں خداع تک پہنچے تو ناجائز اور ممنوع ہو جاتی ہے (منتخبات نظام الفتاوی۳،۸۹)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

''شرعا کوئی تعداد مقرر نہیں، مگر زیادہ نفع لینا مروت کے خلاف ہے ''(فتاوی محمودیہ۱۶،۴۸)۔

محور سوم:

جواب۲ : اگر بنوانے والے نے جس معیار کی چیز بنوانے کا حکم دیا تھا، کاریگر کی کوتاہی کی وجہ سے اس مقررہ معیار میں کمی آ گئی جسکی وجہ سے بنوانے والے کو نقصان اٹھانا پڑا جو نقصان اسکی اجرت سے برابر یا زیادہ تھا تو اسکا اجرت ادا نہ کرنا صحیح ہے، لیکن اسکی اجرت سے کم نقصان ہو تو نقصان کی بقدر اجرت میں کمی کرنا درست ہوگا۔

جیسا کہ مبسوط سرخسی کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

''ولو أسلم غزلا إلى حائک لينسج لہ سبعا فى أربع فحاکہ أكثر من ذلک أو أصغر فهو بالخيار إن شاء ضمنہ مثل غزلہ وسلمہ الثوب، وإن شاء أخذ ثوبہ وأعطاه الأجر إلا فى النقصان، فإنہ يعطيہ الأجر بحساب ذلک ولا يجاوز بہ ما سمى''(مبسوط سرخسی۱۵،۸۶) ۔

اسی طرح کی وضاحت صاحب بدائع نے بھی فرمائی ہے:

''فإن سلم إلى حداد حديدا ليعمل لہ إناء معلوما بأجر معلوم، أو جلدا إلى خفاف ليعمل لہ خفا معلوما بأجر معلوم، فذلک جائز، ولا خيار فيہ، لأن هذا ليس باستصناع بل هو استئجار فكان جائزا، فإن عمل كما أمر استحق الأجر، وإن فسد فلہ أن يضمنہ حديدا مثلہ، لأنہ لما أفسده،فكأنہ أخذ حديدا لہ واتخذ منہ آنيہ بغير إذنہ، والإناء للصانع، لأن المضمونات تملک بالضمان''(بدائع زکریا دیوبند۴،۱۶ کراچی۵،۴)۔

جواب ۳،۴ : یہ دونوں صورتیں جائز ہیں ،اگر یہ آپسی رضامندی سے طے ہوں، اس لئے کہ فقہائے کرام نے مہر کے مسئلے میں وضاحت کی ہے کہ اگر میاں بیوی آپس میں طے

کچھ کریں اور اعلان کچھ کریں تو وہی معتبر ہوگا جو ان دونوں کے مابین طے ہوا ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں :

''تواضعا فی السر علی مہر ثم تعاقدا فی العلانیۃ بأکثر والجنس واحد، فاتفقا علی المواضعۃ فالمہر مہر السر'' (شامی ۳۱۵،۴زکریا)۔

اسی طرح مفتی سلمان صاحب منصور پوری ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :

''مذکورہ صورت میں پارٹی اور آپکی رضامندی سے معاملہ طے ہونے کے بعد جب آپکو مال کی پوری قیمت ایک لاکھ روپئے مل رہی ہے ،تو آپکا پچاس یا ساٹھ ہزار کا بل بناکر دینا اور بقیہ رقم بغیر بل کے لینا شرعا درست ہے،اور اس طرح کی خرید وفروخت جائز ہے،نیز اس صورت میں دونوں فریق میں سے کسی پر بھی گناہ نہیں ہوگا ''(کتاب النوازل۱۷،۵۱۵)۔

اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کے درمیان جو معاملات آپسی رضامندی سے طے ہوتے ہیں اور ان میں کوئی غیر شرعی امر نہ ہو تو ان کا لحاظ کیا جائے گا۔

حدیث میں ہے :

''والمسلمون علی شروطھم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما'' (ترمذی: ۱۳۶۴)۔

جواب ۵: جو ذرات اور ٹکڑے رہ جاتے ہیں انکو زیور بنوانے والے کو واپس کرنا ضروری ہے، کاریگر کے لئے ان بچے ہوئے ذرات کو اپنے پاس رکھ لینا جائز نہیں ہوگا، ورنہ چوری اور خیانت سمجھا جائے گا۔

'' لا یجوز لأحد أن یتصرف فی ملک غیرہ بلا إذنہ أو وکالۃ منہ''(الاشباہ والنظائر: ۲۷۶)۔

اسی طرح حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ درزی کے پاس بچے ہوئے کپڑے کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :

''جو کپڑا بچ جائے وہ مالک کا ہے اسکو واپس کر دینا لازم ہے،اسکو خود استعمال کرنا یا کسی غریب کو دینا جائز نہیں،ورنہ چوری اور خیانت کا گناہ ہوگا ''(آپکے مسائل اور انکا حل۷،۷۱)۔

جواب ۶ :خریدار کے سامنے یہ بات واضح ہونے کے باوجود کہ دھاگے آٹھ گرام ہیں، اسکو دس گرام کا وزن مان کر بیچنا جائز نہ ہوگا،اور خریدار کا یہ عمل درست نہ ہوگا، اور خریدار کو بیچنے والے پر کوئی گناہ نہ ہوگا،اس لئے کہ اس نے خریدار کے سامنے اس بات کو واضح کر دیا ہے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

''إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضیف الحکم إلی المباشر---الخ''(الاشباہ والنظائر، قدیم،۲۳۷)۔

اسی طرح فتاوی شامی میں ہے:

‘‘ولا معصیۃ فیہ وإنماالمعصیۃ بفعل المستاجر وہو مختار ،فینقطع نسبتہ عنہ’’ (شامی ۵۶۲،۹ زکریا)۔

جواب ۷،۸ :سوال نمبر ۷ میں مشتری کا ایک قیراط مال کی پرچی کی بنا پر پانچ سنٹ کی قیمت ادا نہ کرنا جائزنہ ہوگا، اسی طرح سوال نمبر۸ میں ایک زیرو کم ہونے کی وجہ سے صرف پچیس فیصد قیمت قبول کرنے پر مجبور کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ کسی مسلمان کا مال اسکی رضامندی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: ‘‘یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلو أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم’’(النساء : ۲۹)۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے:

‘‘عن أبی حمید الساعدی رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال:لا یحل لامرئ أن یأخذ مال أخیہ بغیر حقہ وذلک لما حرم اللہ مال المسلم علی المسلم’’(مسند احمد: ۳۴۰۰۳)۔

اسی طرح یہ ایک قسم کا دھوکہ بھی ہے،اور احادیث میں دھوکہ دہی کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔

"من غشنا فلیس منا’’(مسلم شریف: ۱۰۱)۔

اسی طرح فتاوی شامی میں ہے:

‘‘لا یحل لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی’’(شامی، کراچی۶۱،۴)۔

محور چہارم:

جواب ۱ : فقہائے کرام اور محدثین عظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے، اور نقد بیع مینقیمت کم کرنا بھی جائز ہے،بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی اس بات پر متفق ہوں کہ بیع معجل ہوگی یا مؤجل؟ اور ثمن بھی متعین ہو، اسی لئے ڈائمنڈ کے مال کو نقد فروخت کرتے وقت ۶یا۸فیصد قیمت کا کم کرنا جائز ہوگا، جبکہ عاقدین بیع کے معجل یا مؤجل ہونے اور کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں۔

چنانچہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں :

‘‘وقد فسر بعض أھل العلم، قالوا بیعتین فی بیعۃ أن یقول أبیعک ہذا الثوب بنقد بعشرۃ، وبنسیئۃ بعشرین، ولا یفارقہ أحد البیعین فإن فارقہ علی أحدہما فلا بأس إذا کانت العقدۃ علی أحد منہما’’ (ترمذی: ۱۳۳۱)۔

اسی طرح مبسوط سرخسی میں ہے:

‘‘وإذا عقد العقد علی أنہ إلی أجل کذا بکذا وبالنقد بکذا، أو قال:إلی شہر بکذا، أو إلی

شهرين بكذا، فهو فاسد، لأنہ لم يعاطہ على ثمن معلوم، ولنهى النبى ﷺ من شرطين فى بيع------وهذا إذا افترقا على هذا، فإن كان يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعہ على ثمن معلوم وإنما العقد عليہ، فهو جائز" (المبسوط للسرخسی۱۳،۹)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''ایک چیز کی قیمت نقد فروخت کرنے میں کم اور ادھار فروخت کرنے میں زیادہ لی جاسکتی ہے، زیادتی قیمت کو کسی مدت پر محمول نہ کریں کہ جیسے جیسے مدت بڑھتی جائے قیمت بھی بڑھتی جائے، اس لئے کہ یہ جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب (منتخبات نظام الفتاوی۳،۳۹)۔

جواب۲ :یہ صورت جائز نہیں ہے، اس صورت کو فقہائے کرام کی اصطلاح میں ضع وتعجل کہتے ہیں، ائمہ اربعہ اسکے عدم جواز پر متفق ہیں،علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں :

''إذا كان عليہ دين مؤجل،فقال لغريمہ :ضع عنى بعضہ، واعجل لک بقيتہ،لم يجز،كرہ زيد بن ثابت، وابن عمر والمقداد، وسعيد بن المسيب، وسالم والحسن، وحماد، والشافعى، ومالک، والثورى، وهشيم، وابن علية، وإسحاق، وأبو حنيفة۔

امام محمدؒ موطا امام محمد میں حضرت زید بن ثابت کا اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

''وبهذا نأخذ من وجب لہ دين على إنسان إلى أجل، فسئل أن يضع عنہ ويعجل لہ ما بقى، لم ينبغ ذلک، لأنہ يعجل قليلا بكثير دينا، فكأنہ يبيع قليلا نقدا بكثير دينا" (موطا امام محمد۱،۳۳۲)۔

اس سلسلہ میں سب سے چشم کشا تحریر عالم اسلام کی مشہور شخصیت حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتھم کی ہے جو مفصل ومدلل بھی ہے، جو فقہ البیوع ۱،۵۴۵، فقہی مقالات۱،۱۰۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

استاذ محترم فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر خریداریا فروخت کرنے والے کی طرف سے شرط لگائی جائے کہ خریدار قیمت مقررہ وقت سے پہلے ادا کردے گا، تو اسکو اتنا ڈسکائونٹ دیا جائے گا، تو یہ صورت جائز نہیں، گویا یہ مہلت کی قیمت ادا کرنی ہے،اس لئے اس میں سود کا شبہ پیدا ہو جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ضع وتعجل کہتے ہیں، البتہ اگر فریقین میں سے کسی کی طرف سے شرط نہ ہو اور بیچنے والا اپنے طور پر پیسے کم کردے، یا خریدار خود پیسے پہلے ادا کردے اور بیچنے والا کچھ پیسے واپس کردے، تو یہ صورت جائز ہوگی؛ کیونکہ یہ صورت رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے پیسے کم کر دینے کی

ہوگی،جس کی اجازت ہے (کتاب الفتاوی۹،۴۰۸-۹)۔

جواب۳،۴ : دونوں مسئلوں میں اعلی کے بجائے ادنی دینے کی وجہ سے مشتری کو دھوکہ ہوا اور چونکہ اعلی اور ادنی یہ مبیع کا وصف ہے اور وصف کے مقابلہ میں ثمن نہیں ہوتا، لہذا قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں ہوگا،البتہ وصف مرغوب فوت ہونے کی وجہ سے مشتری کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو پورے ثمن میں رکھے ورنہ واپس کر دے۔

مصنف عبد الرزاق میں ہے:

''عن الشعبی فی رجل اشتری رقیقا جملۃ،فوجد ببعضھم عیبا، قال:یردھم جمیعا، أو یأخذھم جمیعا،قال سفیان:ونحن لانقول ذلک، نقول المشتری بالخیار، یقوم ما وجد بہ عیب، ویردہ بعینہ، وإن شاء ردھم کلھم''(المصنف لعبد الرزاق: ۱۴۶۹۹)۔

صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں :

''وإذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فھو بالخیار إن شاء أخذہ بجمیع الثمن وإن شاء ردہ'' (الہدایۃ۳،۲۳)۔

فتاوی شامی میں ہے :

''إلا أن یرضی بالضرر فیخیر المشتری حینئذ بین الرد والإمساک من غیر رجوع بنقصان''(رد المحتار۴،۸۹)۔

صاحب احسن الفتاوی تحریر فرماتے ہیں :

''عیب پر مطلع ہونے کے بعد مشتری کو اختیار ہے، چاہے تو کل ثمن کے بدلے اسکو رکھے اور چاہے تو واپس کر دے،معیب جانور کو رکھ کر رجوع بالنقصان کرنا جائز نہیں ''(احسن الفتاوی۶،۴۹۲)۔

جواہرات کی خریدوفروخت سے مربوط فقہی مسائل

مولانا ابراہیم بن سلیمان فلاحی•

محور اول:

جواب ۱ :بائع اور مشتری کے درمیان بیچوانے والا دلال کہلاتا ہے، ایسے دلال کی اجرت کو عرف و رواج پرمحمول کیا گیا ہے، چناں چہ اگر بائع سے اجرت لینے کا عرف ہو تو بائع سے اور اگر مشتری سے اجرت لینے کا عرف ہو تو مشتری سے لے اور اگر دونوں سے اجرت لینے کا عرف ہو تو دونوں سے اجرت لے سکتا ہے، بہر کیف دلال کو اپنی دلالی کی اجرت لینا جائز ہے، بشرطیکہ اجرت متعین طور پر طے کر دی جائے۔

''وإن سعى بينهما وباع المالک بنفسہ يعتبر العرف فتجب الدلالۃ علىٰ البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف جامع الفصولين''(الدر مع الرد۷،۹۳، ط-الرياض)۔

صورتِ مسئولہ میں دلال اپنی دلالی کی چار فی صد فیس وصول کرتا ہے جو المسلمون عند شروطهم کے موافق ہے،اس لیے یہ تو صحیح ہے، مگر اس پر مزید رقم جو حاصل کرتا ہے وہ اس کے عمل کے عوض میں نہیں ہے اورپھر دلال بائع اور مشتری کو اطلاع بھی نہیں کرتا ہے، تویہ ان دونوں کو فریب دینا ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''من غش فليس منا'' (سنن الترمذي، رقم الحديث: ۱۳۱۵)۔

جواب۲ :(الف)صورتِ مسئولہ میں دلال کو اختیار ہے کہ اپنے دلال ہونے کی حیثیت کو ختم کر دے اور چار فی صد اپنی فیس نہ لے اور بائع اور مشتری ہونے کی حیثیت اپنا لے اور خود ہی بائع بن کر تجار کے عرف کے مطابق نفع کما سکتا ہے اور یہ صورت شریعت میں جائز ہے۔

(ب):اور دوسری صورت میں بھی دلال کے لیے دس روپئے کا فائدہ خود رکھ لینا جائز ہے، اس لیے کہ یہاں بھی بیع ہی کی صورت ہے، اگرچہ فرضی مشتری کے ذریعہ سے بیع وجود میں آتی ہے اور حقیقی بائع اور مشتری کو کسی قسم کا دھوکہ دینا نہیں ہے، اس لیے کہ دلال خود دلالی کی اجرت اور زائد نفع دونوں کو جمع نہیں کر رہا ہے؛ بل کہ چار فی صد دلالی کی فیس فرضی خریدار کو دے رہا ہے اور دس روپئے کا فائدہ خود لے

• استاذ حدیث وفقہ دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور، بھروچ، گجرات۔

رہا ہے؛ گویا دونوں صورتوں میں بیع ہے، پہلی صورت مینخود دلال بائع بن گیاہے، اور دوسری صورت میں بائع حقیقی نے فرضی مشتری سے بیع کی ہے اور بیع کے منافع جائز ہیں۔

''إذا حصل الإيجاب و القبول لزم البيع''(الهداية٣،٢٠)۔

جواب ۳ :اگر یقین یا ظن غالب ہے کہ چوری کا مال فروخت کرتے ہیں تو ان سے خریدنا نا جائز ہے؛ کیوں کہ ایسا مال اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔

اور اگر کسی شخص نے غلط فہمی میں مال خرید لیا تو حقیقت واضح ہونے کے بعد وہ مال اصل مالک کو واپس کیا جائے گا اور ادا کردہ قیمت بائع (چور یا غاصب) سے واپس لی جائے گی۔

''من اشترىٰ سرقة وهو يعلم أنها سرقة فقد شرك في عارها وإثمها'' (الجامع الصغير رقم الحديث: ٨۴٢۴، مسند إسحاق بن راهويه، رقم الحديث: ٣٥٨)۔

رد المحتار میں ہے: ''لو ظهر غير حلال أي مسروقا أو مغصوبا يرجع عليه المشتري'' (رد المحتار: باب خيار العيب: ٢٢٠)۔

چوری کے مال پر چور کی ملکیت نہیں ہوتی، اس لیے چور سے مال خریدنا جائز نہیں، جب کہ یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ وہ مال چوری کا ہے؛ کیوں کہ چور بازار تو بازار کا نام ہے، اس میں دوکان دار اپنے پیسوں سے جائز طریقے پر صحیح مال بھی لے کر آتے ہیں اور چور بازار میں فروخت کرتے ہیں،یعنی چور بازار میں ہر مال کا چوری کا ہونا ضروری نہیں ہے، عموماً خریداری کا مال ہی وہاں فروخت ہوتا ہے؛ لہذا عام مال کی خریداری درست ہوگی، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے لوگوں سے حرج کو دور کرنے کے لیے امام کرخیؒ کے قول کو مفتیٰ بہ بتلایا ہے۔

''اكتسب حراما توضيح المسألة ما في التاتارخانية حيث قال:رجل اكتسب ما لا من حرام ثم اشترىٰ فهذا علىٰ خمسة أوجه:إما أن دفع تلك الدراهم إلىٰ البائع أولًا ثم اشترىٰ منه بها أو اشترىٰ قبل الدفع بها و دفعها، أو اشترىٰ قبل الدفع بها و دفع غيرها أو اشترىٰ مطلقًا ودفع تلك الدراهم أو اشترىٰ بدراهم آخر و دفع تلك الدراهم----

و قال الكرخي:في الوجه الأول و الثاني لا يطيب، و في الثلاث الأخيرة يطيب۔

وقال أبوبكر:لا يطيب في الكل، لٰكن الفتوىٰ الآن علىٰ قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس'' (رد المحتار ٧، ۴٩٠ ، ط۔ مكتبه زكريا ديوبند)۔

جواب ۴ : جس مال کے بارے میں چوری کا مال ہونے کا یقین ہو اس مال کی خرید و فروخت کرنا قطعاً حرام ہے، اسی طرح قرائن سے غالب خیال یہ ہو کہ یہ چوری کا مال ہے، تو بھی اس کو خریدنا درست نہیں ہے، اگر خریدچکا ہے اور مالک کا علم ہو جائے تو واپس کرنا ضروری ہے۔

قال علیہ الصلاۃ و السلام:''من اشتریٰ سرقۃ و ھو یعلم أنھا سرقۃ فقد شرک في عارھا وإثمھا'' (فیض القدیر ۸۳٫۶ مکتبہ شاملہ آن لائن٫۵۶۵۴، رقم الحدیث: ۸۴۴۳ بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۸۶٫۱۶)۔

''لم یحل للمسلم أن یشتري شیئًا یعلم أنہ مغصوب أو مسروق أو مأخوذ من صاحبہ بغیر حق، قال علیہ الصلاۃ و السلام:''من اشتریٰ سرقۃ أی مسروقًا و ھو یعلم أنھا سرقۃ فقد اشترک في إثمھا وعارھا'' (الحلال والحرام في الاسلام لیوسف القرضاوي، الفصل الرابع في المعاملات، ص: ۲۱۶، ط-المکتب الاسلامي)۔

''فمن علمت أنہ سرق مالًا أو خانہ في أمانتہ أو غصبہ فأخذہ من المغصوب قھرًا بغیر حق لم یجز لي أن آخذہ' منہ'، لا بطریق الھبۃ و لا بطریق العوض و لا وفاء عن أجرۃ و لا ثمن مبیع'' (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ ۲۴۲٫۲۹، ط-مکتب العبیکان، سعودیہ عربیہ)۔

''لا یجوز التصرف في مال غیرہ بلا إذنہٖ ولا ولایتہٖ'' (الدر المختار، کتاب الغصب مطلب في ما یجوز من التصرف بمال الغیر بدون إذن صریح۲۰۰٫۶)۔

''والحاصل:إن علم أرباب الأموال وجب ردہ' علیھم'' (رد المحتار، مطلب في من ورث مالًا حرامًا ۹۹٫۵، ۳۸۵٫۶، سعید، فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۸۶٫۱۶)۔

اور اگر چوری کے مال ہونے کا شبہ ہو اور بائع سے دریافت کرنے سے معلوم ہو گیا کہ چوری کا نہیں ہے تو ایسا مال لیا جا سکتا ہے، خواہ مخواہ شبہ پر عمل کرکے تنگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''اکتسب حراما توضیح المسألۃ ما في التاتارخانیۃ حیث قال:رجل اکتسب ما لا من حرام ثم اشتریٰ فھذا علیٰ خمسۃ أوجہ۔

و قال الکرخي: في الوجہ الأول و الثاني لا یطیب، و في الثلاث الأخیرۃ یطیب۔

و قال أبوبکر: لا یطیب في الکل، لٰکن الفتویٰ الآن علیٰ قول الکرخي دفعا للحرج عن الناس'' (رد المحتار ۴۹۰٫۷ ، ط مکتبہ زکریا دیوبند)۔

جواب ۵ :خرید و فروخت اور تجارت کے سلسلے میں اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان میں سے ایک اہم حکم یہ ہے کہ کسی چیز پر قبضہ کے بعد ہی اس کو فروخت کیا جائے، اور اشیاء منقولہ میں سے کسی چیز کے خریدنے کے بعد جب تک خریدار اس پر عملاً قبضہ حاصل نہ کرلے، اس کے لیے جائز نہیں کہ ابھی وہ اسے فروخت کردے، چناں چہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے:

''إن رسول اللہ ﷺ نھیٰ أن یبیع الرجل طعامًا حتیٰ یستوفیہ'' (بخاري شریف: رقم الحدیث: ۲۱۳۲)۔

صورتِ مسئولہ میں خریدار نے مال کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور قیمت ادا نہیں کی ہے، اس لیے یہ ادھار بیع ہوئی اور ادھار بیع میں مبیع پر قبضہ کرنے سے ملکیت ثابت

ہوجاتی ہے اور ملکیت میں آنے کے بعد اگر کسی دوسرے کو خرید قیمت سے زیادہ قیمت میں سامان بیچا تو یہ بیچنا صحیح ہے اور اس سے حاصل شدہ رقم میں تصرف کرنا صحیح ہوگا، اب جو رقم ملے گی اس میں سے جس سے ادھار خریدا تھا اس کو رقم ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے گی وہ اس کا نفع ہوگا اور یہ نفع حاصل کرنے کی شرعاً جائز صورت ہے۔

''و لا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكن و التخلّي و ارتفاع الموانع عرفًا و عادةً حقيقةً'' (بدائع الصنائع۴،۳۴۲ ، ط-زكريا)۔

''اشترىٰ بقرةً مريضةً و خلاها في منزل البائع قائلًا إن هلكت فمنّي، و ماتت فمن البائع لعدم القبض'' (رد المحتار۷،۹۸، ط-زكريا)۔

لا حرج في الشراء إذا كانت السلعة مملوكةً وفي قبضتها فلا مانع أن تبيعها بسعر معيّنٍ بعضه نقد وبعضه مؤجّلٌ أو كله مؤجلٌ إلىٰ آجالٍ معلومةٍ قليلةٍ أو كثيرةٍ۔۔۔''(مجموع الفتاوىٰ ومقالات متنوعه ۸،۱۹، ط-رياض)۔

جواب ۶ :خرید و فروخت کی صحت اس پر موقوف ہے کہ انسان اپنی مملوکہ چیز بیچے، دوسرے کی مملوکہ چیز بیچنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر وکیل بنایا ہو تو وکیل مؤکل کی جائداد کو وکالۃً بیچ سکتا ہے، نہ کہ اصالۃً۔

صورتِ مسئولہ میں خرید و فروخت کا معاملہ بائع اور مشتری کے درمیان طے نہیں ہوا ہے، صرف مال کی قیمت کو دریافت کرنے سے نفس بیع کا وجود نہیں ہوتا ہے، اور جب بیع کا وجود نہیں تو ملکیت کا ثبوت بھی نہیں؛ لہذا غیر مملوک مال کی بیع کرنا اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہے، قبل الاجازۃ کسی متعینہ سامان کی قیمت دریافت کر کے دوسرے آدمی کووہ سامان زیادہ قیمت میں فروخت کر دیتاہے اور زائد رقم کو اپنا ذاتی نفع تصور کرتا ہے،تو ایسا معاملہ کرنا شریعت کی نظر میں بالکل جائز نہیں ہے۔

''عن حكيم بن حزامٌ قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه و سلم فقلت:يأتيني الرجل يسألني من البيع ما ليس عندي ابتاع له من السوق ثم أبيعه؟ قال:لا تبع ما ليس عندك'' (سنن الترمذي رقم الحديث: ۱۳۱۵)۔

''كل ما يحتاج إلىٰ قبضٍ إذا اشتراه لم يجز بيعه حتىٰ يقبضه لقول النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: من ابتاع طعامًا فلا يبعه حتىٰ يستوفيه'' متفق عليه (المغني: ۶،۱۸۸ ، دار عالم الكتب، ط- رياض)۔

محورد وم:

جواب ۱ : اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یا تو یہ دَین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جا رہی ہے جس پر دین نہیں جس کو فقہا کی اصطلاح میں ''بیع الدین من غیر من علیہ الدین''کہا جاتا ہے، یا یہ گویا کرنسی کی بیع کرنسی سے ہو

رہی ہے جس میں کمی زیادتی اور ادھار دونوں ممنوعات پائی جا رہی ہیں، اور احادیثِ ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل۱۰۶٫۳) ۔

ہاں البتہ گناہ سے بچنے کے لیے حیلہ کیا جا سکتا ہے کہ بائع دلال سے واجب الاداء رقم سے کم مقدار بنام قرض لے لے اور دلال سے کہہ دے کہ فلاں تاریخ کو اس پرچی کے ذریعہ خریدار سے مقررہ قیمت وصول کر کے لے آنا تو اس میں سے بائع کو قرض میں جو رقم دی ہے وہ وصول ہو جائے گی اور زائد رقم دلالی کی اجرت کے طور پر ہوجائے گی۔

بیع و شرا کے طور پر واجب الاداء رقم کے حق کو مقررہ قیمت سے کم میں بیچنا درست نہیں ہے (مستفاد: إمداد الفتاویٰ ۱۶۹٫۳)۔

فتاویٰ قاسمیہ میں ہے:

''میعادی چیک کی بیع اور بیع الجامکیہ دونوں آپس میں مترادف ہیں اور بیع الجامکیہ کی صورت یہ ہے کہ حکومت کا ملازم یا صاحبِ وظیفہ جس کو منجانب حکومت مقررہ میعاد پر تنخواہ یا وظیفہ ملتا ہے وہ کبھی وقت مقررہ سے پہلے ضرورت کی وجہ سے کم پیسے میں اپنی تنخواہ یا وظیفہ فروخت کر دیتا ہے اور خریدار وقت مقررہ پر صاحبِ وظیفہ کے نام سے پورا وصول کر لیتا ہے تو حضرات فقہا نے اس طرح کی خرید و فروخت کو ناجائز اور حرام کہا ہے، اس لیے بائع کے لیے قبل از وقت کم قیمت میں اپنی پرچی فروخت کرنا ربوا اور سود کی وجہ سے جائز نہ ہوگا '' (فتاویٰ قاسمیہ۴۱۰٫۱۹) ۔

''إن بيع الصک و البراءة والجامكية إنما لا يجوز''(اعلاء السنن کراچی۲۴۴٫۱۴، کتاب البیوع بیع الصک و البراء ة و الجامکیۃ و النوط، دار الکتب العلمیۃ بیروت۶۸۷٫۱۴)۔

''وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية'' (الدر مع الرد مطلب في بيع الجامكية زكريا ۳۳٫۷)۔

جواب: سود لینا اور دینا دونوں ہی معصیت ہے، اِس لیے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا، مگر کبھی کبھی ایسے قرض لینا ضرورورت بن جاتی ہے اور تجارت، کاشت کے لیے ایسے قرض لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، اِن حالات میں بدرجۂ ضرورت ایسے قرض لینے کی اجازت ہوگی؛ البتہ یہ اجازت اُسی وقت ہوگی جب آدمی اُس کے لینے پر اِس طرح مجبور ہو جائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعۂ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضرورتونمثلاً کھانا، کپڑا اور مکان وغیرہ کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے، نہ کہ محض تعیش، آرام طلبی اور معاشی معیار بلند کرنے کے لیے ایسا کرے (جدید فقہی مسائل۲۴۸٫۱)۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ اپنے فتاویٰ میں رقم طراز ہیں: ''سود دینا حرام ہے، حرام کا ارتکاب اضطرار کی حالت میں معاف ہے، پس اگر جان یا عزت کا قوی خطرہ ہے، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہینہے مثلاً: نہ جائداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیرسود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے، اور اگر ایسی

ضرورت نہینہے؛ بل کہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لیے ضرورت ہے، یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے، یا جائداد فروخت ہو سکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، کبیرہ گناہ ہے" (فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۳۰۶،۱۶) ۔

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامةً كانت أو خاصةً ولهذا جوزت الإجارة علىٰ خلاف القياس للحاجة۔۔۔ وفي القنية و البغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الأشباه و النظائر ۱، ۲۶۸)۔

"وإذا كان لإنسان حاجة أو ضرورة ملحة اقتضت معطي الفائدة أن يلجأ إلىٰ هذا الأمر فإن الإثم في هذا الحال يكون علىٰ اٰخذ الرباوحده، وهذا بشرط أن تكون هناك حاجة أو ضرورة حقة لا مجرد توسع في الكماليات أو أمور يستغني عنها" (الحلال والحرام في الاسلام ليوسف القرضاوی ،۲۱۹)۔

الغرض! صورتِ مسئولہ میں قیمت ادا کرنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے خریدار کی عزت کو قوی خطرہ ہے اور عزت کو بچانا ضروری ہے اور مواقع ضرورت میں اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے، اب چاہے بذاتِ خود لے لو یا کسی دوسرے کو واسطہ بنا کر لے۔

جواب ۳ :صورتِ مسئولہ میں عقدِ بیع تام ہو گیا ہے، تبھی تو اگلے شخص کو فی کیرٹ سات سو روپئے میں فروخت کرکے اس سے قیمت وصول کر تا ہے، اب عقد کے تام ہونے کے بعد پہلے شخص سے یہ کہاکہ یہ مال پانچ سو روپئے فی کیرٹ کا نہیں ہے؛ اس لیے اس کی قیمت کم کرو اور اس پر پہلا بائع راضی ہوگیا تو شرعاً یہ صورت جائز ہوگی، جب کہ طرفین کی طرف سے ایک دوسرے کو دھوکہ اور نقصان پہنچانے کی کوئی نیت نہ ہو۔

"إذا كان الإيجاب من المشتري فقبل البائع بأنقص من الثمن أو كان من البائع فقبل المشتري بأزيد إن عقد فإن قبل البائع الزيادة في المجلس جازت كما في التاتارخانية۔۔۔و أما شرائط اللزوم بعد الانعقاد والنفاذ فخلوه من الخيارات الأربعة المشهورة و يزاد خيار الكمية و خيار الغبن إذا كان فيه غرور"(البحرا الرائق ۲۸۰،۵، ۲۸۲ط-دار الكتاب الاسلامي قاهره، هكذا في الهندية ۳،۳،ط-دار الكتب العلمية لبنان/الدر مع الطحطاوي۳۴،۷، ط-دار الكتب العلمية لبنان)۔

ہاں اگر عقد مکمل نہ ہوا ہوتا اور عاقدین آپس میں معاملہ طے کر رہے ہوتے اور مشتری ثمن کی کمی کا مطالبہ کرے تو بائع کو بیچنے اور نہ بیچنے کا اختیار ہے؛ اس لیے کہ بیع میں رضا مندی ضروری ہے اور یہاں بائع راضی نہیں ہے۔

جواب ۴ :کسی چیز کی واقعی خوبیوں کی تعریف اور واقعی عیوب کی تبیین شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے، لیکن تعریف میں مبالغہ کرنا اور چاپلوسی کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح واقعی عیوب سے زیادہ عیوب کو بیان کرنا بھی درست نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

‘‘التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء’’ (رواه الترمذي: رقم الحديث: ١٢٠٩)۔
(یعنی فردا بروز قیامت سچے امانت دار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا)۔
‘‘إن التجار يبعثون يوم القيامة فجارًا إلا من اتقىٰ و برّ و صدق’’ (رواه الترمذي: رقم الحديث: ١٢١٠)۔
(یعنی قیامت کے دن تاجروں کو فاجروں کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا، مگر جو تاجر تقویٰ، نیکی اور سچائی کو اختیار کرے)۔
‘‘قال رسول الله ﷺ:لا تطروني كما أطرت النصارىٰ ابن مريم فإنما أنا عبده، فقولوا عبد الله ورسوله’’ (صحيح البخاري: رقم الحديث ٣٤٤٥)۔
‘‘قال الحافظ و الإطراء المدح بالباطل تقول:أطريت فلانًا، مدحتہٗ فأفرطت في مدحہٖ’’۔
مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر واقعی تعریف جس کا وہ مال مستحق نہیں ہے، جائز نہیں ہے، اور اگر کسی شخص کو دھوکہ دینے کے لیے مال کے غیر واقعی عیوب جو مال میں نہیں ہینان کو بیان کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ‘‘من غشّنا فليس منا’’ (ابن ماجہ: ٢٢٢٥)۔
(جو شخص دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔
جواب ٥ : سوال میں پوچھی گئی پہلی شکل میں ملاوٹ کی ممانعت اس وقت ہے جب کہ مال کو خالص کہہ کر بیچا جائے، اگر تاجر کو پہلے ہی سے بتا دیا جائے کہ اس مال میں ملاوٹ ہے اور ملاوٹ والا مال سستے دام میں ملتا ہے اور خالص مال مہنگا ملتا ہے، جب اس نے یہ کہا کہ مجھے سستا مال چاہیے، ملاوٹ رہنے نہ رہنے سے کوئی غرض نہیں، تو اس سے ایسے مال کی خریدی پر تاجر کی رضا مندی ثابت ہوتی ہے، اس لیے شرعاً اس طرح کے کاروبار میں کوئی حرج اور ممانعت نہیں ہے۔
‘‘عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول:المسلم أخو المسلم و لا يحل لمسلم باع من أخيه بيعاً فيه عيب إلا بيّنه لہ’’ (سنن ابن ماجہ: رقم الحديث: ٢٢٤٦)۔
اور دوسری شکل کا حکم یہ ہے کہ تاجر کو مال کے عیب سے مطلع نہیں کیا گیا ، اس لیے یہ دھوکہ دینا ہے، جس کی شریعت میں ممانعت وارد ہے، لہذا یہ صورت جائز نہیں ہے۔
درمختار میں ہے:‘‘لا يحل كتمان العيب في مبيع أو ثمن لأن الغش حرام’’ (الدر المختار ٢٣٠،٧ ط-دار عالم الكتب الرياض)۔
اور مبسوط السرخسی میں ہے: ‘‘قال:اشتره فإنہ لا عيب بہٖ، ثم وجد بہٖ عيبًا كان لہٗ أن يخاصم فيه بائعہ’’ (المبسوط للسرخسي٩٢،٣ ط-مكتبہ شيعيہ آن لائن)۔

جواب۶ :شریعتِ مقدسہ میں نفع کے بارے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے؛ بل کہ اس کو فطری اتار چڑھاؤ پر رکھا ہے، ہاں! رسول اللہﷺ نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ طلب و رسد میں تناسب و توازن قائم رہے، تاکہ قیمت میں بھی توازن بر قرار رہے، البتہ کسی سامان پر اتنا زیادہ نفع حاصل کرنا جو غبنِ فاحش کے زمرہ میں آتا ہے کراہت سے خالی نہیں، اور غبنِ فاحش یہ ہے کہ سامان کی قیمت مقرر کرنے والوں کے دائرۂ تخمین سے بھی زیادہ ہو۔

و قال في ''الفقہ الحنفي في ثوبہ الجديد'': وعرف الفقهاء الحنفية الغبن الفاحش بأنہ ما لا يدخل تحت تقويم المقومين من أهل الخبرة، فلو قوّم السلعة أحدهم بمائة درهم و قومها الثاني بخمسة و تسعين وقومها الثالث بتسعين مثلًا، فبيعها بما بين التسعين و المائة فيہ غبنٌ يسيرٌ، وبالتسعين فما دونهاغبن فاحش بالبائع، وبمائة فما فوقها غبن فاحش بالمشتري، ثم حدد المتأخرون من الفقهاء الغبن الفاحش للتيسير في الفتوىٰ و القضاء و التطبيق، أنہ ما بلغ خمس القيمة في العقار و عشرها في الحيوان ونصف العشر في العروض و سائر المنقولات، و بهذا أخذت مجلة الأحكام العدلية في المادة:۱۵۶ منها'' (الفقہ الحنفي في ثوبہ الجديد ۱۹۳،۴)۔

''من اشترىٰ شيئًا وأغلىٰ في ثمنہ فباعہ مرابحة علىٰ ذلک جاز، و قال أبو يوسفؒ: إذا زاد زيادة لا يتغابن الناس فيها فإني لا أحب أن يبيعہ مرابحة حتىٰ يبين'' (رد المحتار ۱۶۱،۳ ط-مكتبہ زكريا ديوبند)۔

''لأن الثمن حق البائع؛ لأنہ يقابل ملكہ فيكون التقدير إليہ إلا إذا أغلىٰ فيہ بأن يريد أن يبيع قفيزًا منہ بمائة و الناس يشترون منہ بخمسين فيمنع البائع عنہ دفعًا للضرر عن الناس'' (المحيط البرهانی ۱۴۶،۷ ط-دار الكتب العلمية لبنان)۔

''عن سعيد بن المسيبؒ أن عمر بن الخطابؓ مرّ بحاطب بن أبي بلتعة و هو يبيع زبيبًا لہ في السوق بأرخص مما يبيع الناس فقال لہ عمر بن الخطابؓ: إ ما أن تزيد في السعر بأن تبيع بمثل ما يبيع أهل السوق و إما أن ترفع من سوقنا فتبيع في بيتک لئلا يضربک أهل السوق'' (أوجز المسالک إلىٰ مؤطا مالک ۱۳/۱۴ ط: دارالقلم دمشق)۔

''ولأن التسعير تقدير الثمن وأنہ نوع حجر ولا ينبغي للسلطان أن يسعّر علىٰ الناس إلا أن يتعدى أرباب الطعام تعديًا فاحشًا في القيمة فلا بأس بذٰلک بمشورة أهل الخبرة بہٖ لأن فيہ صيانة حقوق المسلمين عن الضياع'' (كتاب الاختيار لتعليل المختارہ ۲۰۰، كتاب الكراهة ط: دار المعرفة بيروت لبنان)۔

* * *

تیسرا باب

مناقشہ

مناقشہ:

ہیرے وجواہرات کی خریدوفروخت

مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب:

اس سمینار کی یہ دوسری موضوعاتی نشست ہے، جس کا موضوع ہیرے وجواہرات کی خریدوفروخت ہے، اکیڈمی کا موضوعات کے سلسلہ میں جو نظام ہے اس میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ جس علاقہ میں سمینار تجویز ہوتا ہے وہاں میزبانوں سے یہ بات ہوتی ہے کہ آپ اپنے علاقہ کے اعتبار سے اگر کسی موضوع کو اہم اور حساس سمجھتے ہوں تو وہ موضوع اختیار کیاجاسکتا ہے، چنانچہ حسب موقع کئی سمیناروں میں اس طرح کے موضوعات رکھے گئے ہیں اور یہاں اس سمینار میں یہ موضوع اسی پس منظر میں رکھا گیا ہے، چوں کہ ہمارا یہ سمینار جے پور میں تجویز ہوا تھا اور جے پور کی کاروباری اعتبار سے جہاں بہت سی خوبیاں اورخصائص ہیں، وہاں ایک اہم اور بڑا کام ہیرے اور جواہرات کی تجارت کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک نظام ہے کہ بعض موضوع ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا سوالنامہ ہم لوگ اپنے پاس معلومات کی بنیاد پر مرتب کرلیتے ہیں، لیکن خاص صورتوں میں جو موضوع ہوتا ہے اور جن کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے ان سے استفسار اور مذاکرے کے بعد سوالات طے ہوتے ہیں، چنانچہ اس سوالنامے کو تیار کرنے میں دیر بھی لگی، سمینار طے ہونے کے بعد حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب وغیرہ کا جے پور کا سفر ہوا تھا، چنانچہ وہاں کے تجار سے گفتگو ہوئی، اس کے علاوہ سورت گجرات میں بھی اس کا بڑا کاروبار ہے، وہاں بھی لوگوں سے گفتگو ہوئی، بہت سے پہلو سامنے آئے، کتنے لوگوں نے بعد میں کچھ معلومات بھیجی، اسی وجہ سے اس موضوع سے متعلق سوالنامے کا ایک حصہ بعد میں جاری کیا گیا، پہنچایا گیا، اس نشست میں ان شاء اللہ اسی موضوع سے متعلق ہم معمول کے مطابق پہلے تو عرض سنینگے اور اس کے بعد پھر ان شاء اللہ مناقشہ ہوگا اور مزید گفتگو ہوگی ان شاء اللہ، یہ نشست دو سوا دو گھنٹہ کی ہے، اس کے بعد پھر اگلے موضوع کی نشست ہوگی، اس نشست کی صدارت ہمارے اکیڈمی کے مستقل شریک سفر، بلکہ کہنا چاہئےہمارے مربی اور ہمت افزا، حوصلہ افزا اور مغربی یوپی رامپور کے ممتاز اور مقبول عالم دین حضرت مولانا مفتی محبوب علی صاحب وجیہی فرمائینگے، اسٹیج پر تشریف فرما ہیں، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس کی نظامت فرمائینگے، اس موضوع سے متعلق چار عرض ہیں، سب سے پہلے مولانا مفتی محمد شاہجہاں صاحب ندوی اپنا عرض پیش کرینگے ، میری

درخواست ہے کہ وہ تشریف لائیں اور اپنا عرض پیش کریں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

مولانا عتیق احمد صاحب فرما رہے ہیں کہ بہت صبر کے ساتھ آپ حضرات نے سماعت فرمایا، اللہ تعالی جزاء خیر عطا فرمائے، سوالنامہ آپ حضرات نے دیکھا ہے کہ یہ کل چھبیس سوالات پر مشتمل ہے اور اس سوالنامہ میں اتنا پھیلاؤ اس لئے پیدا ہوگیا کہ یہ سمینار جے پور میں ہونے والا تھا اور جے پور میں بہت سے مسلمان جواہرات کے کاروبار سے جڑے ہوئے ہیں اور جب ان کے ساتھ بیٹھک ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ہیرے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر یہاں ہوتا ہے، اور اس میں مسلمان تجار کی ایک بڑی تعداد جڑی ہوئی ہے، اور ظاہر سی بات ہے کہ جہاں اتنے بڑے پیمانے پر یہ کام ہوگا وہاں مسلمانوں کے لئے اس سے جڑے شرعی مسائل بھی پیدا ہونگے، اسی لئے یہاں کے مسلمان تجار نے محور چہارم میں جو سوالات ہیں ان کو مرتب کرکے اکیڈمی کو بھیجا اور ان کو شامل کرنے کی خواہش کی جو آپ حضرات کے سامنے ہے، ان شاء اللہ یہاں جو فیصلہ ہوگا وہ ان کے لئے اطمینان قلب اور آسانی کا باعث ہوگا، مصطفی عبد القدوس صاحب محور دوم کے سوال نمبر ۱ اور محور سوم کے سوال ۱، ۳، اور ۵ پر بات کرینگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کا خیال رکھینگے کہ شریعت میں کثرت سوال کو پسند نہیں کیا گیا ہے، لیکن بہرحال آپ کو اس پر جو گفتگو کرنی ہے وہ آپ کریں۔

مولانا مصطفی عبد القدوس صاحب ندوی:

محور دوم کے سوال نمبر ۱ کے اندر اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آپ نے دے دیا ہے، اگر بحیثیت وکیل ہو تو مسئلہ دوسرا ہے، لیکن سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت وکیل اگر وہ اپنا کام نہیں کررہا ہے، بلکہ مستقل وہ دلال ہے اور دلال کی حیثیت سے وہ کام کررہا ہے اور نفع کمانا چاہتا ہے تو یہ بیع اگر دیون کے مماثل ہو تو پھرنا جائز ہونا چاہئے، جائز نہیں ہونا چاہئے، اس کے بعد محور سوم کے اندر سوال نمبر ۳ میں زیرو کم دکھانے کا مسئلہ ہے، اس پر فریقین اگر راضی ہوں جیسا کہ آپ نے فرمایا تو یقینا درست ہونا چاہئے، معاملہ دونوں کے درمیان کا ہے، ایک بات ذہن میں آتی ہے جو آپ کی گفتگو سے سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر فریقین کے آپسی معاملہ میں اگر کسی تیسرے آدمی کا حق متعلق ہوجائے اور اس کے معاملہ کی وجہ سے نفع ونقصان کا احتمال ہو تو پھر ایسی صورت میں واضح ہونا چاہئے کہ کیا قیمت ہوگی، واضح نہ ہو تو دوسرے کو نقصان ہوگا، اس لئے اس معاملہ کو درست نہیں ہونا چاہئے اور اسی طرح سے محور سوم کے اندر سوال نمبر ۵ میں جو ذرات کے تعلق سے بات آئی ہے اور اس میں اختلاف بھی نقل کیا گیا ہے کہ زیور بنانے والے کو بتادیا جائے کہ .....اور آپ نے وضاحت بھی یہاں پر کی ہے کہ عرف کی دوقسمیں ہوتی ہیں: ایک عرف ہے عملی اور ایک ہے قولی

اور اس معاملہ میں عرف عملی جب پایا جاتا ہو جو زیور بنانے والا دے رہا ہے، اس کو معلوم ہے اور وہ لیتا بھی نہیں ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلائی وغیرہ میں ہوتا ہے بعض علاقوں میں، لیکن بعض علاقوں کا میرے علم میں ہے کہ جو آدمی کپڑا سینے کے لئے دیتا ہے اس میں سے جو بچ جاتا ہے اس کو واپس کرکے دیتا نہیں ہے اور کپڑا والا بھی اس کو کہتا ہے کہ تم چاہو تو استعمال کرلو، تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں عرف عملی ہے کہ جو کپڑا بچ گیا وہ نہیں دیا جاتا ہے، اگر اس طرح عرف عادی ہو اس معاملہ میں تو پھر اس سلسلہ میں جواز کی کراہت نہیں ہونی چاہئے، دوسری بات یہ ہے کہ جو کہا گیا کہ نص کے خلاف اگر عرف ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہوتا صحیح ہے، لیکن بات یہ ہے کہ نص وہاں اس معاملہ میں صریح ہو تب تو، لیکن اس معاملہ میں کوئی نص صریح تو ہے نہیں، صرف نص سے آپ استدلال کررہے ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ جو غش کے مسائل سے استدلال کررہے ہیں وہ بات صحیح ہے، لیکن یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ عرف کے ذریعہ سے بعض مرتبہ نص کے اندر تخصیص اور تخفیف کی گنجائش ہوتی ہے، تو اس اعتبار سے بھی غور کرنا چاہئے کہ یہاں پر تخفیف، تخصیص ممکن نہیں ہے، حالانکہ اور بھی صورتیں ہیں اور آخری بات امور جہالت سے متعلق ہے، اس کی تین شکلیں ہوتی ہیں، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ معاملہ کو درست کرنے کے لئے اس معاملہ کو فسخ کرکے نئے سرے سے معاملہ کرلیا جائے، تاکہ عقد فی عقدین لازم نہ آئے اور جو فریقین کے ساتھ نقصان اور فائدہ کا معاملہ ہو اس سے بچا جائے اور جو دشواریاں ہوں اس سے بچ سکتے ہیں، اگر ایسا ہوسکتا ہے تو دیکھا جائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

نہیں، آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ سامان، بل میں تبدیلی کی جاتی ہے،.....مناسب معلوم ہوتا ہے کردیا جائے، نہیں اس کی شکل وہی ہے مولانا کہ سامان کے بل پر کم قیمت لکھی جائے، ٹیکس سے بچنے کے لئے، لیکن دونوں کے درمیان یہ بات طے ہو کہ اس پر تین سو روپے لکھا گیا ہوگا تو تین ہزار قیمت مان لی جائے گی، تو بل کا لفظ یہاں بڑھا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نامعلوم:

بعد میں مشروط نہیں ہوتا ہے، معروف تجار کے یہاں ہوتا ہے، تو نہ مشروط نہ معروف ہو، اس میں ہے کہ اگر رقم جلدی ادا کردیئے تو کم میں بھی ادا کرتے ہیں یہ عرف ہوتا ہے اور ..... شرط لگائی جاتی ہے تو ہمارے اس تعجیل میں صرف شرط کا مسئلہ ہے، عرف کا مسئلہ نہیں ہے، جب کہ ہمارے سوال میں عرف کا بھی مسئلہ ہے اور شرط کا بھی مسئلہ ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

اصل میں اگر شرط کی شکل ہوتی ہے تو یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ تعجیل کا عوض ہے اور اگر عرف کی بنیاد پر اس میں کمی کی جائے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تعجیل کا عوض ہو، یہ تبرع بھی ہوسکتا ہے عرف، شرط کا لفظ رہنے دیجئے۔

نامعلوم:

عرف میں یہ معاملہ چلتا ہے کہ اگر جلدی ادا کرتا ہے تو کم ہی ادا کرتا ہے، بعض جگہوں اور مارکیٹوں پر یہی ہوتا ہے، ماڑواریوں کے یہاں خاص طور پر۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

آپ حضرات رائے دیجئے۔

نامعلوم:

اگر شرط ہو تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر عرف کی وجہ سے کہا جائے کہ کم ادا کرنا جائز نہیں ہے تو اس میں یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

اصل میں یہ کبھی مبنی ہوتا ہے معاوضہ کے جذبہ پر اور کبھی تبرع کے جذبہ پر مبنی ہوسکتا ہے، شرط کا لفظ مناسب لگتا ہے۔

نامعلوم:

دوسری بات یہ ہے کہ جب عرف بنے گا تو یہ شرط عقد کے وقت ہی لگی رہے گی، عرف ہونے کی وجہ سے، اس کو مشروط بالعقد مانا جائے گااور جب عقد کے وقت یہ مشروط ہو کہ اگر اس وقت قیمت ادا کردی جائے تو اس میں ڈسکاؤنٹ کیا جائے گا، یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف حکم ہوا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

مطلب اس سے عرف والی شکل کی نفی نہیں ہوتی ہے، اور عام طور پر عرف کے بارے میں ترغیب بھی مقصود ہوسکتی ہے، عرف کی بنیاد ضروری نہیں ہے کہ تعجیل کا معاوضہ ہو، اس کی بنیاد تبرع اور گاہک کو راغب کرنا بھی ہوسکتا ہے، تو جو شرط لفظ ہے اس لفظ کو رہنے دیا جائے۔

نامعلوم:

حضرت قیمت کے کمی زیادتی کے سلسلہ میں ایک دو باتیں عرض کرنی ہے کہ قیمت کم وزیادہ جو لکھی جاتی ہے اس سلسلہ میں یہ بات آئی کہ قیمت کم لکھی جائے بل پر، کیا یہ حکم رجسٹری کا بھی ہے کہ زمین ہم نے زیادہ میں خریدی اور کم میں لکھوالی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ اصولی بات ہے، جب طے ہوجائے گی تو ہر جگہ اس کا اطلاق ہوگا اور میں

سمجھتا ہوں کہ آپ جو شکل بتارہے ہیں اس میں تو سب سے زیادہ اس پر عمل ہوتا ہے۔

نامعلوم:

دوسری بات حضرت یہ ہے کہ کمپنیوں کی جو دوائیں آتی ہیں، وہ پانچ روپیہ کی دوا ہوتی ہے اور پچاس روپے لکھی جاتی ہے، اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے، یہاں آپ نے بحث کے دوران سنا ہے کہ بعض قانونی واردات ،واجبات سے بچنے کے لئے اگر کوئی آدمی عوض کو کم کرکے لکھے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے، یہاں یہ صورت مراد ہے، دوا والی صورت میں وہ بات نہیں ہے، کمپنی زیادہ قیمت لکھتی ہے اور اس پر کئی مرحلوں میں کمیشن دیتی ہے، کتابوں میں بھی وہی ہوتا ہے، یوں تو جتنی مصنوعات ہیں سب میں وہی چیز ہوتی ہے، کوکاکولا لوگ پیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک روپیہ بوتل تیار ہوتا ہے اور دس روپے اس کی قیمت رکھی جاتی ہے، تو وہ زیر بحث نہیں ہے۔

نامعلوم:

قیمت کے تعلق سے ایک بات یہ عرض کررہا تھا کہ اس میں بل کا نام نہ لکھا جائے، بلکہ یہ لکھا جائے کہ سامان کی قیمت کم لکھی جائے، چوں کہ بہت سی مرتبہ سامان پر بھی قیمت کم ڈالی جاتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ صرف بل پر ہی قیمت کم ڈالی جائے ، اگر بل اور سامان دونوں کا تذکرہ نہ کیا جائے، صرف یہ لکھا جائے کہ سامان کی قیمت کم لکھی جائے تو ساری شکلیں اس میں آجائینگی۔

مولانا عبید اللہ اسعدی:

دیکھئے اگر کسی مصلحت کے تحت قیمت کم لکھنے میں حرج نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یعنی سامان اور بل دونوں کو چھوڑ دیا جائے۔

* * *